India's moodi

اُردو ڈائجسٹ

جولائی ۲۰۲۰ء

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

قائداعظمؒ نے جس
پاکستان کا خواب دیکھا
وہ شرمندۂ تعبیر کیوں نہ ہوا؟
اُلجھے ہوئے حالات کا تجزیہ

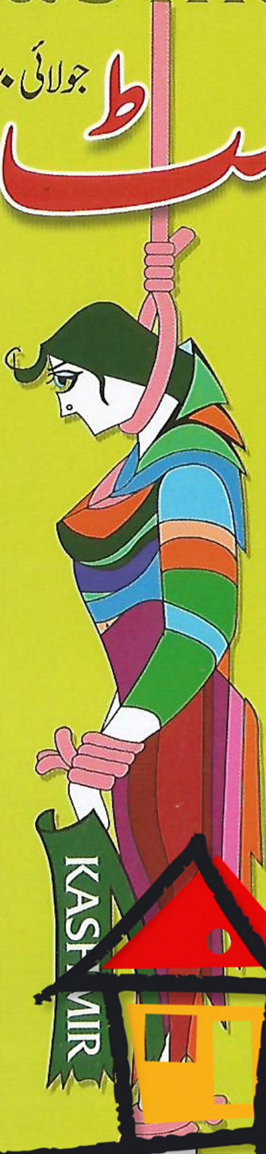

کشمیر پہ منڈلاتے جنگ کے بادل

علاقائی طاقت بننے کے جنون میں مبتلا
مودی جنتا کیا اپنی خوفناک مہم جوئی
سے جنوبی ایشیا کو آگ و خون کے
بھیانک الاؤ میں دھکیل رہی ہے

- ادبی شہ پارے
- مزاح
- شخصی خاکے
- آپ بیتیاں
- شاہکار افسانے
- سفرنامے
- انکشافات

امنگ ایڈیشن

Pakistanipoint
Learning Point

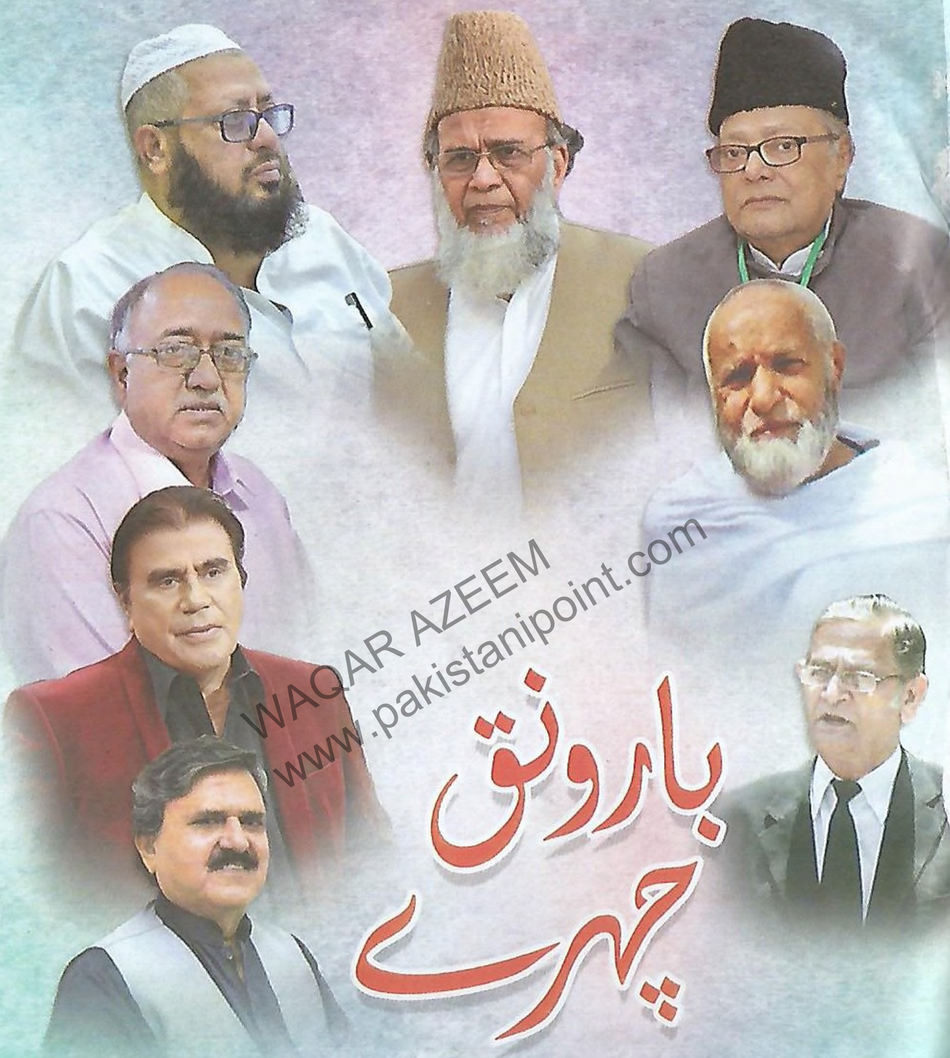

بارونق چہرے

اعلیٰ روایات کا گلزار کہکشاں... جو مُرجھا گیا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

صفحہ 09

اُردو ڈائجسٹ

جولائی 2020ء
ذیقعدہ 1441ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 7

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدرمجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیراعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلسِ تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
سرورق: اسلم کمال (تمغۂ حسنِ کارکردگی)
ڈیزائنر / کمپوزر: کاشف شہزاد / رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707

پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں
بیرون ملک ~~100~~ 80 امریکی ڈالر — اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

G-III,325 جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ہم کہاں کھڑے ہیں

اُلجھے ہوئے حالات کا تجزیہ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہمارے عہد کے ارمانوں اور خواہشوں پر دم دینے والے اہلِ اقتدار سیم و زر کے پجاری بن گئے ہیں

صحافت کو حکومتی طاقت کے ذریعے دبانے کی اکیسویں صدی میں یہ ایک بدترین مثال ہے

عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے حالات انتہائی گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں

قائدِ اعظمؒ نے منتشر مسلمانوں کو ایک قوم بنانے میں بڑی جاں گسل جدوجہد کی تھی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

فہرست

جولائی 2020ء

کچھ اپنی زبان میں

بارونق چہرے 09

جون کا مہینہ ہمارے لیے بڑا ستم گر ثابت ہوا

ہم کہاں کھڑے ہیں

اپنا سامان مختصر رکھیے 13

کورونا وائرس کے ہاتھوں پورا عالمی نظام لرزہ براندام ہے

حالاتِ حاضرہ

بامِ دنیا پہ چین اور بھارت آمنے سامنے 24

چینی فوج نے گھمنڈی مودی کا غرور ملیا میٹ کر دیا

دین دنیا

ایثار و قربانی 57

دل میں محبت و خلوص ہو تو کوئی کسی سے حسد اور نفرت نہ کرے

اسلامی شخصیت

نہرِ زبیدہ 59

جب حجاج کرام کے لیے پانی کی قلت کا مسئلہ حل ہوا

فکر و آگہی

یقینِ کامل 61

مادی کائنات آپ کے زیرِ اثر ہے، آپ اس کے مطیع نہیں

شعوری سانچہ اور حقیقت آشنائی 76

اللہ کے بغیر کائنات اور حیات کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی

تاریخِ عالم

یورپی سامراج کی خونریزیاں 63

خوفناک جنگوں میں اذیت کے بھیانک ذرائع کا ذکر

رُوئے زمین پر پہلا قرنطینہ 201

ہم اُس تاریخ کا حصہ ہیں جو آنے والی نسلوں کا موضوع ہوگا

سفرنامہ

اے اللہ! راضی ہو جا 47

لاکھوں مسلمان دنیا کا خوبصورت ترین نظارہ نہ دیکھ پائیں گے

ایک پاکستانی استاد ترکی میں 186

دلچسپ تہذیبی و معاشرتی جھلکیاں دکھاتا تفریحی دورہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بام دنیا پہ چین اور بھارت آمنے سامنے

24

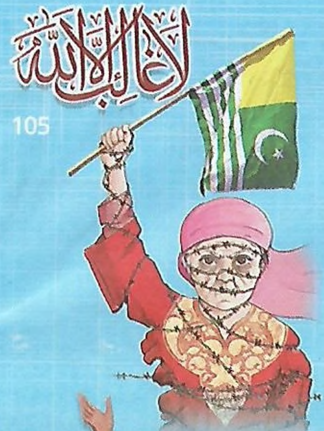

سچا واقعہ

سعادتِ حج اور فطرتِ انساں... بخشش والی بابرکت جگہ پر بھی ہم باز نہیں آتے 73

افسانے/کہانیاں

آئینہ زندگی... مکافاتِ عمل کا پہیہ کبھی نہیں رُکتا، جو بویا وہی کاٹنا ہوگا 117

ضمیر کی جنگ... ایسے گھرانے کی کہانی جنھیں شکر ادا کرنے کی عادت نہیں تھی 126

آخری موقع... آلائشوں میں گھِرے جوان کو جب کفارہ ادا کرنے کا احساس ہوگیا 150

کیا وہ بے وقوف تھا؟... وہ غریب تھا اور دردمند اور ہنس مکھ مگر جینے کا ہنر جانتا تھا 163

خواب... ایسی لڑکی کا فسانۂ حیات جو دل کی خواہشیں ناتمام رہ جانے پر ماتم کناں تھی 165

طوفان کے بعد... زندگی اور محبت بعض اوقات انسان کے ساتھ عجب کھیل کھیلتی ہے 181

پادری یونس کا خزانہ... ایک ایسے عجیب و غریب محافظ کی کہانی، جو صدیوں سے زندہ تھا 96

ایک عظیم استاد... ایسے مثالی اُستاد کی کہانی جو شاگردوں کے آگے جھک گیا 55

بکرے کی ماں... ممتا جانوروں میں بھی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے 204

کورونا! تیرا شکریہ... بچی کے دل سے نکلے الفاظ نے جب ایک ماں کو ہکا بکا کردیا 236

مکمل عشق... ایسی لڑکی کی کہانی جو سر سے پاؤں تک محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی 241

کشمیریات

لاغالب الا اللہ... معصوم شہیدوں کی ساری حرماں نصیب مائیں حساب مانگ رہی ہیں 105

طنز و مزاح

جنونِ لطیفہ... اکثر جی چاہتا ہے کاش ہم مرحوم ہوتے... مشتاق احمد یوسفی کی تحریر 82

سویرے جو کل میری آنکھ کھلی... سحر خیزی کے شوقین کی کہانی، پطرس بخاری کا شاہکار 121

دلہن کی تیاری... باپ کی مسکراتی تحریر، جو اپنی بیٹی کی شادی اس کی پسند سے کرنا چاہتا تھا 146

منانے کے دن... جن قوموں نے دن نہ منائے وہ زیادہ دیر پنپ نہ سکیں 169

بادشاہ سلامت... ایسے شوہر کی کہانی جو صرف نام کا سربراہ تھا... مشکور حسین یاد کا شہ پارہ 194

جاپانی جنگ کی لنگوٹی... جاپانی محاذِ جنگ کی دہلیز پر زعفرانی یادداشتوں کی جھلکیاں 205

دو بخیلوں کی شادی... ہوسکتا ہے کبھی ان دونوں کو نفرت ہوجائے... مسکراتی کہانی 210

چائے کی چاہ... ایک خوشامدی شاعر کی دلچسپ کہانی، جو سب کو شیشے میں اُتار لیتا 217

میرا قیمہ... قصائی کی دکان پر ہونے والی گفتگو کسی لطیفے سے کم نہیں ہوتی 230

سرِ راہ... دورانِ سفر ایسے لوگ بھی ملتے جن کو برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے 129

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سروے/تجرباتِ زندگی

ایڈز، بیماری یا عذاب... بعض اوقات مریض اس کے نام کی دہشت سے ہی مرجاتا ہے 112

بریسٹ کینسر... خواتین اسے موت کا فرشتہ نہ سمجھیں... یہ قابلِ علاج ہے 89

شخصیات/خاکے

عبدالرحمٰن چغتائی... ایسا عظیم فنکار جو تصاویر نہیں بلکہ عظیم قلعے اور محل بناتا تھا 172

گنجا نہاری والا... دیگ میں سب سے پہلے غریب کا حصہ نکالنے والے نہاری فروش 224

مُلّا واحدی... ادبی دنیا کے جگمگاتے ستارے کی حیات کے دریچے وا کرتی تحریر 137

عبدالرحمٰن چغتائی 172

جُرم سزا

ظلم یہ ہے کہ... ایسے نوجوان کی کہانی جو عشق میں شرافت کی زندگی بھول گیا 131

آپ بیتی

سفر شرط ہے... عشق اور علم کی کوئی انتہا نہیں... جنونِ علم کی بے مثال داستان 153

طب و صحت

غذائی جادو... سادہ غذا نہ صرف دسترس میں، بلکہ زندگی صحتمند بناتی ہے 220

تعلیم و تربیت

بچے اور ٹیکنالوجی... ان کی آنکھوں اور کمزور دل کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے 233

258

عید قرباں کے خاص پکوان

نفسیات/جگ بیتی

دوگام سفر... اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنا اور اصلاح کی کوشش نہ کرنا غلط ہے 239

کچھ بھی ناممکن نہیں... اگر حوصلہ اور ارادہ بلند ہو تو غربت بھی آڑے نہیں آتی 244

گوشۂ خواتین

عید قرباں کے خاص پکوان... 258

سادگی سے بھی مثالی پکوان بنائے جاسکتے ہیں

غذائی جادو

220

مستقل سلسلے

شعر و سخن... 249 تبصرہ کتب... 253

چمن خیال... 255 اردو کہاوتیں... 199

مایوسی کا علاج ہنسی... 261

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

ترجمہ: اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً رب کی رحمت سے مایوس وہی ہوتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں۔ (یوسف:87)

ترجمہ: کہا اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید تو صرف گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ (الحجر:56)

ترجمہ: (میری جانب سے کہہ دو) کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔ (الزمر:53)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں کون سا شخص سب سے بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر وہ شخص جو مخموم دل اور زبان کا سچا ہو۔'' صحابہؓ نے عرض کیا: زبان کا سچا تو ہم سمجھتے ہیں، مخموم دل سے کیا مُراد ہے؟

فرمایا: مخموم دل وہ شخص ہے جو پرہیزگار ہو، جس کا دل صاف ہو، جس پر نہ تو گناہوں کا بوجھ ہو اور نہ ظلم کا، نہ اس کے دل میں کسی کے لیے کینہ ہو اور نہ حسد۔'' (ابن ماجہ)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بارونق چہرے

جون کے مہینے میں یکے بعد دیگرے قومی شخصیتیں، دینی ہستیاں، سیاسی رہنما اور اِیثار پیشہ لوگ دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ کورونا بیماری سے موت کے منہ میں چلے جانے والوں کی تعداد چار ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ اِن میں ہمارے قومی ہیرو ڈاکٹرز، نرسیں اور طبی عملے کے لوگ بھی شامل ہیں جو فرنٹ لائن پر جاں لیوا مرض سے نبرد آزما تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الغاشیہ میں ان 'بارونق چہروں' کا ذکر بڑے دلکش پیرائے میں کیا ہے جو دنیا میں کامیاب زندگی گزار کے آئے تھے۔ قرآنِ حکیم کے الفاظ ہیں: ''کچھ چہرے اُس روز بارونق ہوں گے، اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے، عالی مقام جنت میں ہوں گے، کوئی بےہودہ بات وہاں نہ سنیں گے، اس میں چشمے رواں ہوں گے، اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی، ساغر رکھے ہوں گے، گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوں گے۔''

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے معاشرے میں یہ بارونق چہرے بڑی تعداد میں نظر آتے تھے جن کی بدولت اعلیٰ روایات کا گلزارِ کہکشاں کِھلا اور نیکیوں کی مہک ہماری بستیوں میں رچی بسی رہتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت کا نظام درہم برہم ہوتا گیا اور عظمت کے مینار سرنگوں ہونے لگے۔ اس کے باوجود ہماری آنکھوں نے ایسے ایسے مردانِ کار اَور ایسے ایسے اہلِ عزیمت دیکھے ہیں جنہوں نے ہواؤں کا رُخ بدل ڈالا تھا اور لاکھوں اِنسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کا حوصلہ دیا تھا۔ ان کی عظمت اور بےمثل استقامت اور گہری بصیرت کے انوار تک پہنچنے کے لیے ہماری نئی نسل کو بڑی تحقیق اور جستجو سے کام لینا اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم کرنا ہوگا۔

گزشتہ دنوں سید منور حسن کے انتقال کی خبر آئی، تو یوں محسوس ہوا کہ ہم اپنے نہایت بیش قیمت علمی، فکری، دینی، سیاسی اور تہذیبی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت مجاہد اور ایک بیدار مغز انسان تھے جو دِہلی کے سید گھرانے میں 1941ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ 'لے کر رہیں گے پاکستان' کے نعرے لگاتیں اور اُن کے والد تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ وہ جب چھ سال کے ہوئے، تو اُن کا خاندان ہجرت کر کے پہلے لاہور آیا اَور بعدازاں کراچی میں آباد ہو گیا۔ منور حسن کے چھٹ پن میں دلّی تہذیب کی وضع داری در آئی تھی۔ اُن کے والد سندھ مدرسۃ الاسلام میں استاد مقرر ہوئے جہاں محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اُن کا اسمِ گرامی اخلاق حسن تھا اور وہ حُسنِ اخلاق کے ایک دِلربا پیکر تھے۔ اُن کا یہ وصف سید منور حسن کی زندگی کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ پھر یہ عجب اتفاق ہوا کہ وہ گھر کی فضا کے علی الرغم این ایس ایف (نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن) میں شامل ہو گئے اور اَپنی بےپناہ صلاحیتوں کی بدولت کراچی میں اِس تنظیم کی صدارت تک پہنچ گئے۔ اِسی دوران معراج محمد خاں اور نفیس صدیقی سے اُن کا یارانہ قائم ہوا جو نظریاتی تبدیلی کے باوجود باقی رہا۔

گھر کی تربیت نے اُن کے اندر نماز کی ادائیگی کا ایک والہانہ شعور پیدا کر دیا تھا جو اُن کی زندگی میں ایک فیصلہ کُن عنصر کے طور پر جلوہ آرا رَہا۔ ایک روز وہ این ایس ایف کی میٹنگ میں شریک تھے کہ وقتِ نماز آ گیا۔ وہ مسجد میں نماز اَدا کرنے چلے

گئے۔ واپس آئے، تو ساتھیوں نے کسی قدر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اُسی وقت راستے جدا ہو گئے۔ اُنہی دنوں وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر کا مطالعہ کر رہے تھے جو اُن کے دل و دماغ میں ایک طوفان اُٹھانے لگا تھا، چنانچہ 1960ء کے لگ بھگ وہ این ایس ایف سے قطع تعلق کر کے اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو گئے اور تمام کشتیاں جلا ڈالیں۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے تین سال اس کے ناظمِ اعلیٰ رہے۔ اُنھوں نے پروفیسر خورشید احمد، جناب خرم جاہ مراد، ڈاکٹر اسرار احمد اور ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری کی قیمتی میراث کو ایک نیا آہنگ اور ایک نیا شرارہ عطا کیا۔ وہ کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی اور علومِ اسلامیہ میں ماسٹرز کرنے کے بعد جماعتِ اسلامی کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور آخری لمحے تک اسی کا دم بھرتے رہے۔

وہ جماعتِ اسلامی میں ہر سطح کی ذمے داریاں سنبھالتے ہوئے پانچ سال تک منصبِ امارت پر فائز رہے اور عالمی اسلامی تحریکوں میں نہایت فعال کردار بھی ادا کرتے رہے، مگر اُن کی شخصیت کا اصل جوہر اُن کی سادگی، اُن کی حق شناسی، اُن کی مردانگی اور تعلق باللہ کی گہرائی تھی۔ دنیا سے اُن کی بے نیازی ہمارے اسلاف جیسی تھی۔ وہ سیاسی معاملات میں فوجی کردار اور امریکی سامراج کے شدید مخالف اور اپنی رائے کے اظہار میں حد درجہ بےباک تھے۔ اُن کے وفورِ قناعت اور ضبطِ نفس کا یہ عالم تھا کہ زندگی کا بڑا حصہ چار مرلے کے مکان میں گزار دیا اور عمر بھر جماعتِ اسلامی کی طرف سے انتہائی قلیل مشاہرے پر باوقار طریقے سے گزر بسر کی۔ وہ کراچی میں سائیکل اور موٹرسائیکل پر پیچھے بیٹھ کر بڑے بڑے کام سرانجام دیتے رہے۔ دوستوں کے دکھ درد کا خاص خیال رکھتے اور اُن کے ساتھ بڑی اپنائیت سے پیش آتے۔ وہ ایک فرد کے بجائے پورے خاندان کے ساتھ مراسم رکھنے کے قائل تھے۔ وہ دِلوں میں گھر بنانے اور برائی پر نشتر چلانے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ اُنھیں شعر و ادب سے خصوصی لگاؤ تھا اور اُن کے رویوں میں بڑی شگفتگی اور اعلیٰ ظرفی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے انتقال پر ایک دنیا ماتم کناں اور اُن کی خوبیوں کی رطب للسان ہے۔ سید منور حسن، شاعرِ مشرق اقبال کے اِس مصرع کی صحیح تصویر تھے ع

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

وہ اپنے تخلیقی مزاج کے مطابق یقیناً باغِ بہشت کی تزئین و آرائش میں شب و روز مصروف ہوں گے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سید منور حسن کی رحلت سے چند روز پہلے جناب طارق عزیز کی ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لینے کی اطلاع ملی۔ وہ اِس اعتبار سے ایک نادرِ روزگار شخص تھے کہ اُنھوں نے پاکستان بننے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وطن کے ساتھ اُن کی محبت کا یہ عالم رہا کہ زندگی میں جو کچھ کمایا، وہ پاکستان کے نام کر دیا۔ وہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے اینکر تھے جس پر اُن کا پروگرام 'نیلام گھر' ربع صدی تک چلتا اور لاکھوں ناظرین کے دلوں پر وطن کی عظمت کا نقش ثبت کرتا رہا۔ اُن کا یہ صاف ستھرا پروگرام ذہنوں کی تربیت کے حوالے سے پورے پاکستان میں بہت عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ طارق عزیز کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت آواز اور مؤثر ابلاغ کی بےپناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں جو وہ نوجوانوں کے مثبت رجحانات کی پرورش میں بڑی عمدگی سے استعمال کرتے رہے۔ وہ ایک زمانے میں مسٹر بھٹو کے بڑے شیدائی تھے اور اُن کی تقریروں کی داد دینے میں معراج محمد خاں کے ساتھ پیش پیش تھے۔ پھر وہ رومانس ختم ہو گیا اور وہ نواز شریف کی مسلم لیگ میں شامل ہو کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے، مگر اُن کا سیاسی کردار ڈرامائی طور پر ختم ہو گیا اور اُنھوں نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا، لیکن اس تنہائی میں بھی وہ پاکستان کی عظمت کے گیت گاتے رہے۔

جون کا مہینہ ہمارے لیے بڑا ستم گر ثابت ہوا کہ پروفیسر ڈاکٹر قاری مغیث الدین شیخ کے بارے میں پتہ چلا کہ کورونا

وائرس نے اُن کی شمعِ حیات گُل کر دی ہے۔ اس خبر پر بیک وقت ڈھیر سارے دل دھک دھک کرنے لگے تھے۔ اُن کا شمار پنجاب یونیورسٹی کے استاد الاساتذہ میں ہوتا اور اُن کے طلبہ کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اُنھوں نے تین یونیورسٹیوں میں شعبۂ صحافت کو جدید بنیادوں پر استوار کیا۔ اُنھیں علم و تحقیق سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے امریکا کی ایک بلند پایہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری صرف دو سال ہی میں حاصل کر لی تھی جو ایک علمی معجزے سے کسی طور کم نہ تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں لیکچرار مقرر ہوئے، اپنی خداداد سلاحیتوں سے ڈائریکٹر کے منصب تک پہنچے اور شبانہ روز محنت اور اپنی جدتِ طبع سے اسے عالمی معیار کے انسٹی ٹیوٹ کی شکل دینے میں کامیاب رہے۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس نے علوم ابلاغِ عامہ کی وقعت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔

اُن کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے، اُن کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے، لیکن اُن کی کارکردگی کا کڑی نظر سے جائزہ لیتے۔ اِس معاملے میں کسی قسم کی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کمال کا حصول اُن کی فطرت کا لازمی حصہ تھا۔ اِسی طرح وہ نظریات کے بارے میں بہت محتاط اور بڑے مستحکم رہے اور پاکستان کے امیج کو داغدار کرنے والوں کو ہرگز معاف نہیں کرتے تھے۔ علمی اور صحافتی حلقوں میں اُن کا بڑا احترام پایا جاتا تھا کہ وہ ایک بیش بہا قومی اثاثہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے جو کئی پہلوؤں سے بڑی دلچسپ ہے۔ اُن کی قرأت ایک سحر طاری کر دیتی تھی اور اُن کی شگفتہ بیانی سے قریبی حلقے خوب لطف اُٹھاتے رہے۔ اُن کا جنازہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد نے پڑھایا اور وہ پنجاب یونیورسٹی کے قبرستان ہی میں دفن کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے اور ہمیں اُن کی خوبیاں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے!

کراچی سے ہمارے عزیز دوست جناب نصیر احمد سلیمی نے اطلاع دی کہ دوست محمد فیضی بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ بے اختیار زبان نے انا للہ و انا الیہ راجعون کا ورد شروع کر دیا۔ دوست محمد فیضی ایک سیلف میڈ نوجوان تھے جو ایک زبردست مقرر کے طور پر اُبھرے تھے۔ کراچی میں اگر الطاف حسین کا جادو نہ چلتا، تو وہ سندھ کے علاوہ پورے پاکستان کے اُفق پر طلوع ہونے کے وصف سے مزین تھے۔ وہ دھیمے مزاج کے سیاست کار تھے جو متانت سے بات کرتے اور نوجوانوں کے مسائل حل کرنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ کراچی میں اُن دنوں مقررین کا ایک ٹولہ تھا جس میں دوست محمد فیضی کے علاوہ خوش بخت شجاعت اور ضیاء زبیری نمایاں تھے۔ ضیاء زبیری سندھ اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر شاہ فرید الحق کے سرکاری طور پر سیکرٹری مقرر ہوئے اور اُس وقت سندھ اسمبلی میں ظہور الحسن بھوپالی تیزی سے اُبھر رہے تھے جو فنِ خطابت میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ وہ ایم کیو ایم کی دہشت گردی میں شہید کر دیے گئے جس سے سیاست کا رنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ دوست محمد فیضی جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں نوجوانوں کے نمائندے کی حیثیت سے سندھ حکومت میں مشیرِ اطلاعات مقرر ہوئے اور اُنھوں نے صحافیوں کا بارِگراں کم کرنے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ یہی وہ دن تھے جب ایم کیو ایم کا جن بوتل سے نکل چکا تھا اور کراچی جو روشنیوں کی بستی کے طور پر مشہور تھا، اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ دوست محمد فیضی جو شرافت کی ایک توانا آواز تھے، اُنھوں نے حالات سے کنارہ کشی اختیار کی، تاہم کچھ ہی مدت بعد مسلم لیگ نون کا حصہ بنے اور اسی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے، مگر ایم کیو ایم کا عہدِ ستم اختتام پزیر ہوا تو وہ قدرے فعال ہوئے، مگر کورونا وائرس نے اُنھیں آ دبوچا اور موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ یوں کتابِ متانت کا ایک اور ورق تمام ہوا۔ اُن کی خوبیوں کے لاکھوں شناسا اُن کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اِس انتہائی افسردہ ماحول کو جامعہ بنوریہ کراچی کے مہتمِ اعلیٰ مفتی محمد نعیم کے دارِفانی سے کوچ نے مزید سوگوار بنا دیا ہے۔ وہ اُن علما کی فہرست میں بڑے نمایاں تھے جو بھائی چارے، باہمی خیر خواہی اور اِتحاد کا درس دیتے اور دِلوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب دینی مسائل کو حسن و خوبی سے طے کرنے اور مذہبی مفاہمت کو فروغ دینے کی شہرت رکھتے تھے۔ اُن کی جامعہ پاکستان کی بہترین درس گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ وفاق المدارس عربیہ پاکستان کی شوریٰ میں وہ پوری طرح فعال رہے۔ اُن کی وفات سے فی الواقع بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے شعلہ بیاں خطیب علامہ طالب جوہری کے انتقال نے مزید وسیع کر دیا ہے۔ علامہ صاحب اہلِ تشیع سے تعلق رکھتے اور اِتحاد بین المسلمین کے زبردست داعی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ”تم نے گریہ کیا، مجلس تمام ہوئی اور اَب تو دامنِ وقت میں گنجائش بھی نہیں“۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور دینی حلقوں میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے قحط الرجال کا شدید احساس اُبھرا ہے۔ ہم اپنے رب سے اُن کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا کرتے ہیں۔

کورونا کے عہدِ فتن میں پاکستان کے معروف قانون دان اور ایک نڈر وکیل جناب اے کے ڈوگر بھی اپنے خالق کے حضور جا پہنچے ہیں۔ ہم نے 1960ء میں اُردو ڈائجسٹ کا اجرا کیا، تو وہ اس کی مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔ اُنھوں نے انگریزی میں ماسٹرز کیا تھا اور اُنھیں لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ پھر وہ اپنے پیشے کی طرف متوجہ ہوئے، تو اپنی ذہانت اور جرأتِ اظہار کے سبب پورے ملک میں پہچانے جانے لگے۔ اُنھوں نے وکلا کا ایک فورم تشکیل دیا تھا جو عوامی اہمیت کے معاملات اعلیٰ عدالتوں میں اُٹھاتا اور عدلیہ کی آزادی کا پرچم بلند رکھنے کی سعی کرتا تھا۔ جب کچھ غیر سیاسی طاقتیں سیاست کے ارتقا میں حائل ہونے کی خفیہ یا علانیہ کوشش کرتیں، تو جناب اے کے ڈوگر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اَپنے مضبوط دلائل سے آئین کی حکمرانی کی راہیں کشادہ کرتے رہتے۔ اُن کے رخصت ہو جانے سے عوام اپنے مفادات کے محافظ سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منور رکھے اور اُس پر شبنم افشانی کرے!

اِسی جاں لیوا وَبا نے جناب مشتاق ہاشمی اور ہمارے درمیان موت کی ناقابلِ عبور ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ وہ ہمارے محترم دوست جناب جاوید ہاشمی کے بھانجے تھے جو اِنکم ٹیکس کے نہایت معروف وکیل شمار ہوتے تھے۔ جاوید ہاشمی ہماری رہائش گاہ کے قریب ہی سمن آباد، لاہور میں رہتے تھے، جن سے 1965ء میں تعلق پیدا ہوا جو اُن کی وفات کے بعد مشتاق ہاشمی کی طرف منتقل ہو گیا۔ بھٹو صاحب برسرِ اقتدار آئے، تو اُنھوں نے اُردو ڈائجسٹ کو معاشی طور پر تباہ کرنے کے لیے اِنکم ٹیکس کے افسروں کو احکام صادر کیے اور مقدمات کی یلغار کر دی۔ جاوید ہاشمی نے چٹان کی طرح ہمارا دِفاع کیا اور جب اِنکم ٹیکس کا محکمہ بے بس ہو گیا، تو جاوید ہاشمی صاحب پر غصہ نکالنے کے لیے حکومت نے ہم دونوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا۔ جاوید ہاشمی کی وفات کے بعد جناب مشتاق ہاشمی نے ہماری پوری طرح دستگیری کی۔ وہ اپنے مؤکلوں کو گمراہ کرنے یا سبز باغ دکھانے کے بجائے درست مشورہ دیتے تھے اور یہی وصف اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی صاف گوئی، دیانت داری اور دِلوں کو اپنی شگفتہ مزاجی سے سرشار رکھنے کے اوصاف اللہ تعالیٰ کو ضرور پسند آئیں گے اور اُن کی مغفرت کا سامان بنیں گے۔ ہم اُن کے پس ماندگان کے غم اور آزمائش میں پوری طرح شریک ہیں اور اپنے رب کے حضور دعا گو ہیں کہ ہمارے اندر مشتاق ہاشمی جیسے اعلیٰ قدروں کے حامل انسان جنم لیتے رہیں؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

الطاف حسن قریشی

کورونا وائرس کے ہاتھوں پورا عالمی نظام لرزہ براندام ہے
اور سرمایہ داری کا مروجہ نظریہ آخری دموں پر ہے۔
اب انسانی رشتوں کو ایک ایسے نظامِ فکر و عمل کی تلاش ہے
جو اُنھیں تحفظ اور حمایتِ قلب عطا کر سکے۔

اپنا سامان مختصر رکھیے

اُلجھے ہوئے حالات کا تجزیہ......
الطاف حسن قریشی کے قلم سے

آج ہمارے تجزیے کا عنوان ایک شعر کا مصرعِ ثانی ہے جسے عظیم المرتبت شاعرہ نکہت افتخار نے تخلیق کیا ہے۔

جانے کس وقت کوچ کرنا ہو
اپنا سامان مختصر رکھیے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں سے بے اختیار اشک ہائے ندامت کے جھرنے بہ نکلے۔ جان لیوا کورونا نے پہلے ہی زندگی کی بے ثباتی کا نہایت گہرا نقش ثبت کر رکھا تھا کہ نکہت صاحبہ کے شعر نے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ زندگی کے رایگاں چلے جانے کے کرب انگیز احساس نے میرا پورا وجود جھنجھوڑ ڈالا۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ اسلام کے اِس زرّیں اصول کے مطابق بسر کی کہ گھر میں جو کچھ ہو، اسے سونے سے پہلے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اُمت کے صالحین اور اسلاف کا بھی یہی عمل رہا مگر ہمارے عہد کے ارمانوں اور خواہشوں پر دم دینے والے اہلِ اقتدار سیم وزر کے پجاری بن گئے ہیں اور ان کے ذہن سے یہ خیال ہی محو ہو چکا ہے کہ جانے کس وقت کوچ کا وقت آجائے اور سب کچھ یہیں دھرا رہ جائے۔ سو برس کا سامان جمع کرنے کی بے حساب ہوس نے عالمِ انسانیت کو اطمینانِ قلب سے محروم اور غیر معمولی اذیت سے دوچار کر دیا ہے۔

میں نے صحافی کی حیثیت سے فیلڈ مارشل ایوب خان اور اُن کے بعد قائم ہونے والی سیاسی اور فوجی حکومتیں قریب سے دیکھی ہیں اور مجھے اپنے حکمرانوں میں چند چیزیں مشترک نظر آئی ہیں۔ پہلی، زیادہ سے زیادہ اختیارات کے حصول کی لامحدود ہوس، دوسری اقتدار کو طول دینے کی بے پناہ خواہش، تیسری اپنے سیاسی حریفوں کو نابود کر دینے کی ایک بے کراں تڑپ اور چوتھی اُن اداروں کی آزادی سلب کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش جہاں سے متبادل قیادت پروان چڑھ سکتی ہو یا وہ اقتدار و اختیار کو حدود میں رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ زیادہ تر اربابِ حکومت نے اپنی سیاسی جماعت کو نظریاتی اور اخلاقی

بنیادوں پر استوار کرنے کے بجائے کہیں سے اینٹ اور کہیں سے روڑا جمع کر کے ابن الوقتوں کا ایک ہجوم جمع کر لیا اور اسے سرکاری نوازشات کے ذریعے توانائی فراہم کرنے کی رائیگاں کوششیں ہوتی رہیں۔ بالعموم ایک ہی حادثہ بار بار پیش آتا رہا کہ جونہی تخت نیچے سے کھسک گیا، تو پارٹی بھی تتر بتر ہوگئی یا دھڑوں میں بٹ گئی۔ غالباً ہمارے بیشتر کوتاہ نظر حکمران فیلڈ مارشل ایوب خان کی پیروی کرتے آئے ہیں جنہوں نے زمامِ اقتدار سنبھالتے ہی میڈیا اور جامعات کی آزادی اور خودمختاری پر بڑی قوت سے حملہ کیا تھا، کیونکہ یہ دونوں ادارے رائے عامہ کو متحرک رکھنے اور طاقتور تازہ افکار کو فروغ دینے کا عظیم کردار اَدا کر سکتے تھے۔ آخر کار اِنھی دو محاذوں پر پسپائی اُن کے عبرتناک زوال کا باعث بنی۔

❁❁❁

ہمارے وزیرِاعظم عمران خان توسرِ عام فیلڈ مارشل ایوب خان کے عظیم کارناموں کی تعریف کے پُل باندھنے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے میں ایک گونہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے بھی حکومت سنبھالتے ہی میڈیا کی آزادی پر کاری ضرب لگانے کا پروگرام وضع کیا۔ جناب فواد چودھری، وزیرِ اطلاعات ونشریات مقرر کیے گئے جو اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود میڈیا میں اپنے لیے ایک باعزت مقام پیدا نہ کر سکے۔ فضا مکدر رہوتی گئی اور اُن کی جگہ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کا تقرر عمل میں آیا، مگر اُن کی قینچی کی طرح چلتی زبان نے حکومت اور میڈیا کے رشتے بڑی حد تک منقطع کر ڈالے۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی کہ ایسے ہوتے ہیں حکومت کے ترجمان جن کو اپنی بھی کچھ خبر نہیں۔ آتشیں حالات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پاکستان کے معروف شاعر احمد فراز کے صاحبزادے سینیٹر شبلی فراز اِس منصب کے لیے چُنے گئے، مگر وہ بھی کانِ نمک کی نذر ہو گئے۔ اُن کے لب و لہجے سے جس متانت اور وَضع داری کی توقع کی جا رہی تھی، اُسے سخت دھچکا پہنچا۔

دریں اَثنا وفاقی اور صوبائی حکومتیں میڈیا کو شدید مالی بحران سے دوچار کرنے کے لیے اشتہارات کے اربوں روپوں پر مبنی واجبات ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتی رہیں۔ نتیجے میں ہزاروں اخبار نویس ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز بند ہو گئے ہیں۔ اب جو اہلِ صحافت اخبارات اور ٹی وی چینلز میں کام کر رہے ہیں، اُنھیں تنخواہوں کی ادائیگی میں مہینوں کی تاخیر ہو رہی ہے۔ الحمدللہ فرض شناس اور پُرعزم اہلِ قلم یہ کڑی آزمائش بھی برداشت کر گئے، تب پاکستان میں سب سے بڑے میڈیا ہاؤس کے مالک اور نڈر میرِ صحافت جناب شکیل الرحمٰن ایک 34 سالہ فرضی مقدمے میں نیب کے ذریعے گرفتار کر لیے گئے۔ اُن کی قیدِ تنہائی کو چار ماہ ہونے کو آئے مگر ابھی تک ہائی کورٹ نے اُن کی ضمانت نہیں لی ہے جس پر قانونی اور صحافتی حلقے سخت حیران ہیں۔ صحافت کو حکومتی طاقت کے ذریعے دبانے کی اکیسویں صدی میں یہ ایک بدترین مثال ہے جس سے بیرونی دنیا میں پاکستان کا تاثر بہت خراب ہوتا جا رہا ہے، جبکہ اِنسانی حقوق کے علم بردار اِداروں میں گہری تشویش پھیلتی جا رہی ہے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مزید بدقسمتی یہ کہ ماضی کی طرح، پنجاب کی سرکاری جامعات کو حکومت کے زیرِ اثر لانے کا منصوبہ زیرِ غور ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کے ذریعے اِس امر کی گنجائش پیدا کی جا رہی ہے کہ وائس چانسلر کے منصب پر اعلیٰ تعلیم یافتہ معتبر شخصیت کی جگہ بیوروکریٹ یا ہائی کورٹ کے جج کی تقرری بھی عمل میں آ سکتی ہے جو یونیورسٹی کی آزادی اور اس کی خودمختاری کو تلف کر دینے کے مترادف ہوگا۔ سینڈیکیٹ جو یونیورسٹی کا سب سے بڑا فیصلہ ساز اِدارہ ہے، اس کے بارے میں بھی یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ اس کی صدارت کے فرائض وائس چانسلر کے بجائے گورنر یا وزیرِ اعلیٰ کی منظوری سے کوئی بیوروکریٹ یا اُن کا کوئی نمائندہ بھی ادا کر سکتا ہے۔ اِن ترامیم کا مقصد تعلیم و تحقیق کی آزاد فضا کا گلا گھونٹنا اور بیوروکریسی کو سیاسی مقاصد کے لیے جامعات کے اہم ترین معاملات پر مسلط کرنا ہے۔ نئی صدی میں عالمی سطح پر فکر و نظر کی آزادی اور جامعات کی خودمختاری کی تحریک بہت آگے نکل چکی ہے اور یونیورسٹی فیکلٹی کا رُتبہ پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ حکومتِ پنجاب کی اِس جاہلانہ سوچ کی پوری قوت سے مزاحمت کریں گے جن کو عوام کی حمایت بھی حاصل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اکیڈمک اسٹاف کونسل کے صدر ڈاکٹر پروفیسر ممتاز انور نے مضبوط دلائل سے واضح کر دیا ہے کہ عہدِ حاضر میں یہ ترامیم ناقابلِ قبول ہیں، اِس لیے ہم جامعات کی خودمختاری کو سلب کرنے کی ہر کوشش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ پنجاب کی دوسری جامعات بھی حکومت کے اِس منصوبے کے خلاف سینہ سپر دکھائی دیتی ہیں۔ اُمید ہے کہ پاکستان کا میڈیا بھی اِس عظیم الشان تحریک میں اپنا قابلِ قدر کردار اَدا کرے گا اور جبر کے تمام حربے ناکام ہو جائیں گے۔

اِس سے قبل، جناب عمران خان غالباً مخفی دباؤ کے تحت پاکستان کے غایت درجہ دیانت دار، اعلیٰ دماغ اور انتہائی جرأت مند فاضل جسٹس فائز عیسیٰ کے خلاف سپریم جوڈیشنل کونسل میں ریفرنس دائر کرنے کی بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر چکے تھے۔ جسٹس فائز عیسیٰ نے اسے بدنیتی کی بنیاد پر سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا، چنانچہ کئی ہفتوں کی سماعت کے بعد سپریم کورٹ کے دس رُکنی بینچ نے ریفرنس خارج کر دیا اور سپریم جوڈیشنل کونسل کا نوٹس بھی کالعدم قرار دے دیا، مگر اِس بینچ کے سات فاضل ارکان نے فاضل جسٹس فائز عیسیٰ کی اہلیہ اور اُن کی اولاد کی بیرونِ ملک جائیدادوں کی تحقیقات ایف آئی اے کے سپرد کر دی ہیں جو دس رکنی بینچ کے بنیادی فیصلے سے متصادم نظر آتا ہے۔ اِس بنا پر وکلا کی تنظیمیں اِس کے خلاف نظرثانی کی درخواست دائر کر رہی ہیں۔ بدقسمتی سے اِس کے بعد سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو وائرل ہوگئی جس میں عدالتِ عظمیٰ کے علاوہ فاضل جج صاحبان کے خلاف سخت نازیبا الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جسٹس فائز عیسیٰ کی اہلیہ سرینا فائز عیسیٰ نے اسلام آباد کے پولیس اسٹیشن میں یہ درخواست دی ہے کہ اُن کے شوہر کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ پولیس نے فوری طور پر کارروائی کرنے کے بجائے یہ درخواست ایف آئی اے کو ارسال کر دی ہے۔ اِس پر فاضل چیف جسٹس جناب گلزار احمد نے ازخود نوٹس لیتے ہوئے اِس معاملے میں کارروائی شروع کر دی ہے۔ دراصل عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے حالات انتہائی گمبھیر ہوتے جا رہے جو گہرے غور و فکر اور بروقت اقدام کا تقاضا کرتے ہیں۔ اِسی دوران کورونا وائرس کی عالمی تباہی کے نتیجے میں ایک ہمہ گیر سوال یہ زیرِ بحث آ رہا ہے کہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

آئندہ ریاست اور شہریوں کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اور بین الممالک رشتوں میں کیا کیا تغیرات واقع ہوں گے، کیونکہ مروجہ معاشی نظام کی افادیت ختم ہو چکی اور سرمایہ دارانہ نظام بھی آخری دموں پر ہے، چنانچہ ایک ایسا متبادل نظامِ زندگی دریافت کرنا ہوگا جو بنی نوع انسانی کو حقیقی تحفظ، ذہنی طمانیت اور فطری ارتقاء کی ضمانت دے سکے۔

❁❁❁

پاکستان میں آج کل جو مباحث گردش میں ہیں، ان میں بعض حقیقی ہیں اور کچھ مصنوعی۔ بدقسمتی سے بڑی تعداد میں وہ شخصیتیں اِس دنیائے فانی سے کوچ کر چکیں جنھوں نے تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل قریب سے دیکھے تھے۔ تشکیلِ پاکستان پر جو کتابیں دستیاب ہیں، اُنھیں پڑھنے کی ہماری نئی نسل کو فرصت ہے نہ طلب۔ پھر اُن میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو حقائق اِس انداز سے توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہیں کہ تحریکِ پاکستان کی ایک جیتی جاگتی اور حیات بخش تصویر سامنے نہیں آتی۔ تاریخ پر گہری نگاہ رکھنے والے اِس امر کی گواہی دیں گے کہ قائدِ اعظم نے منتشر مسلمانوں کو ایک قوم بنانے میں بڑی جاں گسل جدوجہد کی تھی اور تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنی تمام تر توانائیاں ایک عظیم الشان مقصد کے لیے کھپا دی تھیں، حالانکہ اُنھیں ہندوؤں اور انگریزوں کے علاوہ مسلمانوں کی طرف سے بھی شدید مزاحمتوں کا سامنا تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ میں روح پھونکنے کے لیے شب و روز کام کرتے اور اسے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کے لیے اپنے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑتے رہے۔ اُن کا بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے اُن علاقوں میں سیاسی جدوجہد کی صورت گری کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، مگر تحریکِ پاکستان میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ جانتے ہوئے کہ اُن کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے، وہ بڑی ثابت قدمی سے ایک آزاد مسلم وطن کے لیے جدوجہد کرتے اور زبردست ایثار سے کام لیتے رہے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہندوستان کے جن شمال مغربی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل تھے جہاں سرداروں، وڈیروں، نوابوں اور خانوں کا غلبہ تھا۔ اِن علاقوں میں انگریزوں نے اپنے سیاسی اور عسکری مفادات کی خاطر جاگیرداروں کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا کیا تھا جو دل و جان سے برطانوی حکومت کا وفادار اور قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ 1945-46ء کے فیصلہ کُن انتخابات کے وقت پنجاب میں یونینسٹ حکومت قائم تھی جو بڑے بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔ سندھ میں انتخابی طاقت کا توازن انڈین کانگرس کے ہاتھ میں تھا۔ صوبہ سرحد میں باچا خاں یعنی عبدالغفار خاں کا طوطی بولتا تھا اور اُن کے بھائی ڈاکٹر خان اِس صوبے کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ بلوچستان میں زیادہ تر قبائل آباد تھے اور اسے صوبے کا درجہ حاصل نہیں تھا، حالانکہ محمد علی جناح صاحب نے 1928ء میں جو چودہ نکات پیش کیے تھے، اُن میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ دینے کا مطالبہ شامل تھا۔ اِس علاقے کے خان آف قلات بڑے طاقت ور حکمران تھے جو قائدِ اعظم سے گہری عقیدت رکھتے تھے، مگر ریاست کی اسمبلی میں اُن کی اکثریت تھی جو کانگریس سے متاثر تھے۔ ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے جہاں مسلمان

اکثریت میں تھے، وہ بنگال اور آسام پر مشتمل تھے جو فکری طور پر کلکتہ کے زیرِ اثر تھے جہاں یونیورسٹی انیسویں صدی کے ساتویں عشرے ہی میں انگریزوں نے قائم کر دی تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اُن بنگالی اساتذہ نے قبضہ کر لیا تھا جو بنگلہ زبان سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کر دینے پر تحقیق کے علاوہ زیادہ تر ایسی کتابیں شائع کر رہے تھے جو ہندوانہ افکار کی آئینہ دار تھیں۔ یہی لٹریچر پورے بنگال اور آسام کے اندر نوجوانوں کی عقیدت کا مرکز بنا ہوا تھا۔

اِن حددرجہ نامساعد حالات میں قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کو عوامی سطح پر اِس طرح منظم اور فعال کیا کہ وہ 46-1945ء کے انتخابات میں وہ تمام نشستیں جیت لینے میں کامیاب رہی جو مسلمانوں کے لیے مختص تھیں، حالانکہ قدم قدم پر بھاری بھرکم رکاوٹیں کھڑی ہوتی گئیں۔ بنگال میں مولوی فضل الحق مسلم لیگ کے مدِمقابل آن کھڑے ہوئے جنھوں نے 1940ء کے عظیم الشان اجتماع میں قراردادِ لاہور پیش کی تھی۔ اِسی طرح سندھ مسلم لیگ کے صدر جی ایم سید آخری وقت پر قائدِ اعظم سے ناراض ہو گئے اور اُنھوں نے جن افراد کو مسلم لیگ کے ٹکٹ جاری کیے تھے، اُنھیں آزاد حیثیت میں کھڑا کر دیا۔ اِس نازک وقت میں مسلم لیگ کو نئے اُمیدوار تلاش کرنا پڑے۔ عام حالات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کامیابی کے امکانات معدوم نظر آتے تھے، مگر مسلم عوام کو قائدِ اعظم کی قیادت، امانت اور دِیانت پر اِس قدر اعتماد تھا کہ اُنھوں نے بڑے پیمانے پر مسلم لیگی اُمیدواروں کے حق میں ووٹ ڈالے اور انگریزوں اور ہندوؤں کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے جو ایک آزاد وطن کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نگاہ رہنی چاہیے کہ 46-1945ء کے انتخابات میں صرف وہی لوگ ووٹ ڈال سکتے تھے جو پرائمری پاس تھے یا زمین کے مالک تھے۔ اِن علاقوں میں تعلیم اُس وقت بڑی محدود تھی، اِس لیے زیادہ تر ووٹرز مینددار ہی تھے اور ٹکٹ بھی زیادہ تر اُنہی کے حصے میں آئے۔ انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے جو کانگریس کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے تھے یا کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر تھے، اُنھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ پاکستان وجود میں آنے والا ہے، چنانچہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور ٹکٹ لینے میں بھی کامیاب رہے۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 1946ء کے اوائل میں مکمل ہو گئے، تو قائدِ اعظم نے جملہ منتخب نمائندوں کا کنونشن مئی 1946ء میں دہلی میں طلب کر لیا۔ قراردادِ لاہور میں 'ریاستوں' کا لفظ استعمال ہوا تھا، لیکن چھ سال کے تجربات کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے منتخب نمائندے اِس نتیجے تک پہنچے تھے کہ پاکستان کے نام سے ایک ریاست کا قیام ہی مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر آپشن ہے، چنانچہ دہلی کنونشن میں جناب حسین شہید سہروردی نے ایک ریاست پاکستان کی قرارداد پیش کی جو قائدِ اعظم کی صدارت میں غیرمعمولی اکثریت سے منظور ہوئی۔

کانگریس کی لیڈرشپ جو بادلِ نخواستہ ہندوستان کی تقسیم پر آمادہ ہوئی تھی، اس کی سرتوڑ کوشش رہی کہ (خاکم بدہن) پاکستان وجود میں آتے ہی شدید خلفشار کا شکار ہو جائے، چنانچہ اس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ داغ دیا جسے برطانوی حکومت

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

نے تسلیم کرلیا۔ اِن دونوں صوبوں کی تقسیم کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور آبادی کے تبادلے کا ایک انتہائی ہولناک عمل شروع ہوا۔ بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو کی پیشن گوئی تھی کہ پاکستان زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہ سکے گا، کیونکہ اِس کی قیادت ناتجربے کار اَور اِنتظامی اور معاشی ڈھانچہ انتہائی کمزور ہے۔ حضرت قائدِ اعظم نے اپنی قوم کے اندر اِیثار کیشی، فرض شناسی اور وطن سے محبت کی ایک ایسی جوت جگادی تھی کہ وہ بفضلِ خدا تمام تر چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور اپنے نوزائیدہ وطن کو اپنے پاؤں پر کھڑا کردینے میں کامیاب رہے۔ مہاجرین کی بحالی کا کام بھی حسن وخوبی سے سرانجام پا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مستحکم انتظامی ڈھانچہ بھی وجود میں آ گیا۔ اِس کے علاوہ بین الاقوامی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ پاکستان کی کرنسی بھارت کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوگئی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم صرف تیرہ ماہ زندہ رہے اور اَپنے نحیف جسم کے ساتھ آخری وقت تک رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ اُن کی عظمتِ کردار اَور قوتِ ارادی کی مثال عصری انسانی تاریخ میں شاذونادر ہی ملتی ہے۔

❁❁❁

نئی نسل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ قائدِ اعظم نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر کیوں نہ ہوا۔ اِس ضمن میں ایک قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظم کے ویژن کے خدوخال ایک مرتب شکل میں دستیاب نہیں تھے۔ پنڈت نہرو نے جیل میں Discovery of India تصنیف کی تھی جس میں آزادی کے بعد وطن کی تعمیر کا مکمل نقشہ موجود تھا۔ قائدِ اعظم جو تاریخ بنا رہے تھے، اُن کے پاس تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہیں تھا، اِس لیے وہ اپنے خیالات کا اظہار زیادہ تر علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں ہی میں کرتے رہے۔ وہ اسلام کی لازوال تعلیمات اور اصولوں کے مطابق پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے جس میں تھیوروکریسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُن کا مطمحِ نظر جمہوری اقدار کا فروغ اور سوشل جسٹس کا قیام تھا۔ وہ انسانی مساوات، حریتِ فکر اور باہمی رواداری کے زبردست مبلغ اور جاگیرداری کے شدید مخالف تھے۔ مذہبی اقلیتوں کے حقوق، اُن کی مذہبی آزادی اور اُن کی ثقافتی اور معاشی ترقی کے علم بردار اَور سول بالادستی پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اُنھوں نے یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مغربی سرمایہ داری کا نظام انسانیت کے لیے عذاب ثابت ہورہا ہے، چنانچہ ہمیں اسلامی اصولوں کے مطابق معیشت کا ایک جداگانہ نظام وضع کرنا ہوگا اور مصنوعات تیار کرنے والوں اور مصنوعات کے صارفین کے درمیان ایک توازن قائم رکھنے کی راہیں متعین کرنا ہوں گی۔

قائدِ اعظم کا گیارہ اگست 1947ء کو پاکستان دستور ساز اَسمبلی سے خطاب کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ اس وقت پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات میں انسانوں کا خون بہہ رہا تھا اور برہمن قیادت کی طرف سے یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ پاکستان ایک انتہائی کٹر مذہبی ملک ہوگا جس میں اقلیتوں کو مذہبی آزادی میسر ہوگی نہ اُن کی جان، عزت اور آبرو محفوظ ہوگی اور نہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اُنھیں بنیادی حقوق دیے جائیں گے۔ قائدِ اعظم نے میثاقِ مدینہ کی روح کے مطابق اعلان فرمایا کہ پاکستان کے تمام شہری قانون کی نظر میں مساوی ہوں گے اور انہیں اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی مکمل آزادی ہوگی۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ریاست اپنے شہریوں کے مذہبی عقائد میں دخل نہیں دے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان اور ہندو سیاسی طور پر اپنا وجود کھو دیں گے۔ اُنھوں نے یقین دلایا کہ تمام شہریوں کے لیے معاشرتی انصاف کی فراہمی یقینی بنائی جائے گی۔ وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مارچ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی کے پلیٹ فارم پر قراردادِ مقاصد پیش کی جس میں قائدِ اعظم کے تصورات اور فرمودات یکجا کر دیے گئے تھے۔ اِس میں اعلان کیا گیا تھا:

- تمام کائنات پر فقط اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہے اور پاکستان کے عوام جو اختیار استعمال کریں گے، وہ ایک مقدس امانت ہے۔
- ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔
- اسلام نے جمہوریت، آزادی، رواداری اور سوشل جسٹس کے اصولوں کی جو صراحت کی ہے، اُن پر پورا پورا عمل کیا جائے گا۔
- مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔
- اِس امر کا مناسب التزام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذہب پر کاربند رہیں اور اپنی ثقافت کو فروغ دے سکیں۔
- بنیادی حقوق کی پوری ضمانت دی جائے گی جن میں سماجی حیثیت مواقع اور قانون کی نظر میں برابری، معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف، حریتِ فکر اور عقائد کے اظہار کی آزادی شامل ہیں جو قانونی اور اخلاقِ عامہ کی پابند ہوں گی۔
- عدلیہ کی آزادی کی پوری ضمانت دی جائے گی۔

❁ ❁ ❁

قراردادِ مقاصد میں بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کا یہ اعلامیہ بھی شامل ہے کہ ''پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگا جو سوشل جسٹس کے اسلامی اصول پر قائم ہوگا۔'' بلاشبہ اِس قرارداد میں اسلام کے آفاقی تصورات اور جمہوریت کے عصری تقاضوں کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے جو پاکستان میں سیاسی اور سویلین بالادستی کی ایک مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اِس قرارداد کو عملی جامہ اِس لیے نہیں پہنایا جاسکا کہ اقتدار عملاً جن لوگوں کو منتقل ہوا، ان کے طاقت ور عناصر اِسلام، جمہوریت اور آئین کی بالادستی کے بارے میں پوری طرح یکسو نہیں تھے جبکہ سول اور ملٹری بیوروکریسی میں اقتدار پر قابض رہنے کا ایک خفیہ معاہدہ آغاز ہی میں وجود میں آچکا تھا جس کا پہلا اظہار اکتوبر 1954ء میں ہوا جب دستور ساز اسمبلی تحلیل کر دی گئی اور دُوسرا اکتوبر 1958ء میں سامنے آیا جب 1956ء کا دستور تحلیل کر دیا گیا اور پورے ملک میں 1962ء کے اوائل تک مارشل لا نافذ رہا۔ اس کے نتیجے میں

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

علاقائی سیاسی جماعتوں اور کسی قدر بے لگام سرمایہ داری کو پنپنے کا موقع ملا جس کے باعث ملکی سالمیت خطرے میں پڑتی گئی اور استحصالی نظام کو اپنے قدم جمانے کے مواقع میسر آتے رہے۔ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم ایک منصفانہ معاشی نظام کے زبردست حامی اور معاشرتی عدل کے زبردست موید تھے، مگر پاکستان اِن بلند اہداف تک پہنچنے میں اِس لیے ناکام رہا کہ جن سیاسی زعمانے آگے چل کر اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا، اُن کا بنیادی مقصد عوام کی حالت بہتر بنانے اور ایک عادلانہ معاشی نظام قائم کرنے کے بجائے ریاست کے تمام وسائل پر قابض ہو جانا اور پورے معاشرے کو اپنا غلام بنالینا تھا۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جنرل ضیاءالحق نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے قراردادِ مقاصد کو باقاعدہ آئین کا حصہ بنادیا تھا جسے پہلے محض دیباچے کی حیثیت حاصل تھی۔ اب عدالت کے ذریعے بھی قراردادِ مقاصد کو نافذ کرنے کی منظم کوشش کی جاسکتی ہے۔

پاکستان وجود میں آیا، تو اس کے حصے میں چند چھوٹے کارخانے آئے۔ بھارت سے ہجرت کر کے مسلم صنعت کار آئے اور اُنھوں نے مشرقی پاکستان میں پٹ سن اور کاغذ کے کارخانے لگائے۔ انھی دنوں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ جو بہت بڑے زمیندار ہونے کے باوجود عصری تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے، نے صوبے میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا تاکہ غریب مزارعوں اور کاشت کاروں کو بھی زمین کا مالک بنایا جاسکے۔ اِن زمینی اصلاحات کو روکنے کے لیے نواب زادہ نصراللہ خاں نے ایک تنظیم قائم کی جس نے یہ موقف اختیار کیا کہ مذہب کی رُو سے کسی کو بھی زمین سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ انھی دنوں امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے 'مسئلہ ملکیتِ زمین' کے عنوان سے کتاب شائع کی جس میں دینی حوالے سے یہ نکتہ اُٹھایا گیا تھا کہ اِس امر کی تحقیق کی جائے کہ لوگوں کو زمینیں کس طرح ملی ہیں۔ اگر مسلمانوں کے مفادات کے خلاف انگریزوں کی خدمات بجالانے کے عوض جاگیریں دی گئی ہیں، تو اُنھیں ریاست ضبط کرنے کی مجاز ہوگی۔ اِس کے برعکس اگر وراثت میں جائز طور پر زمین ملی ہے، تو اسے ضبط کرنے یا اس کا ایک حصہ حکومت کی تحویل میں دینے کا ریاست کو حق نہیں پہنچتا۔ مولانا کی اِس تصنیف سے اُس طبقے نے کمال عیاری سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جو زرعی اصلاحات کے خلاف تھا، چنانچہ دولتانہ صاحب کی زرعی اصلاحات نافذ نہ ہوسکیں اور جاگیرداری سسٹم جوں کا توں قائم رہا جسے قائدِ اعظم سب سے پہلے ختم کر دینے کے آرزومند تھے۔

❁❁❁

زمینداروں اور مزارعین کے درمیان زندگی کے معیار میں فرق بہت بڑھتا گیا اور قومی سطح پر یہ سوچ تیزی سے پرورش پانے لگی کہ ملکیتِ زمین پر کوئی حد مقرر ہونی چاہیے۔ وزیرِ اعظم حسین شہید سہروردی نے فروری 1959ء میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ تب جماعتِ اسلامی نے اپنے انتخابی منشور میں زمین کی ملکیت کے لیے ایک حد مقرر کی، مگر انتخابات سے پہلے ہی مارشل لا نافذ ہو گیا اور پھر ایوب خان دس برسوں سے بھی زائد عرصے تک سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ اُنھیں امریکا اور یورپ نے پاکستان میں صنعتی ترقی کے لیے وسیع پیمانے پر امداد فراہم کی اور چند ہی برسوں میں اقتصادی شرح نمو چھ سات فی صد کی سطح

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

تک پہنچ گئی اور ملک میں کارخانے لگنے لگے۔ کراچی میں صنعتی زون میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہوتی جا رہی تھی، لیکن 1965ء کی جنگ نے معاشی ترقی پر کاری ضرب لگائی اور اس کے چار سال بعد پاکستان کے معروف معیشت دان ڈاکٹر محبوب الحق نے 22 خاندانوں کا غلغلہ بلند کر دیا، حالانکہ کیپٹل فارمیشن ابھی اپنے ارتقائی مراحل ہی میں تھا۔ اِس نعرے نے شدید افراتفری پیدا کر دی اور مسٹر بھٹو جو اپنے ڈیڈی فیلڈ مارشل ایوب خان کے مدِمقابل آ چکے تھے، اُنھوں نے سوشلزم کو اپنی سیاسی موومنٹ کا ماٹو بنا لیا۔ وہ عوام کے اندر صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت کو ہوا دے رہے تھے اور مذہب سے بیزاری کا برسرِعام اعلان بھی مختلف انداز میں کرتے جاتے تھے۔ اُن کی تقریروں میں دینی رہنماؤں کا مذاق اُڑایا اور یہ تاثر دیا جاتا کہ وہ اقتدار میں آ کر کارل مارکس اور لینن کا نظام قائم کریں گے اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں گے۔ اِس طرح کے بیانات کے خلاف امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی جو علاج کے لیے لندن گئے ہوئے تھے، اُنھوں نے ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی بیان دیا کہ جب تک ہمارے کندھوں پر سر ہیں، ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دیں گے اور کسی کو پاکستان میں سوشلزم نافذ کرنے کی جرأت نہیں ہو گی۔ اِس بیان سے عوام کو خطرے کا شدید احساس ہوا اور وہ سوشلزم کے خلاف متحد ہوتے گئے۔ بھٹو صاحب کی تقریروں میں فسطائیت کا رنگ جھلکنے لگا تھا اور یہ احساس تقویت پکڑتا جا رہا تھا کہ ایک شخص ہٹلر اور مسولینی کی طرح عوام کے جذبات سے کھیلتے ہوئے اقتدار پر قابض ہو جانا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے مذموم عزائم کو لگام دینا ازبس ضروری ہو گیا ہے۔

عوام کی بڑھتی ہوئی مخالفت کے سبب مسٹر بھٹو کو اپنے اسلوبِ گفتار میں تبدیلی لانا پڑی۔ مولانا کوثر نیازی کے مشورے پر اُنھوں نے پہلے سوشلزم کے ساتھ اسلام کا لاحقہ لگایا اور 'مساواتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم' کا پرچار شروع کر دیا۔ اِس طرح عوام کا غصہ کسی حد تک کم ہوا اور وہ بھٹو صاحب کے فریب میں آ گئے اور سچ مچ یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تقدیر بدل دینے کے لیے ایک مسیحا نازل کیا ہے۔ 1970ء کے عام انتخابات میں اُن کی پارٹی مغربی پاکستان میں سب سے بڑی پارلیمانی جماعت بن کر اُبھری۔ اِس کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آیا اور وہ مغربی پاکستان کے بلاشرکتِ غیرے حکمران بن گئے۔ اُنھوں نے تمام بینک، انشورنس کمپنیاں اور کارخانے قومی تحویل میں لے کر بیوروکریٹس کے حوالے کر دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے معیشت کا پورا چمن اُجڑ گیا، سرمایہ ملک سے فرار ہوتا گیا اور وہ کارخانے جو ملک میں طیارے بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اُن میں خاک اُڑنے لگی۔ سائنسی بنیادوں پر سوشلزم کے نفاذ کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا اور مزدوروں کی حالت میں بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ نیم دِلی سے کی گئی زرعی اصلاحات سے مزارعوں کے حصے میں اتنی زمین بھی نہیں آئی کہ وہ ایک باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ مسٹر بھٹو کے دورِ حکومت کے پانچ سال اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات محدود کرنے، سیاسی حریفوں اور جماعتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور بیوروکریسی کو اپنے احکامات کا غلام بنانے میں گزر گئے۔ آخری زمانے میں تو وہ مزدور لیڈروں کے خلاف بھی ہو گئے تھے۔ پھر جب اُن کے مظالم حد سے بڑھے، تو فطرت کے اصول حرکت میں آئے اور اُن کا عہد کچھ اس طرح تمام ہوا جس کی

یادیں آنکھوں کو نم کر دیتی ہیں۔

اب عالمی سطح پر کورونا وائرس نے ہمارے عالمی نظام کی بنیادی خرابیاں پوری طرح واضح کر دی ہیں۔ کارپوریٹ کلچر نے دنیا کی دولت کو چند افراد یا خاندانوں کے اندر مرتکز کر دیا ہے جو زندگی کے تمام اہم شعبوں پر قابض ہو گئے ہیں۔ انسانی وسائل کی منصفانہ تقسیم کا تصور اب صرف کتابوں کے اندر پایا جاتا ہے اور اِنسان کس قدر بےبس اور بےسہارا ہو گیا ہے، اِس کا دردناک مظاہرہ گزشتہ چند مہینوں سے عالمی سطح پر ہو رہا ہے۔ بیشتر ملکوں میں اولڈ ہاؤسز عقوبت خانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور بوڑھوں کی حالت قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ مغرب میں زیادہ تر سن رسیدہ لوگ کورونا کا شکار ہوئے ہیں جن پر ہسپتالوں کے دروازے بند ہیں۔ امریکا جیسے ملک میں صحت کا نظام اِس قدر ناقص ثابت ہوا ہے کہ وہاں شہریوں کو بروقت طبی امداد فراہم نہیں کی جا سکی۔ سرمایہ داری نظام کی تباہ کاریاں اِس قدر پھیلتی جا رہی ہیں کہ اب اس کا موجودہ حالت میں قائم رہنا محال دکھائی دیتا ہے۔ مستقبل کے لیے ایک ایسا نظام وضع کرنا ہو گا جس میں انسان کو بنیادی اہمیت حاصل ہو اور شہریوں کی تعلیم و صحت کی ذمے داریاں ریاست اُٹھانے کی پابند ہو۔ دولت کو سمیٹنے کے بجائے اپنے معاشرے میں اس کی پیہم گردش کے قابلِ اعتماد انتظامات کرنا ہوں گے۔ خاندان کو انسانی بقا اور خوش حالی کا بنیادی یونٹ قرار دے کر اسے مستحکم بنانا ہو گا۔ لوگوں کو اِس بات کا قائل کرنا ہو گا کہ وہ مال و متاع کے حصول میں روز و شب سرگرداں رہنے کے بجائے مختصر سامان پر قناعت کرنے کی خُو اپنائیں۔ اِس عظیم انقلاب کے لیے آج فضا بڑی سازگار ہے اور اَربابِ فکر و نظر کو اِن بنیادی مسائل پر بھرپور توجہ دینا ہو گی۔ ہسپتال گاؤں گاؤں اور قریے قریے قائم کرنا اور ڈاکٹروں، نرسوں اور طبی عملے کو ایک امتیازی حیثیت دینا ہو گی۔ اِسی طرح معیاری تعلیمی اداروں کا ایک جال بچھانا ہو گا جن میں غریبوں کے بچے اپنی صلاحیتوں کو جلا دے کر غربت سے نیچے کی زندگی سے نکل کر انسانیت کی فلاح و بہبود میں اپنا کردار اَدا کر سکیں۔ یہ بھی قدرت کا ایک عجب کرشمہ ہے کہ امریکا جو مغربی تہذیب کا امام سمجھا جاتا تھا، وہاں نسل پرستی کے خلاف جو ایک طاقت ور تحریک اُٹھی ہے، وہ یورپ سے ہوتی ہوئی آسٹریلیا تک پہنچ گئی ہے۔ غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے مجسمے گرائے اور رنگ و نسل کے امتیازات مٹائے جا رہے ہیں جو اسلام کے زریں اصولوں کے عین مطابق ہے۔ ایک عالمگیر انقلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔

پاکستان کے اندر بھی ایک بحرانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کے باعث غربت میں اضافہ ہوتا آیا ہے اور مزدور اَور کاشت کار شدید معاشی اور معاشرتی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کے سبب شدید اذیت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ گھروں میں خادماؤں اور خدمت گزاروں کا سلسلہ وسیع ہوتا اور آقا اور نوکر کا رشتہ ختم ہو جانے کے بجائے گہری جڑیں پکڑتا جا رہا ہے۔ برسرِ اقتدار لوگ اپنی ناتجربے کاری اور مائنڈ سیٹ کے سبب شہریوں کی زندگیوں اور قسمتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ کورونا وائرس نے ان کی تہی دامانی کو مزید بےنقاب کر دیا ہے۔ حکمرانوں نے ہمارے عظیم وطن کو آئی ایم ایف کے ہاتھوں

گروی رکھ دیا ہے، چنانچہ انہی کے نمائندے ہماری معیشت کی بنیادیں کھوکھلی اور ہماری غربت میں لامحدود اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین سخت کشمکش نے ملکی نظم و نسق تباہ کر ڈالا ہے۔ ہمارے سیاسی عدم استحکام سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھارتی وزیرِاعظم آئے دن ہم پر حملہ آور ہونے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملکی حالات ہمارے حکمرانوں کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں اور کسی خوفناک حادثے کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ جناب عمران خان جو بائیس برس سیاسی ریاضت کرتے آئے تھے، اس غبارے میں سے ہوا بائیس مہینوں ہی میں نکل گئی ہے۔ اِس اعتبار سے داخلی اور بیرونی خطرات حقیقت کا روپ دھارتے محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے میں اپوزیشن کو ایک مثبت کردار اَدا کرنے کے لیے کمرِ ہمت باندھنا اور ہمارے مقتدر اِداروں کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا شدید احساس کرنا ہوگا۔ ہم اِس وقت عرصۂ محشر میں ہیں اور ہمیں یہی احساس زندہ اور توانا رکھ سکتا ہے کہ سب بڑے بڑے مناصب اور دَولت کے انبار کی جستجو میں سرگرداں رہنے کے بجائے آخرت کی فکر کی جائے اور سامانِ زیست مختصر رکھا جائے۔ اِس درویشی میں جو قوت اور جبروت ہے، اس کے سامنے ہر چیلنج بےاثر ہو جائے گا اور بھارت کو پیش قدمی کی جرأت نہیں ہوگی۔ اب عوام کی حاکمیت قائم کرنے کا وقت قریب آن پہنچا ہے جسے پارلیمان کے ذریعے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر ہی سے سلامتی کے راستے برآمد ہوں گے اور حقیقی تبدیلی کا عمل ثمر بار ہوگا۔

کراچی اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں جو دہشت گردی کا ہولناک واقعہ پیش آیا ہے، وہ اِشارہ دَے رہا ہے کہ 'را' پاکستان میں دوبارہ پوری قوت سے سرگرم ہو گئی ہے جو کسی بڑے تصادم کا شاخسانہ بن سکتا ہے۔ اِس نازک لمحے میں پاکستان کی اجتماعی دانش اور قومی عزم فوری طور پر بروئے کار آنے کی ضرورت ہے جس کے لیے قومی یک جہتی کا بیانیہ نوشبت کرنا اوّلین شرط ہے۔ عمارت پر تعینات بہادر گارڈز اَور پولیس اہل کار نے دہشت گردی کا حملہ ناکام تو بنا دیا جس پر وہ قوم کی طرف سے یقیناً خراجِ تحسین اور عملی طور پر حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں، تاہم دہشت گردی کا یہ ہولناک واقعہ ایک بہت سنگین سوال چھوڑ گیا ہے کہ دہشت گرد دِن کے اُجالے میں کراچی کی بہت حساس عمارت تک کیسے پہنچے؟ دوسرا سوال یہ اُٹھتا ہے کہ پاکستان کے الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے اِس خوفناک حادثے کی ہیجان انگیز انداز میں کوریج کیوں کی جبکہ بیشتر مہذب ممالک میں اِس طرح کے مناظر ٹی وی پر نہیں دکھائے جاتے۔ اس ضمن میں تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ پی ٹی وی نے اس واقعے کی کوریج نئی دہلی سے کیوں کی جس سے پاکستان میں سلامتی کے انتظامات کے بارے میں شدید نوعیت کے شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ہمارے سیاست دانوں اور عسکری قیادت کے لیے انتباہ ہے کہ سی پیک کے خلاف امریکا، یورپ اور بھارت بہت گہری منصوبہ بندی کر رہے ہیں جو پاکستان اور چین کے لیے گیم چینجر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں چین، ترکی اور دُوسرے ملکوں کے تعاون سے اس چیلنج کا ہوش مندی سے مقابلہ کرنا اور دَاخلی استحکام پر ہمہ پہلو توجہ دینا ہوگی۔ یہ ہماری قومی قیادت کا سب سے بڑا امتحان ہے کہ وہ اقتدار پر قربان ہو جائیں گے یا قومی وحدت پر اقتدار کو قربان کر دیں گے۔ ◆◆◆

اژدہا انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا

بامِ دنیا پر چین اور بھارت آمنے سامنے

دو بڑی قوتوں کے زبردست ٹکراؤ کی تحیر خیز کہانی

سید عاصم محمود

ہمالیہ کی پُرشکوہ برف پوش و سنگلاخ وادیوں میں سپر پاور بننے کے راستے پر گامزن چینی فوج نے گھمنڈی مودی سرکار کا سارا غرور و تکبر ملیامیٹ کر ڈالا

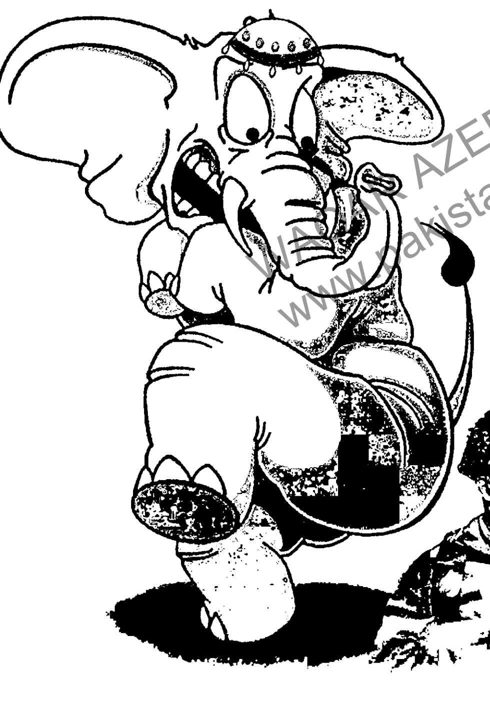

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اوائل اپریل 2020ء کی بات ہے، حکومتِ چین نے بھارتی مودی سرکار کو خبردار کیا کہ وہ لداخ میں دریائے شیوک پر پُل کی تعمیر روک دے۔ مودی حکومت نے چین کے پیغام پر کوئی دھیان نہیں دیا اور اُسے معمول کی کارروائی سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ بھارتی حکمران طبقے کو احساس نہ تھا کہ اس بار چینی حکومت کافی سنجیدہ ہے۔ چینی رہنماؤں کا دراصل اصول ہے کہ پہلے وہ مسائل بذریعہ بات چیت حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بات نہ بنے، تو پھر وہ طاقت استعمال کرتے ہیں۔ دریائے شیوک پر پُل کے معاملے پر آخر اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ چنانچہ چین نے عملی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

دریائے شیوک لداخ کا ایک بڑا دریا ہے۔ 550 کلومیٹر طویل ہے۔ سیاچن گلیشیئر سے نکلتا ہے۔ اس کا راستہ بڑا انوکھا ہے۔ پہلے یہ نیپال کی سمت بہتا، پھر اچانک مڑ کر پاکستان کی سمت بہنے لگتا ہے۔ بلتستان میں داخل ہو کر اسکردو کے نزدیک دریائے سندھ سے مل جاتا ہے۔ گویا یہ ہمارے دریائے سندھ کا معاون دریا ہے۔

نیپال کی سمت بہتے ہوئے دریائے شیوک جب آدھا راستہ طے کر چکے، تو دریائے گلوان اس سے آملتا ہے۔ یہ دریا سلسلہ ہائے کوہِ قراقرم سے نکلتا ہے۔ پھر لداخ کے علاقے اکسائی چن میں بہتے ہوئے دریائے شیوک سے آملتا ہے۔ 80 کلومیٹر لمبا ہے۔ چونکہ یہ اونچائی سے نیچے آتا ہے، لہٰذا اس میں پانی بڑی تیزی سے سفر کرتا ہے۔ دریا کے اردگرد کا علاقہ وادیٔ گلوان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دریا ایک کشمیری نژاد لداخی قلی، غلام رسول گلوان نے 1849ء میں دریافت کیا تھا۔

جنگ بندی کے تین نکات

1962ء کی چین۔ بھارت جنگ میں چینی فوج نے تبت سے پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے شیوک اور دریائے گلوان کے اتصال تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ یہ علاقہ اکسائی چن کہلاتا اور اَب چین کے قبضے میں ہے۔ جب جنگ بندی کا معاہدہ ہوا، تو اس کے تین نکات قابلِ ذکر تھے۔

اوّل یہ کہ لداخ میں جن علاقوں پر چینی فوج قبضہ کر چکی تھی، وہاں ایک عارضی سرحد بنا دی گئی۔ یہ ''لائن آف ایکچوئل کنٹرول'' کہلاتی ہے۔ دوم یہ طے پایا کہ عارضی سرحد سے چینی فوج 20 کلومیٹر پیچھے ہٹ جائے گی۔ تیسرا اور اہم نکتہ یہ تھا کہ عارضی سرحد سے دو کلومیٹر دور تک کوئی بھی فریق کسی قسم کی تعمیرات نہیں کرے گا۔ دونوں ممالک نے معاہدہ تسلیم کر لیا۔

2000ء میں بھارت نے معاہدۂ جنگ بندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لداخ میں ''دربوک۔ شیوک دولت بیگ اولدی روڈ'' کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ یہ سڑک لداخ کے صدر مقام لیہہ کو دربوک اور شیوک دیہات کے ذریعے دولت بیگ اولدی سے ملاتی ہے۔ دولت بیگ اولدی لداخ کے شمالی کونے میں، سیاچن گلیشئر اور درۂ قراقرم کے نزدیک واقع بھارتی فوج کا جنگی مستقر ہے۔ اِس جگہ ہوائی پٹی بھی واقع ہے۔ اِس جنگی ٹھکانے کو بھارتی فوج مسلسل توسیع دے رہی ہے کیونکہ یہ چینی اور پاکستانی سرحدوں کے بہت نزدیک واقع ہے۔

درج بالا سڑک وادی گلوان کے سامنے سے، دریائے شیوک کے ساتھ ساتھ اوپر جاتی ہے۔ جب حکومتِ چین کو سڑک کی تعمیر کا علم ہوا، تو اس نے بھارتی حکومت سے احتجاج کیا۔ تاہم بھارتی حکمرانوں نے گول مول جواب دے کر سڑک کی تعمیر جاری رکھی۔ یہ پچھلے سال کے وسط میں مکمل ہو گئی۔ مودی سرکار نے سڑک کی تکمیل پر خوشیاں منائیں اور اپنی سینا کو ناقابلِ شکست قرار دیتے ہوئے اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ اب اسی سڑک پر وادی گلوان کے نزدیک ایک نیا پل بن رہا تھا جس کی تعمیر پر چین نے سخت احتجاج کیا۔

وادیٔ گلوان کے نزدیک دربوک۔ شیوک دولت بیگ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اولڈی روڈ تقریباً لائن آف ایکچوئل کنٹرول کے ساتھ واقع ہے۔ گویا اِس جگہ بھارتی حکمرانوں نے معاہدۂ جنگ بندی کا تیسرا اُصول توڑ ڈالا جو ایک غیر اخلاقی اور غیر قانونی عمل تھا۔ سوال مگر یہ ہے کہ جب سڑک تعمیر ہو رہی تھی، تو چینی حکومت کیوں خاموش رہی؟

چین نے احتجاج کیوں نہ کیا؟

بنیادی وجہ یہ ہے کہ پندرہ سال قبل چینی حکمرانوں کی تمام تر توجہ اور توانائی اپنی معیشت مضبوط بنانے پر مرکوز تھی۔ اِس لیے اُن کی بھرپور کوشش ہوتی کہ وہ ہر قسم کے جھگڑے اور تنازع سے دُور رہیں۔ زبانی کلامی تو وہ سخت بیان بھی داغ دیتے، مگر ایسا کوئی عملی قدم نہ اُٹھاتے جس سے جھگڑا بڑھ جائے۔ یہی وجہ ہے، اُنھوں نے بھارت کے ساتھ لداخ میں تنازع کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ یہ عمل اُن کی بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتا تھا۔

2013ء میں جب چینی صدر شی جن پنگ برسرِ اقتدار آئے، تو چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن چکا تھا۔ اس کے پاس کئی کھرب ڈالر کا زرِ مبادلہ موجود تھا۔ ملک سے غربت بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا اَب چینی حکمران طبقے نے ماضی کی طرح چین کو ایک عظیم عالمی طاقت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اِسی دوران اکلوتی سپر پاور، امریکا، چین کو دنیا بھر میں پھیلے اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھنے لگا تھا۔ امریکی جرنیل بیان دینے لگے کہ امریکا کی نگاہ میں چین اس کا حریف بن چکا۔ جنوبی بحیرہ چین کے نزدیک امریکی طیارہ بردار جہاز منڈلاتے نظر آئے۔ امریکی حکومت تائیوان سے دوستی کی پینگیں بڑھانے لگی۔ اِسی وقت امریکا، بھارت کے بھی قریب ہو گیا۔ اُسے جدید اسلحہ دیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ امریکی افواج نے اپنی سب سے بڑی کمانڈ کا نام ہی ایشین پیسفک سے بدل کر ''انڈو پیسفک'' رکھ دیا۔

اِن معاندانہ حالات میں چین کا چوکنا و ہوشیار ہو جانا فطری امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 2014ء سے چینی حکومت نے بھی اپنی افواج میں اصلاحات متعارف کرا دیں۔ اب تینوں افواج کے لیے جدید ترین اسلحہ تیار ہونے لگا۔ نت نئے ٹینک، توپیں اور میزائل بننے لگے۔ مقصد یہی تھا کہ اپنا دفاع مضبوط کیا جا سکے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چین کبھی استعماری قوت نہیں رہا، بلکہ بیرونی قوتوں نے اُسے اپنا غلام بنائے رکھا جن میں انگریز اور جاپانی سرِفہرست ہیں۔

مودی کی آمد

2014ء میں بھارت میں ہندو انتہا پسندوں نے حکومت

جب دوستی کی پینگ آسمان پر جھولتی تھی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سنبھال لی۔ ان کا لیڈر، نریندر مودی توسیع پسندانہ عزائم رکھتا ہے۔ وہ ہندو قوم کو کم از کم مقامی سطح پر سپر پاور طاقت بنانا چاہتا ہے۔ اِس لیے وہ بین الاقوامی محاذ پر بہت سرگرم ہو گیا۔ اس نے بیک وقت تینوں بڑی طاقتوں..... امریکا، چین اور رُوس کے ساتھ تعلقات بڑھا لیے۔

نریندر مودی نے خاص طور پر چین کے ساتھ قربت بڑھانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ وہ چینی صدر سے ملاقات کے بہانے ڈھونڈتا رہتا۔ جب بھی شی جن پنگ بھارت گئے، تو اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ اِس حکمتِ عملی سے وہ چین اور پاکستان کا تعلق کمزور سے کمزور تر کرنے کا خواہش مند تھا۔ حتیٰ کہ مودی نے اپنے تاجروں کو چین کے ساتھ تجارت بڑھانے کی کھلی چھٹی دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال 70/ارب ڈالر سے زیادہ کا چینی سامان بھارت آنے لگا۔ جبکہ بھارت سے بہ مشکل 20/ارب ڈالر کا مال ہی چین جا پاتا۔ گویا اِس تجارت میں بھارت کو سخت گھاٹا ہو رہا تھا، مگر مودی سرکاری نقصان برداشت کرتی رہی۔

مودی دراصل پاکستان اور مسلمانوں کا کٹر دشمن ہے۔ حکمران بنتے ہی وہ ایسی خفیہ سازشیں کرنے لگا تھا جن سے عالمی سطح پر پاکستان کو معاشی و سیاسی طور پر نقصان پہنچ سکے۔ چین سے تجارتی و سیاسی روابط بڑھانا بھی پاکستان دشمن منصوبے کی کڑی تھی۔ 2016ء سے 2018ء تک اس منصوبے کو خاصی کامیابی ملی اور پاکستان بین الاقوامی سطح پر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ حتیٰ کہ چین مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے سے کترانے لگا۔ چینی حکومت نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ یہ بھارت اور پاکستان کا باہمی تنازع ہے اور انھی کو مل بیٹھ کر بات چیت سے حل کرنا چاہیے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

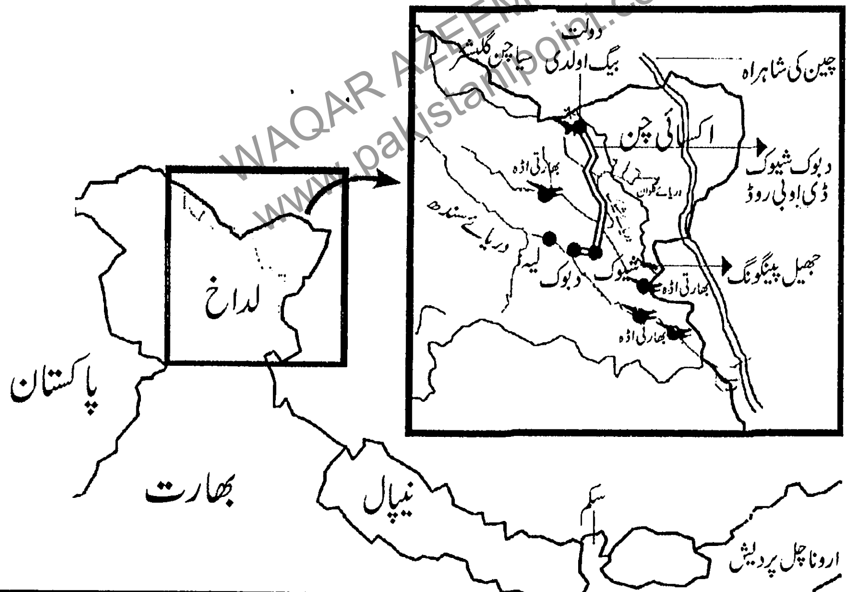

بام دنیا کا ایک حصہ

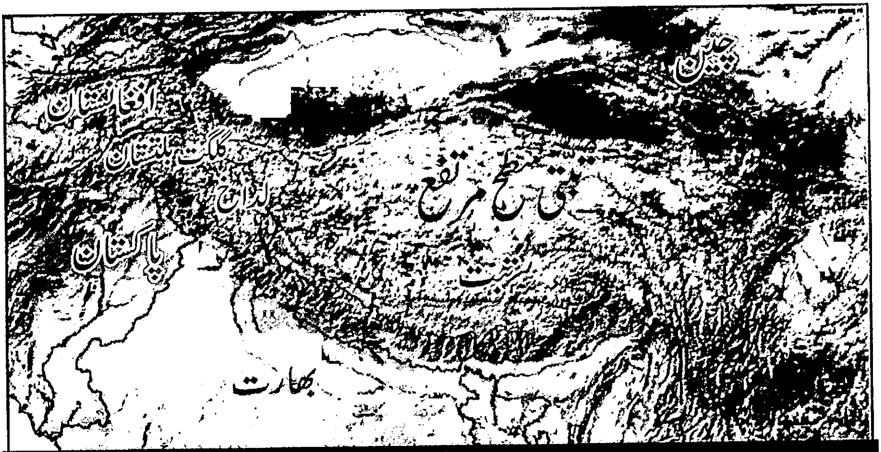

تبتی سطح مرتفع

پاکستانی معاشرہ تباہ کرنے کے لیے مودی سرکار پاکستان دشمن دہشت گرد تنظیموں کو بھی ہر ممکن امداد دیتی رہی۔ جنھوں نے اپنی سرگرمیوں سے پاکستان کو بہت جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ جب کامیابی ملی، تو مودی جنتا مغرور و متکبر ہو گئی۔ یہ غرور مگر ربِ کائنات کو ہرگز پسند نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آ گئی تاکہ مودی سرکار کے تکبر کو نیست و نابود کیا جا سکے۔ یہ لاٹھی مودی کے دماغ میں پڑی تو وہ گھوم گیا اور احمقانہ حرکتیں کرنے لگا۔

پے در پے غلطیاں

نریندر مودی سے اوائل 2018ء میں پہلی کوتاہی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے ٹیرف کے معاملے میں امریکا سے پنگا لے لیا اور دونوں میں رسہ کشی ہونے لگی۔ دوسری یہ کہ جب چین اور اَمریکا کی تجارتی جنگ شروع ہوئی، تو مودی کوشش کرنے لگا کہ چینی علاقوں میں کام کرتی کمپنیاں اور فیکٹریاں بھارت منتقل ہو جائیں۔ یہ حرکت چین کو ناگوار گزری۔ تیسری غلطی یہ کہ اس نے جدید ترین میزائل خریدنے کے لیے روس سے معاہدہ کر لیا۔ یوں وہ روسی حکومت کو منانا چاہتا تھا جو امریکا سے قربت پر بھارت سے ناراض تھی، مگر روسی میزائل خریدنے کے اعلان نے امریکا کو چوکنا کر ڈالا۔

درج بالا غلطیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکا، چین اور رُوس...... تینوں بڑی قوتوں کو احساس ہو گیا کہ مودی ان سے ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ وہ اپنے مفادات حاصل کرنے کی خاطر کسی بھی ایک طاقت کو چھوڑ کر دوسری قوت سے تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ جب یہ سچائی سامنے آئی، تو تینوں بڑی قوتیں مودی سرکار سے دور ہو گئیں اور اُسے فاصلے پر رکھنے لگیں۔

2010ء سے امریکا اور پاکستان کے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ وسط 2018ء میں ٹرمپ حکومت کو احساس ہوا کہ افغانستان پر حملہ کر کے امریکی فوج بھول بھلیوں میں پھنس چکی، لہٰذا اُسے واپس لانے کی باتیں ہونے لگیں۔ تبھی احساس ہوا کہ اِس سلسلے میں پاکستانی حکومت مدد کر سکتی ہے۔ یوں امریکا کے لیے پاکستان دوبارہ اہم ملک بن گیا۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ اس کی حمایت میں بیان دینے لگے۔ حالانکہ پچھلے سال اُنہوں نے پاکستان مخالف بیانات کی بھرمار کر دی تھی۔

بدلتی صورتِ حال نے مودی سرکار کو کھسیانی بلی کھمبا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

نوچ کے مترادف بنا دیا۔ وہ تو پاکستان کو نیچا دکھانے کی خاطر تن دہی سے سرگرم تھی۔ اِدھر صدر ٹرمپ نے افغان مسئلہ حل کرتے ہوئے اُسے گھاس تک نہیں ڈالی۔ پھر مودی پچھلے سال ڈوکلام تنازع کے ضمن میں چین کے ساتھ بھی سینگ پھنسا کر اُسے ناراض کر چکی تھی۔ وسط 2017ء سے چین اور بھارت کے تعلقات میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی۔

بام دنیا پر چلیے

آگے بڑھنے سے پیشتر چین اور بھارت کے جغرافیہ اور تاریخ پر بات ہو جائے۔ نقشے پر نظر دوڑائیے تو ہمیں دونوں ممالک کی سرحد پر چہار جانب بلند و بالا پہاڑوں سے گھری تبتی سطح مرتفع دکھائی دیتی ہے۔ یہ لاکھوں سال قبل اُس وقت وجود میں آئی جب انڈین اور یوریشیائی پلیٹوں میں ٹکراؤ ہوا۔ یہ دنیا کی سب سے بلند اور وسیع ترین سطح مرتفع ہے۔ اِس میں تبت، لداخ، گلگت بلتستان اور مشرقی افغانستان کا علاقہ شامل ہے۔ چین میں اِس کا رقبہ 25 لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اگر لداخ اور پاکستانی و افغان حصہ ملایا جائے، تو رقبہ مزید بڑھ جاتا ہے۔

اِس سطح مرتفع کی اوسط بلندی چودہ ہزار فٹ ہے۔ یہ چار اطراف سے پہاڑوں میں گھری ہے۔ انہی میں دو بلند ترین چوٹیاں ایورسٹ اور کے ٹو بھی شامل ہیں۔ اس لیے تبتی سطح مرتفع کو ''بام دنیا'' (The Roof of the World) کا نام دیا جا چکا۔

اِس علاقے میں کہیں سرسبز وادیاں ہیں، تو کہیں جنگل، سنگلاخ زمین اور سرد صحرا بھی اِس کا مسکن ہیں۔ پہاڑوں سے بہتے جھرنے، چشمے اور ندی نالے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ تبتی سطح مرتفع ہی سے دنیا کے مشہور و معروف دریا مثلاً سندھ، برہم پتر، گنگا، اراوردی، میکونگ، ستلج وغیرہ نکلتے اور کروڑوں ایکڑ رقبہ سیراب کرتے ہیں۔ یہ علاقہ مگر پہاڑی ہونے کے ناتے بہت دشوار گزار ہے۔ اِس لیے یہاں شروع سے انسانی آبادی کم ہے۔

تبتی سطح مرتفع کو چین اور وسطی ایشیا سے آنے والے انسانوں نے آباد کیا۔ پہلی صدی عیسوی میں یہ کشان سلطنت کا حصہ بن گیا۔ یہ سلطنت وسطی ایشیا سے آنے والے قبائل نے قائم کی تھی۔ اُنہوں نے بدھ مت قبول کر لیا تھا۔ اِس لیے اُن کی رعایا میں بھی اِسی مذہب نے رواج پایا۔ کشان حکومت تبت سے لے کر افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔

مسلمان صوفیا کی تبلیغ

جب کشان سلطنت زوال پزیر ہوئی، تو اس کا علاقہ چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب بھی کسی ریاست میں اہل اور دلیر حکمران جنم لیتا، تو وہ آس پاس کی ریاستوں پر حملہ کر کے انہیں مطیع کر لیتا۔ تیرہویں صدی سے مسلمان صوفیا تبتی سطح مرتفع میں آنے لگے۔ اُن کی تبلیغ سے افغانستان، گلگت بلتستان اور لداخ میں ہزارہا غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ تاہم عرصہ دراز تک نومسلموں نے مقامی رسم و رواج بھی اختیار کیے رکھے۔

1460ء میں تبت سے فرار ہو کر لداخ آنے والے ایک تبتی شہزادے نے اپنی مٹھی بھر فوج کی مدد سے وہاں خودمختار نامگیال ریاست قائم کر لی۔ بعدازاں ہندوستان سے مسلمان جرنیلوں نے ریاست پر حملے کیے۔ وہ اُسے فتح کر لیتے، مگر جلد ہی نامگیال حکمران کو باج گزار بنا کر واپس لوٹ جاتے۔ دراصل لداخ کا ماحول اور موسم اِتنے سخت تھے کہ میدانی علاقوں میں رہنے والے اس سے مطابقت نہ کر پاتے۔ اپنے دورِ عروج میں نامگیال ریاست کے علاقے تبت، وادی کشمیر، بلتستان اور شمالی ہند تک پھیلے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ علاقہ تجارت کا مرکز بن گیا۔ تبت سے پشمینہ اون لداخ سے ہو کر کشمیر آنے لگی۔ لداخ میں واقع درۂ قراقرم تجارتی قافلوں کی گزرگاہ بن گیا۔ اٹھارہویں صدی سے اسی راستے کے ذریعے چینی ترکستان اور شمالی ایشیا تک بھی تجارت ہونے لگی۔ یہی تجارت مگر لداخ کی آزادی و

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خودمختاری ختم کرنے کا سبب بن گئی۔

ہندو ڈوگرا کے قبضے میں

ہوا یہ کہ مسلمان حکمرانوں کی نااہلی سے پہلے جموں میں ہندو ڈوگرا خودمختار ہو گئے۔ پھر وادیٔ کشمیر سکھوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اب مہاراجا پنجاب، رنجیت سنگھ لداخ اور تبت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ وہ اپنی سلطنت کی توسیع کا خواہش مند تھا۔ اِس طرح علاقائی تجارت بھی مفت میں اُس کے ہاتھ آجاتی، مگر موت نے اُسے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کی اجازت نہیں دی۔

1839ء میں رنجیت سنگھ چل بسا، تو جموں کا راجا گلاب سنگھ خودمختار ہو گیا۔ وہ ایک چالاک و شاطر حکمران تھا۔ اُس نے جلد لداخ پر حملہ کر کے اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ڈوگرا فوج پھر تبت پہنچی، مگر تبتی فوجیوں نے اُسے مار بھگایا۔ 1841ء میں تبتی فوج نے لداخ لینے کے لیے حملہ کیا، مگر اب ڈوگرا سپاہ نے اُسے شکست دی۔ آخر فریقین کے مابین معاہدہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس وقت سرحد کا کوئی تعین نہیں ہوا۔

اِس طرح لداخ جموں ریاست کا حصہ بن گیا۔ 1846ء میں انگریزوں نے وادیٔ کشمیر راجا گلاب سنگھ کو دے ڈالی۔ یوں ایک نئی ریاست، جموں و کشمیر وجود میں آئی جس میں لداخ اور گلگت بلتستان کے علاقے بھی شامل تھے۔ انگریز نے اس ریاست کے معاملات میں طویل عرصہ دخل نہیں دیا۔ وجہ یہ ہے کہ انگریز پہاڑوں سے اٹی اِس ریاست کو معاشی طور پر بے فائدہ سمجھتے تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر سے انگریزوں نے یہ کوشش ضرور کی کہ ہندوستان اور چین کی سرحد کا تعین ہو جائے۔ یہ سرحد ندی نالوں اور پہاڑی سلسلوں سے بھری پڑی تھی۔ اِس لیے سرحد کا تعین کرنا کٹھن کام بن گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ انگریزوں نے چین کے ساتھ جو بھی سرحد بنائی، اُسے چینیوں

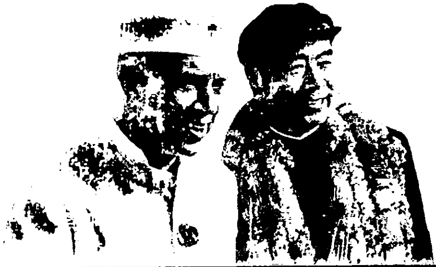

چو این لائی اور پنڈت نہرو

نے تسلیم نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ وہ انگریز کو غاصب سمجھتے تھے۔ پہلی افیون جنگ کے بعد اُنھوں نے چینی حکومت کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔

اُس زمانے میں ہندوستان کے بت پرست و مسلم عوام و خواص اور چین کے مابین تعلقات خوش گوار تھے۔ وہ معاشی، تہذیبی و ثقافتی روابط رکھتے تھے۔ دونوں ممالک سے تجارتی قافلے بحری و بری راستوں کے ذریعے آتے جاتے۔ ہندوستان بھی شاہراہِ ریشم کی تجارت سے مستفید ہوتا۔ ہندوستان ہی سے بدھ مت تبت اور چین پہنچا۔ بعدازاں چینی سیاح ہندوستان آئے اور اُنھوں نے تفصیل سے ہندوستانی قوم اور مقامات کا ذکر کیا۔

WAQAR AZEEM
www.paksitanipoint.com

بھارت کا قیام

لداخ کا علاقہ دشوار گزار تھا۔ اِس لیے ڈوگرا حکمرانوں نے جو ظلم و ستم کشمیری مسلمانوں پر ڈھائے، لداخ کے بیشتر مسلمان اس سے محفوظ رہے۔ ویسے بھی وہ بہت غریب تھے۔ مویشی پالنا اُن کا واحد پیشہ تھا جو انھیں زندہ رہنے میں بھی مدد دیتا۔ صرف نامگیال شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کچھ خوشحال تھے جنھیں ڈوگرا حکمرانوں نے بطورِ باج گزار مراعات دے رکھی تھیں۔ یہ تھی صورتِ حال جب 1947ء میں ہندو ڈوگرا حکمران نے زبردستی ریاست جموں و کشمیر کو بھارت کا حصہ بنا دیا۔ حالانکہ تب لداخ سمیت وادیٔ

کشمیر اور گلگت بلتستان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ بس جموں کے بعض علاقوں میں ہندو اکثریت رکھتے تھے۔ اہلِ کشمیر نے افواجِ پاکستان کی مدد سے گلگت و بلتستان اور وادیٔ کشمیر کا کچھ حصہ آزاد کروا لیا، مگر جموں، وادیٔ کشمیر کا بیشتر علاقہ اور لداخ بھارت ہی کے قبضے میں رہے۔

1949ء میں ماؤزے تنگ کی زیرِ قیادت کمیونسٹ چین میں برسرِ اقتدار آ گئے۔ بھارتی وزیرِاعظم پنڈت نہرو سوشلسٹ تھے، اِس لیے اُنھوں نے اپریل 1950ء سے چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ بھارت، چین سے تعلق بنانے والا ایشیا کا پہلا غیر کمیونسٹ ملک تھا۔ اوائل میں دونوں ملکوں کے مابین تعلقات خوش گوار رہے۔ اُس زمانے میں ''ہند چینی بھائی بھائی'' کا نعرہ زبان زدِ عام تھا۔

1950ء میں چین نے تبت کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ جلد ہی سنکیانگ بھی اس کا حصہ بن گیا۔ ان دونوں وسیع و عریض علاقوں میں مگر شورش رہی۔ تبت میں تبتی قوم پرست چینی حکومت سے ناخوش تھے۔ سنکیانگ میں ایغور مسلمان زیادہ آزادی و خودمختاری چاہتے تھے۔ ان دونوں شورش زدہ علاقوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی خاطر حکومتِ چین نے 1956ء میں لداخ کے علاقے اکسائی چن میں ایک سڑک تعمیر کر لی۔ بھارتی حکومت کو اس تعمیر کا فوری علم نہیں ہو سکا۔

سی آئی اے کا خفیہ کیمپ

اِس دوران پنڈت نہرو خفیہ طور پر چینی کمیونسٹ حکومت کی مخالفت کرنے والے امریکی حکمران طبقے کے مددگار بن گئے۔ اُنھوں نے 1956ء میں سی آئی اے کو بھارتی سرزمین پر ایک خفیہ تربیتی کیمپ کھولنے کی اجازت دے دی۔ اس کیمپ میں تبتی نوجوانوں کو عسکری تربیت دے کر تبت بھیجا جانے لگا تاکہ وہاں وہ چینی فوج سے لڑ سکیں۔ چینی حکومت کو اس کیمپ کی موجودگی کا علم 1958ء میں ہوا۔ چین نے نہرو حکومت سے سخت احتجاج کیا، مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

اتفاق سے 1958ء ہی میں بھارتی حکمران طبقے پر افشا ہوا کہ چینی اکسائی چن میں ایک شاہراہ تعمیر کر چکے۔ اب بھارتی حکومت نے چین سے سخت احتجاج کرتے ہوئے دریافت کیا کہ بھارتی سرزمین پر کیونکر شاہراہ تعمیر کر لی گئی؟ تبھی چینی حکومت نے جواب دیا کہ وہ لداخ کو چین کا حصہ تصور کرتی ہے۔ اس جواب نے پنڈورا کا پٹارا کھول ڈالا اور دونوں ممالک کے سرحدی تنازعات ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

دلائی لاما کی بغاوت

مارچ 1959ء میں ایک انقلابی تبدیلی نے جنم لیا۔ تبت کا روحانی رہنما دلائی لاما فرار ہو کر بھارتی شہر، دھرم شالہ آ پہنچا۔ بھارتی حکومت نے چینی حکومت کے باغی کو نہ صرف پناہ دی، بلکہ اُسے ہر ممکن مدد دینے کا یقین بھی دلایا۔ چنانچہ دلائی لاما نے اپنی جلاوطن حکومت قائم کر لی۔

نہرو حکومت کے اقدامات سے چینی حکومت کو یقین ہو گیا کہ تبتی بغاوت میں بھارت بھی ملوث ہے۔ اس حقیقت نے چینی رہنماؤں کو چراغ پا کر دیا۔ ماؤزے تنگ نے بذاتِ خود اپنی ایسی تحریریں اخبارات میں شائع کرائیں جن میں پنڈت نہرو اور بھارت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم چین کھلم کھلا اپنے پڑوسی سے آویزش نہیں چاہتا تھا۔ چینی رہنماؤں کی اب بھی یہی تمنا تھی کہ بھارت اور چین مل کر ترقی و خوش حالی کی راہ پر گامزن ہوں۔

یہی وجہ ہے اپریل 1960ء میں چینی وزیرِاعظم چواین لائی ایک پلان لیے دہلی آ پہنچے۔ تب تک چینی حکومت یہ دعویٰ کر چکی تھی کہ بھارتی ریاست، اروناچل پردیش کا بیشتر حصہ تبت (یعنی چین) میں شامل ہے۔ اِس لیے اس نے بھارتی حکومت سے واپسی کا تقاضا کیا، مگر پنڈت نہرو نے انکار کر دیا۔ اب چواین لائی یہ پلان کر آئے کہ اکسائی چن، چین کے حوالے کر دیا جائے جبکہ اروناچل پردیش کو بھارت اپنا حصہ بنا لے۔

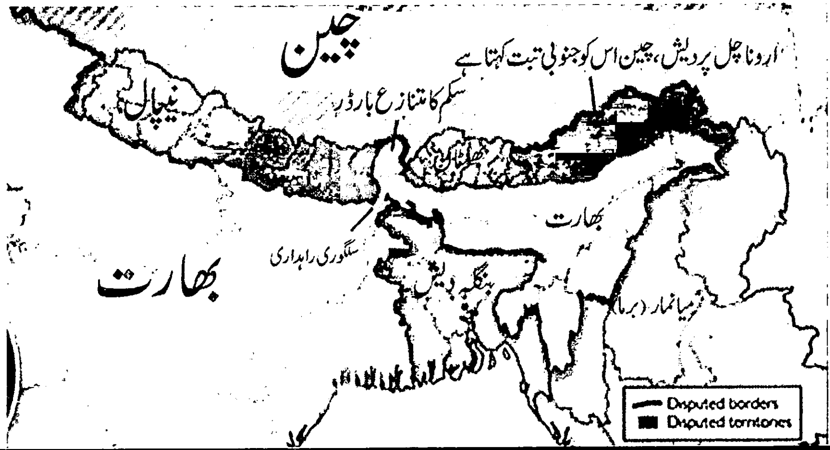

تنازع اروناچل پردیش کی تصویری کہانی

یہ عیاں ہے کہ یہ پلان پیش کر کے چینی قیادت نے بڑے پن اور کھلے دل کا مظاہرہ کیا۔ اکسائی چن ایک بنجر اور غیر آباد علاقہ ہے۔ جغرافیائی اہمیت کے علاوہ وہ کوئی اور خوبی نہیں رکھتا۔ جبکہ اروناچل پردیش قدرتی وسائل سے مالامال علاقہ ہے۔ چینی رہنما اُسے بھارت کے حوالے کرنے کو تیار تھے تاکہ سرحدی تنازعات کی آگ نہ بھڑک سکے۔

بھارت کے لیے یہ چین سے دوستی کرنے کا نادر موقع تھا، مگر اسے پنڈت نہرو نے ضائع کر دیا۔ بھارتی مورخین لکھتے ہیں کہ پنڈت جی کو خوف تھا، اگر انہوں نے اکسائی چن، چین کو دے ڈالا، تو بھارتی عوام ناراض ہو جائیں گے۔ ان کی سیاسی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اپنا سیاسی کیریئر بچانے اور عوامی غم و غصے سے بچنے کے لیے بھارتی وزیراعظم نے چین کی پیشکش مسترد کر دی۔ یوں چواین لائی بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے۔

چین اور بھارت کی سرحد چار ہزار کلومیٹر سے زیادہ طویل ہے۔ بھارت میں یہ لداخ، اترکھنڈ، ہماچل پردیش، سکم اور اروناچل پردیش تک پھیلی ہوئی ہے۔ چین کی طرف سے پوری سرحد کے ساتھ تبت کا خودمختار علاقہ لگتا ہے۔ اس سرحد پر کئی تنازعات نے جنم لے لیا جن میں اروناچل پردیش اور لداخ کے تنازعات بہ لحاظ رقبہ سب سے بڑے تھے۔

چین بھارت جنگ

1960ء کے وسط سے بھارتی فوج کے دستے سرحدی مقامات پر گشت کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر چینی فوج نے بھی گشت بڑھا دیا۔ اگلے دو سال پھر مختلف مقامات پر دونوں افواج کی جھڑپیں ہوئیں۔ چینی قیادت بھارتی حکومت کی چانکیائی چالوں سے اُکتا چکی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ منہ پر رام رام کہنے والے بھارتی حکمران بغل میں چھری رکھتے ہیں۔ وہ موقع پاتے ہی وار کر دیں گے۔

یہی وجہ ہے 20 اکتوبر 1962ء کو چین نے دو مقامات سے بھارت پر حملہ کر دیا۔ پہلا حملہ لداخ پر کیا گیا اور دُوسرا اُروناچل پردیش پر جو اُس زمانے میں نارتھ ایسٹ فرنٹیئر ایجنسی کہلاتا تھا۔ بھارتی فوج حملہ روک نہ سکی اور کئی مقامات پر پسپا ہو گئی۔ ایک ماہی جنگ کے دوران چینی فوج نے دونوں جگہوں پر قبضہ کر لیا جو چینی حکومت کی نگاہ میں چین کا

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

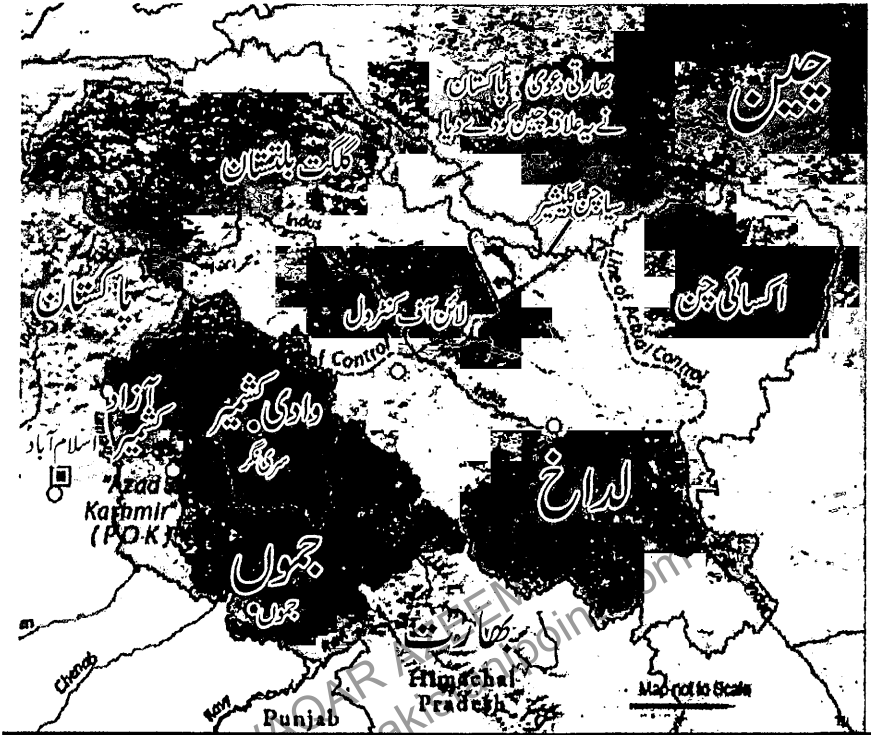

دنیا کا ایک حساس ترین علاقہ

حصہ تھے۔ اس قبضے کے بعد لداخ میں جنم لینے والی بھارت۔ چین سرحد کو چینی وزیرِاعظم چواین لائی نے ''لائن آف ایکچوئل کنٹرول'' کا نام دیا۔

21 نومبر 1962ء کو جنگ بندی کے بعد چین نے اروناچل پردیش میں قبضہ کیا گیا سارا علاقہ خالی کر دیا ہے۔ جبکہ چینی فوج لائن آف ایکچوئل کنٹرول سے بھی بیس کلومیٹر پیچھے ہٹ گئی۔ بیس کلومیٹر کا یہ علاقہ ''نو مین لینڈ'' کہلایا۔ دونوں ممالک نے معاہدہ کیا کہ اس علاقے میں کسی قسم کی تعمیراتی سرگرمی انجام نہیں پائے گی۔ تاہم اس جنگ میں چین لداخ کے علاقے اکسائی چن کو اپنی مملکت میں شامل کرنے میں کامیاب رہا۔ جھگڑا بھی اسی علاقے کے باعث شروع ہوا تھا۔

اکسائی چن 37 ہزار مربع کلومیٹر سے زائد علاقے پر پھیلا ہے۔ بیشتر حصہ بنجر اور پہاڑی ہے۔ موسمِ گرما میں تھوڑے سے حصے پر بارشیں ہوتی ہیں۔ بعض مقامات پر نمکین پانی کی جھیلیں ہیں۔ کبھی کبھی کوئی چینی کمپنی وہاں سے نمک نکال کر لے جاتی ہے۔ نیز اکسائی چن سے گزرتی شاہراہ پر بعض جگہ ہوٹل بنے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکسائی چن میں ایک بھی انسانی بستی آباد نہیں۔

چین سے شکست نے بھارتی قوم میں غیظ و غضب کی لہر دوڑا دی۔ اُنہوں نے نہرو حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

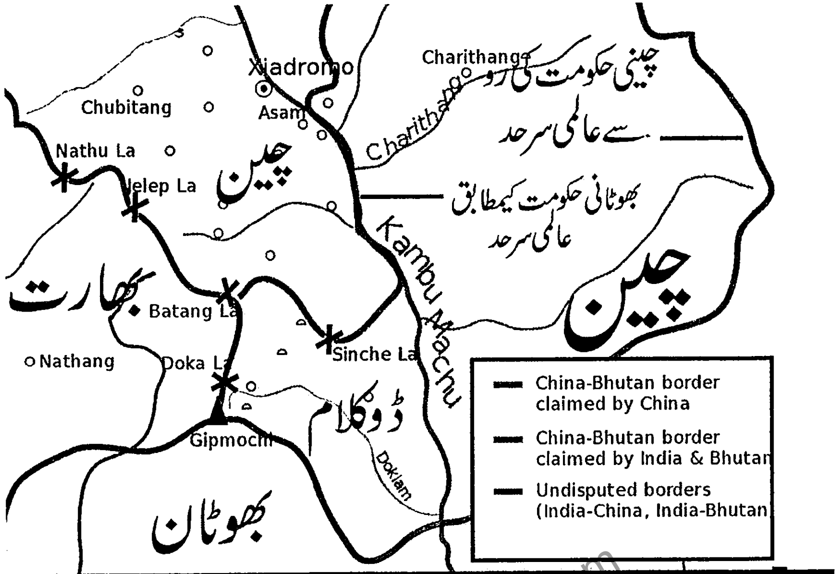

ڈوکلام کا جغرافیائی نقشہ

پنڈت نہرو بھی ہار کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے اور جلد چل بسے۔ آنے والی بھارتی حکومتوں نے سرحدی تنازعات ختم کرنے کے لیے چین سے مذاکرات کیے، مگر وہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئے۔

تعلقات میں بہتری

اکیسویں صدی شروع ہونے کے بعد چین اور بھارت کے مابین تجارت بڑھنے لگی۔ چین 1979ء سے اس پالیسی پر کاربند ہو گیا کہ کسی مملکت سے جھگڑا نہیں کرنا، بلکہ معیشت سدھارنے پر دھیان دینا ہے۔ اس لیے چینی حکومت نے بھارت کے ساتھ سرحدی تنازعات اچھالنے سے پرہیز کیا۔

گو بیسویں صدی میں وقفے وقفے سے سرحدی جھڑپیں ہوتی رہی تھیں۔ اسی دوران چین اور پاکستان کے درمیان گہری دوستی نے جنم لیا جس سے بھارتی حکمران طبقہ پیچ و تاب کھاتا رہا، تاہم دونوں ممالک کی بڑھتی قربت روک نہیں سکا۔

2003ء میں بھارت نے تبت کو چین کا علاقہ تسلیم کر لیا۔ اس سے دونوں ممالک کو غلط فہمیاں کم کرنے میں مدد ملی۔ سردمہری ماند پڑ گئی اور تعلقات بڑھنے لگے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں ممالک کے سرحدی متنازع علاقے بلندی پر واقع ہیں جہاں عموماً شدید ٹھنڈ ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں مستقل طور پر فوج تعینات رکھنا مہنگا عمل ہے۔ اس بندوبست پر کثیر سرمایہ خرچ ہوتا ہے۔ اسی لیے دونوں ملک متنازع علاقوں میں چوکیاں بنانے سے گریز کرتے رہے۔

1975ء میں اروناچل پردیش کے محاذ پر چینی اور بھارتی فوجیوں کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اس میں چار بھارتی فوجی مارے گئے۔ بعدازاں دونوں ممالک کے مابین طے پایا کہ سرحدی متنازع علاقوں میں کوئی فریق گولی نہیں چلائے گا۔ اس معاہدے سے بھی کشیدگی میں کمی آئی اور پٹرول پارٹیاں بغیر اسلحے کے سرحد پر گشت کرنے لگیں۔

WAQAR AZE
www.pakistanipoi

چین کی پسپائی

چین اور بھارت کے مابین اگلا سنگین تصادم جون 2017ء میں انجام پایا۔ ڈوکلام نوے مربع کلومیٹر علاقہ ہے جہاں چین، بھارت اور بھوٹان کی سرحدوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ یہ بھارت کی سلگوری راہداری کے عین اوپر واقع ہے۔ چین کا دعویٰ ہے کہ ڈوکلام اس کا حصہ ہے، تاہم بھوٹان اِس دعویٰ سے اختلاف رکھتا ہے۔

جنگ 1962ء کا ایک منظر

جون 2017ء میں چین ڈوکلام میں ایک سڑک تعمیر کرنے لگا۔ بھوٹانی حکومت نے تعمیر پر اعتراض کیا۔ بھارتی حکومت نے یہ آڑ لے کر کہ اس کا بھوٹان سے جنگی معاہدہ ہے، ڈوکلام میں اپنی فوج داخل کر دی۔ یوں بھارت نے بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی کر دی جو ایک سنگین معاملہ تھا۔ اب تقریباً نصف صدی بعد دونوں ممالک کی افواج آمنے سامنے آ گئیں۔

چین مگر جنگجوئی کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کچھ لیت و لعل سے کام لیتے ہوئے سڑک کی تعمیر روک دی حالانکہ وہ اپنے ہی علاقے میں روڈ بنا رہا تھا۔ سڑک کی تعمیر کا پورا حق رکھتے ہوئے بھی چینی حکومت نے محاذ آرائی سے گریز کیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چین، بھارت سے تجارتی تعلقات میں بگاڑ نہیں چاہتا تھا۔ ان کی باہمی تجارت ایک سو ارب ڈالر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس ہندسے کی وسعت کا اندازہ یوں لگایئے کہ پاکستان کا حالیہ قومی بجٹ تقریباً پینتالیس ارب ڈالر کا تھا۔

واضح رہے، سلگوری راہداری 1947ء میں انگریزوں نے مشرقی پاکستان کی تشکیل کے وقت بنائی تھی تاکہ بھارت کا اپنی آٹھ شمال مشرقی ریاستوں سے جغرافیائی رشتہ استوار رہے۔ یہ راہداری اکثر مقامات پر صرف چودہ میل چوڑی ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو خوف ہے کہ چین نے اگر ڈوکلام میں فوجی مستقر بنا لیا، تو چند دُور مار توپیں ہی بھارت کو شمال مشرقی ریاستوں سے کاٹ دیں گی۔

چینی پالیسی میں تبدیلی

چین نے پسپائی تو اختیار کر لی، مگر وہ بھارتی فوج کا حملہ بھول نہیں پایا۔ اسی لیے بتدریج چین نے بھارتی حکومت سے دوری اختیار کر لی۔ اس نئی تبدیلی سے پاکستان کو فائدہ پہنچا کیونکہ چین دوبارہ عالمی سطح پر پاکستانی حکومت و قوم کی حمایت کرنے لگا۔ اس امر کا عملی مظاہرہ 2018ء میں سامنے آیا جب بھارت بھرپور کوشش کرنے لگا کہ وہ پاکستان کو ایف اے ٹی ایف سے بلیک لسٹ کروا دے۔ یوں مودی سرکار پاکستان کو معاشی نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔

چین مگر بھارت کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے کئی اجلاس کے مواقع پر پاکستان کو بلیک لسٹ ہونے سے بچا لیا۔ یوں پاکستان بڑے معاشی بحران میں گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ اِس اثنا میں مودی سرکار نے ایک اور فاش غلطی کر ڈالی۔ وہ یہ کہ اس نے بھارتی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز اور ظالمانہ مہم شروع کر دی۔ پہلے آسام میں لاکھوں مسلمانوں کو غیر قانونی قرار دیا، پھر بھارت بھر میں یہ عمل انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لاکھوں بھارتی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مسلمانوں کو غیر قانونی بنا کر انھیں بنگلہ دیش یا پاکستان کی طرف دھکیلا جا سکے۔

بھارتی مسلمانوں کے خلاف ظالمانہ پالیسیوں کا آخرکار پوری دنیا میں چرچا ہونے لگا۔ اِس ظلم پر ایران، ترکی، ملائیشیا، انڈونیشیا اور متحدہ عرب امارات نے مودی سرکار کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اقوامِ متحدہ، او آئی سی حتیٰ کہ امریکا سے انسانی حقوق کے اداروں نے بھی بھارتی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یوں دنیا بھر کے سامنے انتہاپسندانہ اور نفرت کی سیاست کرنے والی مودی سرکار کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا۔

بھارتی چوکڑی کی ناکامی

اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت سے ظالم بھارتی حکومت عالمی سطح پر دباؤ میں آ گئی جبکہ مودی سرکار پاکستان کے خلاف جو سازشیں کر رہی تھی، وہ خاصی حد تک دم توڑ گئیں۔ مودی، امیت شاہ، اجیت دوال اور جنرل بپن روات کی چوکڑی پاکستان اور بھارتی مسلمانوں کا زوال چاہتی تھی، مگر قدرتِ الٰہی نے چاروں کو اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

چین اور بھارت کے تعلقات میں سردمہری بڑھ رہی تھی کہ نومبر 2019ء میں مودی سرکار نے ایک اور بم پھوڑ دیا۔ تب ریاست جموں و کشمیر کے حصّے بخرے کرنے کے بعد بھارتی نائب وزیرِاعظم سمجھے جانے والے امیت شاہ نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم چین سے اکسائی چن واپس لیں گے۔

یہ کوئی معمولی بیان نہ تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا نائب وزیرِاعظم اپنے اعلیٰ ترین سول ادارے میں کھڑے ہو کر چین کے خلاف باتیں کر رہا تھا۔ یوں گویا چینی حکومت کو چنوتی دی گئی کہ بھارت چاہے، تو وہ اکسائی چن پر قبضہ کر سکتا تھا۔

چین میں بعض دانش وروں نے اسے بھارت کی کھلی دھمکی قرار دیا۔ چینی میڈیا نے اس معاملے پر بھارت مخالف مضامین شائع کیے، تاہم چینی حکومت نے فوراً کوئی ردِعمل نہیں دکھایا۔ البتہ ریاست جموں و کشمیر کا تیاپانچہ کرنے پر چین پاکستان کے ساتھ مل کر اس ناروا بھارتی اقدام کے خلاف بہت متحرک ہو گیا۔ چینی حکومت کی کوششوں کے باعث ہی کئی عشروں بعد مسئلۂ کشمیر پر اقوامِ متحدہ میں اجلاس ہوا۔ نیز کئی برس بعد چین نے اِس مسئلے پر کھل کر پاکستانی موقف کی حمایت کی۔

لاک ڈاؤن کی چال

وادیٔ کشمیر میں احتجاج روکنے کے لیے مودی سرکار نے سخت لاک ڈاؤن لگا دیا تھا، مگر اُسے خبر نہ تھی کہ عنقریب پورا بھارت سخت بندشوں کا نشانہ بننے والا ہے۔ اگرچہ یہ بندشیں بھارتی حکومت نے دانستہ ہی لگائیں تاکہ چین کو بدنام کیا جا سکے۔

اِس امر کی تفصیل یہ ہے کہ دسمبر 2019ء سے چین میں نیا کورونا وائرس ظاہر ہو گیا۔ اِس وائرس کا آغاز تاحال نہایت پُراسرار معاملہ ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ امریکی لیبارٹری کی تخلیق ہے جو چین لا کر پھیلا دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ چینی معیشت کی زبردست ترقی روکی جا سکے۔ دیگر ماہرین کہتے ہیں کہ یہ کسی چینی لیبارٹری سے فرار ہو کر عوام میں پہنچ گیا۔ بہرحال اس کے بطن سے چین میں وبا پھوٹ پڑی۔

حیرت انگیز بات یہ کہ 24 مارچ 2020ء تک بھارت میں کورونا کی وبا میں مبتلا گنے چُنے ہی مریض تھے، مگر اس روز مودی سرکار نے پورے ملک میں نہایت سخت لاک ڈاؤن لگا دیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ اقدام امریکا و برطانیہ کے دباؤ کی وجہ سے کیا گیا۔ اِن ملکوں نے دراصل کورونا وائرس کی آڑ میں چین کو بدنام کرنے کی مہم چلا رکھی تھی۔ اب مودی جنتا بھی اس نفرت انگیز اور مکروہ مہم میں مغربی استعمار کی ساتھی بن گئی۔

وبا پھیلتے ہی امریکی صدر ٹرمپ کورونا کو ’’چینی وائرس‘‘

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

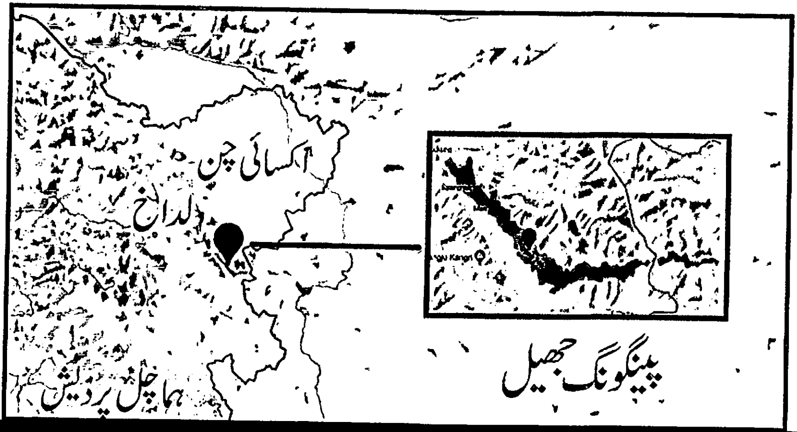

پینگونگ جھیل

کہنے لگے۔ امریکا اور یورپ میں اخبارات نے چین کے خلاف تضحیک آمیز کارٹون شائع کیے۔ اِس پروپیگنڈے کی وجہ سے مغرب میں چینی قوم کے خلاف نفرت بڑھ گئی۔ فطری طور پر چینی حکومت کو اِس پروپیگنڈے سے تکلیف پہنچی۔ یہی وجہ ہے، وزارتِ خارجہ چین کے افسروں نے سوشل میڈیا میں مغربی استعمار کی مہم کو آڑے ہاتھوں لیا اور اُسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ماہرین کا کہنا ہے، پچھلے چالیس برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ چینی حکومت نے اپنے معاصرین پر اتنی سخت نکتہ چینی کی۔

تابوت میں آخری کیل

مغربی استعمار کی چین مخالف مہم میں بھارت کی شمولیت گویا دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوئی۔ اب چینی حکمران طبقے نے مغرور و متکبر مودی سرکار کو آئینہ دکھانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ وہ خود ہی نہیں، دنیا والے بھی بھارتی حکمرانوں کی اصلیت دیکھ سکیں۔

امیت شاہ نے اکسائی چن لینے کی دھمکی دی تھی، اِس لیے ماہِ اپریل میں چینی فوج نے لداخ کے دو اہم ترین مقامات..... وادیٔ گلوان اور پینگونگ جھیل میں پیش قدمی کی اور عین سرحد پر اپنے خیمے گاڑ لیے۔ چینی فوج جنگ 1962ء میں اسی سرحد سے پیچھے پلٹی تھی۔ چینی کمانڈروں نے پھر دریائے شیوک پر نئے پُل کی تعمیر پر اعتراض کر دیا۔ بھارتی بین الاقوامی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اُسے تعمیر کر رہے تھے۔ بھارتی فوج نے چینی کمانڈروں کا احتجاج ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا اور پُل پر کام بھی جاری رکھا۔

بھارتی فوج کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھ کر چینی مزید تاؤ کھا گئے۔ اُنھوں نے مئی کے پہلے ہفتے میں پینگونگ جھیل کے ایک حصّے پر قبضہ کرلیا۔ واضح رہے اس جھیل کا 70فی صد حصّہ چین کے قبضے میں ہے۔ بقیہ پر بھارتی فوج کا قبضہ ہے۔ چینی فوج پینگونگ جھیل کا مزید رقبہ اپنے قبضے میں لے کر یقیناً بھارتی سورماؤں کو چیلنج کرنا چاہتی تھی کہ ہمت ہے تو آؤ، یہ علاقہ ہم سے چھین کر دکھاؤ۔

جلد ہی لداخ میں دونوں افواج کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں۔ اِن جھڑپوں میں گھونسوں اور لاتوں کا آزادانہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استعمال ہوا۔ یہ طریقِ جنگ دیکھ کر کوئی حیرت زدہ ہوا، تو کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آج کل خلائی سیاروں سے لیزر گن چلانے کے تجربات جاری ہیں۔ اور اِدھر دنیا کی دو بڑی عسکری قوتوں کے فوجی ایسے طریق سے جنگ لڑ رہے تھے جو کبھی کا فرسودہ ہو چکا۔

متحارب افواج کے کمانڈروں نے مشتعل جذبات ٹھنڈے کرنے کی خاطر باہمی اجلاس کیے، مگر لگتا ہے کہ بات بن نہیں سکی۔ یہی وجہ ہے، 16 جون کی شب چشمِ فلک نے وادیٔ گلوان میں عجیب منظر دیکھا۔ تب چینی فوجیوں نے ڈنڈوں، سریوں، گھونسوں اور لاتوں کے ذریعے بیس سے زائد بھارتی فوجی مار ڈالے جبکہ بیسیوں زخمی ہوئے۔ چینی فوجی مرنے اور زخمی ہونے کی بھی اطلاعات ہیں۔ اِس دوران ایک بھی گولی نہیں چلائی گئی۔

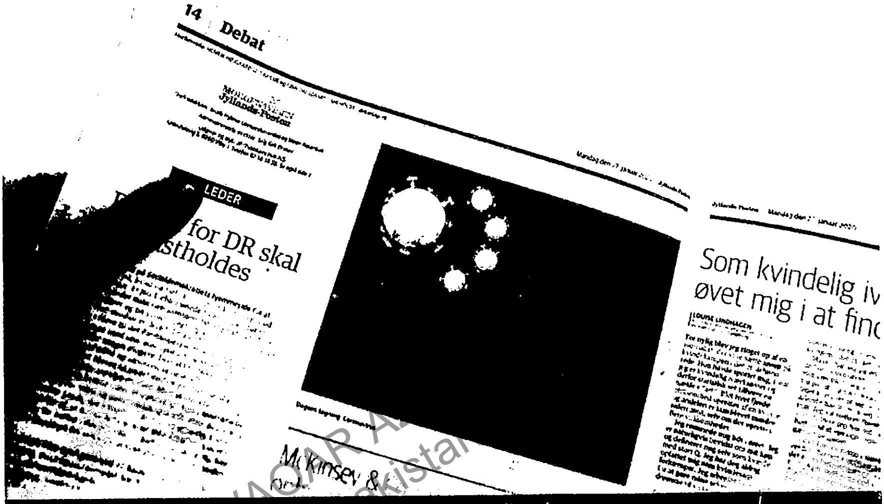

چین کی تضحیک کرنے والا کارٹون

مکافاتِ عمل

یہ خبر پڑھ کر مجھے دسمبر 2014ء میں دیکھی گئی ایک ویڈیو یاد آ گئی۔ تب بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کو اقتدار سنبھالے پانچ ماہ بیت چکے تھے۔ ویڈیو میں کچھ انتہا پسند ہندو گھونسوں، لاتوں، ہاکیوں اور ڈنڈوں سے ایک مسلمان نوجوان کو نہایت بے رحمی سے پیٹ رہے تھے۔ یہ منظر اِتنا خوفناک تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مسلم نوجوان درد کی شدت سے بے تاب ہو کر چلّا رہا تھا، مگر ظالموں کو رحم نہ آیا۔ آخر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ایک انتہا پسند بار بار کہہ رہا تھا: ''ارے مسلّو! اب تم نہیں بچو گے۔ ہماری حکومت آ گئی ہے۔''

اِس کے بعد چشمِ فلک نے دیکھا کہ مسلمانانِ بھارت پر ظلم و تشدد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بھارت میں پچھلے ڈیڑھ سو برس سے مسلمان اکثریت کے زیرِ عتاب ہیں۔ سینکڑوں مسلم

کش فسادات میں ہندوؤں نے طاقت کے نشے میں بڑی شقاوتِ قلبی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ لیکن مودی سرکار آنے کے بعد مسلمانانِ بھارت جس قسم کے مسائل و مصائب کا شکار ہوئے، اُن کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔ مودی جنتا نے کشمیر سے لے کر دہلی اور کلکتہ تک کے مسلمانوں کو لہو میں نہلا دیا اور ان پر ظلم کی انتہا کر دی۔

جب میں نے بھارتی فوجیوں کی کٹی پھٹی لاشوں پر

فوجیوں کے ہاتھوں بھارتی سینا کی ایسی زبردست مرمت کرائی کہ بھارتی حکمران طبقہ اپنی ذلت تادیر یاد رکھے گا۔ چینیوں نے اُن کے گھر میں گھس کر اُنھیں مارا اور چوہوں کی طرح بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

چین کی جیت

بھارتی جرنیل اور سیاست دان اپنی خفت و ذلت مٹانے کی خاطر پروپیگنڈا کرنے لگے کہ وادی گلوان میں 43 چینی

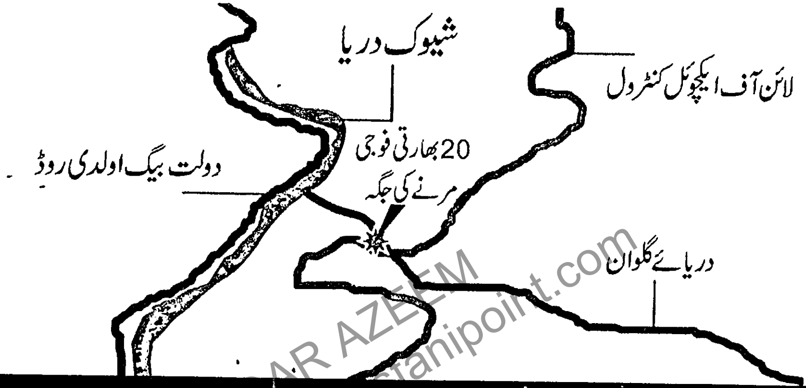

جہاں بھارت چین ٹکرا ہوا

www.pakistanipoint.com

ہندوؤں کو بین کرتے دیکھا، تو مجھے بیسیوں ویڈیوز میں ہاتھ جوڑ کر، آنکھوں میں پانی لیے، رحم کی اپیل کرتے مجبور و مقہور بھارتی مسلمان یاد آ گئے۔ تب احساس ہوا کہ آخر اُن کی آہیں اور سسکیاں رنگ لے آئیں۔ بارگاہِ الٰہی میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہاں فریاد ضرور سنی جاتی ہے۔ اور پھر مکافاتِ عمل کا پہیہ چل پڑتا ہے۔ کرنی کا پھل ظالم کو مل کر رہتا ہے۔

مودی سرکار نے جموں و کشمیر پر قبضہ کر کے پونے ایک کروڑ مسلمانوں کو دیوہیکل جیل خانے میں قید کر دیا۔ تبھی قدرتِ الٰہی کو جوش آیا اور اُس نے بھارت تو کیا سبھی دنیا والوں پر لاک ڈاؤن کی زحمت نازل کر دی۔ مغرور و متکبر مودی نے تب بھی عبرت نہ پکڑی، تو رب تعالیٰ نے چینی

فوجی بھی مارے گئے۔ مگر سوشل میڈیا کے اِس دور میں جھوٹ چھپانا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ بہرحال بھارتی ٹی وی اینکروں نے بھی بھرپور کوشش کی کہ مودی سرکار کے خلاف عوام کا غم و غصہ کم سے کم کیا جا سکے۔ عام بھارتی بے جا لاک ڈاؤن کی وجہ سے پہلے ہی اپنی حکومت سے کافی تنگ تھے۔ چینی فوج کے ہاتھوں ہزیمت نے انھیں مودی سرکار کے خلاف مزید بھڑکا دیا۔ یوں حکومت کے لیے پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

چین اب پوری وادیٔ گلوان پر مکمل قبضہ کر چکا۔ وہ وہاں مستقل فوج رکھنے کے لیے تعمیرات بنوا رہا ہے۔ چینی فوج دربوک۔ شیوک دولت بیگ اولدی روڈ کے عین سامنے پہاڑوں پر بھی براجمان ہے۔ بلندی پر ہونے کے باعث وہ

اس سڑک کو بے اثر بنا چکی۔ اسی طرح خود بھارتی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ پینگونگ جھیل کا مزید 60 مربع کلومیٹر رقبہ اب چین کے قبضے میں ہے۔ گویا دو ماہی جھڑپوں میں چینی فوج کا پلّہ بھاری رہا اور وہ بھارتی نیتاؤں کو خاک چٹانے میں کامیاب رہی۔ اِس دوران پارلیمنٹ میں بلند آہنگ دعویٰ کرنے والے امیت شاہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور اس کی ساری اکڑ ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اِس سورما کا زور صرف نہتے و بے کس بھارتی مسلمانوں پر ہی چلتا ہے۔ چین سے شکست نے مودی سرکار کے دعویٰ کا پول کھول دیا۔ مودی فخر سے کہتا تھا کہ بھارتی افواج سپر پاور بن رہی ہیں مگر چینی فوج نے ایک گولی چلائے بغیر کئی بھارتی فوجی مار ڈالے۔ اس واقعے سے بھارتی افواج کے مورال پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

چینی مصنوعات کا بائیکاٹ

بھارت اور چین کے مابین جنگ شاید نہ ہو سکے، لیکن صورتحال کافی گمبھیر ہے۔ چین نے تبت میں جدید ترین توپیں، ٹینک اور لڑاکا طیارہ پہنچا دیے ہیں۔ اضافی نفری بھی تعینات کر دی۔ مارشل آرٹس کے ماہر فوجیوں کو تربیت دینے کے لیے بلا لیا۔ اسی طرح بھارت نے بھی لداخ میں مزید فوج بلوا لی۔ وہاں میزائل شکن نظام نصب کر دیا۔ فوجیوں کو گولی چلانے کا اختیار مل گیا۔ غرض سرحد پر 15 جون جیسا ایک اور واقعہ رونما ہوا تو دونوں ممالک جنگ کے الاؤ میں کود سکتے ہیں۔

حالیہ جھڑپوں سے ان کے باہمی تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔ اب جب تک مودی سرکار کی حکومت ہے، دونوں ممالک کے مابین تعلقات خوش گوار نہیں ہو سکتے۔ اُدھر بھارت میں چینی اشیا کی بائیکاٹ مہم کا آغاز ہو چکا۔ ریاستی حکومتیں چینی کمپنیوں کے ساتھ کروڑوں ڈالر مالیت کے معاہدے ختم کر رہی ہیں۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ وہ چین سے مال نہیں منگوائیں گے۔ لیکن ماہرینِ معاشیات نے بھارتی حکومت کو خبردار کیا ہے کہ وہ چین سے تجارت میں قدغنیں نہ لگائے۔

دراصل لاک ڈاؤن نے بھارتی معیشت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اگر بھارت نے سستی چینی اشیا کے بجائے مغربی ممالک سے مہنگا مال خریدنے کا منصوبہ بنایا، تو مملکت کا درآمدی بل کئی ارب ڈالر بڑھ جائے گا۔ اور موجودہ حالات میں بھارتی معیشت یہ مالی بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اطلاع ہے کہ بھارتی حکومت نے سرکاری و نجی کمپنیوں کو چینی کمپنی، ہوواِئے کی 5 جی ٹیکنالوجی والی مصنوعات خریدنے سے روک دیا۔ نیز بندرگاہوں پر چینی سامان کلیئر نہیں کیا جا رہا۔

چین و بھارت کی حالیہ جھڑپیں خطے کے حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔ قبل ازیں بیان ہو چکا کہ 1980ء سے لے کر 2015ء تک چین نے مفاہمتی بلکہ نہایت دھیمی خارجہ پالیسی اختیار کیے رکھی۔ مدعا یہ تھا کہ اپنے معاشی اہداف حاصل کیے جا سکیں، مگر 2015ء سے چینی حکومت مسلسل اپنا دفاع مضبوط بناتے ہوئے اربوں ڈالر مالیت کے ہتھیاروں سے اپنی فوج لیس کر رہی ہے۔ گویا چین اب مفاہمتی پالیسی ترک کر کے عالمی سطح پر اپنی تزویراتی و جغرافیائی اہمیت بھی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ چین کے حکمران متمنی ہیں کہ اب ان کی مملکت کو بطورِ سپر پاور تسلیم کیا جائے۔

اِسی نئی سرکاری حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ چین نے لداخ میں اپنی عسکری طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور بھارتی حکمران طبقے پر آشکارا کر دیا کہ وہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے..... چینی افواج اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ یہی نہیں، اگر بھارتی سینا نے جارحیت دکھائی، تو وہ اس کی زمین پر پہنچ کر بھی اُسے پچھاڑ سکتی ہے۔

مسئلہ کشمیر دفن نہیں ہو سکتا

پاکستان کے نقطۂ نظر سے بھارت و چین جھڑپوں کے ذریعے یہ اہم تبدیلی جنم لے چکی کہ اب چینی حکومت بھی خاصی حد تک مسئلۂ کشمیر میں دخیل ہو رہی ہے۔ وجہ یہی کہ وہ بھی سابقہ ریاست جموں و کشمیر کے ایک حصّے پر حکمران ہے۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ایوب خان اور چیواین لائی۔ پس منظر میں دیوارِ چین

گویا اب بھارتی حکمران طبقہ کبھی مسئلۂ کشمیر کو دفن کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ مسئلہ اُسے ڈراؤنے خواب کی طرح چمٹ جائے گا۔

ماضی میں مفاہمتی پالیسیوں کے باعث چین نے دانستہ مسئلۂ کشمیر پر بات چیت سے بھی پرہیز کیا، لیکن اب وہ ایک معاشی طاقت بن چکا۔ یقیناً بھارت سے تجارت اب بھی چینی حکومت کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ چین کی بھی کوشش ہوگی کہ بھارتی حکمرانوں سے کچھ دو کچھ لو کا معاملہ اختیار کیا جائے، لیکن بھارت نے کسی بھی طرح چین کے قومی مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں، تو حالات بہت گھمبیر ہوسکتے ہیں۔ تب دونوں ملکوں کے مابین خوفناک جنگ چھڑ سکتی ہے۔

وادی گلوان پر قبضے سے چین اب وادیٔ کشمیر کے دروازے پر پہنچ چکا۔ اس کے قریب ہی سیاچن گلیشئر واقع ہے جہاں عرصۂ دراز سے بھارتی اور پاکستانی فوجیں نبرد آزما ہیں۔ اس سے پرے گلگت بلتستان واقع جو چین کے عظیم الشان سی پیک منصوبے کا حصّہ بن چکے۔ گویا ماضی کے برعکس چین اب جموں و کشمیر کی معاشی، سیاسی، جغرافیائی اور معاشرتی جہات کا حصّہ بن چکا۔ وہ اب چاہتے ہوئے بھی مسئلۂ کشمیر

سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔

کشمیر میں حالات بدل چکے

لداخ دو اضلاع، ضلع لیہہ اور ضلع کارگل پر مشتمل ہے۔ ضلع لیہہ میں بدھی آبادی کی کثرت ہے۔ ضلع کارگل کی 90 فی صد آبادی مسلمان ہے۔ لداخ کے بدھوں کی اکثریت چین کا حصّہ بننا چاہتی ہے۔ اسی طرح کارگل کے مسلمان اب پاکستان میں شمولیت چاہتے ہیں یا پھر بھارتی استعمار سے آزادی۔ اب وہ بھارتی انتہاپسندوں کے زیرِ اقتدار رہنے کے خواہش مند نہیں۔ مودی سرکار نے ریاستی مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی انتہا کر کے انہیں اپنا مخالف بنا لیا ہے۔

جنگ 1965ء سے قبل پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں فوجی دستے بھجوا کر ''آپریشن گرینڈ سلام'' شروع کیا تھا۔ تب پاکستانی فوج کو توقع تھی کہ اہلِ کشمیر بھارتی سینا کے خلاف ان کا ساتھ دیں گے، لیکن پاکستانی جرنیلوں کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی۔ وجہ یہی تھی کہ تب بھارتی حکومت حتی الامکان ریاست جموں و کشمیر کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی۔ تب بیشتر معاملات کشمیری مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔ اِسی لیے انھوں نے بھارت کے خلاف بغاوت کرنا موزوں خیال نہیں کیا۔

اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی۔ اِس وقت جموں، وادیٔ کشمیر اور لداخ کی پوری مشینری اور انتظامیہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ یہ پوری مشینری خصوصاً وادیٔ کشمیر میں مسلمانوں کی برتری ختم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کر رہی ہے۔ اِسی لیے سابقہ ریاست کے تمام مسلمانوں میں بھارتی حکمرانوں کے لیے سخت نفرت اور دُشمنی پائی جاتی ہے۔ اگر آج پاک۔ بھارت جنگ ہو جائے، تو خصوصاً وادیٔ کشمیر میں گلی گلی محلے محلے سے پاکستان کے حق میں جلوس نکلیں گے اور بعید نہیں کہ کشمیری نوجوان مسلح بغاوت کر دیں۔ وادی میں اب تحریکِ آزادی کا فروزاں شعلہ بھارتی استعمار سر توڑ کوشش کے باوجود بھی سرد نہیں کر سکتا۔

چین پاکستان سرحدی تنازع

یہ واضح رہے کہ بھارت کے مانند پاکستان کی بھی چین کے ساتھ سرحد معین نہیں تھی۔ انگریزوں نے حد بندی کی تھی مگر وہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی۔ 1962ء کی بھارت۔ چین جنگ کے بعد پاکستانی صدر، ایوب خان کوشش کرنے لگے کہ چین کے ساتھ سرحد کا تعین ہو جائے۔ یوں وہ طاقتور پڑوسی کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے۔ اِس عمل میں نوجوان وزیرِ خارجہ، ذوالفقار علی بھٹو بھی اُن کے شریکِ کار رہے۔

آخر پاکستانی حکومت کو کامیابی ملی اور 2 مارچ 1963ء کو دونوں ممالک کے مابین سرحدی معاہدہ ہو گیا۔ اِس موقع پر بھارتی حکومت نے پروپیگنڈا کیا کہ پاکستان نے بلتستان کا 2,050 مربع میل رقبہ چین کو تحفتاً دے ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ چین نے پاکستان کو 750 مربع کلومیٹر علاقے کا تحفہ دے کر اپنی فراخ دلی کا اظہار کیا۔

پاکستان کے مرحوم وزیرِ خارجہ اور ممتاز سفارت کار، عبدالستار اپنی سوانحِ حیات میں لکھتے ہیں کہ جب سرحد کی حد بندی جاری تھی، تو حکومتِ پاکستان کو علم ہوا کہ ہنزہ کے باشندے اس علاقے میں مویشی چرانے لے جاتے ہیں جو اَب چین میں شامل ہونے والا تھا۔ یہ علاقہ درہ شمشال میں دریائے مزتاغ کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔

حکومتِ پاکستان نے پھر وزیرِ اعظم چو این لائی کو مطلع کیا کہ ہنزہ کے چرواہے اس علاقے میں مویشی چراتے ہیں۔ اگر وہ سرحد پار چلا گیا، تو بیچارے غریب چرواہوں کے لیے اپنے مویشیوں کو چارہ کھلانا بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ تبھی چو این لائی نے دریا دلی کا مظاہر کرتے ہوئے 750 مربع کلومیٹر کا علاقہ پاکستان ہی میں شامل رہنے دیا۔ اس علاقے میں چراہ گاہیں واقع ہیں۔ چینی وزیرِ اعظم کی اِس مہربانی نے اہلِ پاکستان کے دل جیت لیے اور یوں دونوں کے مابین ہمالیہ سے بلند اور بحیرہ عرب سے گہری دوستی کا آغاز ہوا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اس بروقت معاہدے کے بڑے دُوررَس نتائج برآمد ہوئے۔ یوں پاکستان اور چین کے مابین سرحدی تنازع جنم لینے کا امکان ختم ہوگیا۔ یہی نہیں، اہلِ پاکستان کو وسیع و عریض چراہ گاہیں بھی مل گئیں۔ دونوں ممالک نے پھر کئی دوستانہ معاہدے کیے۔ ان میں ہوائی سفر کا معاہدہ بھی شامل ہے۔ چین نے کسی بھی غیر کمیونسٹ مملکت سے اپنی نوعیت کا یہ پہلا معاہدہ کیا تھا۔

ولیم وان ایکیلن (William Van Eekelen) ڈنمارک کے مشہور سیاست دان اور سفارت کار ہیں۔ وہ زمانۂ نوجوانی میں بطورِ سفارت کار دہلی اور لندن میں تعینات رہے۔ اِس دوران انہیں سرکاری و نجی اداروں میں مختلف دستاویز پڑھنے کا موقع ملا۔ اپنی معلومات کی بنا پر 1969ء میں اُنہوں نے ایک کتاب ''انڈین فارن پالیسی اینڈ دی بارڈر ڈسپیوٹ ود چائنا'' (Indian Foreign Policy and The Border Dispute with China) تحریر کی۔ اس میں سرکاری ماخذات کی روشنی میں ولیم وان ایکیلن نے اقرار کیا ہے کہ چین نے سرحدی معاہدہ کرتے ہوئے پاکستان کو 750 مربع کلومیٹر علاقہ دے ڈالا۔

معاشی و عسکری تقابلی جائزہ

اب معیشت اور عسکریات کے اہم شعبوں میں چین اور بھارت کا تقابلی جائزہ ہو جائے۔ بھارت کا نومنل جی ڈی پی 3.202 ٹریلین ڈالر ہے۔ یہ دنیا کا پانچواں بڑا جی ڈی پی ہے۔ لاک ڈاؤن سے قبل معاشی ترقی 4.2 فی صد تھی۔ اب بھارت کی تاریخ میں پہلی بار وہ منفی ہندسوں (منفی 3.2 فی صد) میں آ چکی۔ اس کی فی کس آمدن 2,338 ڈالر ہے۔ بھارت میں کاروبار شروع کرنا آسان (easy) ہے۔

بھارت میں افراطِ زر 6.58 فی صد ہے۔ 6.3 فی صد آبادی نہایت غریب ہے۔ 60 فی صد آبادی روزانہ صرف 3 ڈالر یا اس سے کم کما پاتی ہے۔ بے روزگاری اب دس فی صد سے زائد ہو چکی۔ بھارت سالانہ 330 رارب ڈالر کی اشیا باہر بھجواتا ہے۔ 5 فی صد چین جاتی ہیں۔ 514 رارب ڈالر کا مال باہر سے منگواتا ہے۔ گویا بھارتی تجارت خسارے میں ہے۔ وہ 13.58 فی صد اشیا چین سے درآمد کرتا ہے۔ درآمدات میں عرب لیگ کے بعد چین، بھارت کا دوسرا بڑا ساتھی ہے۔

بھارت قرضوں کے انبار تلے دب رہا ہے۔ اس پر 543 رارب ڈالر کا بیرونی قرضہ ہے۔ جبکہ مجموعی قرضے 2.1 ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکے۔ یہ جی ڈی پی کا 70 فی صد ہیں۔ بھارتی حکومت کو ہر سال 550 رارب ڈالر کی آمدن ہوتی ہے۔ جبکہ اخراجات 730 رارب ڈالر تک پہنچ چکے۔ گویا بھارتی بجٹ بھی خسارے میں ہے۔ بھارت 507 رارب ڈالر کے ذخائرِ زرِ مبادلہ رکھتا ہے۔

چین کا نومنل جی ڈی پی 14 ٹریلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا بڑا جی ڈی پی ہے۔ لاک ڈاؤن سے قبل معاشی ترقی 6.1 فی صد تھی۔ اب 7 فی صد ہے۔ چین دنیا کے اُن گنے چنے ممالک میں شامل ہے جن کی معاشی نمو لاک ڈاؤن کے باعث منفی نہیں ہوئی۔ فی کس آمدن دس ہزار ڈالر ہے۔ چین میں کاروبار شروع کرنا بہت آسان (very easy) ہے۔

افراطِ زر 3 فی صد ہے۔ 1.7 فی صد آبادی غریب کہلاتی ہے۔ بے روزگاری 4.3 فی صد ہے جو اَب بڑھ چکی۔ چین 2.5 ٹریلین ڈالر کی اشیا باہر بھجواتا ہے۔ ان میں سے 3 فی صد بھارت جاتی ہیں۔ درآمدات کی مالیت 2.08 ٹریلین ڈالر ہے۔ گویا چین کی تجارت فائدے میں ہے۔ وہ بھارت سے صرف 4 فی صد مال منگواتا ہے۔

چین کے بیرونی قرضوں کی مالیت 1.598 ٹریلین ڈالر ہے، تاہم جی ڈی پی کے لحاظ سے مجموعی قرضے 47 فی صد ہیں جو معمول کی سطح سمجھی جاتی ہے۔ چینی حکومت کو سالانہ 2.553 ٹریلین ڈالر کی آمدن ہوتی ہے۔ اخراجات 3 ٹریلین ڈالر سے بڑھ چکے۔ گویا چین کا بجٹ بھی خسارے میں جا رہا ہے۔ چین مگر 3.219 ٹریلین ڈالر کے ذخائرِ زرِ مبادلہ رکھتا ہے۔ یہ دنیا

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

میں ڈالروں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

درج بالا معاشی تقابلے سے عیاں ہے کہ بھارتی حکمران پچھلے سات عشروں میں اپنے وطن سے غربت کی لعنت ختم نہیں کر سکے۔ جبکہ چینی حکومت نے غریب آبادی خاصی حد تک کم کر دی۔ یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ چین اب بقیہ غریب علاقوں میں بھی ترقی و خوش حالی کی لہر پہنچانے کے لیے اقدامات کر رہا ہے۔

عسکری شعبے میں چین دنیا کی سب سے بڑی متحرک (ایکٹو) فوج رکھتا ہے۔ سپاہ کی تعداد تقریباً 22 لاکھ ہے۔ بھارتی سپاہ میں ساڑھے چودہ لاکھ فوجی شامل ہیں، تاہم بھارت کی محفوظ فوج (بقول بھارتی حکمرانوں کے) 21 لاکھ ہے۔ چین پانچ لاکھ محفوظ فوج رکھتا ہے۔

چین کی فضائیہ میں 3,210 جنگی جہاز، ہیلی کاپٹر اور دیگر فضائی ہتھیار شامل ہیں۔ ان میں 1,200 لڑاکا طیارے اور 900 سے زائد ہیلی کاپٹر ہیں۔ بھارتی فضائیہ کُل 2,123 ہتھیار رَکھتی ہے۔ ان میں 538 لڑاکا طیارے اور 700 سے زیادہ ہیلی کاپٹر ہیں۔

چین کی برّی فوج نو لاکھ سپاہ رکھتی ہے۔ اس کی دسترس میں 33 ہزار بکتر بند گاڑیاں، 3,500 ٹینک، 3,800 بھارتی توپیں اور 2,650 راکٹ پروجیکٹر ہیں۔ بھارت کی برّی فوج ساڑھے چھ لاکھ فوجیوں پر مشتمل ہے۔ یہ فوج 8,686 بکتر بند گاڑیاں، 4,292 ٹینک، 4,000 بھاری توپیں اور 266 راکٹ پروجیکٹر رکھتی ہے۔

چینی بحریہ کے اہم ہتھیاروں کی تعداد 777 ہے۔ ان میں 2 طیارہ بردار جہاز، 74 آبدوزیں، 36 ڈسٹرائر، 52 فریگیٹ، 50 کورویٹ، 29 بارودی سرنگیں بچھانے والے جہاز اور 220 پٹرول بوٹس شامل ہیں۔ بھارتی بحریہ 285 ہتھیار رَکھتی ہے۔ ان میں ایک طیارہ بردار جہاز، 16 آبدوزیں، 10 ڈسٹرائر، 13 فریگیٹ، 19 کورویٹ، بارودی سرنگیں بچھانے والے 3 جہاز اور 139 پٹرول بوٹس شامل ہیں۔

درج بالا عسکری تقابلے سے عیاں ہے کہ چین جنگ و جدل کے میدان بھی بھارت پر برتری رکھتا ہے۔ خاص بات یہ کہ اس کا جنگی بجٹ تقریباً پونے تین سو ارب ڈالر تک پہنچ چکا۔ چین آج نت نئے جدید ہتھیار بنانے پر اربوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ جبکہ بھارت کا جنگی بجٹ 71 ارب ڈالر ہے۔ مزید برآں بھارت غیر ممالک سے بیشتر اسلحہ خریدنے پر مجبور ہے۔ وجہ یہ کہ بھارتی سائنس دانوں اور انجینئروں کو محض ایک ہتھیار بناتے ہوئے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ وہ ہتھیار مسلسل تجربات سے گزر کر بھی تیار نہیں ہو پاتا۔

قرآن و سنت میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ جنگ سے حتی الوسع پرہیز کریں، مگر دفاع مضبوط تر رکھیں تاکہ دشمن کے حملے پر اُسے بھرپور جواب دیا جا سکے۔ پاکستان بھی اسلامی مملکت ہونے کے ناتے صرف دفاعی جنگ لڑتا ہے۔ بھارتی حکمران طبقہ مسلسل ارضِ پاک کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ بھارت معاشی و عسکری طور پر ہم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، لیکن اہلِ پاکستان بھی بساط سے بڑھ کر اس کا زبردست مقابلہ کر رہے ہیں۔

پڑوسی بھی ناراض

بھارتی حکمران اپنے غرور اُور توسیع پسندانہ عزائم کے سبب دیگر پڑوسیوں کو بھی ناراض کر چکے۔ بنگلہ دیشی وزیر اعظم، بیگم حسینہ واجد بھارت نواز بلکہ اس کی غلام ہے۔ مگر جب مودی سرکار نے آسام میں بنگالی نژاد مسلم شہریوں پر ظلم توڑنے اور بھارتی مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا، تو بنگلہ دیش میں اس کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ اب یہ حال ہے کہ بیگم حسینہ واجد بھی کھل کر مودی سرکار کی حمایت نہیں کر سکتی۔ اُسے خطرہ ہے کہ سیکولر بنگلہ دیشی بھی حکومت مخالف مظاہرے شروع کر دیں گے۔

نیپال سے بھی بھارت کا سرحدی تنازع چل رہا ہے۔ دونوں

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ممالک کی سرحد پر پونے چار سو مربع کلومیٹر کا رقبہ وجۂ تنازع بنا ہوا ہے۔ اس پر انگریزوں نے بڑی عیاری سے قبضہ کر لیا تھا۔ جب چانکیہ کے پیروکار بھارتی حکمرانوں نے حکومت سنبھالی، تو انہوں نے بھی قبضہ برقرار رکھا۔ اب نیپالی تقاضا کر رہے ہیں کہ یہ علاقہ واپس اُنہیں دیا جائے۔ یوں بھارتی حکمران جس ریاست کو اپنا ماتحت سمجھتے تھے، وہ بھی ان کے خلاف بغاوت کر چکی۔ آج نیپال میں بھی بھارتی حکومت کو متکبر اور زورآور سمجھ کر اُس سے نفرت بڑھ رہی ہے۔ سری لنکا، بھوٹان اور مالدیپ بھی مختلف معاملات میں بھارت سے اختلاف رکھتے ہیں۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ جو مودی سرکار پاکستان کو معاشی مسائل میں مبتلا کرنا چاہتی ہے، آج وہی سنگین معاشی مصائب کا نشانہ بن چکی۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی معاشی شان وشوکت بڑھانے کے لیے جعلی اعداد وشمار کا سہارا لے رکھا ہے۔ اگر حقیقی اعداد وشمار سامنے آ جائیں، تو بھارتی حکومت کی ساری خودنمائی کی قلعی اُتر جائے اور نیچے سے کوئی شیر نہیں، بیمار گائے برآمد ہو گی۔

نریندر مودی اپنے آپ کو طرم خان اور چالیس چلنے میں تیس مار خان سمجھتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ طاقت میں سب سے بڑا ہے، اس کی تدبیروں سے مودی کی ساری شیخی اور اکڑ کافور ہو گئی۔ آج وہ ایک شکست خوردہ لیڈر ہے جو اپنی غلطیاں اور نادانیاں چھپانے کی خاطر راستے ڈھونڈ رہا ہے۔ مثلاً لاک ڈاؤن لگانے کی زبردست غلطی اور چین سے بدترین ہار چھپانے کے لیے اس نے پاکستان کا آدھا سفارتی عملہ نکال دیا۔ مدعا یہ تھا کہ عوام کی توجہ ادھر مبذول ہو جائے۔ پاکستان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بھیگی بلی کو خاطر میں نہیں لایا۔

پاکستان کو کیا کرنا چاہیے؟

پاکستان کے لیے اب اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ اپنی معیشت کا قبلہ درست کر لے تبھی وہ بھارت کی مات سے ملنے والے تمام فوائد حاصل کر سکے گا۔ اِس وقت حکومت قرضے لے لے کر حکومتی نظام چلا رہی ہے۔ یوں تو ارضِ پاک کا دفاع مضبوط تر نہیں بنایا جا سکا۔ ہمارے مجموعی قرضوں کا حجم جی ڈی پی کے 95 فی صد تک پہنچ چکا جو خطرناک بات ہے۔ آج سرکاری آمدن کا بیشتر حصہ سود دینے اور قرضے اتارنے پر خرچ ہو رہا ہے۔ اس لیے حالیہ بجٹ میں دفاعی اخراجات نہیں بڑھ سکے بلکہ ڈالر کی قیمت بڑھنے سے اُلٹا ان میں کمی آ گئی۔

یہ یقینی ہے کہ حکومتِ پاکستان تن تنہا معاشی مسائل مثلاً غربت، بیروزگاری، کرپشن، مہنگائی وغیرہ پر قابو نہیں پا سکتی۔ ان سے نکلنے کی خاطر پاکستانی عوام خصوصاً ایلیٹ طبقے کو اپنا کردار اَدا کرنا ہو گا۔ مثلاً وہ اپنے حصّے کے ٹیکس ایمانداری سے دے تاکہ حکومتی آمدن بڑھ سکے۔ کورونا وائرس وبا کے بعد خاص طور پر یورپ اور امریکا ہجرت کرنا زیادہ کٹھن مرحلہ بن جائے گا۔ لہٰذا پاکستانی نوجوان نسل کو سمجھنا چاہیے کہ اب اسی ارضِ پاک کے ساتھ جینا مرنا ہے۔ وہ پاکستان کی ترقی وخوشحالی کے لیے اپنی عیاں ومخفی صلاحیتیں بہترین انداز میں استعمال کریں اور اپنے دیس کو معاشی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے طاقتور بنا دیں۔ تب نریندر مودی تو کیا، اس کا باپ بھی پاکستان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

حالت سے آشکارا ہے کہ چین کے ساتھ سرحدی تنازعات میں سینگ پھنسا کر مودی سرکار انوکھی آفت میں پھنس گئی۔ یہ معاملہ گلے کی ایسی ہڈی بن سکتا ہے جو اُگلی جائے نہ نگلی جائے۔ اب بھارتی حکمرانوں کو پاکستان ہی نہیں چین، نیپال، سری لنکا حتیٰ کہ بنگلہ دیش میں بھی مخالفت کا سامنا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خود کو عقلِ کُل سمجھنے والا مودی مع اپنی ٹیم اس گمبھیر صورتحال سے کیونکر پیچھا چھڑا پائے گا اگر وہ امریکا کی زیر قیادت بننے والے چین مخالف اتحاد میں شامل ہو گیا تو دونوں پڑوسیوں کی خفیہ وعیاں جنگ مزید تیز ہو سکتی ہے۔ امریکی وزیر خارجہ نے یہ کہہ کر جلتی پر تیل تو پھینکا ہے کہ امریکا یورپ سے اپنی فوج انڈو پیسفک لانے کو تیار ہے۔ ♦♦♦

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ڈاکٹر عشرت عزیز

اے اللہ! راضی ہو جا

حیرت انگیز طور پر حج کی مثال دُنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی کیونکہ یہ مسلمانوں کا وہ اجتماع ہے جس میں عام عبادات کی طرح محض انفرادیت ہی ربّ ذوالجلال کے قرب کا باعث نہیں بلکہ کائنات کے ذرّے ذرّے کا خیال رکھ کر اجتماعیت قائم کرنے کو حج کہتے ہیں۔ گویا حج کا ارادہ باندھنے کے بعد سے ہی حج شروع ہو جاتا ہے۔

حاجی کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کے لیے دل میں بغض نہ رکھے، بلکہ اپنا کاسۂ دل خالی کر لے تاکہ اللہ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر زندگی میں کسی کی دل آزاری کی تھی تو حج کا ارادہ باندھتے ہی ایک فہرست تیار کر لے اور وہ بھی اس خیال کے ساتھ کہ رب راضی ہی تب ہوگا جب اس کے بندے راضی ہوں گے۔

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو اپنی عبادات میں کائناتی اجسام کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ حج کے دوران کسی بھی جاندار کو مارنا تو ایک طرف، اسے آزار بھی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ جانداروں میں سر کی جوؤں سے لے کر دیگر جانور، پودے اور انسانوں تک ساری مخلوقِ خدا شامل ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے سب سے اہم اور بابرکت سفر کے بارے میں درست معلومات بہت کم لوگوں کو ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت حج یا عمرہ کے بعد یہی کہتی ہے کہ پہلی بار کے سفر میں ہم سے بہت غلطیاں ہوئیں اور تمام مناسکِ حج

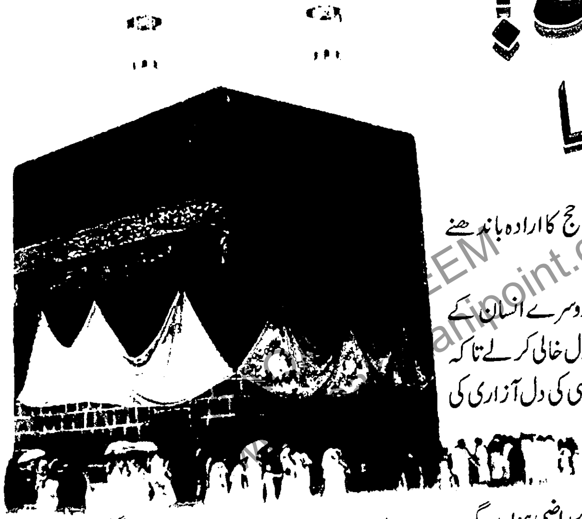

اس طرح ادا نہ ہو پائے جیسے ان کا حق تھا۔ اگلی بار جائیں گے تو سب پتا ہوگا۔

عمر اور سانسوں کا کیا بھروسا کب ساتھ چھوڑ دیں؟ اگلا پل کس نے دیکھا ہے۔ یہ مضمون سب کے لیے راہنمائی کا کام دے گا۔ خصوصاً خواتین کو دورانِ حج درپیش مسائل اور حالات کو ایک خاتون ہی بہتر انداز میں بیان کر سکتی ہے۔

☆ **آغازِ حج میں مسائل:**

حج زندگی کا ایسا سفر ہے جس میں اگر راہیں کھوٹی ہوگئیں تو

اس سال لاکھوں مسلمان دُنیا کے سب سے خوبصورت نظارے سے محروم رہیں گے...

منزلیں دُور ہو جاتی ہیں یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا۔ یہ مسائل درج ذیل ہیں:

☆ **زبان و بیان کا مسئلہ:**

اگر چہ عربی مسلمانوں کی زبانِ خاص سمجھی جاتی ہے تاہم عدم توجہی کے سبب صرف قرآن پڑھ لینے کو ہی عربی سے تعلق سمجھا جاتا ہے۔ آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب عرب کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی حجاج کرام کو زبان و بیان کے حقیقی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔

ہوائی اڈے سے لے کر رہائش حجاج تک یہی خیال ہوتا ہے کہ کسی طرح ہوٹل یا دیگر رہائش تک بخیریت پہنچ جائیں۔ زبان و بیان میں تردّد کے باعث حجاج کرام زیادہ تر اپنے گروہ کے راہنماؤں کو ہی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عازمینِ حج مسلسل اس اذیت میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں وہ گم نہ ہو جائیں۔

☆ **دورانِ رہائش مسائل:**

حج، جسمانی اور روحانی عبادات کا ایسا مرقع ہے جس میں مکمل ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ حجاج کرام حج کی ترتیبِ خاص، دعائیں، عباداتِ خاص اور حج کے متعلقہ مسائل کی طرف مسلسل نظر کر سکیں، تاکہ اس کا حج ضائع نہ ہو لیکن دورانِ رہائش کچھ مسائل اس طرح سے ذہن و دل پر حاوی ہو جاتے ہیں کہ اصل مقصد یاد رکھنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

ا۔ جنوبی ایشیا کے کثیر المسلم ممالک مثلاً پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش وغیرہ کو ایک ہی رہائش گاہ میں رکھا جاتا ہے۔ چاہے ہوٹلوں کی الگ الگ منازل ہی کیوں نہ ہوں۔ آتے جاتے حجاج کرام تاریخی واقعات کا کوئی ایک طعنہ سُن ہی لیتے اور سوچتے ہیں کہ یہاں تو ہم ایک ہو کر رب کو پکارنے آئے تھے اور حج کی روح کو سمجھ ہی نہیں سکے تو حج کیا صرف جسمانی عبادت کی اُٹھک بیٹھک کا نام ہے؟

2۔ مختلف ممالک کے تاریخی اور معاشرتی اختلافات تو ایک طرف، ایک ہی ملک، معاشرے اور ایک ہی گروپ کے رہنے والے آس پاس کے لوگ ہی اخلاقیات سے نابلد دکھائی دیتے ہیں۔ ہاسٹل کے روم میٹس کی طرح جب دورانِ حج بھی رہائشی کمرے کی درجہ بندی کی جاتی ہے تو صاحبانِ کمرا میں مندرجہ ذیل اخلاقی مسائل کی وجہ سے تکرار تو ایک طرف، تُو تکار کی نوبت بھی آجاتی ہے:

(1) دوسروں کے آرام کی پروا کیے بغیر اونچی آواز میں بات کرنا اور دروازے کھولنا، بند کرنا۔

(2) حجاج کرام کا ذاتی مہمانوں کو بغیر اجازت اپنے کمرے میں مدعو کرنا اور دیر تک ٹھہرائے رکھنا۔

(3) سوشل میڈیا کے مختلف وسائل مثلاً واٹس ایپ، اسکائپ اور دیگر تصویری وسائل کے ذریعے اپنے دُور بیٹھے رشتہ داروں کو پُورے کمرے کی سیر کرانا (یہ سوچے بغیر کہ یہ اجتماعی رہائش گاہ ہے اور دیگر روم میٹس کی اجازت ضروری ہے)۔

(4) گندے برتن، میلے کپڑے اور گندے بستر اس آس پر چھوڑ کر چلے جانا کہ دوسرے سنبھال لیں گے۔ کھانا مقرر کردہ ڈائننگ ہال میں کھانے کی بجائے کمروں میں لا کر کھانا۔

(5) ملحقہ غسل خانے کے بیسن (منہ دھونے اور وضو کرنے کی جگہ) کو برتن دھونے کے لیے استعمال کرنا اور سالن کے تیل اور بد بُو سے اَٹے ہوئے چھوڑ دینا۔

(6) اپنے روم میٹس کی حاجت کی پروا کیے بغیر غسل خانوں کو دیر تک زیر استعمال رکھنا، جس میں دیر تک نہاتے رہنا اور کپڑے دھونا بھی شامل ہے۔

(7) زیادہ تر غسل خانے بیت الخلا سے ملحق ہوتے ہیں اور غلاظت کی صفائی لازمی ہوتی ہے ورنہ دیگر حجاج کی پاکی پلیدی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی پروا نہیں کی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

جاتی۔ جہازوں کی طرح رہائش گاہوں میں بھی سیٹنگ کموڈ ہوتے ہیں جن کو حجاج کرام اپنی ذاتی پاکی کا خیال رکھتے ہوئے جوتوں سمیت استعمال کرتے اور یوں دوسروں کے لیے ناپاکی کا باعث بنتے ہیں۔

(8) اکثر بڑی عمر کے خواتین وحضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ دیر تک ان کی روز مرہ کی کہانیاں سُنی جائیں جبکہ حج کے قلیل دورانیے کو اللہ کی عبادت کے لیے ہوش مندی سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ صورتِ حال اس وقت زیادہ خراب ہوتی ہے جب کمرا رہائش میں ایک ہی وقت میں ایک بندہ پنکھا یا ائیر کنڈیشنر چلانا چاہتا اور دوسرا سختی سے روک رہا ہوتا ہے۔ چھے لوگ چوہدراہٹ کا رویہ دوسروں پر زبردستی ٹھونسنے کے لیے ماحول کو کافی خراب کر دیتے ہیں۔

دورانِ پیدل سفر مسائل

زیادہ تر حُجاج کرام اپنی رہائش گاہ سے حرمین اور دیگر مقامات تک سفر پیدل طے کرتے ہیں۔ مسلسل ریلی پیل یا بے توجہی کے باعث پیدل گزرگاہیں خاص طور پر مسجد الحرام کے آس پاس کے فُٹ پاتھ مقامِ اعلیٰ کے شایانِ شان نہیں اور اللہ کے مہمانوں کی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔

اگرچہ کہ یہ رب ذوالجلال کے گھر کی طرف جانے والے راستے ہیں۔ جن کی صفائی اور خوشبوؤں میں بسا ہونا حق ہے لیکن اس کے برعکس گندگی، اِنسانی غلاظت، بچے ہوئے کھانے کے ٹکڑے، پانی کی خالی بوتلیں اور جُوس کے ڈبے مسلسل اُن پاک راستوں کے تقدس کو مجروح رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں مسجد الحرام کے آس پاس کے راستے اور سڑکیں نماز کے اوقات میں نمازیوں سے اَٹ جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر ایمرجنسی کی صُورت بنے تو نقصان کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔

دورانِ حج اخلاقی مسائل:

دورانِ حج جب دُنیا کے ہر کونے سے مختلف رنگ، نسل، قومیت، عادات واطوار کے قافلے ایک ہی منزل، ایک ہی مقصد کی جانب گامزن ہوتے ہیں تو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سب ٹھیک اور آسان ہوگا۔ لیکن ان کی اپنی مخصوص عادات ورواج دورانِ حج کئی اِقسام کے بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

1۔ گروہی طواف:

اللہ کے گھر سب مہمان برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ اصولاً صحنِ کعبہ میں لبیک الّٰھم لبیک کہتے ہوئے دِل ہر قسم کے بندھنوں اور قیود سے آزاد ہونا چاہیے لیکن یہاں بھی کئی اِقسام کے اِخلاقی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کُچھ ممالک کے گروہ صحنِ کعبہ میں بھی اپنی الگ پہچان رکھنے کے لیے دوسرے مسلمانوں کے آزار کا باعث مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر بن جاتے ہیں۔

(i) ان گروہوں کی ترتیب کُچھ اِس طرح ہوتی ہے کہ مرد دو رویہ چلتے ہیں اور درمیان میں خواتین ہوتی ہیں۔

(ii) یہ گروہ اتنے Packed ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا طواف کے درمیان اِن کی گروہی ترتیب کو نہ تو چھیڑتے ہوئے گزر سکتا ہے اور نہ ہی ڈسٹرب کر سکتا ہے۔

(iii) اکثر گروہ کافی بڑے ہوتے ہیں۔ یہ گروہ ایک مخصوص چال میں چلتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پیچھے آنے والے حاجیوں کو اِن کی رفتار کے مطابق ہی چلنا پڑتا ہے۔

(v) ان گروہی طواف میں مصروف مسلمانوں کی ایسی ترتیب بچوں اور بوڑھوں کے آزار کا سبب بنتی ہے۔

2۔ معذور افراد کے لیے مخصوص کرسیاں (وہیل چیئر)

طوافِ کعبہ کے لیے معذور افراد اپنی مخصوص کُرسیوں پر بیٹھ کر مخصوص راستوں سے گزرتے ہیں لیکن حج کے دِنوں میں انتظامیہ اور نہ ہی اِن وہیل چیئرز کو چلانے والے عزیز و اقارب یہ مخصوص راستے استعمال کرتے ہیں بلکہ عام حاجیوں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کے راستوں میں ہی اِن کرسیوں کو چلانے کی کوشش کرتے ہوئے بہت سے حجاج کے پیر اور ٹانگیں زخمی کر دیتے ہیں۔ اکثر اوقات وہیل چیئر چلانے کے لیے مقامی کم عمر نوجوان مقرر کیے جاتے ہیں جو بے حسی کے ساتھ وہیل چیئر چلاتے ہوئے کئی حجاج کو زخمی کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

3۔حرم کی پولیس اور سادہ لباس میں اہلکار:

مسجد الحرام میں پولیس کے نام پر زیادہ تر نوجوان ڈیوٹی دیتے نظر آتے ہیں جو اُردو اور انگریزی سے نابلد ہونے کے باعث راہنمائی کے فرض سے تو بَری ہوتے ہیں لیکن حجاج کرام کی ذرا ذرا سی غلطیوں سے نمٹنے کے لیے چیخ کر بولنے اور فوراً سزا دینے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ اِس لیے حجاج کرام مسلسل اِسی فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے کہ حج ہی نہ کر سکیں۔

جبکہ مدینہ منورہ میں ایسے اہلکار جا بجا گھومتے نظر آتے ہیں جو صحنِ نبویؐ میں بالخصوص خواتین پر بدعت کے فتاویٰ لگاتے رہتے اور روزہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنے کو صرف "مانگنا" سمجھتے ہیں۔

4۔حجرِ اسود:

حجرِ اسود کی اہمیت سے حج پہ آنے والا ہر حاجی واقف ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان اس کی ایک جھلک دیکھنے اور بوسہ دینے کے لیے بے تاب کھنچے چلے آتے ہیں لیکن حج کے موقع پر حجرِ اسود کے آس پاس منڈلاتا انسانوں کا بے کراں سمندر، پاس کھڑے سپاہی کا سپاٹ چہرہ، اللہ کے گھر میں دھکم پیل، کھینچا تانی اور بے ہنگم شور، پہلی بار آنے والے حجاج کرام کو ششدر اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، کہ کیا وہ حج کو مجروح کرنے کے لیے آگے بڑھے؟ یا دل پہ پتھر رکھ کر اس پتھر کو دُور سے ہی سلام کرے۔ خصوصاً خواتین اس عظیم پتھر کے پاس جانے کا سوچ ہی نہیں سکتیں کیونکہ دھکم پیل میں پردے کا خیال رکھنا مشکل عمل ہے۔

5۔جُوتوں کی حفاظت:

اگرچہ حرمین کی انتظامیہ نے جوتوں کو پلاسٹک بیگ میں لپیٹ کر اپنے سامان کے چھوٹے بستے میں (جو ہر حاجی کے ساتھ ہوتا ہے) رکھنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جا بجا پولیتھین بیگ اسٹینڈ بھی نظر آتے ہیں جہاں سے یہ بیگ بلا معاوضہ حاصل کر کے جوتوں کو لپیٹا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اکثر حجاج کرام اپنے جوتوں کی حفاظت اور استعمال میں اخلاقیات کا خیال رکھنا بالکل بھول جاتے ہیں اور مندرجہ ذیل حرکات فرماتے نظر آتے ہیں:۔

(i) جوتوں کو بغیر پلاسٹک بیگ میں رکھے حرمین کے اندر لے جانا۔

(ii) جوتوں کی حفاظت کے لیے حرمین کے ستونوں اور ایئر کنڈیشن کے والوز میں اڑس کے رکھنا۔

(iii) غسل خانوں میں ان ہی جوتوں کو لے جانا اور گیلے جوتے دوسرے نمازیوں کے سروں پہ ٹپکاتے ہوئے اگلی صف میں شامل ہونے کی کوشش کرنا۔

(iv) گندے جوتے ایک دوسرے میں اُڑس کر اپنے سامنے یا سائیڈ پہ رکھ کر نماز کے لیے کھڑے ہو جانا۔

6۔آبِ زم زم کا بے جا استعمال:

انتظامیہ نے حرمین میں آبِ زم زم کی فراہمی اور استعمال کا بڑا اچھا انتظام کیا ہے۔ جا بجا گرم اور ٹھنڈے آبِ زم زم کے کُولر نصب ہیں جن کے ساتھ عارضی گلاس موجود ہیں تاکہ حجاجِ کرام دل کھول کر یہ پُرشفاء پانی پی سکیں لیکن اکثر حجاج کرام یہ بابرکت پانی پینے کے علاوہ سر دھونے، جسم بھگونے اور وضو کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ صحن کعبہ میں ہی یہ عمل کرنے کی وجہ سے کولروں کے آس پاس مسلسل گیلاہٹ اور پھسلن رہتی ہے۔

مسجد نبویؐ میں یہ عمل دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ کولروں کی چھوٹی ٹونٹیوں سے بڑے گیلن اور بوتلیں بھرنے میں اتنے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مصروف ہوتے ہیں کہ انتظار میں کھڑا حاجی مسلسل صبر کے گھونٹ بھرتا یا لڑائی کرتا نظر آتا ہے۔

سڑکوں اور لمبے راستوں کے مسائل:

یقیناً حج کے ایام میں ٹریفک کنٹرول میں کوتاہی پر حیرت نہیں ہونی چاہیے لیکن حجاج کرام کی راہنمائی کے لیے اگر کوئی منظم پلان ہوتا بھی ہے تو نظر نہیں آتا، بالخصوص طوافِ وداع کے موقع پر جب بچے، بوڑھے، خواتین اور مرد منیٰ سے مسجد الحرام اور مسجد الحرام سے دوبارہ منیٰ جانے کا مقبول عمل انتہائی سخت موسمی حالات میں کرتے ہیں، ایسے میں حجاج کرام کی بے چارگی کا فائدہ اُٹھانے کے لیے سڑکوں پر موٹر سائیکل سے لے کر ٹرک تک سب موجود ہوتے ہیں جو اصل کرائے سے کئی گنا زیادہ پیسے لے کر حجاج کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں ''مدد'' کرتے جبکہ کئی حجاج کرام پیدل سفر کو ترجیح دیتے اور زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے اکثر بھٹکتے رہتے ہیں۔

منیٰ کے مسائل:

منیٰ اُس خیموں کی بستی کا نام ہے جو گنتی کے چند دنوں کے لیے بسائی جاتی ہے۔ اگرچہ انتظامیہ کے یہاں بھی بہت اچھے انتظامات ہوتے ہیں لیکن اصل انتظام کسی بھی منتظم کے لیے کوالٹی کنٹرول کا ہے جو ایک مسلسل عمل ہے۔ منیٰ میں مندرجہ ذیل مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

1۔ حجاج کے پیدا کردہ مسائل:

پہلے دن کی رہائش میں حجاج کرام سکون کا سانس لیتے ہیں لیکن اس کے بعد اپنے لیے خود ہی مسائل کا انبار لگا دیتے ہیں:۔

(i) خیموں کے درمیان عارضی راستوں کو جوتوں سے اَٹ دینا۔

(ii) عارضی لیکن چھوٹے راستوں میں سونا شروع کر دینا۔

(iii) وہیل چیئرز اور دیگر ذاتی سامان راستوں میں خیموں کے باہر رکھنا شروع کر دینا۔

(iv) کھانے پینے کی وافر مقدار کا غلط استعمال کرتے ہوئے بچے ہوئے کھانے کے ڈبے، بوتلیں، گلاس راستوں میں چھوڑ دینا۔

(v) غسل خانوں میں غلاظت چھوڑ دینا۔

(vi) وضو کی جگہوں پر کپڑے دھونے شروع کر دینا۔

(vii) اپنی غلطی پر ندامت کی بجائے جھگڑا کرنا۔

(viii) غسل خانوں میں رش سے بچنے اور اپنی پاکی کا خیال کرتے ہوئے چھوٹی بوتلوں میں پانی بھر کر استعمال کرنا اور اُن کو وہیں چھوڑ دینا۔

2. انتظامیہ کے پیدا کردہ مسائل:

بہترین انتظامات کے بعد باقاعدگی سے معیار کو قائم نہ رکھنا۔

(ii) باورچی خانوں کے ساتھ ہی ہر قسم کے گند سے بھرے کوڑے کے بڑے لفافے ڈھیر کرتے جانا، جو تین دن بعد ایک پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتا اور سکیورٹی مسائل کے ساتھ اِس کی موجودگی صحت کے لیے بھی خطرناک ہوتی ہے۔

(iii) غسل خانوں کی عارضی تعمیر اتنی عارضی ہوتی ہے کہ بعض اُکھڑی ہوئی حالت میں حجاج کرام کو ملتے ہیں۔

(iv) غسل خانوں میں پانی یا تو قلیل مقدار میں آتا ہے اور یا مسلسل چیک نہ رکھنے کے باعث بہتا رہتا ہے۔

(v) مخصوص خیموں کے راستوں سے جب شاہراہوں پہ آئیں تو جگہ جگہ غیر قانونی حج کرنے والے نظر آتے ہیں جو جہاں سینگ سمائے وہیں اپنے خاندانوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور پیدل چلنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔

(vii) کچھ مقامی حضرات انتظامیہ کی ناک کے نیچے غیر قانونی حج کرنے کے سلسلے میں مساجد کو اپنے خاندانوں سے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

پُر رکھتے ہیں جس میں ایک واضح مثال مسجد خیف ہے جو مِنیٰ میں واقع ایک تاریخی مسجد ہے۔ یہ انبیاء کی گزرگاہ رہی ہے۔ جبکہ حالتِ زار یہ ہوتی ہے کہ پُورے تین دن مردانہ حصے میں مقامی مرد اور زنانہ حصے میں مقامی خواتین استراحت پزیر ہوتی ہیں اور تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی جبکہ غیر ملکی حجاج کرام یا تو دروازے سے ہی لوٹ جاتے ہیں یا بڑی مشکل سے دو نفل ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(viii) حج مکمل ہونے کے بعد ہر راستے، پہاڑی، کھلی جگہ اور جہاں جس کو جگہ ملے ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو ایک استرا اور قینچی لے کر منہ مانگے داموں سے بال کاٹتے اور گنجا کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی بنائی ہوئی انتہائی قلیل حجامت گاہیں بھی نظر آتی ہیں لیکن نہ تو اُن کے اندر ہوا کا صحیح اِخراج اور نہ ہی صفائی کا صحیح اِنتظام نظر آتا ہے۔ مِنیٰ کی ساری سڑکیں بالوں سے اَٹی نظر آتی ہیں۔ جب کہ حفظانِ صحت کے اِن سنگین مسائل کی طرف نہ تو حجاج کرام کی نظر جاتی ہے جو انتہائی مجبور ہوتے ہیں اور نہ انتظامیہ کی۔

عرفات اور ہمارا رویہ:

میدانِ عرفات وہ اہم علاقہ جہاں ایک خاص حصے کے اندر حج کے مخصوص اوقات میں حاضری کے بغیر حج قبول نہیں۔ یہاں کے مسائل درج ذیل ہیں:

رُکنِ عرفات سے پہلے حجاج کرام کو ہر رکنِ حج تیزی اور تندہی سے مقررہ وقت کے اندر ادا کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا جسم اور ذہن انتہائی تیز رفتاری سے سارے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے۔ عرفات میں کوئی مخصوص عبادت نہ ہونے کے باعث اکثر حجاج کرام اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں کر پاتے۔ دُور دُور تک خیموں میں ہونے کے باعث خطبۂ حج اکثر حجاج براہ راست نہیں سن سکتے۔ وقت گزارنے کے لیے کھانے، پینے اور دوسرے کے خیموں کی سیر میں گھومتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ظہر اور عصر کی نماز کا وقت ہوجاتا ہے۔

بہت کم حجاجِ کرام اس راز سے آگاہ ہیں کہ قیامِ عرفات خلیفۂ رب ہونے کا احساس دلاتا ہے کیونکہ یہاں رب کی رحمت اور بندے میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ اِسی لیے حدیث مبارک میں عرفات سے لوٹنے والے حاجی کو ایک نومولود بچے سے تشبیہہ دی گئی ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔

مزدلفہ:

مزدلفہ......رات کی تاریکی ہے۔ مزدلفہ کے وہ کنکر جن پر رات کو سونے کا حکم بھی ہے اِن ہی کو اپنے دامن میں چُن کر اپنے ازلی دشمن ابلیس کو مار کر رمی ادا کر کے، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ سمجھ لینے کا اِشارہ بھی ہے۔ مزدلفہ سے مِنیٰ کی طرف واپسی پر حجاج کرام اپنا جسمانی بوجھ راستوں میں ہلکا کرنا شروع کردیتے ہیں۔ چٹائیاں (جو مزدلفہ میں سونے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں)، پلاسٹک کا دیگر سامان، کھانے پینے کا اِضافی سامان، بوتلیں، پھٹے ہوئے بیگ وغیرہ یہ سامان سڑکوں پر ہی جاتے جاتے پھینک دیا جاتا ہے جو پیچھے آنے والے حجاج کرام کے آزار کا باعث بنتا ہے۔

رمی:

تین مینار جو شیاطین کی نسبت سے منفی طاقت کا گڑھ ہیں۔ اُنھیں پتھر مارنے کا عمل رمی کہلاتا ہے۔ غالباً مزدلفہ کے کنکروں پر سو کر جو اِنسانی توانائی balance (مستحکم) حالت میں آجاتی ہے اسی توانائی کے حامل پتھروں کو (منفی قوت، شیاطین) کو دے مارا جاتا ہے۔ حج میں بھگدڑ اور انسانی ضیاع کے سب سے زیادہ واقعات مِنیٰ اور مِنیٰ سے ملحقہ اُس علاقے میں ہوتے ہیں جہاں رمی کی جاتی ہے۔ انتظامیہ نے بہترین وسائل سے آنے جانے کے کشادہ راستے تعمیر کیے ہیں لیکن اِن راستوں کی ترتیب کی پیروی نہ کرنے اور راستوں میں ہی ہجوم کی وجہ سے حادثات نمودار ہوتے ہیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.net

خواتین کو پیش آنے والے مسائل:

محرم کی ضروری موجودگی کی وجہ سے اکثر اوقات ایک مرد کے ساتھ کئی خواتین حج ادا کرنے کے لیے حرمین تشریف لاتی ہیں۔ بالغرض خواتین کی تعداد کو کُل تعداد کا نصف بھی سمجھ لیا جائے تو اِن 50% حجاج کرام کے لیے اِتنی ہی تعداد میں مخصوص انتظامات نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے مندرجہ ذیل مسائل نظر آتے ہیں۔

1۔ بیت الخلاء

مکہ کے آس پاس میقات (عمرے کی نیت کرنے کا مقام) کی جتنی جگہیں ہیں، وہاں خواتین کے لیے کافی قلیل بیت الخلاء اور غسل خانے ہیں۔ دورانِ حج وہاں صفائی کا عملہ عام حالات میں نظر نہیں آتا۔ یہاں بھی گروہی طواف کی طرح گروہی قبضہ نظر آتا ہے جہاں ایک خاتون بیت الخلاء جاتی ہیں تو باقی گروہ اس بیت الخلاء میں صرف اپنے گروہ کی خواتین کی ضرورت پوری ہونے تک کسی اور کو جانے نہیں دیتا۔

جیسا کہ اِن بیت الخلاء اور غسل خانوں میں کسی مرد کا آنا ممنوع ہے۔ چنانچہ بوڑھی اور معذور خواتین زیادہ پریشانی کا شکار دکھائی دیتی ہیں جن کے لیے مخصوص اوقات یا غسل خانے دکھائی نہیں دیتے اور وہ اپنے خیال رکھنے والے مردوں کو باہر چھوڑ کر ایسی اجنبی خواتین میں پریشان حالت میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ اکثر خواتین کے جھگڑے ضرورت سے زیادہ غسل خانوں میں وقت ضائع کرنے پر نظر آتے ہیں جہاں انتظار میں کھڑی خواتین کے صبر کا پیمانہ چھلک جاتا ہے۔

2۔ حرمین میں مسائل:

(i) اللہ کے گھر میں خواتین کے لیے دورانِ طواف کوئی بندش نہیں۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ طواف کرتیں، نماز پڑھتیں، زم زم پیتیں اور سعی کرتی ہیں۔ انسان سمجھے جانے کا یہ احساس بہت حسین ہوتا ہے لیکن جیسے ہی نماز کے مخصوص اوقات شروع ہوتے ہیں، خواتین کو رُکاوٹیں لگا کر مخصوص حِصوں میں نماز ادا کرنے کے لیے معمور عملہ ہدایات شروع کر دیتا ہے۔ ایسے میں اکثر خواتین محرموں سے بچھڑ جانے کے خوف کی وجہ سے ہدایات کی پابندی یا تو کر نہیں سکتیں یا پھر مردوں کے قریب ترین حصوں میں رش لگانا شروع کر دیتی ہیں۔

(ii) حرمین کے وسیع و عریض صحنوں سے گزر کر بیت الخلاء جانے سے بچنے کے لیے اپنے پاس پانی کی چھوٹی بوتلیں رکھتی ہیں جو مسجد کی صفوں پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا وضو تازہ کرنے کے لیے مختصر وضو کر لیتی ہیں۔ وہ پانی کے چھینٹے دوسری خواتین یا مسجد کی صف پر گرنے کی بھی پروا نہیں کرتیں۔

(iii) مسجد نبویؐ میں انتظامی رُکاوٹوں کے باعث حج کے دوران کثیر التعداد خواتین حجاج کرام کو ایک حصے تک ہی مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ دُنیا کے مختلف گوشوں سے زیادہ تر ایسی خواتین آتی ہیں جو اپنے رسول ﷺ کی مسجد کے ہر گوشے کو اسی طرح ہی دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتی ہے جیسا کہ مرد حجاج لیکن مخصوص حصے میں رُکنے کی وجہ سے منبر رسول ﷺ، اصحاب صفہ کے چبوترے اور دیگر اہم جگہوں تک رسائی نہیں ملتی۔

دورانِ حج جو خواتین کا مخصوص عملہ معین ہوتا ہے وہ بھی عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کر سکتا اور راہنمائی کے لیے ہاتھ کے اشاروں کا استعمال اور عربی میں چیخ کے بولنا اکثر خواتین کے کام نہیں آتا۔

مدینہ میں ریاض الجنتہ اور روضۂ رسول ﷺ کے مخصوص حصے تک رسائی کے لیے پہلے ساری دُنیا کی خواتین کو ایک حصے میں جمع ہونے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ جہاں عملے کی خواتین اتنے بڑے مجمع سے یا تو چیخ کر خطاب کرتی ہیں یا پھر ایسا لاؤڈ اسپیکر ہاتھ میں لیے نظر آتی ہیں جو زیادہ تر نام کا ہی لاؤڈ اسپیکر ہوتا ہے۔ اکثر ہدایات خواتین کے کانوں تک

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

نہیں پہنچتیں اور وہ ایک دوسرے سے پوچھ کر ہی کام چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مخصوص جھنڈوں کے ذریعے خواتین کو اُن کے ملک کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایرانی خواتین ایران کے جھنڈے اور ایرانی زبان بولنے والی معلمہ کے حصے میں چلی جاتی ہیں، الغرض انڈونیشیا، امریکا، افریقہ سبھی ممالک کی خواتین الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں سوائے انڈیا، بنگلہ دیش، افغانستان، پاکستان اور ملحقہ کئی چھوٹے ملکوں کی خواتین کے۔ جنہیں حیرت انگیز طور پر صِرف پاکستان کے جھنڈے کے ساتھ اکٹھا ہونے کو کہا جاتا ہے جس پر خوشگوار حیرت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن جب کُل حجاج کرام کی آدھی سے زیادہ تعداد پر مشتمل خواتین کے اس مخصوص گروہ کی لمبائی، چوڑائی پر نظر پڑتی ہے تو ذہن گھومنے لگتا ہے۔

حیرت انگیز طور پر سب سے آگے عربی ممالک کے گروہ ہوتے ہیں۔ یہ ترکیب ریاض الجنۃ کے مخصوص حصے تک توکسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے لیکن جیسے ہی ریاض الجنۃ کے مخصوص سبز کارپٹ پہ پاؤں رکھتے ہیں تو "محمود اور ایاز" سب ایک ہو جاتی ہیں۔ اب یہاں پر کسی 'عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں رہتی'۔ سب ہی زیادہ سے زیادہ نوافل پڑھنے اور مخصوص میناروں کے قریب جانے کی کوشش میں اپنے جسمانی زور کا مظاہرہ شروع کر دیتی ہیں۔ وہ دھکم پیل ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔ زبان کے آزادانہ استعمال میں یہ بھی بُھلا دیا جاتا ہے کہ وہ وہاں کس مقصد کے لیے ہیں؟

☆☆

ان سب مسائل کے ادراک کا تعلق یقیناً انتظامی حالات بہتر کرنے سے تو ہے ہی لیکن اصل مقصد ہر حاجی کو آگاہی کے علاوہ حج کا اصل فلسفہ سمجھانا ہے کہ حج تو کرتے ہی بہترین اخلاق کی عملی کی تربیت کے لیے ہیں۔ ہمیں تو دُنیا کے مختلف گوشوں سے اکٹھا ہی آپس میں ایک ہونے کے لیے کیا جاتا ہے جبکہ صحنِ کعبہ ہو یا ریاض الجنۃ ہم الگ ہی رہتے اور بُھول جاتے ہیں کہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش میں شاید جنت البقیع تک تو رسائی مل جائے مگر اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا تک نہیں۔

◆◆◆

اقبالؒ نے سچ ہی کہا تھا

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے!
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
تم ہو آپس میں غضب ناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا، سریرِ کئے بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی؟

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قُرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

احراز الحسن جاوید

ایک عظیم استاد

ایک دن جامعہ ملّیہ کالج دہلی کے عیسائی پرنسپل، پروفیسر کیلاٹ صاحب نے ہوسٹل کے طلبہ کو بلایا اور پوچھا: ''کئی روز سے اذان کی آواز نہیں آئی، کیا تم لوگ نماز نہیں پڑھتے؟''

طالب علموں نے یک زبان ہو کر کہا: ''ہم اسکول کے بچے تو نہیں۔ اپنے اچھے برے کو خوب سمجھتے ہیں۔ جی چاہے گا نماز پڑھیں گے، جی چاہے گا نہیں پڑھیں گے۔ آپ سختی نہیں کر سکتے۔''

پروفیسر کیلاٹ بولے: ''سختی تو میں کروں گا اور ضرورت پڑی، تو واقعی مار مار کر نماز پڑھاؤں گا، کیونکہ اِس ادارے کا نام جامعہ ملّیہ اسلامیہ ہے۔ داخلے کے فارم پر تمہارا نام مسلمانوں کا سا لکھا ہے اور مذہب کے خانے میں بھی تمہارے سرپرستوں نے لفظ ''اسلام'' ہی درج کیا ہے۔ مَیں عیسائی ہوں، لیکن تمہارے ماں باپ نے مجھ پر اعتماد کر کے تمہیں یہاں داخل کرایا ہے۔ مجھے اُن کے اعتماد اور اعتبار کا بھرم رکھنا ہے۔ اِس لیے نماز تو تم کو ضرور پڑھنی پڑے گی، یا پھر اپنے سرپرستوں سے لکھوا لاؤ کہ اُنہیں اپنی اولاد کے مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اِس کے بعد مَیں تمہیں آزاد چھوڑ دوں گا۔''

لڑکوں نے کہا: ''ہم تعلیم چھوڑ دیں گے۔''

پرنسپل کیلاٹ بولے: ''ضرور چھوڑ دو۔ مَیں کالج اور ہوسٹل میں قفل ڈال دوں گا۔''

لڑکوں نے اُن کی بات نہ مانی اور پرنسپل صاحب نے اصولوں کی خاطر سچ مچ ہوسٹل اور کالج میں قفل ڈال دیا۔ طلبہ جامعہ ملّیہ اوکھلے کے ہوسٹل سے اُٹھ کر جنگ پورے (تین میل دُور ایک آبادی) میں آ گئے اور کرائے کے ایک مکان میں ان باغیوں نے دو تین دن گزارے، مگر جب دو تین دن بعد بھی کیلاٹ صاحب کو ٹس سے مس ہوتے نہ دیکھا، تو خود ہی غیرت میں آ کر کہا کہ مسلمان ہونے کے باوجود ہمارا یہ رویّہ ہے اور اُن کا عیسائی ہوتے ہوئے یہ طرزِ عمل۔ واپس جا کر کیلاٹ صاحب سے معافی مانگی، نماز پڑھنے کا وعدہ کیا اور کالج اور ہوسٹل دونوں کھل گئے۔

❁

کسی بات پر مشتعل ہو کر کیلاٹ صاحب نے ایک دن کسی طالب علم کے تھپڑ مار دیا۔ طلبہ اتنی سی بات کو لے اُڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ فوراً ہڑتال شروع ہو گئی۔ طلبہ کا سامان بندھ بندھ کر ہوسٹل سے باہر آنے لگا۔

کیلاٹ صاحب دروازے پر کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ جب آخری طالب علم کا سامان بھی باہر آ گیا، تو اُنہوں نے لڑکوں کو اشارہ کر کے پاس بلایا اور پوچھا: ''تم لوگ واقعی جا رہے ہو؟''

لڑکوں نے جواب دیا: ''آپ نے ہمارے ایک ساتھی کی بے عزتی کی ہے۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔''

کیلاٹ صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ رندھے ہوئے گلے سے بولے: ''میرے بیٹو! مَیں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے غصّے پر قابو نہیں رہا۔ ایک طمانچہ تم بھی میرے گال پر مار لو۔'' اس کے بعد دیکھنے والی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ طالب علم، پرنسپل صاحب کے پیروں میں گرے ہوئے اشکِ ندامت کے موتی برسا رہے ہیں اور سامان واپس جا رہا ہے۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

”آپ کی زکوٰۃ و عطیات نے بدل دیا مقدر“

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء و طالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر کے اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور اس طرح قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

الحمدللہ **6,820** طلباء و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کیلئے **-/177,449,015** روپے کے وظائف جاری کیئے جاچکے ہیں جن میں **1189** یتیم اور **451** معذور طلبہ بھی شامل ہیں

اسکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی تعداد اور شعبہ جات کی تفصیل

میڈیکل	
ایم بی بی ایس	1568
بی ڈی ایس	64
ڈاکٹر آف فزیوتھراپی	65
ڈی وی ایم	136
ڈی فارمیسی	121
ہیلتھ سائنسز	45

انجینئرنگ	
بی ایس سی انجینئرنگ	1638
بی ٹیک	24
ڈپلومہ ایسوسی ایٹ انجینئرنگ	167

کمپیوٹر سائنسز	
بی سی ایس/آئی ٹی	75
آئی سی ایس	25

سائنسز	
ایم ایس سی	176
بی ایس آنرز	1038
ایف ایس سی	713

مینجمنٹ	
ایم بی اے/ایم پی اے	66
بی بی اے	77

کامرس	
اے سی سی اے/سی اے	28
ایم کام	41
بی کام آنرز	164
آئی کام	57
ڈی کام	05

سوشل سائنسز	
ایم فل	26
ایم اے	147
بی اے آنرز	64
بی اے	87
ایف اے	114

تعلیم و تدریس	
ایم ایڈ	10
بی ایڈ آنرز/بی ایڈ	44
بی ایس ایڈ	13

قانون	
ایل ایل بی	22

زکوٰۃ و عطیات دیجیے علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

آپ کے تعاون کے منتظر

ایس۔ ایم۔ ظفر — سرپرست
مجیب الرحمٰن شامی — چیئرمین
غلام احمد بمبل — سینئر وائس چیئرمین
شکیلہ لقمان — وائس چیئرمین
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی — سیکرٹری جنرل
ایوب صابر اظہار — سیکرٹری فنانس
احسان اللہ وقاص — (رکن مجلس عاملہ)

کاروان علم فاؤنڈیشن

Meezan Bank
The Premier Islamic Bank

میزان بینک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ

لاہور: مہدی رضا **0300-1103344** اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری **0300-1104455**

مکان نمبر 604، بلاک سی، (نزد شوق چوک) فیصل ٹاؤن لاہور۔

فون: **0321 846 1122, 0333 846 1122** وٹس ایپ نمبر: **0300 110 3030**

کاروان علم فاؤنڈیشن تمام متعلقہ حکومتی اداروں سے باقاعدہ رجسٹرڈ فلاحی ادارہ ہے لہٰذا آپ مکمل اطمینان اور اعتماد سے اپنی زکوٰۃ و عطیات ارسال کر سکتے ہیں

کاروان علم فاؤنڈیشن کو دیے گئے عطیات کی رقوم پر حکومت پاکستان کی طرف سے ٹیکس استثنیٰ دیا گیا ہے **Tax Exemption # 3952155**

www.urdunovelpoint.com
SARA AZEEM

ایثار و قربانی

عائشہ خان

ایثار و قربانی انسان کا اعلیٰ وصف ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی ضروریات پس پشت ڈال کر دوسروں کی ضروریات کو مقدم رکھنا۔ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانا، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا۔

یہ وہ بہترین اخلاقی صفت ہے جو انسان کو انسانیت کی بلندیوں پر لے جاتی ہے...... اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ بناتی اور آخر میں اسے بلند درجات پر پہنچاتی ہے۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کی ساری زندگی ایثار و قربانی اور محبت و خلوص سے دلوں کو گداز کر دینے والی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں مہمان ہوئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں صرف بکری کا دودھ تھا۔ آپؐ نے وہ دودھ مہمان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب اہل خانہ بغیر کچھ بھی کھائے سوئے...... وہ بھی ایسی صورت میں جب اس سے پچھلی رات بھی فاقہ رہا تھا۔ (المسند)

اسی طرح ایک مرتبہ کسی فقیر نے دروازے پر صدا لگائی۔ گھر میں اس وقت صرف ایک روٹی اور حضرت عائشہؓ روزے سے تھیں پھر بھی خادمہ سے کہا کہ وہ روٹی اس فقیر کو دے دو۔

خادمہ نے کہا گھر میں اس وقت کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں تم اس کو دے دو۔''

خادمہ نے کہا اگر یہ روٹی اسے دے دی تو شام کو آپ کے افطار کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں۔''

خادمہ نے روٹی فقیر کو دے دی۔

خادمہ کہتی ہے کہ جب شام ہوئی تو ایک ایسے شخص کی جانب سے ایک سالم بھنی ہوئی بکری بطور ہدیہ آگئی جس کی جانب سے پہلے کبھی کوئی ہدیہ نہیں آیا تھا۔

حضرت عائشہؓ نے خادمہ کو بلایا اور کہا۔ آؤ اب سیر ہو کر کھاؤ۔ تمہاری اس روٹی سے بہت بہتر کھانا آ گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ازدواج مطہرات کی زندگی کے ایسے ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ بھی دل و جان سے آپؐ کی تقلید کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مہاجرین میں سے ایک صاحب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی بھوک اور تنگی کا ذکر کیا۔ آپؐ نے ازدواج مطہرات کے پاس ایک بندہ بھیجا مگر کہیں سے بھی کھانے کو کچھ نہ ملا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاس موجود انصار

اور اگر دلوں میں محبت اور خلوص پیدا ہو جائے تو پھر نہ لوٹ مار ہوگی نہ چوری، حسد و رقابت نہ کینہ توزی

مردوں سے ارشاد فرمایا:

"جو کوئی آج رات میرے مہمان کی مہمان نوازی کرے گا اللہ اس پر اپنا خاص رحم و کرم کرے گا۔"

حضرت ثابت بن قیسؓ عرض پیرا ہوئے۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں مہمان کا حق خدمت ادا کروں گا۔"

حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مہمان ہیں۔ ان کی خوب خاطر مدارت کرو۔

بیوی نے کہا گھر میں تو صرف بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا ہے اور تو کچھ بھی نہیں۔

حضرت ثابت بن قیسؓ نے فرمایا:

"بچوں کو بہلا کر سلا دو اور جب ہم کھانا کھانے لگیں تو تم چراغ کی لو درست کرنے کے بہانے چراغ بجھا دینا تاکہ ہم خود کھانا نہ کھائیں اور مہمان ٹھیک سے کھا لیں۔"

چنانچہ بیوی نے ایسا ہی کیا اور دونوں میاں بیوی نے کھانا مہمان کو کھلا دیا۔ انھوں نے خود اور بچوں نے فاقے سے رات گزاری۔

صبح جب یہ صحابیؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تم دونوں میاں بیوی کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی ہے۔"

ترجمہ: "ترجیح دیتے ہیں خود پر دوسروں کو اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔" (الحشر: 9)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ جنگ یرموک کا ہے۔

حضرت ابوجہم بن حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جنگ یرموک میں، میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا۔

ایک مشکیزے میں پانی اپنے ساتھ لے لیا کہ ممکن ہے وہ پیاسے ہوں تو انھیں پانی پلاؤں۔ اتفاق سے وہ ایک جگہ اس حالت میں پڑے ہوئے ملے کہ دم توڑ رہے تھے اور جان کنی کی حالت میں انھیں پانی پلانے کی کوشش کی۔ اتنے میں ایک صاحب جو قریب ہی پڑے تھے اور وہ بھی اسی حالت میں تھے انھوں نے آہ کی...... میرے چچازاد بھائی نے آہ سنی تو مجھے انھیں پانی پلانے کے لیے کہا۔

میں ان کے پاس پانی لے گیا۔ وہ ہشام بن ابی العاصؓ تھے۔ ان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ان کے قریب سے ایک تیسرے صاحب کراہے تو ہشام بن ابی العاصؓ نے مجھے ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس گیا تو ان کی جان نکل گئی...... جلدی سے ہشامؓ کے پاس آیا تو وہ بھی راہی عدم ہو چکے تھے۔ میں فوراً اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ بھی دم توڑ چکے تھے۔

یہ تھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی زندگیاں...... زندگی کے آخری لمحے تک دوسروں کی فکر کرنا...... اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا......

اسی طرح کے خلوص اور قربانی کا جذبہ اگر آج ہم لوگوں میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ معاشرتی اور طبقاتی خلیج جو دلوں میں نفرتوں کو بڑھا رہی ہے اور معاشرے میں اضطراب و انتشار پھیلا رہی ہے خود بخود ختم ہو جائے گی۔ فطری سی بات ہے کہ جیسے یہ سوچ کہ دوسروں کو ہمارا خیال اور احساس نہیں، بیگانگی، کدورت اور نفرت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح خیال اور احساس کیا جانا، اپنائیت اور محبت پیدا کرتا ہے۔

اور اگر دلوں میں محبت اور خلوص پیدا ہو جائے تو پھر نہ کہیں بم دھماکے ہوں گے نہ خودکش حملے...... قتل و غارت گری ہوگی نہ خون ریزی...... لوٹ مار ہوگی نہ چوری، حسد و رقابت ہوگی نہ کینہ توزی......

ہر سُو امن و امان ہوگا اور یہ دنیا خوشیوں کا گہوارہ بن جائے گی...... یہ سب دیوانے کا خواب ہے نہ ہی کوئی ناممکن بات......

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے جذبہ ایثار و قربانی کو پوری طرح سے اپنا لیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

نہرِ زُبیدہ

جنہوں نے حجاجِ کرام کے لیے پانی کی قلت کا مسئلہ حل کردیا

عبدالمالک مجاہد

یہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ دنیا کے چپے چپے میں اسلام کی کرنیں اپنی تابناک شعاعیں بکھیر رہی تھیں۔ وہی عرب جو کچھ عرصہ پہلے انتقام کی آگ میں جھلس رہے تھے آج اسلامی تعلیمات کی بدولت باہم بھائی بھائی بن چکے تھے، قبائل کے درمیان باہمی اختلافات بلاشبہ پائے جاتے تھے مگر محاذ جنگ پر جب اکٹھے ہوتے تو سب ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ تلواروں کے سائے میں ان کی نمازیں ادا ہوتی تھیں اور جن جن ملکوں میں وہ جہاد کا پرچم لہراتے وہاں کے باشندوں کے ساتھ عدل وانصاف کرنا ان کی شان تھی۔ دوسری جانب مسلمان مبلغین بھی دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھے ہوئے تھے، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں مملکت اسلامیہ کی باگ ڈور خلیفہ ہارون رشید کے ہاتھ میں ہے، دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان بیت اللہ شریف کا حج ادا کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ مکہ میں پانی ناپید ہے۔ حجاج کرام اور اہلِ مکہ بڑی مشکل سے کسی طرح پانی کا بندوبست کرپاتے ہیں۔

اسی زمانہ میں ملکہ زبیدہ بنت جعفر فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ آتی ہیں۔ انھوں نے جب اہلِ مکہ اور حجاج کرام کو پانی کی دشواری اور مشکلات میں مبتلا دیکھا تو انھیں سخت افسوس ہوا؛ چنانچہ انھوں نے اپنے اخراجات سے ایک عظیم الشان نہر کھودنے کا حکم دے کر ایک ایسا فقیدہ المثال کارنامہ انجام دیا جو رہتی دنیا تک عالم بشریت کو یاد رہے گا۔

ام جعفر زبیدہ بن جعفر بن ابوجعفر منصور ہاشمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید کی چچازاد بہن تھیں۔ ان کا نام "أمتہ العزیز" تھا۔ ان کے دادا منصور بچپن میں ان سے خوب کھیلا کرتے تھے، ان کو "زبیدہ" (دودھ بلونیوالی متھانی) کہہ کر پکارتے تھے، چنانچہ سب اسی نام سے پکارنے لگے اور اصلی نام لوگ بھول ہی گئے۔ یہ نہایت خوبصورت اور ذہین وفطین تھیں۔ جب جوان ہوئیں تو خلیفہ ہارون رشید سے ان کی شادی ہوگئی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ذوالحجہ 165 ہجری میں ہوئی۔ ہارون رشید نے اس شادی کی خوشی میں ملک بھر سے عوام وخواص کو دعوت پر بلایا اور مدعوین کے درمیان اس قدر زیادہ مال تقسیم کیا جس کی مثال تاریخ اسلامی میں مفقود ہے۔ اس موقع پر خاص بیت المال سے پچاس ملین درہم (50,000,000) خرچ ہوئے۔ ہارون رشید نے اپنے خاص مال سے جو کچھ خرچ کیا وہ اس کے علاوہ تھا۔

ہارون رشید ملکہ زبیدہ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی بیوی کو یہ کہہ کر پکارا: "ام نہر! ذرا ادھر آنا"۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

زبیدہ نے بعد میں مشہور عالم اصمعی کو بلوا کر پوچھا: ''امیر المومنین مجھے 'اُم نہر' کہہ کر پکارتے ہیں، اس کے کیا معنی ہیں؟ اصمعی نے جواب دیا: ''چونکہ جعفر عربی لغت میں 'نہر' کو کہتے ہیں اور آپ کی کنیت ام جعفر ہے، اس لیے نہر معنی مراد لے کر آپ کو اس نام سے پکارا ہوگا۔

زبیدہ بڑی ہی سمجھدار خاتون تھیں، حاشیہ برداروں کے کہنے پر کبھی فوری فیصلہ نہیں کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک شاعر نے ان کی خدمت میں چند اشعار سنائے، مگر ردیف وقافیہ اور الفاظ کی ترکیب میں شاید وہ اپنا مافی الضمیر اچھی طرح سے ادا نہیں کر سکا۔ شعر کے مفہوم سے ان کی عظمت کے بجائے گستاخی عیاں تھی۔ حشم وخدم نے شاعر کی عبارت کو ملکہ کی بے ادبی پر محمول کیا اور اس کو گرفتار کرنا چاہا مگر ملکہ نے ان سے کہا:

''اس کو نظر انداز کر دو، کیونکہ جس کی نیت اچھی بات کہنے کی ہو مگر اس سے لغزش ہو جائے، ایسا شخص اس آدمی سے بہتر ہے جس کی نیت بری ہو مگر وہ بات اچھی کہہ جائے۔''

ملکہ زبیدہ کی خدمت کے لیے سو نوکرانیاں تھیں جن کو قرآن کریم یاد تھا اور وہ ہر وقت قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ ان کے محل میں سے قرأت کی گنگناہٹ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح آتی رہتی تھیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

زبیدہ نے پانی کی قلت کے سبب حجاج کرام اور اہلِ مکہ کو درپیش مشکلات اور دشواریوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو انھوں نے مکہ میں ایک نہر بنانے کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ مکہ والوں کو بہت زیادہ مال سے نوازتی رہتی تھیں اور حج وعمرہ کے لیے مکہ آنے والوں کے ساتھ ان کا سلوک بے حد فیاضانہ تھا۔ اب نہر کی کھدائی کا منصوبہ سامنے آیا تو مختلف علاقوں سے ماہر انجینئر بلوائے گئے۔ مکہ مکرمہ سے 35 کلومیٹر شمال مشرق میں وادیٔ حسنین کے ''جبال طاد'' سے نہر نکالنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک نہر جس کا پانی ''جبال قرا'' سے ''وادی نعمان'' کی طرف جاتا تھا اسے بھی نہر زبیدہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ مقام عرفات سے 12 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع تھا۔ علاوہ ازیں منیٰ کے جنوب میں صحرا کے مقام پر ایک تالاب نہر زبیدہ کے نام سے تھا جس میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا، اس سے سات کاریزوں کے ذریعہ پانی نہر میں لے جایا گیا، پھر وہاں سے ایک چھوٹی نہر مکہ مکرمہ کی طرف اور ایک عرفات میں مسجد نمرہ تک لے جائی گئی۔ اس عظیم منصوبے پر سترہ لاکھ (17,000,00) دینار خرچ ہوئے۔

ملکہ زبیدہ نے انتہائی شوق اور جذبۂ اخلاص کے تحت نہر کی کھدائی کرائی تھی۔ وہ حجاج کرام اور اہلِ مکہ کو پانی کی دشواریوں سے نجات دلانا چاہتی تھیں اور یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے انھوں نے کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ نہر زبیدہ کی منصوبہ بندی شروع ہوئی تو اس منصوبہ کا منتظم انجینئر آیا اور کہنے لگا: ''آپ نے جس منصوبہ کا حکم دیا ہے اس کے لیے خاصے اخراجات درکار ہیں، کیونکہ اس کی تکمیل کے لیے بڑے بڑے پہاڑوں کو کاٹنا پڑے گا، چٹانوں کو توڑنا پڑے گا، نشیب و فراز کی مشکلات سے نمٹنا پڑے گا، سیکڑوں مزدوروں کو دن رات محنت کرنی پڑے گی، تب کہیں جا کر اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔''

یہ سن کر ملکہ زبیدہ نے جو جواب دیا وہ دلچسپ بھی ہے اور اس سے ان کی قوت فیصلہ اور منصوبے میں دلچسپی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے چیف انجینئر سے کہا:

''اس کام کو شروع کر دو، خواہ کلہاڑے کی ایک ضرب پر ایک دینار خرچ آتا ہو۔''

اس طرح جب نہر کا منصوبہ تکمیل کو پہنچ گیا تو منتظمین اور نگران حضرات نے اخراجات کی تفصیلات ملکہ کی خدمت میں پیش کیں۔ اس وقت ملکہ دریائے دجلہ کے کنارے واقع اپنے محل میں تھیں۔ ملکہ نے وہ تمام کاغذات لیے اور انھیں کھول کر دیکھے بغیر دریا برد کر دیا اور کہنے لگیں:

''الٰہی! مجھے دنیا میں کوئی حساب کتاب نہیں لینا، تو بھی مجھ سے قیامت کے دن حساب نہ لینا۔''

ملکہ زبیدہ نے یہ عظیم الشان کام انجام دے کر حجاجِ کرام اور باشندگانِ مکہ مکرمہ کو پانی کی قلت کے سبب درپیش مشکلات کا مسئلہ حل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس نہر کو ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔

ان کی وفات جمادی الاولیٰ 216ھ میں ہوئی۔ ♦♦♦

یقینِ کامل

فہیم اعوان

مادی کائنات آپ کے زیرِ اثر ہے، آپ اس کے مطیع نہیں ہیں

آپ نے کبھی موٹر سائیکل پر غور کیا ہے؟ اسے بنانے والی کمپنی نے صرف دو افراد کی گنجائش رکھی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ دو افراد سے زیادہ اس پر ایک وقت میں سوار نہیں ہو سکتے لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ اسی موٹر سائیکل کے پیچھے ایک چھکڑا لگا کر اس پر کم از کم چھے افراد کو بٹھا کر منزل مقصود تک پہنچایا جا رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ بنانے والے نے اس کی گنجائش دو افراد کی رکھی تھی، پھر یہ اپنی گنجائش سے زیادہ کیسے وزن اُٹھا سکتی ہے؟

غور و فکر کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی گنجائش دو افراد کی رکھی گئی تھی لیکن اس کی مجموعی اور حقیقی صلاحیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جس وجہ سے یہ بوقتِ ضرورت اس مقرر کردہ گنجائش سے زیادہ وزن اُٹھا لیتی ہے۔

اب ذرا یہی مثال سامنے رکھ کر آپ اپنے جسم کے بارے میں سوچیں کہ اسے بنانے والے نے اس کی گنجائش ایک فردِ واحد کی رکھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمارا جسم اس ایک فرد واحد کا وزن، جو عموماً ستر سے سو کلو گرام تک ہوتا ہے، اُٹھاتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنی کارکردگی کھونے لگتا ہے اور دوہرا ہونے لگتا ہے۔

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ایک کمپنی جو اپنی چند ہزار میں بکنے والی مشین کے بارے میں اتنی فکر مند ہے کہ اس کی تجویز کردہ گنجائش سے زیادہ اس کی صلاحیت رکھی تا کہ کسی بھی طرح کی ہنگامی حالت میں بھی اس کی بنائی ہوئی مشین کے بارے میں کوئی منفی تاثر نہ پیدا ہو اور جو دنیا کی سب سے اعلیٰ مشین یعنی آپ کے جسم کو بنانے والی اس عظیم ہستی نے کیا اس کی مجموعی صلاحیت میں کوئی کمی چھوڑی ہو گی؟

یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر مسئلہ

WAQAR AZ www.pakistanipo m

کہاں پر ہے؟ کہ ہماری کمر وقت کے ساتھ ساتھ جھکنے لگتی ہے، ہمارے جوڑ جوڑ دکھنے لگتے ہیں اور ہمارے قدم بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہونے لگتے ہیں؟ حتیٰ کہ دورِ جدید کے طبیب و حکماء بھی کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

ایک بات تو طے ہے کہ اگر آپ اپنی مشین کو رواں رکھنے والے عناصر جسے عرفِ عام میں تیل پانی کہتے ہیں کو بروقت ملاوٹ سے پاک اور مناسب مقدار میں مہیا نہیں کریں گے تو پھر اس کی کارکردگی میں کمی کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا کی باقی مشینوں اور اس خالق کائنات کی بنائی ہوئی مشین میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ آپ کے اس جسم کے اندر اس کا معالج خود موجود ہے جو اس میں موجود نقص بروقت درست کر دیتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ وہ معالج کون ہے؟ وہ ہے آپ کی روح یعنی آپ خود...... جی ہاں آپ کی روح آپ خود ہیں۔ یہ جسم تو آپ کا لباس ہے۔ ہم بیک وقت دو طرح کی کائنات میں رہ رہے ہیں۔ ایک تو وہ جو ہمیں اپنی ظاہری آنکھوں سے نظر آتی ہے، جس کی تصدیق تمام تر سائنسی علوم کرتے ہیں اور اسے ہم مادی کائنات کہتے ہیں۔ ہمارا جسم اسی مادی کائنات کا حصہ ہے جو یہاں موجود مادی عناصر جیسے آگ، ہوا، پانی، مٹی سے مل کر بنا ہے۔ طبیب و حکماء انھی مادوں کا مختلف طریقوں علاج کرتے ہیں۔ ہمارا یہ مادی جسم زمان و مکان، وقت کا محتاج ہے۔

دوسری طرف ایک روحانی کائنات ہے، جس کے ہم خود باسی ہیں۔ یہ کائنات زمان، مکان، وقت حتیٰ کہ موت سے یکسر آزاد ہے۔ بقول محترم واصف علی واصف صاحب:

"انسان اپنی ملکیت کی ملکیت بن چکا" مطلب یہ کہ اس مادی کائنات کی ہر چیز جیسے ہمارا جسم، ہمارا مکان، ہماری گاڑی اور باقی مادی اشیاء ہماری ملکیت میں ہیں، نہ کہ ہم ان کی ملکیت میں ہیں۔ حقیقتاً یہ سب کچھ ہمارا محتاج ہے نہ کہ ہم اس کے۔

درحقیقت سارے معاملات یہیں سے بگڑتے چلے جاتے ہیں جب آپ اپنے آپ کو اس مادی کائنات کے زیر اثر اور اسے اپنے اُوپر حاوی کر لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ وہ بھاری پتھر ہیں جنھیں ہم اپنی روح، یعنی اپنے اُوپر لاد کر چلتے رہتے ہیں اور جب ان کا وزن حد سے زیادہ تجاوز کرنے لگتا ہے تو ہمارا جسم ہمیں اس بوجھ کے ساتھ اُٹھاتے اُٹھاتے دوہرا ہونے لگتا ہے۔ ہمارے جوڑ جوڑ جکڑنے لگتے ہیں، ہمارے قدم ہمارا بوجھ اُٹھانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ پھر ہم اپنے اس مادی جسم کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے معالجین کا رخ کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم خود ہی تو اس کے معالج ہیں۔

اصل مسئلہ تو ہمارے اپنے اندر ہے۔ روح پر پڑا بوجھ ہمیں اس جسم کے علاج کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ ہم پر پڑا یہ بوجھ نا تو ظاہری آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا حقیقی علاج کسی ظاہری آنکھ رکھنے والے معالج کے پاس ہے۔ اس بوجھ کو دیکھنے کے لیے اندر کی آنکھ کا کھلا ہونا ضروری ہے۔ اپنے اندر کی آنکھ کو کھولنے کی کوشش کریں۔ جیسے ہی آپ کی روحانی آنکھ کھلے گی، چاہے تھوڑی سی سہی...... تو آپ کو اپنا بوجھ اور روحانی معالج نظر آنے لگے گا۔ اس آنکھ کو کھولنے کے لیے کچھ بنیادی باتیں کرتے چلیں۔

پہلی بات...... ہمیشہ مؤثر رہیں اور کبھی بھی کسی سے بھی متاثر نا ہوں۔

دوسری بات...... یقینِ کامل۔ آپ اس بات کا یقین اپنے اندر بٹھا لیں کہ آپ ایک روحانی کائنات کے فرد ہیں اور مادی کائنات کی ہر چیز آپ کے زیر اثر ہے۔ مادی کائنات کی کوئی بھی چیز آپ پر حاوی نہیں۔ بظاہر حالات کتنے ہی اس کے مخالف کیوں نہ لگیں آپ نے ہر حال میں اس یقین کو پانا ہے۔

جیسے ہی آپ کا ان دو باتوں پر عمل پختہ ہوگا آپ کو اس مسئلے کے کئی حل نظر آنے لگیں گے۔ ●●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تاریخِ عالم

محسن فارانی

یورپی سامراج کی خونریزیاں

جدید تہذیب کی علمبردار یورپی اقوام نے گزشتہ صدیوں میں بنی نوع انسان کا جو خون بہایا ہے، اس کی دیگر اقوام میں

قرونِ وسطیٰ کی خوفناک جنگوں میں قتل اور اذیت دہی کے اتنے بھیانک ذرائع اور آلات استعمال کیے گئے کہ ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

مثال نہیں ملتی۔ اہل یورپ (Europeans) مختلف نسلوں پر مشتمل اقوام کا مجموعہ ہیں۔ 2002ء میں شائع ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق ان نسلوں کی کل تعداد 87 تک پہنچتی ہے جن میں سے 33 نسلیں نسبتاً بڑی اور اپنے اپنے ممالک رکھتی ہیں۔ ان نسلوں میں سے اہم ترین نسلیں: روسی، جرمن، فرانسیسی، انگریز، اطالوی، یوکرینی، ہسپانوی اور پرتگالی ہیں۔

انگریزوں (The English) کو اینگلوسیکسن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال پہلے جرمنی کے علاقوں اینگلیا (Anglia) اور سیکسنی (Saxony) سے آ کر جزیرہ برطانیہ (Britian) میں آباد ہوئے تھے۔ ان سب نسلوں کو ایک ثقافت نے متحد رکھا ہوا ہے جو کہ ''یہودی عیسائی ورثہ (Judeo-Christian Heritage)'' کے نام سے معروف ہے۔

یہ اصطلاح عصر حاضر میں مغربی دنیا میں بہت عام ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان مضبوط رشتہ قائم ہے اور وہ دونوں فکری اور ثقافتی لحاظ سے ایک ہی جنس ہیں۔ اگرچہ قرون وسطیٰ کی یورپی مملکتوں میں یہود کو صدیوں تعذیب وہلاکت کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ان کی اس دشمنی کے ڈانڈے 29ء میں عیسیٰ مسیح علیہ السلام پر رومی گورنر پونتس پیلاطس کی عدالت میں چلائے جانے والے مقدمے سے جا ملتے ہیں۔ جب ان کے دشمن یہود نے انھیں سولی پر چڑھانے کے احکام جاری کروا لیے تھے مگر قدرت الٰہی سے انھیں زندہ آسمانوں پر اُٹھا لیا گیا۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں جب رومی حکمران عیسائی ہو گئے اور یورپ میں عیسائیت رائج ہوگئی تو پھر صدیوں وہاں یہودی عیسائیوں کے ظلم کا نشانہ بنتے رہے۔

جب انگریز بادشاہ رچرڈ تیسری صلیبی جنگ میں شرکت کی تیاری کر رہا تھا تو اس نے انگلستان میں صلاح الدین ٹیکس (Saladin Tax) لگایا تھا اور یہودیوں سے اضافی ٹیکس وصول کیا تھا۔ جنگی اخراجات کے لیے مزید رقم کی ضرورت تھی، چنانچہ انگریز فوج نے یارک شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں یہود کی ایک بڑی آبادی تھی اور شبہ تھا کہ انھوں نے اپنی پوری دولت ظاہر نہیں کی۔ حالت یہ تھی کہ یارک شہر کے باہر عیسائی نعرے لگا رہے تھے:

''مسیح کے دشمنوں کو مار دو!'' محصور یہودیوں نے اس خدشے سے فیصلہ کیا کہ ہمیں یہ لوگ قتل بھی کریں گے اور ہماری دولت اور عورتیں بھی چھین لیں گے، لہٰذا مسادا شہر (فلسطین) کے آباء کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ہم بھی اجتماعی خودکشی کر لیں جیسے بارہ سو برس پہلے انھوں نے رومیوں کے حملے کے وقت اجتماعی خودکشی کی تھی، چنانچہ یارک میں ہر یہودی نے گھر میں اپنے بیوی بچے ذبح کر دیے، پھر اکٹھے ہو کر انھوں نے قرعہ ڈالا اور دس آدمیوں کے نام نکلے جو بغدے لے کر کھڑے ہو گئے اور قطاروں میں آگے آنے والوں کی گردنیں اُتارتے گئے۔ پھر ان دس افراد میں قرعہ اندازی سے ایک یہودی کا نام نکلا اور اس نے باقی نو کی گردنیں اُڑا دیں اور آخر میں اپنے سینے میں خنجر مار کر جان دے دی۔ یوں یارک کے سینکڑوں یہودیوں نے اجتماعی خودکشی کر لی اور پھر ان کی دولت رچرڈ کے ہاتھ آئی۔

ایسے ہی سولھویں صدی عیسوی میں سپین کی مذہبی عدالتوں کے حکم پر مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں کو بھی زندہ جلایا اور شکنجوں میں کسا جاتا تھا۔ فرانس، اٹلی، ہالینڈ اور جرمنی وغیرہ میں کئی بار یہود کا قتل عام کیا گیا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ''وینس کا سوداگر'' میں اسی دور کے ایک سودخور لالچی یہودی شائی لاک کا نفرت انگیز کردار پیش کیا گیا ہے اور بیسویں صدی میں نازیوں کے ہاتھوں یہود کا قتل عام ابھی کل کی بات ہے۔

4) قرون وسطیٰ کی طویل یورپی جنگوں میں لاکھوں افراد قتل ہوئے جو متعدد بار برپا ہوئیں۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان صد سالہ اور ہفت سالہ جنگیں ہوئیں۔ صد سالہ جنگ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دراصل 1337ء سے 1453ء تک لڑی گئی جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے فرانس کے علاقوں پر اپنا دعویٰ ختم کر دیا۔ مغربی فرانس کا ایک بڑا علاقہ آج بھی برٹنی (Brittany) کہلاتا ہے۔

5) ان یورپی جنگوں کی ایک مثال وہ تیس سالہ جنگ (1618ء تا 1648ء) ہے جس میں گیارہ ملین سے زائد لوگ مارے گئے تھے اور جرمنی کی آبادی بیس ملین (2 کروڑ) سے کم ہو کر تیرہ ملین (ایک کروڑ 30 لاکھ) رہ گئی تھی۔ مردوں کی تعداد بہت کم رہ جانے سے اس جنگ نے ایک مرد کو کئی کئی شادیاں کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس جنگ کے آخری پندرہ برسوں میں نہایت خونریز معرکے ہوئے۔ مسٹر گنڈلے نے اپنی کتاب ''تیس سالہ جنگ'' میں لکھا ہے کہ ایک معرکے میں لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد صرف 38 ہزار تھی جبکہ ان کے پیچھے پیچھے ایک لاکھ 27 ہزار عورتوں اور بچوں کا جم غفیر بھی چلا آ رہا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو وسطی یورپ کا بیشتر حصہ کھنڈر بن چکا تھا اور 8 لاکھ سپاہی ان جنگی معرکوں میں کام آئے تھے۔ یہ جنگ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقہ بندی کی بنا پر لڑی گئی تھی۔

6) سولہویں صدی عیسوی میں فرانس کی مذہبی جنگوں میں مجموعی طور پر چالیس لاکھ کے قریب لوگ قتل ہوئے۔ یہ جنگیں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحی فرقوں کے درمیان لڑی گئیں۔ اس کے بعد فرانس آج بھی کیتھولک اکثریت کا ملک ہے۔

7) برطانیہ اور فرانس کے مابین سات سالہ جنگ (1756ء تا 1763ء) میں 14 لاکھ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ جنگ یورپ، امریکہ اور ہندوستان میں لڑی گئی۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ نے فرانس سے نیو فرانس (کینیڈا) اور بحرالکاہل اور بحر ہند کے کئی جزیرے ہتھیا لیے۔

8) نپولین کی جنگوں (1798ء تا 1815ء) میں 60 لاکھ سے زیادہ لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ 1798ء-1799ء میں نپولین نے مصر و شام پر حملہ کر کے خونریزی کی تھی۔ مئی 1803ء میں نپولین نے یورپ فتح کرنے کا آغاز کیا اور اگلے سال وہ شاہ فرانس بن گیا اور مغربی اور وسطی یورپ فتح کرنے کے بعد 1812ء میں پونے سات لاکھ فوج کے ساتھ ماسکو پر چڑھائی کر دی لیکن ماسکو والے شہر کو آگ لگا کر فرار ہو چکے تھے اور جو شہر میں رہ گئے تھے وہ مزاحمت کرتے رہے۔ اس دوران برف باری معمول سے پہلے شروع ہو گئی جس میں بہت بڑی تعداد میں فرانسیسی ہلاک ہو گئے اور پھر نپولین کو نامراد ہو کر واپس آنا پڑا۔

1815ء میں واٹرلو کی جنگ میں نپولین نے متحدہ یورپی لشکر سے شکست کھائی اور پھر زندگی کے آخری چھے سال اسے بحر اوقیانوس جنوبی کے جزیرہ سینٹ ہیلینا میں برطانوی قید میں گزارنا پڑے۔

9) یورپی سامراجی ممالک نے 1884ء کی برلن کانفرنس میں براعظم افریقہ کی بندر بانٹ کر لی تھی اور افریقی ممالک کو غلام بنا کر ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔ 1904ء میں جنوب مغربی افریقہ (موجودہ نمیبیا) کے ہریرو قبیلے نے قابض جرمن حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس پر جرمن فوج نے اس باغی قبیلے کو صحرائے کالاہاری میں دھکیل دیا اور جنہوں نے واپس آنے کی جسارت کی، ان سب کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ اس طرح نصف ہریرو قبیلہ جرمنوں کی خون خواری کی نذر ہو گیا۔ اب چند سال پہلے جرمن حکومت نے اس قتل عام پر نمیبیا کی حکومت سے معافی مانگی۔

جرمن مشرقی افریقہ جو اس وقت تانگانیکا کہلاتا تھا اور آج کل تنزانیہ کے نام سے معروف ہے، 1905ء میں تانگانیکا کے لوگوں نے ظالمانہ ٹیکسوں اور جبری بیگار پر احتجاج کیا تو ان پر سختیاں کی گئیں اور پھر پورے ملک میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ تانگانیکا کی یہ بغاوت ''میجی میجی'' کہلاتی ہے۔ قابض جرمنوں نے بغاوت کچلنے کے لیے ان کے لیڈر گولیوں سے اُڑا دیے اور وہاں مصنوعی قحط پیدا کر دیا۔ جرمن فوجی فصلوں، اناج

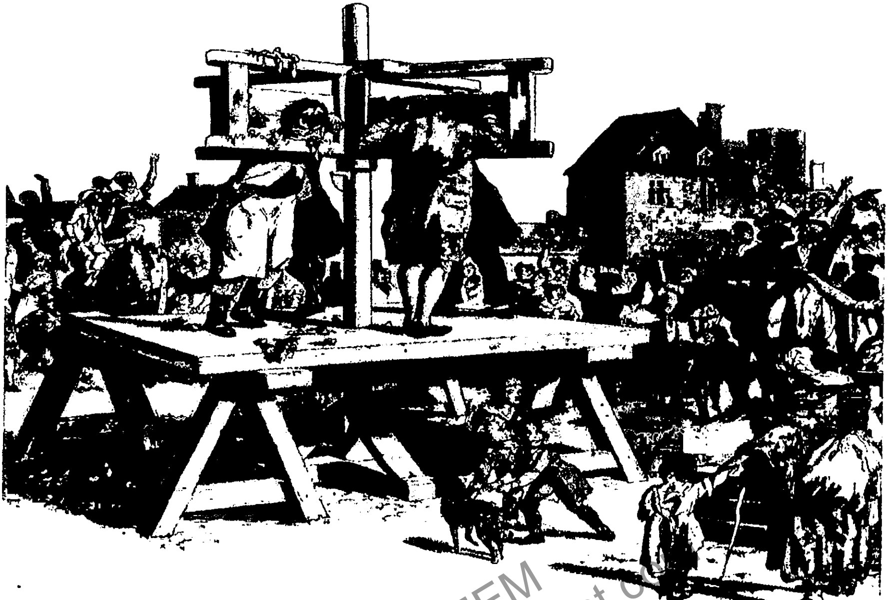

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

گھروں اور دیہات نذرِ آتش کرتے رہے۔ یوں دو لاکھ سے زیادہ افریقی باشندے ہلاک ہو گئے۔

10) آسٹریا اور سربیا کے تنازع سے شروع ہونے والی پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) میں 20 ملین (2 کروڑ) سے زیادہ لوگ مارے گئے۔

ایک سرب دہشت گرد نے بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو میں آسٹروی ولی عہد فرڈی ننڈ کو ہلاک کر دیا تھا اور قاتل آسٹروی صوبہ بوسنیا سے فرار ہو کر سرحد پار سربیا میں جا چھپا تھا۔ آسٹریا کے بادشاہ نے اس کی حوالگی کا مطالبہ کیا جو برطانیہ اور فرانس کی شہ پر مسترد کر دیا گیا۔ اس پر مغربی طاقتوں میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس جنگ میں شریک سلطنت عثمانیہ کو سب سے زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا اور مصر، فلسطین، شام، لبنان اور عراق ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

1915-1916ء کی گیلی پولی کی جنگ قسطنطنیہ پر قبضے کے لیے لڑی گئی جس میں حملہ آور اتحادیوں برطانیہ، فرانس، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا کے ایک لاکھ 72 ہزار فوجی مارے گئے جبکہ ایک لاکھ 89 ہزار ترک شہید ہوئے۔

11) پہلی جنگ عظیم میں جرمنی پر بھاری تاوان کے علاوہ شدید پابندیاں لگائی گئیں جن کے نتیجے میں جرمنی میں ہٹلر کو اپنی آمریت قائم کرنے کا موقع ملا۔ اس نے 1938ء میں آسٹریا اور پھر چیکوسلاویکیا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جرمنی کے پولینڈ پر حملے کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) شروع ہو گئی جس میں تقریباً 85 ملین (ساڑھے آٹھ کروڑ) انسان کام آئے۔ صرف روس کے دو کروڑ لوگ اس جنگ کا ایندھن بنے۔ آخر کار جرمنی کے اتحادی جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹم بموں کی نازل کردہ تباہی کے ساتھ یہ جنگ ختم ہو گئی۔

12) روسی کمونسٹ آمر جوزف سٹالن کے دور (1924ء

تا 1953ء) کی روسی خانہ جنگی میں نو ملین (90 لاکھ) سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے۔ ان میں زیادہ تر کسان، مزدور اور کریمیا، چیچنیا اور ترکستان کے نہتے مسلمان تھے۔

13) جنگ کوریا (1950ء تا 1953ء)، جنگ ویت نام (1964ء تا 1975ء)، سوویت روس کی افغان جنگ (1979ء تا 1989ء) اور امریکہ کی افغان جنگ (2001ء تا 2020ء)۔ ان جنگوں میں نصف کروڑ کے لگ بھگ انسان ہلاک ہوئے ہیں۔ جنگ ویت نام میں دس لاکھ کے قریب ویت نامی مارے گئے جبکہ 58 ہزار امریکی مارے گئے۔

روس اور امریکہ دونوں نے افغانستان پر جو جنگیں مسلط کیں، ان میں کم و بیش دس دس لاکھ افغانی شہید کر دیے گئے۔ ان کے علاوہ امریکہ کی جنگ عراق (2003ء تا 2008ء) میں 6 لاکھ کے قریب عراقی مارے گئے اور تقریباً ساڑھے چار ہزار امریکی جہنم رسید ہوئے۔

امریکی افغان جنگ کا شاخسانہ پاکستان پر امریکی ڈرون حملے بھی ہیں۔ فوجی آمر جنرل پرویز مشرف کی اجازت سے ان ڈرون حملوں کا آغاز 17 جون 2004ء کو ہوا جب جنوبی وزیرستان میں ڈرون میزائل نے طالبان کمانڈر نیک محمد کو شہید کر دیا۔ 30 نومبر 2005ء کو میر علی (شمالی وزیرستان) اور پھر 13 جنوری 2006ء کو ڈمہ ڈولا (باجوڑ) پر عید قربان کے روز ڈرون حملہ ہوا جس میں 22 افراد شہید ہوئے۔ برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب کے مطابق یہ حملہ غلط اطلاع پر کیا گیا تھا جس میں مارے جانے والوں میں 5 عورتیں اور 5 بچے بھی شامل تھے جبکہ 14 شہدا کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا۔ ایک حملہ اکتوبر 2006ء میں خار (باجوڑ) میں ہوا جس میں مدرسے کے 84 طلبہ و اساتذہ فجر کے وقت شہید کر دیے گئے۔ ڈمہ ڈولا اور خار کے ڈرون حملوں کے بعد مشرف حکومت نے اعلان کیا کہ یہ کارروائی ہماری فورسز نے کی ہے۔ اس کا مقصد عوام کو امریکی غنڈہ گردی سے بے خبر رکھنا تھا۔

امریکی صدر اوباما کے دور میں 23 جون 2009ء کی سہ پہر مکین (جنوبی وزیرستان) میں لوگ نماز جنازہ پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ان پر تین میزائل آن گرے۔ اس سانحے میں نیویارک ٹائمز کے مطابق 60 بے گناہ شہری جاں بحق ہوئے۔ اسی برس 18 اکتوبر کو رغزئی (جنوبی وزیرستان) میں ڈرون حملہ ہوا۔ ایک کمپاؤنڈ پر دو میزائل فائر کیے گئے تھے۔ لوگ امدادی کارروائی کے لیے وہاں پہنچے تو ایک اور ڈرون حملہ ہو گیا جس سے 13 افراد شہید ہو گئے۔ اگلے روز جب لوگ اجتماعی جنازے کے لیے اکٹھے ہوئے تو تیسرا ڈرون حملہ کر دیا گیا جس میں 70 لوگ شہادت پا گئے۔

امریکا کی یہ سفاکی عین اس روز عمل میں آئی جب مقامی عسکریت پسندوں کے ساتھ معاہدہ ہونے والا تھا۔ ان ڈرون حملوں کے نتیجے میں شروع ہونے والی دہشت گردی کے آزار سے پاکستان آج تک نجات نہیں پا سکا۔

یورپی جنگیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس مضمون میں ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ قرون وسطیٰ کی خوفناک جنگوں میں قتل اور اذیت دہی کے اتنے بھیانک ذرائع اور آلات استعمال کیے گئے کہ ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مثلاً قیدیوں کے جسموں میں لوہے کی کنگھیاں گاڑی گئیں۔ جسموں کو چیرنے کے لیے آریاں استعمال کی گئیں۔ بھاری آلات سے ہڈیوں کو کچلا گیا۔ آگ پر تپائی گئی لوہے کی سلاخوں سے جسموں کو داغا گیا۔ ٹانگیں توڑ دی گئیں۔ جبڑوں کو اُکھاڑا گیا۔ عورتوں کے پستانوں کو مشینوں کے ذریعے جڑوں سے کھینچا گیا۔ قیدی لوہے کے تابوتوں میں بند کر دیے گئے۔ تفتیش کے لیے قیدیوں کو کیل دار کرسیوں پر بٹھایا گیا۔ اندلس کے مجبور مسلمانوں پر بھی ایسے ہی ہولناک مظالم ڈھائے گئے۔ لاکھوں اندلسی مسلمان شہید اور لاکھوں جلاوطن کر دیے گئے جبکہ لاکھوں جبراً عیسائی بنا لیے گئے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جب یورپی اقوام اپنے انھی ظلم وستم کے ہتھیاروں کے ساتھ دنیا میں نکلیں تو انھوں نے انسانیت کو بے انتہا تباہی اور بربادی سے دوچار کیا۔ اس کی تفصیلات ہوشربا ہیں:

1) یورپی عیسائی براعظم امریکہ کی طرف بڑھے تو انھوں نے ناقابل تصور بھیانک وسائل اور ذرائع استعمال کرتے ہوئے وہاں کے اصلی باشندوں کا صفایا کر دیا جنھیں کولمبس نے ریڈ انڈینز کا نام دیا تھا۔ انھوں نے ریڈ انڈینز کو چیچک، تپ دق اور ہیضے کے جراثیم سے آلودہ سینکڑوں کمبل تحفے کے طور پر دیے تاکہ آرام سے انھیں ختم کر دیں اور اس طرح چند ہی دہائیوں میں لاکھوں مقامی باشندوں کو قتل کیا۔

یورپی سامراجیوں نے ایک اور شرمناک ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہوئے مقامی باشندوں کے سروں کی قیمتیں مقرر کیں جس کے نتیجے میں بہت سارے انسانی شکاری بر اعظم امریکا میں پھیل گئے جنھوں نے انعام کے لالچ میں انتہائی بے دردی سے انسانی کھوپڑیاں اُڑائیں حتیٰ کہ ہر طرف کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں ہو گئیں۔ انسانی شکاری اس بات پر فخر کیا کرتے کہ ان کے جوتے انسانی چمڑے سے بنے ہوئے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ انسان کا چمڑا

اُتارنے اور مثلہ کرنے کے لیے باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں سینئر یورپی نمائندے شرکت کیا کرتے تھے۔

یورپیوں نے براعظم امریکا میں ایک سو ملین (10 کروڑ) سے زیادہ مقامی باشندوں کو نیست و نابود کر کے ان کی جگہ وہاں یورپیوں کو بسایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج شمالی اور جنوبی امریکا کے تمام ممالک میں مختلف نسلوں کے یورپی باشندے بستے ہیں، مثلاً:

برازیل کے باشندے پرتگالی اور ہسپانوی ہیں۔

ارجنٹائن میں ہسپانوی اور اطالوی بستے ہیں۔

برازیل کے سوا لاطینی امریکا کی زیادہ تر آبادی ہسپانوی نژاد ہے، خصوصاً چلی، یوراگوئے، کولمبیا، میکسیکو، پیرو، کیوبا، وسطی امریکا اور وینز ویلا وغیرہ میں۔

2) پندرہویں، سولہویں صدی عیسوی میں جب یورپیوں نے براعظم افریقا کا رخ کیا تو انھوں نے غلامی کو انسانوں اور مویشیوں کی تجارت میں تبدیل کر دیا۔ یورپین حکومتوں نے اس تجارت پر اجارہ داری قائم کی اور اس کے لیے ''اصول و ضوابط'' وضع کیے۔ غلاموں کی تجارت کرنے والی کمپنیوں کے حصص سب سے زیادہ نفع بخش تھے۔ غلاموں کی تجارت اور نجی کمپنیوں کو اس کی اجازت ملنے کے بعد ان کمپنیوں نے ایک کروڑ سے زائد افریقیوں کو یورپی اقوام کی امریکی کالونیوں (نوآبادیوں) میں لے جا کر فروخت کیا۔

صرف فرانسیسی کمپنیاں سالانہ کم از کم ایک لاکھ افریقیوں کو براعظم امریکا میں فرانس کے زیر قبضہ علاقوں میں بھیجتی تھیں۔ اس انسان دشمن تجارت میں ہسپانوی اور انگریزی کمپنیوں اور اطالوی، جرمن اور پرتگالی تاجروں کو بھی شامل کر لیں تو تعداد کہاں تک پہنچ جائے گی۔ صرف امریکہ کے دونوں براعظموں (شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ) میں بھیجے جانے والے افریقیوں کی تعداد کا اندازہ ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔

یہ ایک نفع بخش اور مقبول کاروبار تھا جس کے لیے یورپی حکومتیں ضروری اجازت نامے جاری کرتی تھیں اور لوگ ان کمپنیوں کے حصص (شیئرز) خرید کر ان میں اپنا پیسہ لگاتے تھے۔

یہ ظلم و ستم کی وہ داستانیں تھیں جو یورپیوں نے امریکہ اور افریقہ میں رقم کیں۔ اب بات کرتے ہیں براعظم ایشیا کی۔

3) ایشیا میں انھوں نے بڑا عجیب کام کیا۔ ہندوستان کے ساحلوں اور جزائر شرق الہند (ایسٹ انڈیز) پر قابض یورپی حکومتیں منشیات کا کاروبار کرتی تھیں۔ برطانیہ نے 1781ء میں چین کو ہندوستان سے افیون کی پہلی کھیپ برآمد کی۔ جب چینیوں پر افیون کی خرابیاں ظاہر ہونے لگیں تو چین کے بادشاہ نے ایک فرمان جاری کر کے اس کی درآمد پر پابندی عائد کر دی۔ فرانس اور برطانیہ نے اپنے بحری بیڑے اور فوجیں چین کی طرف بھیج دیں تاکہ وہ منشیات کی تجارت کے لیے اپنے دروازے کھولے۔

اس جنگ افیون میں وہ چین کو شکست دینے اور دارالحکومت نانکنگ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور جون 1858ء میں انھوں نے چین کے بادشاہ کو برطانیہ، فرانس، ریاست ہائے متحدہ امریکا اور روس کے نمائندوں کے ساتھ ''تیان جن (Tianjin)'' نامی معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے میں درآمد کی اجازت ملنے والے تجارتی سامان میں افیون کو بطورِ خاص متعارف کروایا گیا نیز اس میں یہ بھی طے ہوا کہ چین میں عیسائیت کے فروغ کی اجازت ہو گی۔

اس معاہدے کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین میں 1850ء میں نشے کے عادی افراد کی تعداد دو ملین تھی جو بڑھ کر 1878ء میں 120 ملین یعنی 12 کروڑ ہو گئی۔ یہ معاہدہ 1911ء تک قائم رہا حتیٰ کہ سن یات سن کی قیادت میں جمہوری انقلاب برپا ہوا تو معاہدہ تیان جن منسوخ قرار پایا۔

مذکورہ بالا حقائق یورپیوں کی ظالمانہ فطرت کی مختصر سی جھلکیاں دکھاتے ہیں جسے بدلنے میں ان کی نام نہاد تہذیب

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بھی کامیاب نہیں ہوسکی۔ ''مہذب'' یورپیوں نے ہر وہ بہیمانہ کام کیا جو ایک جاہل اور اجڈ جنگلی کو بھی زیب نہیں دیتا۔

4) عصر حاضر کی تاریخ میں دنیا نے بوسنیا کے قتل عام کا مشاہدہ کیا ہے جس میں ظالم سرب عیسائیوں کے ہاتھوں تین لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ 60 ہزار مسلمان عورتوں اور بچیوں کی عصمت دری کی گئی اور ڈیڑھ ملین (15 لاکھ) مسلمان بے گھر ہوئے۔ یہ قتل عام تقریباً چار سال جاری رہا جس میں سربوں نے 800 مساجد کو شہید کیا۔ ان مساجد میں سے کچھ تو سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وحشی سربوں نے بوسنوی دارالحکومت سرائیوو (Sarajevo) کے غازی خسرو بیگ (Gazi-Husrev-Beg) نامی تاریخی کتب خانے کو جلا دیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو حراستی کیمپوں میں ڈال کر ان پر خوفناک تشدد کیا۔ انھیں بھوکا پیاسا رکھا حتیٰ کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئے۔

بوسنیا میں سب سے المناک سانحہ جولائی 1995ء میں ہوا جب سریبرینیکا (Srebrenica) کا مشہور قتل عام ہوا جس کا سربوں نے دو سال تک محاصرہ کیے رکھا۔ جب وہ اہل سریبرینیکا کو دو سال تک بھوکا پیاسا رکھنے کے باوجود ان پر غلبہ نہ پا سکے تو محصور مسلمان مجبوراً رات کی تاریکی میں جائے پناہ ڈھونڈنے نکلے مگر وحشی سرب فوج نے انھیں راستے میں گھیر لیا اور ایک فیکٹری کے احاطے میں لے گئے۔ وہاں انھوں نے مَردوں کو عورتوں سے الگ کیا اور 8 ہزار مَردوں اور لڑکوں کو جمع کر کے سب کو چھری چاقوؤں سے ذبح کر دیا اور ان کا بدترین مثلہ کیا۔ یہ سب انھوں نے سریبرینیکا شہر کی حفاظت کی ذمہ داری پر مامور ڈچ فوج کی موجودگی میں کیا۔

سربوں کی طرح کروٹ عیسائیوں نے بوسنیا سے متصل ہرسیگووینا میں مسلمانوں کا خون بہایا اور موستار شہر میں دریا پر بنا وہ تاریخی پل بھی برباد کر دیا جسے یونیسکو نے ''تاریخی انسانی ورثہ'' قرار دے رکھا تھا۔

5) گزشتہ چند سال میں اقوام یورپ کی سب سے

گھناؤنی اور سنگین وارداتوں میں سے ایک مارچ اپریل 2003ء میں امریکی افواج کا قبضہ ہے جن میں 80 فیصد فوجی دراصل انگریز، جرمن اور آئرش تھے۔ امریکیوں نے عراقی قیدیوں پر شرمناک مظالم ڈھائے۔ ایک سکینڈل 2004ء میں منظر عام پر آیا۔ امریکی افواج نے بدنام زمانہ ابوغریب جیل (بغداد) میں قتل، عصمت دری اور خوفناک تشدد جیسے جرائم کیے تھے۔ انھوں نے عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی۔ مردوں کو بجلی کے جھٹکے لگائے اور ان پر بھوکے کتے چھوڑ کر ان کے جسموں کو تار تار کیا۔

امریکی افواج نے عراقی قیدیوں پر تشدد کے 13 مختلف طریقے آزمائے جن میں مارنے پیٹنے سے لے کر، جنسی حملے، آبروریزی، کئی کئی دنوں تک مردوں اور عورتوں کو برہنہ رکھنے، مرد قیدیوں کو برہنہ کر کے انھیں خواتین کے زیر جامہ پہننے پر مجبور کرنے، قیدیوں سے ہم جنس پرستانہ حرکتیں کروا کر ان کی فلمیں بنانے اور برہنہ قیدیوں کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرنے کے شرمناک طریقے شامل تھے حتیٰ کہ برہنہ عراقی مردوں کے ساتھ بے حیا امریکی فوجی خواتین کی شرمناک حرکات کی ویڈیو بھی منظر عام پر آ گئی۔ یہ ویڈیو ایک امریکی فوجی بریڈلے میننگ نے عام کر کے امریکہ کے چہرے پر کالک مل دی۔

یہ یورپیوں کی یورپ سے باہر جنگوں کا ثمر تھا کہ وہ دنیا کی وسیع قیمتی زمینوں پر قابض ہو کر خود کو پوری دنیا کا مالک گرداننے لگے تھے۔ چنانچہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے مقامی باشندوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد آج یورپی گورے وہاں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ آسٹریلیا کے اصلی باشندوں ''ایبارجنز'' (Aborigins) کا صفایا کرنے کے بعد یورپی فرنگی آسٹریلیا کے بھی مالک ہیں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں جب برطانوی آسٹریلیا پہنچے تو کوئی اس ویران برّاعظم میں آباد ہونے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار عیار برطانوی حکمرانوں نے جیلوں سے قاتلوں اور ڈاکوؤں کو نکالا اور بحری جہازوں میں بھر کر موجودہ سڈنی کے ساحل پر چھوڑ دیا کہ وہیں مرو، جیو۔ یوں آسٹریلیا گوروں سے آباد ہونے لگا اور انیسویں صدی میں ان گورے قاتلوں اور ڈاکوؤں نے ایبارجن باشندوں کو نیست و نابود کر کے آسٹریلیا کو گوروں کا ملک بنالیا۔

اسی طرح یورپی روسی گورے برّاعظم ایشیا کے پورے شمالی علاقے سائبیریا کے مالک ہیں جو لاکھوں مربع میل پر محیط ہے۔ روسی سامراجی اٹھارویں انیسویں صدیوں میں یورپی روس سے نکل کر سائبیریا کے وسیع و عریض رقبے پر قبضہ کرتے چلے گئے حتیٰ کہ ایشیا کے انتہائی مشرق میں آبنائے بیرنگ (4 کلومیٹر چوڑی) پار کر کے شمالی امریکہ کے وسیع علاقے الاسکا پر بھی قبضہ کر لیا جسے بعد میں 1867ء میں زارِ روس نے امریکا کے ہاتھ بیچ دیا کیونکہ اب روسیوں کو وسطی ایشیا (ترکستان) پر قبضہ کرنے کی فوجی مہمات کے لیے سرمایہ درکار تھا۔

جزیرہ برطانیہ کے انگریز سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے تجارت کرنے آئے اور اگلی صدی میں مغلیہ سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ 1757ء میں بنگال پر برطانوی قبضے سے لے کر 1803ء میں سقوطِ دہلی، 1843ء میں سندھ اور 1849ء میں پنجاب پر قبضے کے بعد برطانوی ہند کی حدود درہ خیبر تک پہنچ گئیں۔

انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں 1857ء میں ہندوستان میں ایک بڑی بغاوت نے جنم لیا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا جبکہ وہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی۔ انگریز سازشوں اور جدید اسلحے اور تربیت یافتہ فوج کی مدد سے بڑی خونریزی کے بعد جون 1858ء تک بغاوت فرو کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں سے خوفناک انتقام لیا۔ دہلی اور

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دوسرے شہروں میں جگہ جگہ پھانسیاں گڑی تھیں حتیٰ کہ بڑے بڑے درختوں کے تنوں سے لٹکا کر سینکڑوں ہندوستانیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان شہداء میں بھاری اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی۔ بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں اور علماء کو توپ دم کیا گیا یعنی انھیں توپ کے دہانے سے باندھ کر توپ داغی جاتی اور ان مجبوروں کے جسموں کے چیتھڑے اُڑ جاتے جبکہ انگریز مرد اور عورتیں اس ''تماشے'' سے محظوظ ہوتے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں علماء کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں یعنی انھیں جہازوں میں بھر کر دُور دراز بحر ہند کے جزائر انڈیمان میں عمر قید کے لیے بھیج دیا جاتا۔

برطانیہ پر حکومت کرنے والے انگریز برطانیہ کے علاوہ آج بھی 16 دیگر ممالک اور علاقوں کے مالک ہیں جو اگرچہ خودمختار ممالک کے طور پر رجسٹرڈ ہیں لیکن اس کے باوجود برطانوی تاج کی عملداری میں آتے ہیں اور انھیں برطانوی اوورسیز ٹیریٹریز (سمندر پار علاقے) کہا جاتا ہے جن میں سب سے مشہور کینیڈا، آسٹریلیا اور جمیکا ہیں۔ دیگر برطانوی زیر قبضہ علاقے جبرالٹر، جزائر فاک لینڈ، سینٹ ہلینا وغیرہ ہیں۔

فرانسیسی بھی دنیا بھر میں وسیع و عریض زمینیں رکھتے ہیں جو دنیا کے مختلف براعظموں میں تقسیم ہونے والے 13 خطے بنتے ہیں جنھیں فرانسیسی اوورسیز ٹیریٹریز کہا جاتا ہے، مثلاً نیو کیلیڈونیا (بحرالکاہل)، فرنچ گیانا (جنوبی امریکا)، جزیرہ مارتنیق (ویسٹ انڈیز)، ری یونین (بحر ہند) اور جزیرہ مایوٹی (جزائر قمریا کوموروز)۔

ڈنمارک ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر وہ یورپ سے باہر اپنے سے دس گنا بڑے علاقوں کا مالک بن چکا، جیسے گرین لینڈ اور جزائر فارو۔ یاد رہے گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے جو تقریباً 23 لاکھ مربع کلومیٹر پر محیط ہے یعنی پاکستان کے رقبے کا تین گنا۔

یوں یورپی گورے اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ علاقوں پر قابض ہیں۔ ان میں سے اکثر دنیا کے امیر ترین خطے ہیں۔ اس طرح انھوں نے عالمی دولت کا بڑا حصہ حاصل کر رکھا ہے جس کے چھن جانے کا اندیشہ بھی نہیں۔ وہ دنیا پر اپنا تسلط جما کر تاریخ کی بے مثال دولت اور عیش و عشرت کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ مغربی یہود و نصاریٰ نے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے بعض نام نہاد عالمی ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ ان میں سرفہرست اقوام متحدہ (UN) ہے۔

یہ ادارہ دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں یہود و نصاریٰ کے مخصوص مفادات کے لیے قائم کیا گیا، چنانچہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 29 نومبر 1947ء کو تقسیم فلسطین کی ظالمانہ قرارداد منظور کر کے اسرائیل کے قیام میں ابلیسی کردار ادا کیا۔ اس کے چھے ماہ بعد 14 مئی 1948ء کو فلسطین میں یہود کی ناجائز ریاست اسرائیل وجود میں آ گئی اور ظالم یہودیوں نے لاکھوں مسلمان فلسطینیوں کو ان کی زمینوں اور جائیدادوں سے جبراً بےدخل کر دیا اور آج وہ بے چارے غزہ کی پٹی، لبنان، شام اور اردن کے کیمپوں میں بڑی مشکل زندگی گزار رہے ہے جبکہ اسرائیل یورپ اور امریکا کی پشت پناہی سے جون 1967ء کی جنگ جیت کر پورے فلسطین پر قابض ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کا بھی منہ چڑا رہا ہے۔

مسئلہ فلسطین کی طرح مسئلہ کشمیر بھی برطانیہ اور اسی اقوام متحدہ کا پیدا کردہ ہے جو مقبوضہ کشمیر پر قابض بھارت سے اپنی قراردادیں منوانے سے قاصر ہے اور یوں ایک کروڑ کشمیری مسلمان ظالم بھارتی ہندو سامراج کے مظالم کا شکار ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی لونڈی اقوام متحدہ نے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ اس کے برعکس جہاں کسی اسلامی ملک میں مسیحی اقلیت مطالبہ کرتی ہے تو اقوام متحدہ وہاں اپنی نگرانی میں ریفرینڈم کروا کر ایک مسیحی مملکت قائم کروا دیتی ہے۔ جنوبی سوڈان اور مشرقی تیمور کی مسیحی ریاستیں سوڈان اور انڈونیشیا سے توڑ کر اسی طرح وجود میں لائی گئی ہیں۔ ◆◆◆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سعادتِ حج اور فطرتِ انسان

ظفر علی

ہم وہاں بھی اپنی حرکات نہیں چھوڑتے جہاں ہماری اوقات ہی کچھ نہیں، عجیب واقعات کا تذکرہ

راقم کو 2006ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کی سعادت اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کریم سے نصیب ہوئی۔ اُمید واثق ہے کہ اس کے حضور اس عاجز کی طرف سے یہ مقدس فریضہ مقبول و مبرور ہوا ہوگا۔ حرمین شریفین میں قیام کی مدت تقریباً چالیس (40) دن تھی جن میں سے صرف سات آٹھ دن مدینہ منورہ میں بسر ہوئے۔ اس چالیس روزہ قیام کے دوران کچھ انوکھے واقعات پیش آئے جن سے قارئین کرام ضرور محظوظ ہوں گے:

پیشہ ور گداگروں سے مڈبھیڑ

مسجدِ حرام اور گردونواح میں بھیک مانگنے کی سخت ممانعت ہے مگر پیشہ ور بھکاری کسی نہ کسی طرح اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن نمازِ ظہر کے بعد میں شاہ فہد مرحوم کے توسیع کردہ حصے کے بیسمنٹ (بدرون) میں جا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ایک مسکین صورت آدمی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ یہ پاکستانی یا بھارتی تھا۔ اس نے نہایت آہستہ سی آواز میں مُجھ سے خیرات طلب کی۔ میں نے اس کی حالت سے متاثر ہوتے ہوئے اُسے دینے کے لیے اپنی جیب سے غالباً دو (۲) ریال کا نوٹ نکالا کہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بزرگ عمر آدمی نے وہ فوراً مجھ سے لے لیا اور کہا کہ پہلے آدمی کو بھی کچھ اور دے دیں۔ چنانچہ میں نے اُسے بھی کچھ خیرات دے دی۔ یہ ''واردات'' کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلتے بنے۔

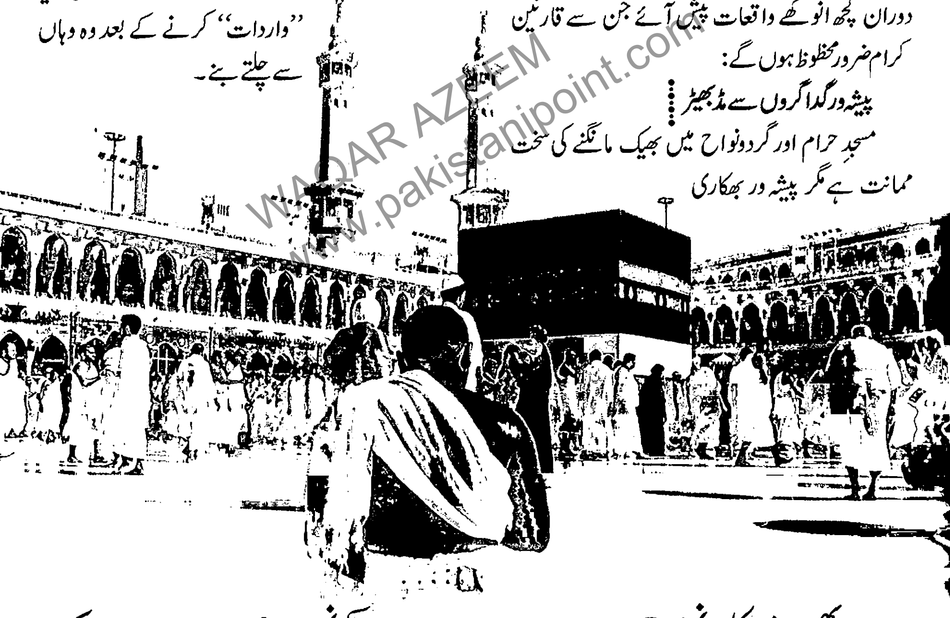

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے دوران کا ایک عجیب واقعہ

ایامِ حج کے بعد کی بات ہے۔ میں اپنے ساتھی اور دوست کے ساتھ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے حرم پاک کی طرف روانہ ہوا۔ پہلی اذان ہو چکی تھی۔ بیرونی صحن بھی نمازیوں سے بھر چکے تھے اور قریبی مارکیٹ کے سامنے بھی لوگ صفیں بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم بھی یہیں بیٹھ گئے۔ کچھ وقت کے بعد دوسری اذان ہوئی۔ امام صاحب نے خطبہ دیا اور نماز باجماعت کھڑی ہو گئی۔ پہلی رکعت کے بعد جب ہم دونوں (جو ساتھ ساتھ کھڑے تھے) دوسرے سجدے میں گئے تو ہمارے درمیان ایک آدمی نے زبردستی اپنے لیے جگہ بنائی اور سجدے میں شامل ہو گیا۔

تکمیلِ نماز اور سلام کے بعد اُس نے کھڑے ہو کر اپنی رہ جانے والی پہلی رکعت ادا کی اور پھر سلام پھیر کر اُٹھا اور دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ چھریرے بدن والا تھا اور غالباً اریٹیریا یا ایتھوپیا کا باشندہ تھا۔

نمازِ عشاء باجماعت ادا کرنے کا انوکھا طریقہ

ایامِ حج کے دوران نماز کے اوقات میں نمازیوں کا بڑا اژدحام ہوتا ہے اور مسجد حرام کے باہر سڑکوں پر بھی نماز ادا کی جاتی ہے۔ میں عموماً نمازِ مغرب مسجد حرام کی چھت پر، جہاں تین گنبد بنے ہوئے ہیں، ادا کیا کرتا اور نمازِ عشاء تک وہیں بیٹھا رہتا اور یہ نماز بھی ادا کرنے کے بعد رہائش جاتا۔ ان ایام میں لوگوں کی آسانی کی خاطر ہر نماز کی اذان کے چند منٹ بعد جماعت کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک دن نمازِ مغرب کے کچھ دیر بعد مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ میں ساتھیوں کو بتا کر نیچے جانے لگا تو اُنھوں نے تاکید کی کہ جلدی واپس آنا ورنہ عشاء کی جماعت سے رہ جاؤ گے۔ اس پر جلدی جلدی دورات المیاہ (Wash Room) میں پہنچا جہاں لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ بہرحال مجھے یہاں تقریباً آدھا گھنٹہ لگا۔ میں وضو کر رہا تھا کہ عشاء کی اذان ہونے لگی۔ جب باہر نکل کر بابِ فہد کے سامنے صحن میں پہنچا تو وہ مکمل طور پر بھر چکا تھا۔ اب نماز باجماعت کی اقامت ہونے لگی۔ میں صفوں میں سے گزرتا ہوا بابِ فہد پر پہنچ گیا۔ باب کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ میں ان سے ایک دیوار پر چڑھنے لگا تو سپاہی نے مجھے روک دیا۔ اسی دوران دو اور آدمی جلدی سے اسی دیوار پر چڑھ گئے اور نماز کی نیت باندھ لی تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور باجماعت نماز ادا کرنے میں کامیاب ہوا۔

طوافِ زیارت کے دوران نمازِ عصر کی ادائیگی

10 ذوالحجہ کو نمازِ ظہر باجماعت ادا کرنے کے بعد دوسری منزل پر ہم نے طوافِ زیارت شروع کیا۔ طواف کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے ایک شوط یا چکر میں کافی وقت لگ گیا۔ ہم نے ابھی چار چکر مکمل کیے تھے کہ عصر کی اذان ہو گئی۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہیں صف بن گئی مگر اگلی صف ہمارے اتنی قریب تھی کہ سجدے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس لیے ہمیں جھک کر اشارے سے سجدے کرنے پڑے۔ نماز کے بعد ہم نے باقی ماندہ چکر لگائے۔ ان ہی چکروں میں ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔ میں اور میرا دوست ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ میرے پیچھے سے ایک آدمی (غالباً فلسطینی) نے مجھے میرے دونوں کندھے اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور خود آگے ہو گیا۔ اس پر مجھے غصہ نہیں آنا چاہیے تھا مگر انسان بھول جاتا ہے۔ میں نے فوراً اُسے پیچھے ہٹایا اور اس سے آگے ہو گیا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا اور اس سے معذرت کرنے کا خیال آیا۔ جب ذرا آگے گیا تو وہی شخص جلدی سے میرے قریب آیا اور اشاروں اشاروں میں معذرت کرنے لگا۔ جواب میں نے علامتی معذرت کر کے اپنی غلطی کا ازالہ کیا۔

فیشن زدہ مسلمان بھائی

فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے دنیا بھر سے مسلمان مکہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مکرمہ آتے ہیں جن میں ہمارے کچھ فیشن زدہ بھائی بھی ہوتے ہیں جنھوں نے ڈاڑھی کو (جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے) بھی فیشن کی نذر کر دیا ہوتا ہے۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی کے بارے میں تو پہلے ہی سے سُن رکھا تھا مگر اب اس کے علاوہ کئی اور قسم کی فیشن ایبل ڈاڑھیاں دیکھنے میں آئیں۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔ (الف) صرف نچلے ہونٹ کے نیچے درمیان میں چند چھوٹے چھوٹے بال۔ اس سلسلے میں سُنا ہے کہ کسی تجدد پسند مصری کی تحقیق ہے کہ ٹھوڑی کی ہڈی کو عربی میں لحیۃ کہا جاتا ہے۔ اس لیے صرف اسی ہڈی پر موجود بال رکھنا ڈاڑھی کا حکم رکھتا ہے۔ استغفر اللہ!

(ب) سارے چہرے پر باریک بالوں کی ایک پتلی سی لکیر۔

(ج) نوکدار خط والی خشخشی سی ڈاڑھی۔

اللہ تعالیٰ فیشن زدگی کے خبط سے ہمیں محفوظ رکھے۔

؎ جو ناخوب تھا بتدریج وہی خوب ہوا
کہ مِٹ جاتا ہے غلامی میں قوموں کا ضمیر

ریاض الجنۃ کا ایک انوکھا واقعہ

ریاض الجنۃ کی اہمیت سے ہر لکھا پڑھا مسلمان بھائی واقف ہے۔ یہ مقام حجرۂ مبارکہ اور منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین واقع ہے۔ اپنے آقا محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش ہونے سے پہلے ریاض الجنۃ میں جا کر دو رکعت نفل بطور تحیۃ المسجد ادا کیے جاتے ہیں اور یہاں زائرین کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔ نمازِ عشاء کے بعد یہاں آنے والے لوگوں کی تعداد قدرے کم ہو جاتی ہے۔ میں ایک اسی وقت اس مقدس جگہ پہنچا اور حجرہ مبارکہ کی دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ اس دیوار کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ اس وقت وہاں دو نگران ملازم کھڑے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ ملازم اس بزرگ سے سختی سے پیش آئیں گے اور فوراً پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے۔ یہ بزرگ کُرتا اور دھوتی پہنے ہوئے اور سر پر عام سفید سی ٹوپی تھی۔ میں بڑا پریشان سا تھا کیونکہ حرمین شریفین کے ملازمین کے رویے میں کافی ساری سختی اور درشتگی پائی جاتی ہے مگر جو منظر میں نے دیکھا، وہ حیران کُن تھا۔ دونوں ملازموں نے اُس بزرگ کا دایاں اور بایاں ہاتھ پکڑ کر اُسے دیوار کے فرش پر لگی ہوئی اینٹوں (شاذروان) پر کھڑا کر دیا۔ وہ صاحب کافی دیر زیرِ لب غالباً درود و سلام پڑھتے رہے۔ پھر موصوف نے اشارہ کیا تو دونوں ملازموں نے ان کے ہاتھ پکڑ اُنھیں نیچے اُترنے میں مدد کی اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس مبارک جگہ پر ہم اپنے گناہ بخشوانے کی نیت سے جاتے ہیں اُس پاک و بابرکت جگہ پر بھی انسان اپنی فطرت دکھانے سے نہیں چوکتا۔

☆☆☆

حج کی فضیلت

"جب تم اپنے گھر سے بیت اللہ کا قصد کر کے نکلتے ہو تو تمھاری اونٹنی کے ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ایک گناہ معاف کر دیتا ہے اور طواف کے بعد تمھاری دو رکعت حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ہوتی ہے اور صفا اور مروہ کے درمیان تمھاری سعی ستر غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ہوتی ہے اور یوم عرفہ کی شام کو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر آ کر تم پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ دیکھو یہ میرے بندے ہیں جو دور دراز سے پراگندہ حالت میں اور غبار آلود ہو کر میرے پاس آئے ہیں، یہ میری رحمت کے اُمیدوار ہیں۔ اگر تمھارے گناہ ریت کے ذرّات کے برابر، یا بارش کے قطروں کے برابر، یا سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں تو میں نے ان تمام گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ (الطبرانی، صحیح الترغیب و الترہیب للالبانی:1112)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

شعوری سانچہ اور حقیقت آشنائی

مجیب الحق حقی

انسان جو نظریات ترتیب دیتا یا تخلیق کرتا ہے اس کا مبدا انسانی دماغ ہے اور عقل وشعور دماغی وصف ہے۔ دماغ میں عقل وشعور کے مختلف سانچے ترتیب پاتے ہیں جس کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے۔ عقیدہ یا نظریہ خیالات کا غیر طبعی محور ہے۔ ہر عقیدے سے منسلک عقل کے تئیں مخصوص دائرے یا پیرائے میں خیالات عمل پذیر ہوتے ہیں۔ دماغ کے دو رخ ہیں۔ ایک جسمانی، جو نظر آتا ہے اور دوسرا غیر طبعی یعنی اس کا متحرک پیرایہ جو شعور، عقل، خیالات اور روحانی کیفیات کی آماجگاہ ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کے عقائد بھی دو پیرائے رکھتے ہیں۔ ایک کا تعلق دماغ کے طبعی رخ یعنی عملی تجربات سے اور دوسرا اس کے غیر طبعی رخ سے منسلک ہے یعنی ہر جہت دماغ میں اپنے منبع سے منسلک ہے۔ گویا عقائد اور نظریات کی دو بنیادی اقسام ہوئیں۔ ایک وہ جو طبعی ماحول سے اخذ ہوتا اور دوسرا غیر طبعی عوامل سے منسلک ہے۔ اب جو انسان طبعی حقائق کے تحت اپنے عقائد متعیّن کرتا ہے وہ ایک خاص طبعی سانچے میں اپنی عقل کو مقید کر لیتا ہے اور اسی بنا پر اس کے خیالات میں طبعی رُخ غالب ہوتا ہے۔ انسان کا یہی طبعی شعوری سانچہ اس کو علمی دریافتوں اور سائنسی نظریات کے حوالے سے ایک احساس یقین میں مبتلا کرتا ہے جس میں انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ہر غیر طبعی مظہر یا اس سے متعلّق علم کے مقابل سائنسی نظریات کو فوقیت دیتا ہے۔

کیا آج کا انسان خدا کے بغیر کائنات اور حیات کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتا ہے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

انسان اپنے حواس پر، جو فوری اور یقینی اطلاع اور معلومات کا ذریعہ ہیں زیادہ بھروسا کرتا اور کسی مظہر سے منسلک حقیقت کی تلاش میں یہی یقین انسان کو ایسے نظریات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جیسے: ''جو حواس کی گرفت میں آیا وہی حقیقت ہے۔''

گویا طبعی جہت میں ایک ایسی ذہنیت ترتیب پا جاتی ہے جو حواس سے آشنا دنیا ہی کو نہ صرف حقیقت مانتی بلکہ طبعی حقائق کی مسلسل اور مؤثر اثر آفرینی کے تحت پختہ یقین کا خوگر ہو کر احساسِ تفاخر میں غرق ہو جاتا ہے۔ بظاہر کسی ایمان و یقین کے محور سے بندھ کر، حواس کے شعور کے پسندیدہ رخ سے منسلک ہوتا، غور و فکر کرتا ہے، ہر سائنسدان یا فلسفی فطری مظاہر کے چکرا دینے والے پس پردہ سسٹم کی کھوج میں اسی عقلی سانچے میں مفروضات متعیّن کرتا ہوا طبعی جبلّت کی ایمانیات میں حقیقت آشنائی چاہتا ہے۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ ابھی انسان عقیدے اور ایمانیات کے ان پیرایوں کی علمی جہتوں سے ناواقف ہے جو بیرونی دنیا کے عوامل اور مظاہر پر اثر انداز ہو کر اُن کے ردِّعمل کے پیرایوں میں تغیّر لاتے ہیں۔ ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان کا یقین یا اس کا حد درجہ اعتماد خلاف معمول نتائج دیتے ہیں، مثلاً ایک شخص اس یقین کے تحت زہر پی لیتا ہے کہ یہ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا یا بظاہر کوئی انہونا دعویٰ کرتا ہے اور ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ اس کی کیا توجیہہ پیش کر سکتے ہیں؟ اسی طرح بعض اوقات غیر فطری واقعات ظہور پزیر ہوتے ہیں جن کی کوئی سائنسی تشریح نہیں ہوتی حالانکہ جو بھی مظہر یا وقوعہ سامنے آتا ہے وہ کوئی مخفی علمی سہارا لازماً رکھتا ہے مگر اپنی فکر کی طبعی جبلّت کے تئیں ایسے واقعات کو مافوق الفطرت کہہ کر حقائق سے پہلو تہی کی جاتی ہے کیونکہ مافوق الفطرت مظاہر کی سائنسداں یا اسکالر اپنے اسی طبعی عقلی سانچے سے منسلک علوم کی روشنی میں توجیہہ نہیں دے پاتے۔ جدید انسان کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ وہ طبعی شعور کے ادھورے اوزار سے کائنات کی مشین کے کل پرزوں کی بافت کی نہ صرف پہچان کرنا چاہتا بلکہ مصر ہوتا ہے کہ اس کا علم قابل اعتبار ہے۔ سائنسی ایمانیات کی اساس خالصتاً فزکس پر ہے اس لیے نیم معتبر ہے مگر علمی و فکری غلبے کے تئیں پوری نوع انسانی طبعی علم کے پنجرے یا فریب کاری کے شعبدے میں قید ہو کر رہ گئی۔ خالص علم وہ ہوتا ہے جو کائنات اور حیات کے ہر گوشے کی اوّل تا آخر شفاف توجیہہ دے اور راہنمائی کرے۔ جدید علم کا شعبدہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو خالص اور حقیقی فلسفۂ حیات کی راہنمائی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ جدید علم کا سحر ہی ہے کہ انسان بہت سادہ سی بات بھی نہیں سمجھ پاتا یا سمجھ بھی جائے تو قبول نہیں کرتا مثلاً یہ خیال کہ کائنات خود بخود بن گئی! سب جانتے ہیں کہ خود کوئی چیز نہیں بن سکتی لیکن کائنات کے لیے ایسا ہونا قبول کر لیتے ہیں۔ ہمارے اطراف بے شمار مابعد الطبعیاتی مظاہر ایسے موجود ہیں جن کی موجودگی اور انسانوں کی گواہی کے باوجود سائنسدان ان کے بارے میں مہر بہ لب ہیں۔ جس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ سائنسی علوم بھی نامکمّل ہیں۔ ہم اس بنیاد کی خود ساختہ بھول بھلیوں میں گھومتے ہیں کہ انسان کا عقیدہ اور سائنس دو جدا چیزیں ہیں۔ یہ ایسا ذہنی قفل ہے جو عموماً ہر خاص و عام کے ذہن میں لگ چکا۔ یہ غیر حقیقی فلسفہ ایسا دوراہا ہے جو انسانی سوچ و نظریات کے فطری بہاؤ کو دولخت کر کے صحیح سمت سے بھٹکائے ہوئے ہے۔ صدیوں کے مخصوص فلسفوں کے دباؤ اور متعیّن علمی ماحول نے ہم سب کی سوچ میں ایک جوہری تبدیلی پیدا کر دی کہ علم ایک اکائی نہیں بلکہ دو جدا رُخوں، طبعی اور مابعد الطبعی، کا حامل مظہر ہے۔ حواس کی مضبوط اور مؤثر پشتیبانی کے بموجب طبعیات اور مادیّت کی علمی برتری اور غلبے نے آخرت کے تصوّر کو پامال کر دیا اور اب انسان نہ اپنی ابتدا اور نہ بعد از اختتام کسی مظہر پر غور کرتا ہے۔ جدید مادّہ پرست انسان نے کسی جوابدہی کے فطری نظم کو علم کے سراب میں اس طرح پسِ پشت ڈالا کہ ایک عام توحید پرست مسلمان بھی تصوّرِ آخرت کو کہیں دور تحت

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

لاشعور میں دفن کر چکا جو کبھی کسی کمزور لمحے میں اپنا رنگ دکھا کر پھر معدوم ہو جاتا ہے۔ دین اور دنیا کے علوم کو الگ کرنے کے نتیجے میں آخرت کے تصور کے مؤثر اثرات ہماری معاشرتی زندگی میں مفقود اور عنقا ہیں۔

اب سوال یہی ہے کہ کائنات کے حقائق کی جانکاری کیسے ہو؟ کائنات کے حوالے سے حقیقت کو جاننے سے پہلے سوال یہ ہوگا کہ حقیقت آشنائی کے پیرائے کیا ہونے چاہئیں؟ کیا فزکس یا میٹا فزکس الگ الگ کائنات کے نظام کی مکمّل علمی تصویر کشی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں؟ ہمارا اب تک کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ یہ دونوں معلوم علمی بنیادوں پر ایسا نہیں کر سکے۔ جدید علوم یا سائنس کائنات کی ابتدا سے لے کر اب تک کے بہت سے مظاہر کی علمی تشریح تو کر گئی لیکن انسان کے بنیادی سوالات اور کائنات و حیات کی نمود و بقا کے شفاف حتمی جوابات دینے سے آج بھی قاصر ہے۔ روحی علوم میں حقیقت آشنائی اللہ کی ذات سے مخفی تعلّق قائم کرنا اور اپنی ذات کی حقیقت جاننا ہے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ سائنس اور مذہب کے دائرہ کار جدا ہیں جبکہ یہی وہ فکر ہے جو انسانوں کو سائنسی بنیادوں پر اس کے اصل مقام سے آشنائی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ انسان کی اسی طبعی ایمانیات کا منطقی نتیجہ انسان کو نہ صرف اپنے آغاز اور انجام سے بے خبر رکھے ہوئے بلکہ علوم کی آفرینش و مبدا اور اس کی منزل مقصود سے بھی لاعلم ہے۔ کیا ہمارا علم یہ بتا سکتا ہے کہ:

علم کیوں ہے اور علوم کی پیش رفت کس ابتدا سے کس منزل کی طرف ہے؟

یہاں پر سائنسدان اور ہمارے فلسفی گُنگ ہیں کیونکہ انھیں نہ علوم کے مبدے کا علم ہے اور نہ اس کی منزل کا۔

شفّاف حقیقت تک انسان کی رسائی اس وقت ہی ہو گی جب انسان کی طبعی اور غیر طبعی ایمانیات ہم آہنگ ہو جائیں۔ یعنی طبعی اور روحی علوم اور تجربات کو یکجا کر کے کائنات اور انسان سے متعلّق حقائق کی چھان بین ہی حقیقت تک رسائی دے گی۔ حقیقتِ وجود اس وقت عیاں ہو گی جب انسان ہر مابعدالطبعیاتی مظہر کی علمی تشریح کے قابل ہو جائے یعنی جب انسان ایک مربوط ایمانیات کے تئیں تحقیق پر مائل ہوگا تبھی وہ کسی حقیقی تشریح کو حاصل کر پائے گا۔ منصفانہ اور فطری ایمانیات کے بجائے منتشر و منقسم ایمانیات نے سائنس اور اسلام میں ایک مصنوعی محاذ آرائی کی فضا بنائی ہے حالانکہ اس سلسلے میں قرآن وہ واحد واسطہ ہے جو طبعی اور روحی ایمانیات کو مشترکہ معنی خیزی عطا کر سکتا ہے۔ یہاں ہم مختصراً ان چند بنیادی باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی ٹھوس سائنسی وضاحت ابھی تک ممکن نہیں ہوئی۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ حقیقی شعوری پیش رفت کیا ہمیں مطمئن کرنے والے جواب رکھتی ہے۔

انسان جو بھی بناتا ہے اس کا ایک مقصد ہوتا ہے لیکن سائنس کائنات کا مقصد بتانے سے قاصر ہے۔ کائنات اور حیات کا وجود کیونکر ممکن ہوا؟ مادّہ کہاں سے آیا؟ شعور کیا ہے؟ اس کے جوابات سائنس کے پاس نہیں۔ سائنس معجزات کو مسترد کرتی ہے کیونکہ خلاف فطرت کوئی امر واقع نہیں ہوسکتا مثلاً آگ کی فطرت جلا دینا ہے تو خلافِ فطرت امر واقع نہیں ہوسکتا کہ آگ نہ جلائے۔

قرآن کا غیر معمولی حالات میں ظاہر اور پھر ہمیشہ کے لیے انسانی حافظے میں محفوظ ہو جانا ہی اس کی سچّائی کا ثبوت ہے۔ کوئی محقّق، سائنسدان یا کوئی اسکالر قرآن کا مصنّف نہیں پیش کر پایا۔ یہ ناکامی ثابت کرتی ہے کہ قرآن انسان کی تحریر نہیں۔ قرآن ان دیکھے خالق اور ان دیکھی دنیا پر یقین لانے کا مطالبہ اسی لیے کرتا ہے کہ انسان اور کائنات ایک عظیم تر علم کے زیر اثر ہیں جو بہت سے چھپے مظاہر رکھتا ہے۔ قرآن سے ماخوذ کوئی اشارہ دراصل ہمارے طبعی اور غیر طبعی شعور کا مشترک اثاثہ ہے۔ جیسا ہم نے جانا کہ غیر طبعی شعور روح سے منسلک ایک مظہر ہے اور روح کا تعلّق خالق کی صفات سے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہے جس میں عقل وفہم کے پیرائے کسی اور رنگ میں ہوتے ہیں اسے ہم روحانیت بھی کہتے ہیں۔ جب ہم طبعی علم اور روحی خواص یعنی دماغ کے دونوں رخوں کو یکجا کر کے دانش کا استعمال کرتے ہیں تو ہمیں قرآن کے ذریعے کائنات اور حیات کے ہر لاینحل سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر جب ہم سائنس اور اسلام کو ایک علم کے طور پر لیتے ہیں تو ہمارا شعور اپنی حقیقی فطرت پر عمل پزیر ہوتا ہے۔

کائنات نیست سے کیسے وجود میں آئی؟

ماہرین فلکیات اور طبعیات کے خیال میں پوری کائنات نیست سے اس لیے ظاہر ہوئی کیونکہ نیست طبعاً ایک بے چین مظہر ہے اس لیے ایسا تو ہونا تھا! اس فکر میں کتنی علمیت ہے وہ ظاہر ہے۔

اسٹیون ہاکنگ نے گرینڈ ڈیزائن میں لکھا کہ قانون ثقل کی موجودگی میں نیست میں نہ صرف کائنات خود بن سکتی ہے بلکہ بنائے گی۔

یہ سائنس کی سب سے مضحکہ خیز اور لایعنی وضاحت ہے۔ کیونکہ اگر نیست میں قانون ہے تو وہ نیست نہیں۔ عقل کے حوالے سے بھی نیست سے ہست کا ظہور ایک ضعیف نظریہ ہے جس کی حمایت میں کوئی ٹھوس دلیل نہیں۔ اس کے برعکس جب ہم طبعی اور غیر طبعی مشترک شعور کے حوالے سے غور کریں تو اسلام کے پاس ٹھوس جواب ہے کیونکہ یہاں عقل سے ماوراء ایک اور ذریعۂ علم کے تیئں شواہد پر غور اور مظاہر کی تشریح کی جاتی ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ نے کائنات اور انسان کی تخلیق کی۔ یعنی ایک ذات ہے جو نیست سے ہست کو تخلیق کرنے کی طاقت اور علم رکھتی ہے۔ یہاں اصل نکتہ یہ ہے کہ ہمارا طبعی شعور اپنی محدودیت کی بنا پر عقل سے اللہ یعنی وجود کو تخلیق کرنے والے کو بھی وجود کے پیمانے اور پیرایوں میں تلاش کرتا ہے۔ یہ ایک بھول بھلیاں ہے جس میں انسان وجودیت کے مظہر میں ہی اللہ کی ذات کی تلاش میں سوال در سوال کرتا بھٹک رہا ہے۔

ازل ایک سرحد ہے جس کے اندر مظہر وجودیت قید ہے۔ اللہ ازل سے باہر ایک ایسا عظیم مظہر ہے جس کی شناخت طبعی وجودیت پر ایمان والے نہیں کر پاتے کیونکہ طبعی شعور کا ازل سے قبل یعنی لاشئے کے مظہر سے کوئی رابطہ ممکن نہیں لیکن جب ہم طبعی اور غیر طبعی شعور پر مبنی حقیقی عقل کا استعمال کرتے ہیں تو قرآن میں وہ روشنی نظر آتی ہے جو ازل سے قبل یا وجودیت کے دائرے سے باہر خالق کائنات وحیات کی ذات سے رابطہ مہیا کرتی ہے۔ غور کریں تو انسان وجودیت کا قیدی ہے، اس لیے اس کی تخلیقات وجودیت کی جبلّت میں ہی ظاہر ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ ایک خاص علمی اور دھاتی جہت اور مخصوص ماحول میں انسان کی بنائی مصنوعی حیات اور مصنوعی ذہانت یعنی سپر کمپیوٹر یا ہیومنائیڈ روبوٹ کا محدود دائرہ کار اور ان کا انسان سے تعلق اور ان روبوٹ کے اپنے خالق (انسان) کی ذات اور وجود کے ادراک کی محدودیت یہ بات ثابت کرتی ہے کہ انسان بھی اپنے خالق کے ادراک میں ایسے ہی کسی دائرے میں قید ہے۔

انسان کا ساختہ مصنوعی ذہن دھات اور توانائی کی حدود میں رہ کر انسان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسان کا دماغ خلیات سے بنا ہے اور حتمی طور پر محدود دائرے میں اپنے خالق کی ذات کا عرفان دماغ کے خالص طبعی رخ سے نہیں حاصل کر سکتا۔ اللہ کا وجود حقیقتِ کبریٰ ہے لیکن طبعی فکر کے مدّوجزر میں انسان کا طبعی دماغ اللہ کی ہستی کی وسعت اور اس کی قوتوں کے پیرایوں کے ادراک کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہ ہمارے دماغ کا روحی رُخ ہی ہے جو روح کی تخلیق کے وقت اپنے خالق کے خطاب سے سرفراز ہے اور علوم باطن کے اسرار سمجھتا ہے۔

یہاں قرآن تخلیق کی ایک نئی جہت بتاتا ہے کہ ایک زندہ جاوید قادر ہستی ہے جو نہ صرف نیست سے ہست تخلیق کرنے بلکہ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالنے کا علم اور قوت رکھتی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہے اور اسی نے نہ صرف کائنات اور حیات تخلیق کیں بلکہ ان کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔ مزید یہ کہ وہ ہر طرح کی تخلیق پر قادر ہے۔ یہ مناظر بھی ہم سب دیکھتے ہیں لیکن طبعی جبلّت طبعی وضاحت کی تلاش میں ہے۔

شعور کے حوالے سے سائنس گومگو میں ہے جبکہ قرآن شعور کو اسی عظیم خالق کی تخلیق قرار دے کر بتاتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں انسان تین اندھیروں میں پالا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ یہی شعور کی بیداری اور یہی سپر سائنسی تخلیق ہے۔ قرآن ایک نہیں کئی قدم آگے بڑھ کر اعلان کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے خواہ جاندار ہو یا بے جان شعور کی حامل ہے اسی لیے ہر چیز اپنے رب کی نہ صرف عبادت کرتی ہے بلکہ سجدہ بھی۔ یہ برتر علم کا دعویٰ ہے اور انسان کو ابھی یہ علوم دریافت کرنا ہیں۔

ارتقاء فطری سپر سائنس کا ایک پروگرام ہے جسے انسان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یعنی انسان اس ضمن میں اپنی طبعی عقل سے جو کچھ دریافت کر رہا وہ حیات کے تسلسل ہیں جو ایک سسٹم کے تحت وقوع پزیر ہو رہے ہیں۔ انسان کی طبعی سوچ کی یہی جبلّت اور یہی بڑا جھول ہے کہ وہ یہ ماننے کو تو تیار ہے کہ ارتقاء کا پیچیدہ عمل خود بخود ہو رہا لیکن زیادہ عقلی وضاحت کو ماننے پر نہیں تیار کہ کوئی اس عمل کا خالق ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ ہم عام حالات میں کسی سسٹم کے خود بخود چلنے کے دعویٰ کو مسترد کرتے ہیں لیکن ارتقاء اور نیچرل سلیکشن کو ایک نصاب کے طور پر قبول کرتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ جب تک خالق کا وجود طبعی طور پر انسان کے علم کی پہنچ میں نہیں آئے گا انسان کی طبعی عقل اس کو جاننے سے قاصر ہی رہے گی، لہٰذا یہاں بھی حقیقی عقل جس کے پیرائے دو رخی ہیں وہی بالآخر انسان کی راہنمائی کرے گی۔ قرآن انسان کو اس کی عقلی ڈائمنشن کے تئیں اور اس کی سمجھ کی لغت یا ڈکشنری میں یہی بتاتا ہے کہ اس کا خالق ایک ہے، وہ ایک ایسی زندگی ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوئی اور نہ کسی کو جنم دیتی ہے۔ یعنی پیدائش اور موت جو انسان کی زندگی سے نتھی ہے انسان کا خالق اس ڈائمنشن سے منسلک نہیں بلکہ اس سے باہر ہے۔ اس لیے یہاں کے طبعی قوانین سے بالاتر ہے۔ اس نے قرآن میں کہہ دیا (خلق الموت والحیات) کہ میں نے موت اور زندگی کی تخلیق کی۔

کرامات اور معجزے:

فطرت یا قدرت (نیچر) ایک پروڈکٹ ہے جو انسان کے مشاہدے میں تو ہے لیکن انسان اس کے پس پردہ بے شمار سسٹم کی وضاحت سے قاصر ہے مثلاً یہ کہ ہر مظہر ایک جبلّت پر کیوں ہے؟ جب انسان یہ کہتا ہے کہ فطرت سے ہٹ کر کچھ نہیں ہو سکتا تو انسان دراصل اپنے تجربات اور مشاہدات کے تئیں اسی یک رخی عقل کے بموجب اُس انجانی جبلّت پر بھروسا کرتا ہے لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ انسان نے ان باتوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے جن کو خلاف فطرت مظاہر، کرامات اور معجزے کہا گیا۔ ہماری عقل ان مشاہدات کو اس لیے قبول نہیں کر پاتی کیونکہ ہمارے مادّیت پر مبنی عقیدے کی وجہ سے ہماری عقل اس ضمن میں راہنمائی سے قاصر ہے۔ انسان معجزوں کو اس وقت مسترد کرے جب یہ دعویٰ ہو جائے کہ انسان کُل علم حاصل کر چکا۔ معجزے اور کرامات یا خارق العادات واقعات اُس سپر سائنسی علوم کے وہ اوراق ہیں جنہیں انسان اپنی طبعی عقل کی معراج کے سفر پر پڑھتا رہے گا۔ یعنی اس کا علم یہ بتاتا رہے گا کہ ایسا ممکن ہے۔ ابھی انسان روح کو ہی نہیں جان پایا تو روحانی طاقتوں کا ادراک کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن یہ دنیا طبعی ہے اور یہاں طبعی علوم کو بظاہر برتری ہے اور رہے گی کیونکہ انسان کو جسم اور عقل اس دنیا کو مسخر کرنے کے لیے دیے گئے ہیں۔

خارق العادات واقعات کے بموجب ذرا غور تو کریں، حضرت عیسیٰؑ ہاتھ پھیر کر مریض کو صحت مند کر دیتے تھے تو کیا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

آج کل ریکی سے انسان ایسا نہیں کر رہا! انرجی ہیلنگ کیا ہے؟ اگر حضرت داؤد کے ہاتھوں میں لوہا نرم ہوجاتا تھا تو کیا آج کی مائنڈ سائنس فورتھ ڈائمنشن میں ہمیں ایسا کرنے کی بہت محدود قوت نہیں سکھا رہی؟ اگر ایک صاحبِ علم ایک ثانیے میں ملکہ سبا بلقیس کا تخت لے آتا ہے تو کیا سائنس مادّے سے توانائی اور توانائی سے مادّے میں تبدیلی پر کامیاب ریسرچ نہیں کر رہی؟

اگر نبی اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو کیا آج کی سائنس یہ نہیں بتا رہی کہ روشنی کی رفتار سے بھی تیز سفر سے وقت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ٹائم ٹریول پر فلمیں اسی لیے بنیں کہ علمی طور پر ایسا ممکن ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر نفس پر نگہبان ہیں، تو آج انسان خود اس پر قادر ہے کہ کسی بھی فرد کی ہمہ وقت نگرانی کر سکے۔

قرآن نے کہا کہ تمہارے اعمال محفوظ کیے جارہے ہیں تو چند دہائی قبل عجیب لگتا تھا لیکن آج انسان خود ہر وقوعہ کا ریکارڈ رکھتا ہے۔

بس انسان ہی مان کر نہیں دے رہا کہ اس کی سائنس ایک 'سپر سائنس' کی ذیلی شاخ ہے جس کا کام اس عظیم تر علم کے میکینزم کو سمجھنا اور اپنے کام میں لانا ہے۔

نبیوں اور لوگوں کی پیش گوئیاں تو وہ حیرت کدہ ہے جس میں جدیدیت ہمیشہ گم رہے گی، کیونکہ اسٹیون ہاکنگ نے اپنی آخری کتاب میں اعتراف کیا کہ سائنس انسانی ارادے کے اگلے لمحے کی پیش گوئی کر تو سکتی ہے لیکن اس کے لیے کھربوں انسانی سیل کا علم درکار ہوگا اور ان کی کیلکولیشن کے لیے کئی ارب سال درکار ہوں گے! جبکہ روحی علم تو ہزاروں سال کے انسانوں کے اعمال ہی کی نہیں واقعات کی بھی پیش گوئی کرنے کی قدرت رکھتا ہے جس کی گواہ تاریخ اور کتابیں ہیں۔

یہ چند مثالیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ محض طبعی سوچ انسان کو حقیقت آشنا نہیں بنا سکتی۔ اس کے لیے قرآن سے راہنمائی ہی اس کے مخمصوں کا حل ہے۔ کائنات میں العلیم کا لامحدود علم پھیلا ہوا ہے اسی لیے انسان جتنا بھی جان لے، اسے یہی لگتا ہے کہ ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے کیونکہ علم پرت در پرت ہر جگہ موجود ہے۔ خدا کو ذاتی مسئلہ قرار دینے والے یا عقیدۂ توحید پر عقلی دلیل طلب کرنے والے خود اپنے خالص مادّی عقیدے کی دلیل دینے سے قاصر ہیں۔

توحید پر قرآن سے بڑھ کر کوئی ثبوت نہیں اور رسالت مآب ﷺ کی بعثت سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں۔ خاص و عام مسلمانوں کو بھی سائنس اور جدیدیت کے مبلغین کی مرعوبیت کے اس اثر سے نکلنا ہوگا کیونکہ برتر علم وحی کا ہے۔ وہی بتاتا ہے کہ کائناتی تخلیقات ایک سپر سائنس کا پرتو ہیں جبکہ انسانی علوم اصل سائنس کے ذیلی تحقیقی شعبے ہیں۔ اسلام اصل علم کا نمائندہ ہے۔ طبعی علم اگر طاغوت کے پاس ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ طاغوت برحق ہوگیا۔ طاغوت برحق ہوتا تو اس کے پاس کائنات کے ہر عقدے کا حل ہوتا جو کہ نہیں ہے۔ کیا جدید انسان خدا کے بغیر کائنات اور حیات کی توجیہہ پیش کر سکا؟ کیا کوئی سائنسدان کسی لیبارٹری میں کائنات کے خودبخود بننے کو ثابت کر سکا؟

کائنات میں وقت کے بیکراں سمندر میں بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر فنا ہونے والا اگر عقل کا خوگر انسان کیا اس قدر تنگ فکر ہو سکتا ہے کہ نہ اسے یہ تجسّس کہ میں کیوں بنا اور نہ یہ فکر کہ موت کے بعد کیا ہے؟ اور دعویٰ کائنات کے عاقل ترین ہونے کا۔ لیکن ایسا ہی ہے، تو پھر یہ مان لیں کہ فطرت کے سچ کا معیار کچھ اور ہے اور جدید انسان کا کچھ اور۔ جب تک انسان توحید یعنی ایک اللہ پر ایمان نہ لے آئے وہ حقیقت آشنا نہیں بن سکتا۔ عقل طبعی کے لیے یہی عقل حقیقی کا پیغام ہے۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

جنونِ لطیفہ

مشتاق احمد یوسفی

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن، جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے! چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام و دہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں، اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے۔

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بدذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے لیکن ہم اعداد و شمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں بھی اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکا۔ ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبدالودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ اب وہ خانساماں جو ستر قسم کے پلاؤ پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے۔ جواب میں انھوں نے بالکل الٹی بات کہی۔

کہنے لگے، خانساماں وانساماں غائب نہیں ہو رہے، بلکہ غائب ہو رہا ہے وہ ستر قسم کے پلاؤ کھانے والا طبقہ جو بٹلر اور خانساماں رکھتا اور اڑد کی دال بھی ڈنر جیکٹ پہن کر کھاتا تھا۔ اب اس وضعدار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے نکاح ثانی کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ گیا گزرا باورچی بھی روٹی کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے جبکہ منکوحہ نہ صرف روٹی کپڑے پر ہی راضی ہو جاتی بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ خود کام کرنا بہت آسان ہے مگر دوسروں سے کام لینا نہایت دشوار۔ بالکل اسی طرح جیسے خود مرنے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن دوسروں کو مرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ معمولی سپاہی اور جرنیل میں یہی فرق ہے۔ اب اسے ہماری سخت گیری کہیے، نااہلی یا کچھ اور...... کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔ ایسا بھی ہوا کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بلاقی خاں نے بانٹی۔ ممکن ہے مذکور الصدر حضرات اپنی صفائی میں یہ کہیں کہ:

ہم وفادار نہیں تُو بھی تو دل دار نہیں

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش ہم مرحوم ہوتے۔ اور ہمارا ذکر بھی اتنے پیار سے ہوتا جتنا خانساماں کا

لہٰذا ہم تفصیلات سے احتراز کریں گے۔ حالانکہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ من جملہ دیگر مشکلات کی اس سراسیمگی کو بیان کریں جو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم سے ازروئے حساب یہ دریافت کرنے کو کہا جائے کہ اگر نوکر کی تیرہ دن کی تنخواہ تیس روپے اور کھانا ہے تو نو گھنٹے کی تنخواہ بغیر کھانے کے کیا ہوگی؟ ایسے نازک مواقع پر ہم نے سوال کو آسان کرنے کی نیت سے اکثر یہ معقول تجویز پیش کی کہ اس کو پہلے کھانا کھلا دیا جائے لیکن اوّل تو وہ اس پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔ دوم کھانا تیار ہونے میں ابھی پورا سوا گھنٹہ باقی ہے اور اس سے آپ کو اصولاً اتفاق ہوگا کہ نو گھنٹے کی اجرت کا حساب 10-1/4 گھنٹے کے مقابلے میں پھر بھی آسان ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہ انصاف کے طالب۔ کچھ تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے وہ ہم سے زیادہ خستہ تیغِ ستم نکلیں اور کچھ اس ڈر سے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مقصد سرِدست ان خانساماؤں کا تعارف کرانا ہے جن کی دامے درمے خدمت کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخی کی جھلک آئے تو اسے تلخیِ کام و دہن پر محمول کرتے ہوئے، خانساماؤں کو معاف فرمائیں۔

خانساماں سے عہدِ وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبدالودود بیگ سے سیکھے۔ یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہرکس وناکس کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ایک دن ہم نے دیکھا کہ ان کا دیرینہ باورچی بھی ان سے ابے تبے کر کے باتیں کر رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ شرفا میں اندازِ گفتگو محض مخلص دوستوں کے ساتھ روا ہے۔ جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آن نکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے۔ نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ عندیہ بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک شرط انھوں نے یہ بھی لگائی کہ اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے تو پہلے ”عرضی مالک“ پیش کرنا پڑے گا۔

کافی ردّ و کد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں جو ہم ان میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام کاج میں جُتی رہتی ہیں۔ کہنے لگے، ”صاحب! ان کی بات چھوڑیے۔ وہ گھر کی مالک ہیں۔ میں تو نوکر ہوں!“ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا، میز نہیں لگاؤں گا، دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا، پھر کیا کرو گے؟

”یہ تو آپ بتایئے۔ کام آپ کو لینا ہے۔ میں تو تابع دار ہوں۔“

جب سب باتیں حسب منشاء ضرورت (ضرورت ہماری، منشا ان کی) طے ہوگئیں تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیحدہ نوکر نہیں ہے۔ اس لیے کچھ دن تمھیں سودا بھی لانا پڑے گا۔ تنخواہ طے کرلو۔

فرمایا، ”جناب! تنخواہ کی فکر نہ کیجیے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔“

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

"پھر بھی؟"

کہنے لگے، "پچھتر روپے ماہوار ہو گی لیکن اگر سودا بھی مجھ ہی کو لانا پڑا تو چالیس روپے ہو گی۔"

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا خانساماں آیا مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کا پانی اُتارنے کی غرض سے پوچھا، "مغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟"

"ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔ حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟"

ہم نے صحیح صحیح بتا دیا۔ جھوم ہی تو گئے۔ کہنے لگے، "میں بھی ایک سال ادھر کاٹ چکا ہوں۔ وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی تو دُور دُور دھوم ہے۔"

مزید جرح کی ہم میں تاب نہ تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے ہاں ملازم رکھ لیا۔ دوسرے دن پڈنگ بناتے ہوئے انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، اس لیے بیٹھ کر چولہا نہیں جھونکوں گا۔ مجبوراً کھڑے ہو کر پکانے کا چولہا بنوایا۔

ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا مگر برادے کی انگیٹھی پر۔ چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولہا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا خریدا اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولہے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا البتہ صورت اور خال و خد اب تک یاد ہیں۔ ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بلکہ پابندی سے ملاگری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔ آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ، "گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟"

تنک کر بولا، "صاحب! ہاتھ بیچا ہے، زبان نہیں بیچی۔"

اس نے نہایت مختصر مگر غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا تو وہ فوراً استعفیٰ دے دے گا۔ اس کے رویے سے ہمیں بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے۔ نیز ہم اس منطقی نتیجے پر پہنچے کہ دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔ اسی طرح ریڈیو والوں کو فرشتے آتشیں گرز مار مار کر بار بار ان ہی کے نشر کیے ہوئے پروگراموں کے ریکارڈ سنائیں گے۔

ہم کھانے کے شوقین ہیں، خوشامد کے بھوکے نہیں (گو کہ اس سے انکار نہیں کہ اپنی تعریف سن کر ہمیں بھی اپنا بنیان تنگ معلوم ہونے لگتا ہے)۔ ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ باورچی کھانا پکانے کے بجائے ہمارے گن گائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم اور سابق آقاؤں کا کلمہ پڑھتا رہے۔ جب کہ اس توصیف کا اصل مقصد ہمیں جلانا اور ان خوبیوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہیں۔ اکثر اوقات بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی مرحوم ہوتے تاکہ ہمارا ذکر بھی اتنے ہی پیار سے ہوتا۔ بعض نہایت قابل خانساماؤں کو محض اس دُور اندیشی کی بنا پر علیحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپیگنڈہ کرتے رہیں۔ جو شخص بھی آتا ہے یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے سابق آقا نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا (یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ اصولی طور پر ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر بھروسا کرتے ہیں لیکن ریزگاری ضرور گن لیتے ہیں)۔ ایک خانساماں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس کا پچھلا "صاب" اس قدر شریف آدمی تھا کہ ٹھیک سے گالی تک نہیں دے سکتا تھا۔

ہم نے جل کر کہا، پھر تم نے نوکری کیوں چھوڑی؟

تڑپ کر بولے، "کون کہتا ہے کہ خدابخش نے نوکری چھوڑی؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ میری پانچ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تھی اور اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ تو یہ کہ ان کے گھر کا خرچ بھی میں ردی اخبار اور بیئر کی خالی بوتلیں بیچ کر چلا رہا تھا۔ انھوں نے کبھی حساب نہیں مانگا۔ پھر انھوں نے ایک دن میری صورت دیکھ کر کہا: ''خدا بخش! تم بہت تھک گئے ہو۔ دو دن کی چھٹی کرو اور اپنی صحت بناؤ۔'' دو دن بعد جب میں صحت بنا کر لوٹا تو گھر خالی پایا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ ''تمہارا صاب تو پرسوں ہی سارا سامان باندھ کر کہیں اور چلا گیا۔'' یہ قصہ سنانے کے بعد اس نمک حلال نے ہم سے پیشگی تنخواہ مانگی تاکہ اپنے سابق آقا کے مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔

گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرمانے ایک تجربہ کار خانساماں بھیجا۔ جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا، ''بھئی باقی سب تو ٹھیک ہے مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے۔ یہ کیا بات ہے؟''

کہنے لگا، ''صاب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟''

اس ستم ایجاد کی بدولت برصغیر کے ہر خطے بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں اس ہیچمدان پنبہ دہاں کے دسترخوان پر سمٹ کر آ گئیں۔ مثلاً دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں سالم کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس قدر ترش کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں تو پٹ سے کھل جائیں۔ پوچھا تو انھوں نے آگاہی بخشی کہ دکن میں روسا کھٹا سالن کھاتے ہیں اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اللہ جانے بقیہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔

اسی دن شام کو ہم نے گھبرا کر پوچھا کہ دال میں پرانے جوتوں کی بو کیوں آ رہی ہے؟

جواب میں انھوں نے ایک دھواں دھار تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔ دوسرے دن جب ہم نے دریافت کیا کہ بندۂ خدا یہ چپاتی ہے یا دسترخوان؟ تو ہنس کر بولے کہ وطن مالوف میں روٹی کے حدود اربعہ یہی ہوتے ہیں۔

آخر کئی فاقوں کے بعد ایک دن ہم نے بہ نظر حوصلہ افزائی کہا:

''آج تم نے چاولوں کا اچار بہت اچھا بنایا ہے۔''

وہ دہکتے ہوئے توے سے بیڑی سلگاتے ہوئے بولے، ''بندہ پروری ہے! کاٹھیاواڑی پلاؤ میں قورمے کے مسالے پڑتے ہیں!''

''خوب! مگر یہ قورمے کا مزہ تو نہیں۔''

''وہاں قورمے میں اچار کا مسالا ڈالتے ہیں۔''

پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیڑ کر کہا، ''میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟''

سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے، ''آپ کو معلوم نہیں؟ شاہان اودھ لگی ہوئی فیرنی کھاتے تھے؟''

''مگر تم نے دیکھا کہ کیا انجام ہوا اودھ کی سلطنت کا؟''

مختصر یہ کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ صبح و شام ہمارے ناپختہ ذوق و ذائقہ کو سنوارتا اور مشروبات و ماکولات سے وسیع المشربی کا درس دیتا رہا۔ آخر میں مرزا کو شبہ ہو چلا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے جو سالن کے ذریعے صوبائی غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔

اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ واردان بساط مخسا اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسانی معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے، وہ نت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نبات تازہ کو ایک خاص درجۂ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

پکایا جائے تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جاسکتے ہیں۔

انھی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچی کو بھیجا کہ اس سے کہو مہمان بیٹھے ہیں۔ اس وقت سل کُوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان ہی مہمانوں کی تواضع کے لیے سل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا تو محسوس ہوا گویا چٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے کھا رہے تھے اور ہماری طرح کرکرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔ صبح تک سب کو پیچش ہوگئی۔ صرف ہمیں نہیں ہوئی اور ہمیں اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی اس میں مبتلا تھے۔

یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ ہم بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم تو پرانی چال کے آدمی ہیں۔ اس لیے نئی زندگی سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔ موت برحق ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ بلانے کے لیے ہم اپنی نیک کمائی میں سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں کسی مرض ناشناس حکیم کے ہاتھوں مرنے پر بھی چنداں اعتراض نہ ہوگا لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط روح قبض کرنے کا اختیار نہیں دینا چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔

بیماری کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی سن لیجیے جسے ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہ وہ سچ مچ آغا تھے)۔ ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اُٹھتی ہیں۔ تادم وداع ان کے کھانا پکانے اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا۔ یعنی ڈرا دھمکا کر اس کی خوبیاں منوا لیتے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اُٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کر دیا۔ اس سے قطع نظر، وہ کافی تابعدار تھے۔ تابعدار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ چائے لاؤں؟ اور ہم تکلفاً کہتے کہ 'جی چاہے تو لے آؤ ورنہ نہیں۔' تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں بھی لاتے تھے۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی ان کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ ''اپنا'' اس لیے کہ حالانکہ ہم سب ہی ان کے کھانوں سے عاجز تھے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر پُرامن طریقے سے رخصت کیا جائے۔ انھیں نوکر رکھنا ایسا ہی ثابت ہوا جیسے کہ شیر ببر پر سوار ہو تو جائے لیکن اُترنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔

ایک دن ہم اسی ادھیڑبن میں لیٹے ہوئے گرم پانی کی بوتل سے پیٹ سینک اور دوا پی پی کر انھیں کوس رہے تھے کہ سر جھکائے آئے اور خلاف معمول ہاتھ جوڑ کر بولے، ''خو! صاب! تم روز روز بیمار اوتا اے۔ اس سے امارا قبیلہ میں بڑا رسوائی، خو، خانہ خراب اوتا اے،'' (صاحب! تم بار بار بیمار ہوتے ہو۔ اس سے ہمارے قبیلے میں ہماری رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہوتا ہے۔) اس کے بعد انھوں نے کہا س... معاف کرایا اور بغیر تنخواہ لیے چل دیے۔

ایسی ہی ایک اور دعوت کا ذکر ہے جس میں چند احباب اور افسران بالادست مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے جو قورمہ پکایا، اس میں شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کے غوطے لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔ اِکا دُکا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ:

صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

اور بسا غنیمت تھا کیونکہ مہمان کے منہ میں پہنچنے کے بع... غالب کے الفاظ میں، یہ کیفیت تھی:

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے

دورانِ ضیافت احباب نے بکمال سنجیدگی مشورہ دیا کہ ”ریفریجریٹر خرید لو۔ روز روز کی جھک جھک سے نجات مل جائے گی۔ بس ایک دن لذیذ کھانا پکوا لو اور ہفتے بھر ٹھاٹھ سے کھاؤ اور کھلاؤ۔

قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے، اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

ہم نے اس عذاب مسلسل کی شکایت کی تو وہی احباب تلقین فرمانے لگے کہ

جب خرچ کیا ہے صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

کل پھر مرزا سے اپنی گونا گوں مشکلات کا ذکر کیا تو کہنے لگے:

یہ الجھنیں آپ نے اپنے چٹورپن سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں۔ ورنہ سادہ غذا اور اعلیٰ خیالات سے یہ مسئلہ کبھی کا خود بخود حل ہو گیا ہوتا۔ یہی آئین قدرت ہے اور یہی آزاد تہذیب کی اساس بھی! آپ نے مولوی اسماعیل میرٹھی کا وہ پاکیزہ شعر نہیں پڑھا؟

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

عرض کیا، مجھے کسی کے آزاد رہنے پر، خواہ شاعر ہی کیوں نہ ہو، کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس شعر پر مجھے عرصہ سے یہ اعتراض ہے کہ اس میں آزادی سے زیادہ خشک روٹی کی تعریف کی گئی ہے۔ ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کر سکتی۔

فرمایا: برداشت کی ایک ہی رہی! خراب کھانا کھا کر بدمزہ نہ ہونا، یہی شرافت کی دلیل ہے۔

گزارش کی: ”مردانگی تو یہ ہے کہ آدمی عرصہ تک عمدہ غذا کھائے اور شرافت کے جامے سے باہر نہ ہو۔“

مشتعل ہو گئے، ”بجا! لیکن یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آدمی اُٹھتے بیٹھتے کھانے کا ذکر کرتا رہے۔ برا نہ مانیے گا۔ آپ کے بعض مضامین کسی بگڑے ہوئے شاہی رکابدار کی خاندانی بیاض معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو کم پڑھی لکھی عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔“

ہم نے ٹوکا، ”آپ بھول رہے ہیں کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔“

وہ بگڑ گئے، ”مگر آپ نے تو اسے جنونِ لطیفہ کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی اپنی بے قصور قوم کی اصلاح کے درپے ہیں تو کوئی کام کی بات کیجیے اور ترقی کی راہیں سجھائیے۔“

مزہ لینے کی خاطر چھیڑا، ”ایک دفعہ قوم کو اچھا پہننے اور کھانے کا چسکا لگ گیا تو ترقی کی راہیں خود بخود سوجھ جائیں گی۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ جس دیس میں لاکھوں آدمیوں کو دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہوتا ہو، وہاں بھگوان کی بھی ہمت نہیں کہ ان داتا کے سوا کسی اور روپ میں سامنے آ سکے۔ بھوکے کے لیے بھوجن ہی بھگوان کا اوتار ہے اور......“

قطع کلامی کی معافی مانگے بغیر بولے، ”مگر وہ تو بکری کا دودھ اور کھجور کھاتے تھے اور آپ فن غذا شناسی کو فلسفۂ خدا شناسی سمجھ بیٹھے ہیں۔ خود آپ کے محبوب یونانی فلسفی جو بھرپور زندگی کے قائل تھے، دماغ سے محسوس کرتے اور دل سے سوچتے تھے مگر آپ تو معدے سے سوچتے ہیں اور دیکھا جائے تو آپ آج بھی وہی مشورہ دے رہے ہیں جو ملکہ میری انطونیت نے دیا تھا۔ ایک درباری نے جب اس کے گوش گزار کیا کہ روٹی نہ ملنے کے سبب ہزاروں انسان پیرس کی گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں تو اس نے حیرت سے پوچھا کہ یہ احمق کیک کیوں نہیں کھاتے؟“

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خیالِ واصف

ایک آدمی بڑا خوبصورت ہے اور اگر اپنے صاحب کو پسند ہی نہیں تو پھر کیا خوبصورت ہے۔ بات تو کوئی نہ بنی۔ جس کی تعریف یہ ہے کہ اسے قبول کرنے والا عشق موجود ہو۔ وہ حسن کہ جسے عشق نہیں ملا، اس حسن کو ہم کیا کہیں، سوائے محرومی کے اور اگر حسن نہیں ہے اور اسے عشق مل گیا تو عشق کا ملنا ہی حسن ہے ورنہ وہ حسن محرومی ہے۔ اگر محبوب کو طالب مل جائے تو وہ محبوب کہلاتا ہے، ورنہ محبوب کی اور کوئی صفت نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی چاہنے والا ہو۔ اگر کوئی چاہنے والا نہیں ہے تو کوئی کتنا ہی حسین ہو، بیکار ہے۔ اگر آپ کے اندر طلب کی تمنا نہ ہو تو آپ کتنے ہی اچھے ہو جائیں، بیکار ہے۔ گویا آپ کے اندر تضاد پیدا ہو گیا، تضاد کا پیدا ہونا دراصل محبت کی محرومی ہے۔

(گفتگو 3 صفحہ:143)

☆☆☆

اپنے ماحول پر گہری نظر رکھیں اور اس کا بغور مطالعہ کریں غور کریں۔ آپ کے بیوی بچے، ماں باپ، بہن بھائی، عزیز واقارب، یار دوست، آپ کے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ لوگ آپ کے سامنے آپ کو کیا کہتے ہیں اور آپ کی عدم موجودگی آپ کا تذکرہ کس انداز میں کرتے ہیں؟ کبھی کبھی خاموشی سے اپنے گھر کے سامنے سے اجنبی ہو کر گزر جائیں اور سوچیں اس گھر میں آپ کب تک ہیں؟ وہ وقت دور نہیں جب یہ گھر تو ہوگا مگر آپ نہیں ہوں گے۔

اس وقت اس گھر میں کیا ہوگا؟ آپ کا تذکرہ کس انداز میں ہوتا رہے گا۔ (کرن کرن سورج)

☆☆☆

معمولی بات بڑے غیر معمولی نتائج برآمد کرتی ہے۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بات اتنی بڑی بات ہوتی ہے کہ اسے دانائی اور رعنائی خیال کی انتہا سمجھ لیا جاتا ہے۔

اگر چھوٹی بات کو چھوٹا نہ سمجھا جائے تو کوئی بڑی بات بڑی نہ رہ جائے۔ چھوٹے کاموں کو بڑی احتیاط سے کرنے والا انسان کسی بڑے کام سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔

چھوٹے انسانوں سے محبّت کرنے والا، ان کا ادب کرنے والا، ان سے برابر کا سلوک کرنے والا، کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ سے نہیں ڈرتا۔ معمولی انسان سے محبّت غیر معمولی انسان کا ڈر نکال دیتی ہے۔ ایک سجدہ حاصل ہو جائے تو ہزاروں سجدوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

(قطرہ قطرہ قلزم صفحہ 91)

☆☆☆

وہ شخص جو اپنے آپ کو ماحول سے بلند سمجھتا ہے۔ سکون نہیں پائے گا۔

اور وہ شخص بھی جو اپنے آپ کو اپنے ماحول سے نیچا سمجھتا ہے..... وہ بھی سکون نہیں پائے گا۔

(واصف علی واصف، گفتگو

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تجرباتِ زندگی

شمع سکندر

بریسٹ کینسر

میرا تعلق لوگوں کے اُس گروہ سے ہے جنہیں دوا کھانے سے نفرت، ڈاکٹروں سے اللہ واسطے کا بیر اور اسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیشہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی کہ اگر اسپتال کی طرف دیکھ لیا تو پتھر کی بن جاؤں گی۔

زندگی میں نشیب وفراز، سختی، نرمی، بیماری، آزمائش زندہ رہنے کا لازم حصہ ہیں جس سے کسی کو مفر نہیں۔ اللہ کا احسان تھا کہ کسی بڑی آزمائش کا سامنا نہ ہوا۔ البتہ بچوں کی چھوٹی موٹی تکالیف کا ٹوٹکوں سے ہی علاج کیا۔ جیسے زکام بخار ہے تو جوشاندہ، پیٹ خرابی کی صورت میں سونف، الائچی اور پودینے کا قہوہ بنا دیا۔ گیس یا اپھارہ ہوا تو اجوائن، قے ہو تو بڑی الائچی کا قہوہ، کولیسٹرول (Cholestrol) کے لیے لہسن اور سر کو خدانخواستہ چوٹ لگ جائے تو ہلدی دودھ میں شہد ڈال کر پلا دیا غرضیکہ ہر درد کا درماں جڑی بوٹیوں سے ہی کیا۔

شوہر کا شوق کتب بینی ہے۔ صحت وغذا اور ہومیوپیتھی

خواتین اسے موت کا فرشتہ نہ سمجھیں... اس سے لڑیں اور زندگی کی جنگ جیت لیں

سے متعلق کتب کا مطالبہ اُن کے معمولات میں شامل ہے۔ پانی ہم تمام عمر اُبال کر پیتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے زندگی صحت کے عین اصولوں کے مطابق گزاری تو بے جا نہ ہو گا۔

میں سمجھتی تھی کہ الحمدللہ ہماری صحت مند زندگی کا راز انھی احتیاطی تدابیر میں مضمر ہے۔ بچے بھی میرا مذاق اُڑاتے کہ امی کو کوئی بیماری بتانے کا کیا فائدہ؟ کوئی نہ کوئی بدذائقہ قہوہ پلا دیں گی۔ ٹانگ میں درد ہو تو کہیں گی ٹانگ پر تکیہ رکھ کر سو جاؤ، سر میں درد ہو تو پردے آگے کھینچ کر کمرے میں اندھیرا کر کے سو جاؤ۔

ایک دفعہ سردیوں کی یخ بستہ رات تھی۔ میری بہن کا بڑی پریشانی میں فون آیا:

”باجی! طٰہٰ کو بہت تیز بخار ہے۔ کیا کروں؟ میں نے کہا آرام سے گود میں لے کر بیٹھ جاؤ۔ گود کی گرمائش سے اُسے فرق پڑ جائے گا۔ صبح ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ صبح تک الحمدللہ طٰہٰ کا بخار اُتر گیا۔ میرے بہنوئی نے تو میرا مذاق ہی بنا لیا۔ جسے بخار ہو بولتے ہیں:

”بھئی ان کو گود میں لے کر بیٹھ جائیں۔“

بہرحال زندگی نارمل ڈگر پر چل رہی تھی کہ اچانک ایسا تلاطم آیا کہ ہلا کر رکھ دیا۔

ایک دن معمول کے مطابق صبح اُٹھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے انگڑائی لی۔ بے ساختہ ہاتھ چھاتی پر لگا تو معمولی سی گلٹی محسوس ہوئی۔ پورے جسم میں جھرجھری سی پھر گئی لیکن دوبارہ اُسے چھونے کی ہمت نہ کر سکی۔

اکثر ٹی وی یا اخبارات اور جرائد میں چھاتی کی علامات چھپتی رہتی ہیں۔ زیریں میں عجیب سا خوف محسوس ہوا لیکن فوراً کسی بُرے خیال کو جھٹک کر معمول کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔ کالج میں بھی بارہا خیال آیا لیکن پھر کام کی مصروفیت میں بھول گئی۔ گھر پہنچ کر پھر خیال آیا کہ چیک تو کروں کیا واقعی کوئی گلٹی ہے یا میرا وہم؟

میں نے لیٹ کر ڈاکٹروں کی ہدایت کے عین مطابق جو میں نے وقتاً فوقتاً پڑھی تھیں، اپنا معائنہ خود کیا لیکن کوئی گلٹی محسوس نہ ہوئی۔ یا تو میں مارے خوف کے صحیح معائنہ نہ کر سکی یا گلٹی اتنی چھوٹی تھی کہ میں اُسے دوبارہ محسوس نہ کر سکی۔ بہرکیف میں بظاہر تو مطمئن ہو گئی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ایک بے اطمینانی موجود رہی۔

انھی دنوں میرے بیٹے کو ٹوکیو یونیورسٹی پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ مل چکا تھا اور وہ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا اس وقت ڈاکٹر کے پاس گئی تو بیٹے کا جانا تعطل کا شکار ہو گا اس لیے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ مارچ میں وہ چلا گیا۔

دو ماہ میں نے اسی تذبذب کی کیفیت میں گزارے لیکن ڈاکٹر کو رجوع کیا اور نہ ہی گلٹی کو دوبارہ چھونے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر سکی۔ ایک روز دوبارہ بے ساختگی میں ہاتھ لگا تو گلٹی نمایاں محسوس ہوئی۔ اب میں نے اپنے شوہر کو بتایا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اگلا مرحلہ تجربہ کار ڈاکٹر کی تلاش تھا۔ اس میں تقریباً پندرہ روز لگ گئے۔ ہم نے ایک ڈاکٹر پر اکتفا نہیں کیا۔ تین مختلف ڈاکٹروں کی رائے لی۔ سب کا خیال تھا کہ گلٹی Suspicious ہے۔ دراصل ڈاکٹر یکدم مریض کو صدمہ نہیں دینا چاہتے لیکن اشارۃً بتا دیتے ہیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ بہرحال ٹیسٹوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا اور مرض کی تصدیق ہو گئی کہ مجھے چھاتی کا کینسر ہے۔

جیسے میں پہلے عرض کر چکی کہ ڈاکٹروں اور دواؤں سے دور بھاگتی تھی لیکن حیران کن بات تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا حوصلہ اور ہمت دے دیا کہ ذرّہ برابر خوف محسوس نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت دی کہ میں خود حیران رہ گئی۔ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور موت برحق۔ ہر شخص کینسر سے تو نہیں مرتا۔ کئی دوسری ان گنت بیماریاں بھی ہیں۔ دل گردہ، جگر،

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ڈینگی، ایکسیڈنٹ، تو پھر ڈر کس بات کا؟ اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا رکھیں۔

میری سرجری ہوئی۔ پھر میں کیموگرافی اور Radition کے مراحل سے گزری۔ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر صحت یاب کیا تو سوچا کہ یہ بیماری بہت عام ہوتی جا رہی۔ کیوں نہ اپنے تجربات سے دوسروں کو آگہی دوں۔ شاید اس سے بہت سے مریض مستفید ہو سکیں۔

خود پر یقین اور اللہ پر مکمل بھروسا

سب قارئین سے گزارش ہے کہ مکمل اعتماد اور یقین رکھیے کہ یہ مرض قابل علاج ہے۔

بیماری سے متعلق کوئی علامات ظاہر ہوں تو قطعی طور پر نظر انداز کریں، نہ ہی پوشیدہ رکھیں۔ فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ ہر گلٹی کینسر نہیں ہوتی۔ اگر ڈاکٹر کی تشخیص یہ بتاتی ہے کہ یہ کینسر نہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور خدانخواستہ کینسر ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں کہ بروقت تشخیص سے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ کینسر قابل علاج مرض ہے۔

احتیاط لازم ہے

کہا جاتا ہے: ''احتیاط علاج سے بہتر ہے۔''

Prevention is better than cure.

۱۔ایسی خواتین جن کے خاندان میں ماں یا بہن کو چھاتی کا کینسر رہا ہو، اُنھیں بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اُنھیں کسی بھی گلٹی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔وہ خواتین جنھیں ماہواری کم عمری میں شروع ہوئی ہو اگر اُنھیں کوئی گلٹی محسوس ہو تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

۳۔ایسی خواتین جو ہارمون تھراپی لے رہی ہوں، زیادہ محتاط رہیں کیونکہ ہارمونز جسم میں توازن کو مدھم کرتے ہیں۔

۴۔شراب نوشی یا کسی بھی قسم کی نشہ آور دوا لینے والی خواتین، نشہ آور ادویہ ترک کر دیں۔

۵۔ ایسی خواتین جنھوں نے کسی بھی وجہ سے ایکسرے کروائے ہوں اور وہ ریڈیائی شعاؤں سے متاثر ہوئی ہوں۔

۶۔اگر کسی خاتون کی ایک چھاتی میں کینسر ہوا ہو تو دوسری میں بھی ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

۷۔موبائل فون کو ایسی جیب میں نہ رکھیں جو جسم سے قریب ہو تاکہ اُس کی شعاعیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اُسے ہمیشہ بیگ میں رکھیں۔

۸۔اگر پہلے بھی کوئی گلٹی ہوئی ہو تو امکان ہے کہ دوسری مرتبہ گلٹی مہلک ہو۔

۹۔ایسی خواتین جن کی پہلی اولاد ۳۵ سال کی عمر کے بعد ہوئی یا کبھی اولاد پیدا ہی نہیں ہوئی، انھیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

خوفزدہ نہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ جن خواتین میں یہ علامات پائی جائیں اُنھیں یہ بیماری ضرور لاحق ہو گی لیکن اگر محتاط رہیں تو بہتر ہے کیونکہ صحت مند زندگی گزارنا ہمارے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے بہت اہم ہے۔ ماں صحت مند تو صحت مند گھرانہ۔

علامات

صحت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سب نعمتوں میں بڑی نعمت ہے۔ اپنے جسم میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو انسان خود سب سے پہلے محسوس کر سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل تبدیلیوں کی صورت میں فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وجہ تبدیلی کینسر ہے یا کچھ اور۔ یہ بات بار بار یاد رکھنے کی ہے کہ کینسر قابل علاج مرض ہے۔ جتنی جلدی تشخیص اور علاج ہو گا اتنے ہی صحت یابی کے قوی امکانات ہیں۔

۱۔ چھاتی یا بغل میں گلٹی کی صورت فوراً کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

www.pakistanipoint.com WAQAR AZEEM

۲۔ چھاتی کی ساخت میں کوئی تبدیلی محسوس ہو۔
۳۔ نپل اندر کی طرف دھنسے ہوئے محسوس ہوں۔
۴۔ دودھ کے علاوہ کسی اور مواد یا خون کا خارج ہونا۔
۵۔ چھاتی پر دانے نمودار ہوں یا جلد سنگترے کی طرح کھردری ہوجائے۔
۶۔ چھاتی کی جلد سرخی مائل ہوجائے، سوجن محسوس ہو یا نپل کے اردگرد کی جلد سیاہی مائل ہوجائے۔
۷۔ لمبے عرصہ تک رہنے والی کھانسی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔
۸۔ جسم میں کسی تِل یا موکے میں کوئی تبدیلی نمودار ہو۔
۹۔ کسی زخم کا لمبے عرصے تک مندمل نہ ہونا۔
۱۰۔ جسم کے کسی حصے سے خون کا رسنا۔
۱۱۔ وزن میں مسلسل کمی ہونا۔
۱۲۔ خوراک نگلنے میں تکلیف ہونا۔

ضروری نہیں کہ ان میں سے کسی علامت کے ظاہر ہونے کا مطلب خدانا خواستہ کینسر کا حملہ ہی ہے۔ یہ چونکہ تیزی سے بڑھتا ہوا مرض ہے، اس لیے فوری تشخیص از حد ضروری ہے۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ۔ (سورۃ الشعراء ۸۰)

اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو تُو ہی (یعنی اللہ) مجھے شفا عنایت فرماتا ہے۔

قرآنی آیات سے علاج

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس میں برکت اور شفا ہے۔ مجھے دورانِ علاج بہت مخلص دوستوں نے مختلف آیات اور وظائف پڑھنے کو کہا۔ میں نے بھی یقین کامل کے ساتھ ان کی تلاوت اور تسبیح کی۔

درود شریف پڑھنا اپنے معمول میں شامل کر لیں۔ چلتے پھرتے، کام کرتے، لیٹتے جب یاد آئے درود شریف پڑھیے۔

۱۔ حٰمٓ لا ینصرون کی تسبیح پڑھتے رہیں۔
۲۔ اوّل، آخر ۱۱ مرتبہ درود شریف پڑھیے۔

i) سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الصافات 79)
ii) سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (سورۃ یٰسین، 58)
iii) سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ (سورۃ الصافات، 37)
iv) سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ (سورۃ الصافات، 109)
v) سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ (سورۃ الزمر،
vii) سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (سورۃ قدر، 05)

۳۔ اوّل آخر ۱۱ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیے۔

سورۃ رحمان کی تلاوت سنیے روزانہ ۳ مرتبہ ۷ دن تک۔

4) اوّل آخر ۷ مرتبہ درود شریف سورۃ مریم کی تلاوت کر کے پانی پر پھونک دیں۔ اُسی جگ میں مزید پانی ڈال جائیے۔ ۴۰ روز تک یہ عمل دہرایئے۔

یہ عبادات زیادہ وقت طلب نہیں۔ آپ اپنے روزمر معمولات بھی نبھاتے رہیے۔

شفا بالغذا

اللہ تعالیٰ نے خوراک میں ہی ہمارے لیے شفا رکھ ہے۔ علاج کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی غذا میں بھی تبدیلی لا چاہیے۔ مثلاً ہلدی، لیموں، لہسن، گاجر، زیتون کا تیل، بن گوبھی، شہد کا استعمال دوران علاج اپنے اندر بہت افادیت لیے ہوئے ہے۔

ہلدی

ہلدی سے کون واقف نہیں۔ صدیوں سے ہمار کھانوں کا لازمی جزو ہے۔ اس سے ہمارا مدافعتی نظام مضبو ہوتا ہے۔ ہلدی کسی بھی قسم کی چوٹ کو جلد مندمل ہونے می مدد دیتی ہے۔ ہمارے جسم سے فاسد مادے خارج کرتی ا کسی بھی قسم کے ٹیومر کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ خصوصاً کین میں یہ بہت سودمند ہے۔

آپ بازار سے ہلدی کی گنڈھی لے آئیں۔ اُسے پی لیں اور روزانہ رات کو ایک چائے کا چمچہ (AS) ایک ک دودھ میں اُبال کر سونے سے پہلے پی لیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

ہلدی ٹماٹر کا سوپ

ٹماٹر۔3/4 کپ دھو کر کاٹ لیں۔
سبزیوں کا سوپ۔1/2 کپ۔
درمیانہ سائز پیاز۔پیس لیں۔
ناریل کا تیل۔01 چائے کا چمچ
سیب کا سرکہ۔01 چمچ۔
ہلدی۔2 چائے کے چمچے۔

تیل میں پیاز اور لہسن کو تل لیں۔ٹماٹر اور ہلدی ڈال کر ہلکی آنچ پر پانچ منٹ پکائیں۔اس کے بعد سبزی کا سوپ اور سرکہ ڈال کر پکائیں۔پھر گرائنڈر میں ڈال کر آمیزہ بنالیں۔ نمک اور کالی مرچ ڈال کر پی لیں۔

کینسر سے بچاؤ اور بڑھنے سے روکنے کے لیے انتہائی مفید ہے۔

لیموں

لیموں کی افادیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ اس میں وٹامن سی کا خزانہ چھپا ہے۔لیموں کے رس سے زیادہ افادیت اس کے چھلکے میں ہے۔آپ لیموں کے قتلے کاٹ کر پانی کے جگ میں ڈال دیں۔لیموں کے صحت مند اجزا پانی میں حل ہو جائیں گے۔چین میں کینسر پر بہت تحقیق ہوئی ہے۔اس کے مطابق لیموں میں کینسر کے جرثومے مارنے کا کرشماتی اثر ہے۔ جو Chemo سے ہزار گنا تیزی سے کینسر کے خلیے مارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ہمیشہ لیموں کے چھلکے ڈال کر پانی پئیں۔

گاجر کا جوس

سیب، گاجر اور چقندر کا جوس روزمرہ خوراک میں شامل کیجیے۔کچھ معالج روزانہ 2/2-1 کلوگرام گاجروں کے جوس سے پینے کا مشورہ دیتے ہیں جو کینسر کے علاج میں بہت معاون و مددگار ہوتا ہے۔

کدو اور بند گوبھی کا جوس بھی اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ ضروری نہیں آپ تمام جوس ایک ہی دن میں پی جائیں۔ متوازن طریقے سے چلیں۔ایک ہفتہ ایک قسم کا جوس، اگلے ہفتے کوئی دوسرا جوس پئیں۔اگر آپ کو کبھی کوئی جوس موافق نہیں آتا اور اس سے اپھارا، گیس یا جسم میں درد کی شکایت شروع ہو جائے تو اسے چھوڑ دیں۔اپنے جسم کے ردّعمل کو آپ سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ہوسکتا ہے 2/1-2 کلو گاجر کا جوس ایک شخص آسانی سے ہضم کر لے لیکن کسی دوسرے مریض کو موافق نہ آتا ہو۔ایسا شخص صرف ایک گلاس پی لے۔ آپ خشک خوبانی کا مغز دس عدد روزانہ ہی لینا شروع کر دیں۔یہ بھی Anti- Oxidant ہے۔

بڈونگ ڈائیٹ سے علاج

ڈاکٹر جوہانہ بڈوگ ایک جرمن بائیو کیمسٹ تھیں۔انھوں نے تمام عمر کینسر پر تحقیق کی۔ وہ فزکس اور کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ تھیں۔اُنھوں نے 9 مئی 2003ء کو 95 برس کی عمر میں وفات پائی۔وہ لوگوں کے کینسر کا علاج خوراک سے کرتی تھیں۔ ان کے طریقِ علاج میں پھلوں اور سبزیوں کے استعمال پر زور دیا جاتا۔اُن پر اعتراض یہ کیا جاتا کہ وہ گوشت کھانے سے منع کرتیں۔اُن کا کہنا ہے کہ اگر آپ دریائی مچھلی یا گھر میں پلی ہوئی مرغی کھائیں تو کوئی حرج نہیں لیکن فارمی مچھلی اور مرغی سے پرہیز کریں اُن کے خیال میں Processed Fat اور Hygrohenated Oil ہماری صحت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔اُنھوں نے 1952ء میں Budwing Diet سے کینسر کا علاج شروع کیا۔

طریقہء علاج

(وہ گھر میں بکری یا گائے کے دودھ سے پنیر تیار کرنے کو کہتیں۔)

کاٹیج چیز......چھ اونس
السی کے بیج۔4 چمچ Teaspoon
السی کے بیج کا تیل 01Teaspoon
ہلدی ایک چائے کا چمچ (گھر میں پسی ہوئی)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سب اجزا پیس لیں اور روزانہ ایک خوراک لے لیں۔

دورانِ علاج احتیاطی تدابیر

تمام ادویہ طاقتور کیمیائی اجزا سے بنتی ہیں چاہے عام استعمال کی اسپرین ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح کینسر کی طاقتور کیمیائی اجزا سے بنی ادویہ جہاں بیمار خلیات تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، وہیں وہ صحت مند خلیوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں۔ کبھی کبھار وہ جسم کے مختلف آرگنز کو بھی متاثر کر سکتی ہیں۔

اگرچہ تمام دنیا میں اس مرض کی ابتدائی جڑ جاننے کے لیے تحقیق ہو رہی ہے لیکن تاحال Chemo ہی اس کا مؤثر ترین علاج ہے۔ دوا انجیکشن کے ذریعے Intervenous دی جاتی ہے۔

۱۔ دورانِ علاج پانی زیادہ مقدار میں پئیں۔ کم از کم دن میں آٹھ تا دس گلاس تاکہ جسم سے نقصان دہ مواد پیشاب کے ذریعے خارج ہو جائے۔ قبض نہ ہونے دیں۔

۲۔ پانی کے جگ میں ایک یا دو لیموں کے قتلے کاٹ کر ڈال رکھیں۔ چینیوں کے مطابق لیموں کے چھلکے میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو کینسر سے متاثرہ خلیوں کو مارنے کی طاقت کیمو کی نسبت کئی ہزار گناہ زیادہ رکھتے ہیں۔

۳۔ چھلکے والے پھل جیسے سیب، انار، کیلا، آم وغیرہ چھلکا اُتار کر کھائیں۔ بغیر چھلکے والے پھلوں سے دورانِ کیمو پرہیز کریں جیسے امرود اور انگور وغیرہ۔

۴۔ ایسی خوراک استعمال کریں جو آپ کی قوت مدافعت کو مضبوط کرے مثلاً انڈہ، سمندری مچھلی، دیسی مرغی وغیرہ۔ فارمی مچھلی یا مرغی سے پرہیز کریں۔

۵۔ کچی سبزیوں سے گریز کریں۔ اُن کو بھاپ یا اُبال کر استعمال کریں۔

۶۔ تازہ پھلوں اور سبزیوں کا جوس پئیں جیسے انار، سیب، چقندر، گاجر وغیرہ۔

۷۔ کھانا پکانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ اچھی طرح دھوئیں اور کم تیل میں سالن پکائیں۔

۸۔ دورانِ کیمو بازار کا کھانا، شادی بیاہ کے کھانے یا فاسٹ فوڈ سے قطعی پرہیز رکھیں۔

۹۔ نمک یا چینی کا استعمال کم کریں۔ خصوصاً چینی انتہائی مضرِ صحت ہے۔ یہ کینسر زدہ خلیوں کی مرغوب غذا ہے اور ٹیومر کو بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ چینی کا نعم البدل کھجور، گڑ یا شہد ہے لیکن کم مقدار میں۔

۱۰۔ ہمیشہ نیم گرم پانی سے غسل لیں۔

۱۱۔ ننگے پاؤں نہ چلیں اور کسی کٹ یا چوٹ کی صورت میں فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ کھلے مقامات پر جاتے وقت ماسک پہن لیں۔ تاکہ ہوا میں موجود جراثیم آپ کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کیموتھراپی کے دوران مریض کا مدافعتی نظام بہت کمزور ہو جاتا ہے اور خدانخواستہ جراثیم حملہ آور ہو جائیں تو وہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

تھوڑی سی احتیاط مریض کو بہت سی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ آپ اس بیماری کو اپنی مضبوط قوت ارادی سے شکست دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیں۔ اطمینان اور سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

جان ہاپکنز کی تحقیق

ہر انسان کے جسم میں کینسر کے خلیے موجود ہوتے ہیں جو کسی بھی ٹیسٹ سے ظاہر نہیں ہوتے۔ جب تک اُن کی تعداد سیکڑوں میں نہ پہنچ جائے۔ علاج کے بعد اگر کوئی ڈاکٹر یہ بتاتا ہے کہ اب آپ کے جسم میں کوئی خلیہ کینسر کا موجود نہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ واقعی وہ موجود نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ قابلِ گرفت ساخت میں نہیں ہے۔

۱۔ ایک نارمل صحت مند انسان کے جسم میں پوری زندگی کا مدافعتی نظام مضبوط ہو تو کینسر کے خلیات برباد ہو جاتے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہیں اور تیزی سے نشوونما پا کر ٹیومر کی شکل اختیار نہیں کرتے۔

۲۔ جب کسی شخص کو کینسر ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے جسم میں غذائیت کی کمی ہے۔ جس وجہ سے اُس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیماری نے حملہ کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں جیسے ماحولیاتی آلودگی، طرزِ زندگی، ذہنی دباؤ وغیرہ۔

۳۔ غذائیت کی کمی پر قابو پانے کے لیے مناسب خوراک اور سپلیمنٹ لینے چاہئیں جو آپ کے مدافعتی نظام کو مضبوط کر سکے۔

۴۔ کیموتھراپی ایک طاقتور طرزِ علاج ہے جو نہ صرف آپ کے ٹیومر کو ختم کرتا ہے بلکہ یہ صحت مند خلیوں کو شدید نقصان پہنچاتا ہے نیز جسم کے مختلف اعضاء مثلاً دل، گردے، جگر اور پھیپھڑوں کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

۵۔ ریڈیائی شعاؤں سے علاج بھی ایک طرف تو کینسر کے خلیات کو جلا ڈالتا اور دوسری طرف کئی مزید قسم کے انفیکشن کو جنم دیتا ہے۔ دونوں علاج ایک حد تک مدد کرتے ہیں۔ کئی دفعہ یہ سیل اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ وہ مزاحم ہو جاتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے اینٹی بائیوٹک مسلسل کھانے سے اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔

۶۔ کینسر سیل ختم کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اُن چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو ان خلیات کو بڑھنے میں مدد دیتی ہیں مثلاً:

۱۔ چینی۔ چینی کینسر زدہ خلیوں کی خوراک ہے آپ چینی کا نعم البدل گڑ یا شہد استعمال کریں۔

۲۔ دودھ: دودھ جسم میں بلغم پیدا کرتا ہے، اس لیے دودھ کا استعمال کم کر دیں۔

۳۔ گوشت: سرخ گوشت کی جگہ مچھلی اور مرغی استعمال کریں۔ کینسر کے خلیات ہمیشہ تیزابی ماحول میں پھلتے پھولتے ہیں۔

۴۔ تازہ سبزیاں اور پھل: آپ کی ۸۰ فیصد خوراک تازہ سبزیوں، پھل، بیج خشک میوہ جات اور گندم پر مشتمل ہونی چاہیے۔ تازہ سبزیاں اور پھل ۱۵ منٹ میں خلیات تک پہنچ کر انھیں صحت مند بناتی ہیں۔

۵۔ چائے، چاکلیٹ اور کافی سے پرہیز کریں۔ سبز چائے اور قہوہ بہتر ہے۔ پانی بہت پئیں۔ اُبلا ہوا یا فلٹر سے چھنا ہوا ہو۔ نلکے کا پانی پینے سے گریز کریں۔ اُس میں جراثیم ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

۶۔ وٹامن ای اور سی بیمار خلیوں کو مارنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

۷۔ کینسر ذہن، جسم اور روح کی بیماری ہے۔ ایک صحت مند رویہ اور صحت مند روح کینسر کے خلیات کو نہ صرف بڑھنے سے روکتی ہے بلکہ مار دیتی ہے۔

۸۔ لوگوں کی برائیوں کو نظرانداز کریں، غصہ نہ کریں، معاف کریں، محبت کریں اور زندگی سے ہر لمحہ لطف اندوز ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کو اپنا شعار بنائیں۔

۹۔ کھلی تازہ ہوا میں لمبے سانس لیں، آکسیجن کینسر Cell کو مارنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۱۰۔ مائیکروویو کا استعمال کم سے کم کریں اور پلاسٹک کے برتن ہرگز اس میں نہ رکھیں۔ پلاسٹک کا ڈھکنا بھی اس میں نہ رکھیں۔

۱۰۔ پلاسٹک کی بوتل فریزر میں رکھیں اور نہ ہی دھوپ میں۔

۱۱۔ کینسر بھی باقی بیماریوں کی طرح ہی کی ایک بیماری ہے۔ اسے ذہن پر سوار نہ کریں۔ اللہ پر یقین کامل رکھیں اور زندگی نارمل انداز میں گزاریں۔ یقین کریں بہت آسانی سے آپ اس بیماری کو شکست دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

پُراسرار کہانی

شاہد لطیف

پادری پونس کا خزانہ

پادری گلفام جوزف نے فکرمندی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے خط کو دوبارہ دیکھا۔ شکستہ تحریر میں مختصر خط اُس کے عزیز دوست نذیر مارٹن کی طرف سے تھا:

”دوست!! خط ملتے ہی شیام گڑھ کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ دیر مت کرنا۔“

پادری گلفام کو علم تھا کہ اُس کا دوست دو ہفتے پہلے کسی مہم پر شیام گڑھ گیا تھا۔ نہ جانے وہاں کیا پیش آیا ہو گا؟ پادری اِسی لیے پریشان تھے۔ اُنھوں نے فوراً ایک بیگ میں دو جوڑے رکھے اور اپنے نائب کو گرجا کے انتظام کی ہدایت دے کر روانہ ہو گئے۔ سات آٹھ گھنٹے کا فاصلہ طے کر کے شام کے قریب دیے ہوئے پتے پر جا پہنچے۔

وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں ایک ہی سرائے تھی۔ پادری اِسی میں رہ رہے تھے۔ دروازہ اِن کے ملازم نے کھولا۔ وہ پادری گلفام کو لے کر اندر کمرے میں داخل ہوا۔ اپنے دوست کو دیکھتے ہی اُسے

ایک ایسے عجیب و غریب محافظ کی کہانی، جس نے بے شمار دماغ چکرا کر رکھ دیے اور کوئی اس کی اصلیت نہ جان پا

دھچکا لگا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہا تھا۔ انھیں آتا دیکھ کر پادری نذیر مارٹن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ کمزور آواز میں بولے:

"مجھے یقین تھا تم فوراً چل پڑو گے۔ میں ابھی بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ تمھیں ایک بہت ضروری کام کے لیے بلایا ہے لیکن وعدہ کرو جب تک کام مکمل نہیں ہوتا تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے میرے دوست!" پادری نے وعدہ کیا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے اور تم بھی مجھ پر بھروسا کرو۔ میں یہ کام، تمھاری ہدایت کے مطابق کرنے کی کوشش کروں گا بغیر کسی سوال جواب کے۔"

"ٹھیک ہے۔" پادری نذیر یکدم نڈھال دِکھائی دینے لگا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اُس نے مضمحل آواز میں کہا: "باقی باتیں میرا وفادار خادم جاوید سائمن بتا دے گا۔ اب میں آرام کروں گا۔"

خادم سائمن، پادری گلفام کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔ "جناب! آپ تازہ دَم ہو جائیں۔ میں کھانا لے آتا ہوں۔"

کھانے سے فراغت کے بعد سائمن نے کہا: "جناب! اب آپ آرام کیجیے۔" پھر ہچکچاتے ہوئے بولا: "دروازہ اندر سے اچھی طرح بند رکھیے گا اور کچھ بھی ہو...... کھولنا نہیں۔ صبح سورج نکلنے کے بعد میں خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔"

پادری گلفام نے وعدے کے مطابق کچھ نہ پوچھا اور دل ہی دل میں حیرت زدہ بستر پر لیٹ گئے۔ شاید فوراً سو بھی گئے کیوں کہ ایک تھکا دینے والے لمبے سفر سے یہاں تک پہنچے تھے، مگر یہ کیا...... اچانک ہڑبڑا کر اُٹھے۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ رفتہ رفتہ حواس بحال ہوئے تو اُنھیں محسوس ہوا گویا کمرے میں کیچڑ اور پھپھوندی جیسی سڑاند پھیلی ہو۔ پھر وہ

مانٹیگ روڈس جیمز Montague Rhodes James

(۱۸۶۲ سے ۱۹۳۶)

یہ برطانیہ کے نامور اہلِ قلم اور قرونِ وسطیٰ کے ماہر تھے جو ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۸ میں کنگز کالج کیمبرج کے اور ۱۹۱۸ سے ۱۹۳۶ میں ایٹن کالج کے پرووسٹ رہے۔ اس دوران ۱۹۱۳ سے ۱۹۱۵ تک یونیورسٹی آف کیمبرج میں وائس چانسلر بھی ہوئے۔ روحوں سے متعلق کہانیوں میں حقیقت پسندی کا عنصر انھوں نے شامل کیا۔ اس سے پہلے روحوں پر کہانیاں گھسی پٹی ایک ہی قدیم ڈگر پر لکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے آثارِ قدیمہ اور نوادرات کے پس منظر میں بھی پراسرار کہانیاں لکھیں۔ درجِ ذیل کہانی "پادری یونس کا خزانہ" The Treasure of Abbot Thomas اِن کی کتاب Ghost Stories of an Antiquary کی آٹھویں اور آخری کہانی سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ میں شائع ہوئی۔

چونکے۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے کوئی آہستگی سے دروازے پر زور آزمائی کر رہا ہو۔ اچانک اُنھیں خادم کی بات یاد آئی، "کچھ بھی ہو دروازہ نہیں کھولنا۔" وہ سوچ میں پڑ گئے مگر وہ بدبو اُن کی سوچ میں مُخل ہو رہی تھی۔ اب وہ اُٹھے اور بدبو کا منبع ڈھونڈنے لگے۔ کمرا بالکل صاف تھا۔ غسلخانے میں بھی بظاہر کوئی گندگی نہیں تھی لیکن بدبو پورے کمرے اور غسلخانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تھک ہار کر وہ بستر پر لیٹ گئے اور تکان کے باعث جلد ہی نیند کے جھونکے آنے لگے۔ ساری رات نیند، بدبو اور دروازے کی زور آزمائی کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ پھر حیرت انگیز طور پر پو پھٹتے ہی کمرے میں سکون ہو گیا۔

وہ دماغ ماؤف کر دینے والی بدبو غائب تھی اور دروازہ خاموش تھا۔ اس وقت پادری گہری نیند سوئے ہوئے تھے جب دروازے پر دستک کی آواز سے آنکھ کھلی۔ سائمن اُن کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ پادری صاحب بمشکل اُٹھے۔ دروازہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کھولا۔ سامنے خادم ناشتہ کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔

"معاف کیجیے جناب۔ مجھے معلوم ہے رات آپ بے چین رہے مگر پادری صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ براہِ مہربانی ناشتہ کیجیے۔" یہ کہہ کر خادم ٹرے میز پر رکھ کر کمرے سے نکل گیا۔ پادری گلفام غسلخانے جاتے ہوئے سوچنے لگے: "اسے رات کی بے چینی کا کیسے پتا؟" وہ حیرت زدہ ضرور تھے مگر بدگمان ہرگز نہیں۔

آدھے گھنٹے بعد دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد پادری نذیر مارٹن بولے:

"میرے عزیز دوست! اب کام کا وقت ہو گیا۔ تم سائمن کے ساتھ جاؤ۔ وہ تمھیں کام کی نوعیت سے آگاہ کر دے گا۔" وعدے نے پادری کی زبان بند رکھی۔ وہ خاموشی سے اُٹھے اور خادم کے ساتھ باہر نکل گئے۔

☆☆☆

تقریباً چالیس پینتالیس منٹ بعد دونوں واپس سرائے میں پادری نذیر مارٹن کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پادری گلفام کا چہرہ شدّتِ جذبات سے تمتما رہا تھا۔

"کام مکمل ہو گیا؟" پادری نذیر نے سوال کیا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں جناب۔" پادری گلفام کے بجائے خادم نے ادب سے جواب دیا۔ "ہمارے محترم پادری صاحب نے بخیر وخوبی تمام فریضہ انجام دیا۔"

بستر پر لیٹے ہوئے پادری نذیر نے گہرا سانس لیا:

"خداوند کا شکر ہے۔" پھر پادری گلفام کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک کیا اور کہنے لگا: "سائمن! تم بھی بیٹھو اور میرے عزیز دوست۔ میں تمھیں پوری کہانی سناتا ہوں۔ اس کا آخری حصّہ سائمن سنائے گا۔ اب میں خود کو تروتازہ اور پُرسکون محسوس کر رہا ہوں۔ اب مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں تمھیں تفصیل سے سب سناؤں۔"

پادری گلفام ہمہ تن گوش ہو گئے۔ پادری نذیر نے چند لمحے توقف کیا پھر اُٹھ بیٹھے اور ہلکا سا کھنکھار کر یوں گویا ہوئے:

☆☆☆

"پچھلے سال کی بات ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر کی تحقیقی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ اس کی تحقیق پُرانے گرجا گھروں کے بارے میں تھی۔ خصوصاً وہ گرجا گھر جو اب آباد نہیں رہے مگر اُن کی کوئی نہ کوئی تاریخی اہمیت ضرور ہے۔ اِن میں شیام گڑھ کا گرجا بھی شامل تھا۔ اِس گرجے کا ذکر کرنے سے پہلے اُس محقق نے ایک داستان بیان کی جس کی کڑیاں اِسی سے جا ملتی ہیں۔ اُس نے اپنی کتاب میں لکھا کہ گئے وقتوں میں اِس گرجا کے رہائشی کوارٹر میں 'یونس' نام کے ایک پادری تھے۔ انھوں نے ذاتی طور پر شیام گڑھ کے اِس گرجا کی تزئینِ نو اور آرائش کا کام شروع کیا۔ وہ خود بھی بہت اچھے کاریگر تھے۔ لکڑی پر نقش و نگار بنانا، دیواروں پر تصاویر بنانا، شیشوں پر رنگ و روغن سے تصویر کشی کرنا...... وہ اِن تمام چیزوں کے ماہر تھے۔

کہا جاتا ہے اِس گرجے کے اندر جتنا بھی لکڑی کا کام ہوا یعنی کھڑکیاں دروازے وغیرہ اور بڑے عبادت والے ہال کی تمام کھڑکیوں کے شیشوں پر مقدس ہستیوں کی رنگین شبیہیں انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائیں یا اپنی زیرِ نگرانی بنوائیں۔ جب تک وہ زندہ رہے گرجا میں باقاعدگی سے عبادت کروائی۔ وہ گرجا کے احاطے ہی میں رہتے تھے۔ اِن کا کوئی والی وارث نہیں تھا نہ ہی کوئی دور پرے کا عزیز۔ عیسائی ہو یا کسی بھی دین مذہب کا کوئی بھی ضرورت مند، مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ قصبہ بھر میں بہت ہر دل عزیز اور مقبول تھے۔ مرنے سے پہلے وقتاً فوقتاً لوگوں کو اشارے دینے لگے۔ جس کا خلاصہ صاحبِ کتاب نے کچھ یوں بیان کیا۔"

''پادری یونس کے پاس سونے کی شکل میں کچھ دولت موجود تھی جو اُس نے اُسی گرجا کے احاطے میں کہیں چھپا دی تھی۔ اس دولت کا کوئی وارث نہ تھا۔ پادری یونس لوگوں سے کہتا تھا کہ اُس نے وہ دولت چھپائی ضرور مگر اُس کی کھوج کے لیے کچھ نشانیاں چھوڑی ہیں۔ اب جو بھی قسمت آزمائی کرے اور دولت ڈھونڈ نکالے تو وہ اُسی کی ہوگی۔ اگر وہ یہ دولت استعمال کر سکے تو ضرور کرے۔

صاحبِ کتاب اِس کے بعد رقمطراز ہے کہ جب یہ روایات اِس تک پہنچیں تو وہ بھی قسمت آزمانے وہاں جا پہنچا۔ گرجا گھر کی عمارت اپنی جگہ قائم مگر بہت بوسیدہ تھی البتہ احاطے میں موجود رہائشی کوارٹر کھنڈر بن چکا تھا۔ قصبے کے لوگوں سے اِن روایات کی تصدیق ہوئی۔ وہاں کے لوگ ایسی مہم جوئیوں کے عادی تھے۔ کسی نے تعرض نہ کیا۔ مدد کے لیے لوگ بھی مہیا کیے لیکن باوجود کوشش وہ کسی نشانی کا کھوج نہ لگا سکا۔

وہ لکھتا ہے یقیناً نشانیاں دیواروں کی تصاویر اور شیشے پر نقش و نِگار میں ہی پوشیدہ ہیں مگر افسوس وہ انھیں ڈھونڈ نہ سکا اور اپنی مفصل تحقیق لکھنے کے بعد اُس نے آنے والی نسلوں کے لیے ایک چیلنج چھوڑ دیا۔ میں نے کئی مرتبہ کتاب کا وہ حِصّہ پڑھا جس میں پادری یونس کے چھپے خزانے اور نِشانیوں کا ذکر تھا۔''

''پھر میں نے اِس کام کا بیڑا اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ سائمن ایک عرصہ سے میرے ساتھ ہے۔ میرا ہمدم، ہمراز اور قابلِ بھروسا۔ میں نے سائمن کو تفصیل بتائی اور ہم دونوں اپنی تیاری کرنے لگے۔ ہم نے پورا منصوبہ بنایا جس میں اِس بات کو بھی مدنظر رکھا کہ کیا خبر ہمیں رات کو کوئی خفیہ کارروائی کرنا پڑے تو ہم نے مصوری کا سامان بھی ساتھ رکھ لیا۔ آج سے دو ہفتے پہلے ہم اس سرائے میں پہنچ چکے تھے۔ اگلے دِن ہم نے گرجا کا جائزہ لیا۔ عبادت کا بڑا ہال گرد و غبار اور جالوں سے اَٹا پڑا تھا۔ تمام تصاویر اِن کے پیچھے چھُپی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک تصویر منتخب کی اور اس کی مٹی دھول صاف کرنے لگے۔ دس پندرہ منٹ کی محنت کے بعد تصویر کے نقش و نگار واضح ہو گئے۔ سورج کی تیز کرنیں کمرا روشن کیے ہوئے تھیں۔ اِس روشنی میں اندازہ ہوا کہ تصویر کا روغن ابھی تک اپنی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شام تک ہم کافی تصویریں اور شبیہیں صاف کر چکے تھے۔ ہر ایک تصویر مختلف تھی۔ کہیں تجریدی مصوری، کہیں ہندسی رجیومیٹریکل شکلوں سے فن پارہ بنایا گیا تھا۔

''اگلے دِن میں کاغذ پنسل ساتھ لے گیا۔ دوپہر تک مزید کئی کھڑکیوں کے شیشے صاف کیے۔ پھر ہم نے کام روک دیا۔ اب میں فرداً فرداً ہر تصویر کی اہم باتیں نوٹ کرنے لگا۔ دِن ڈھلے تک تقریباً سب تصاویر کی اہم باتیں نوٹ ہو گئیں۔ سرائے میں واپس آ کر بہت سر کھپایا مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ وہ تمام تصاویر جو ہماری پہنچ میں تھیں وہ ہم صاف کر چکے تھے۔ اب کچھ کھڑکیاں اور بڑے روشندان جو بُلندی پر تھے، وہاں سیڑھی کے بغیر پہنچنا ممکن نہ تھا۔

''تیسرے دن ہم پہلے قصبے کے اکلوتے بازار گئے۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک خاصی لمبی سیڑھی کرائے پر مل گئی۔ وہیں سے ہم نے ایک مزدور بھی اُجرت پر ساتھ لے لیا۔ اُوپر دو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ہم نے مزدور کو سیڑھی پر چڑھایا کہ وہ کھڑکی کو احتیاط سے صاف کرے۔ جب کھڑکی صاف ہو گئی تو ہم نے مزدور کو بھیج دیا کہ کل آ کر دوسری کھڑکی صاف کرے۔ اب میں سیڑھی پر چڑھا۔ کھڑکی بڑی تھی۔ اس کی اہم باتیں نوٹ کرنے کے لیے تین مرتبہ سیڑھی کھسکانی پڑی۔ صفائی بھی اِسی طرح ہوئی تھی۔ چوتھے روز مزدور صبح ہی پہنچ گیا۔ دوسری بڑی کھڑکی کی صفائی شروع ہوئی۔ ابتدائی مٹی دھول، جالے صاف ہوئے تو تصویر کے گرد ایک کالا حاشیہ نظر آیا۔ آدھی کھڑکی صاف ہوئی تو سیڑھی کھسکائی۔ مزدور دوبارہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اُوپر چڑھا۔ اب جو صفائی شروع کی تو جانے کس طرح قدرے زور سے اُس کا ہاتھ کالے حاشیے پر پڑا کہ اُس پر جمے ہوئے ٹھوس رنگ یا روغن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُتر گیا اور نیچے سے پیلا رنگ دکھائی دینے لگا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیا کالے رنگ سے کوئی چیز چھپائی گئی ہے؟ کیا کالا رنگ کسی چیز کو چھپانے کے لیے پیلے رنگ پر کیا گیا؟

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ ہوگیا۔ میں نے ڈانٹ کر مزدور کو کہا کہ تم نے نقصان کر دیا ہے۔ اب تم نیچے اُتر آؤ۔ باقی کام ہم خود کرلیں گے۔ وہ پہلے ہی شرمندہ تھا۔ فوراً نیچے اُتر آیا۔ میں نے طے شدہ اُجرت اُس کے حوالے کی اور واپس بھیج دیا۔

''اب میں خود اُوپر چڑھا اور بہت احتیاط سے کالے حاشیے کو کھرچا۔ واقعی تھوڑا ہی رنگ اُترا تو نیچے پیلے رنگ کے اُوپر کچھ حروفِ تہجی لکھے نظر آئے۔ مجھے اپنی کامیابی نزدیک محسوس ہوئی۔ بہت احتیاط سے میں نے تمام کالا حاشیہ کھرچ ڈالا۔ چاروں اطرف میں ایک ترتیب سے حروفِ تہجی لکھے ہوئے تھے مگر شام قریب تھی۔ اِس لیے نوٹ کرنے کا کام اگلے دن کے لیے اُٹھا رکھا۔

''پانچویں روز ہم دونوں خوشی خوشی گرجا گھر جا پہنچے اور تمام حروف کو اُفقی اور عمودی اُسی ترتیب سے نوٹ کیا۔ وہ حروفِ تہجی انگریزی میں تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے انھیں کاغذ پر نقل کرلیا۔ جب ایک طرف کے حروف لکھ لیے تو تصدیق کے لیے انھیں گنا۔ حاشیے پر اور میرے لکھے ہوئے حروف برابر تعداد میں تھے۔ یعنی اڑتیس (۳۸)۔ اِس طرح میں سب حروفِ تہجی لکھتا اور تصدیق کے لیے گنتی کرتا گیا۔ وہ سب اڑتیس اڑتیس تھے۔ یہ بہت صبر آزما اور مُشقت طلب کام تھا۔

''دوپہر کے بعد ہم فارغ ہوئے اور سرائے میں اِن حروف کو جوڑنے کا کام شروع کیا۔ ہم نے ہر طرح کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ رات سر پر آگئی۔ ہم ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ دوبارہ تصویر پر غور کرنے صبح جائیں گے۔ یقیناً اِسی تصویر میں اِن حروف کو سمجھنے کا کوئی سُراغ چُھپا ہوگا۔

''ہمیں وہاں آئے چھٹا دِن تھا جب ہم دونوں پھر گرجا کے اِسی کمرے میں تھے۔ میں سیڑھی سے اُوپر چڑھا۔ کھڑکی کے شیشے پر روغن سے بنائی ہوئی تین مُقدس ہستیوں کی شبیہیں تھیں۔ پس منظر میں بادل اور چند پرندے اُڑتے دکھائے گئے تھے۔ کہیں بھی کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ اچانک میری نظر حاشیے کے اندرونی کونے پر پڑی۔ وہاں رومَن ہندسوں میں بہت باریک سا XXXVIII یعنی اڑتیس لکھا تھا۔ میں نے پھر شبیہوں پر غور کرنا شروع کیا۔

''پہلی شبیہہ کے بائیں ہاتھ میں پرانے زمانے کا نیم کھلا گول کاغذ تھا اور دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت ہوا میں بلند تھی۔ میں نے غور سے کاغذ کو دیکھا تو اُس میں انگریزی میں واضح لکھا تھا: ''ایک پتھر کی ۷ آنکھیں۔'' شاید یہ اُس جگہ کا سُراغ تھا جہاں خزانہ پوشیدہ تھا۔

''دوسری شبیہہ کے بائیں ہاتھ میں ایک کتاب اور دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں ہوا میں بلند تھیں۔ کتاب پر کوئی خاص قابلِ توجہ بات نہ تھی۔

''تیسری شبیہہ کے بھی بائیں ہاتھ میں ایک کاغذ تھا مگر سادا اور دائیں ہاتھ کی تین اُنگلیاں ہوا میں بُلند تھیں۔ میرے ذہن میں ایک جھپاکا ہوا۔ ہاتھ کی ایک دو اور تین انگلیاں ......یقیناً یہ ہی سُراغ تھا۔ میں فوراً سیڑھی سے نیچے اُترا۔ میں اور سائمن تیزی سے سرائے پہنچے۔ حروفِ تہجی کو سامنے رکھ کر پنسل ہاتھ میں لی اور پہلا حرف چھوڑ کر اگلے حرف کے گرد دائرہ بنا دیا۔ پھر ایک حرف چھوڑ کر اگلے دو حروف کے گرد دائرہ بنایا۔ پھر ایک حرف چھوڑ کر اگلے تین حروف کو دائرے میں کر دیا۔ اِس طرح تمام حروف کو ترتیب کے ساتھ ایک، دو

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اور تین حروف کے گرد دائرے بناتا رہا۔ جب تمام حروف مکمل ہو گئے تو دائرے سے باہر حروف کو لکھنا شروع کیا۔ بہت واضح الفاظ ترتیب پاتے رہے اور پیغام مکمل ہو گیا۔ جو اِس طرح تھا: ''میں، یونس نے شیام گڑھ میں گرجا کے احاطے میں کنوئیں کے اندر سونے کی دس ہزار اینٹیں محفوظ کی ہیں اور اُن پر ایک نگران بھی مُقرر کیا ہے۔

''ہم دونوں کی خوشی بیان سے باہر تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نگران مقرر کیے جانے کی بات پر ہم دونوں فکر مند بھی تھے کہ نہ جانے یہ کیسا نگران ہو؟ یہ سوچ کر ہی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر اُٹھی اور ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ ہم دونوں نے خیالات کے بہت گھوڑے دوڑائے مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ فیصلہ ہوا کہ کنوئیں کی تلاش اگلے دِن کی جائے۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

''ساتویں دِن صبح گرجا پہنچے۔ ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی سامنے داخلی دروازہ ہے۔ ہم دائیں مُڑے تو ذرا ہی آگے ہمیں ایک جگہ اینٹوں کے آثار نظر آئے۔ قریب پہنچے تو واقعی ایک کنوئیں کی منڈیر تھی۔ اِس کے اُوپر پانی نکالنے والی چرخی بالکل صحیح حالت میں تھی۔ معلوم ہوتا کہ مقامی لوگ کچھ عرصہ پہلے تک بھی اِس کا پانی استعمال کرتے رہے تھے۔ پھر کنوئیں کے منہ پر لکڑیاں رکھ اور اُوپر سے گھاس پھونس بچھا کر اُسے بند کر دیا۔ ہم نے کنوئیں کے چاروں اطراف خوب غور و خوص کیا۔ ٹو ٹا کوارٹر بھی دیکھ آئے مگر کسی محافظ کا اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''احاطے کی دیوار جا بجا شکستہ اور دروازہ بھی غائب تھا۔ اِس بات کا امکان موجود تھا کہ اگر ہم دِن میں کوئی کارروائی کریں تو لوگوں کی نظروں میں آسکتے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ ہم بازار سے مضبوط لمبی رسی خرید کر لائے۔ تصویر کشی کا سامان اور 'ایزل بورڈ' ہمارے پاس پہلے ہی موجود تھا۔

''قدرت بھی جیسے ہم پر مہربان تھی۔ اگلے دن چاند کی چودھویں رات تھی۔ آٹھویں دِن ہم نے صبح ہی سرائے کے مالک سے کہہ دیا کہ آج رات ہم چاند کی روشنی میں گرجا کی تصویر کشی کریں گے اور رات کو دیر سے واپسی ہو گی۔ شام کو ہی ہم اپنا سامان گرجا کے احاطے میں پہنچانے لگے۔ تصویر کشی کے سامان کے ساتھ رسّی، ایمرجنسی لائٹیں بھی احاطے میں رکھ دیں۔ کھانا کھا کر رات آٹھ بجے ہم احاطے میں پہنچ گئے۔ ایک طرف ہم نے مصوری کا سامان اِس طرح سیٹ رکھا کہ ہم ایزل اور کینوس کے پیچھے چھُپ جائیں۔

یہ تیاری کر کے ہم نے کنوئیں کا منہ کھولا۔ ایک لمبے عرصے تک بند رہنے کی وجہ سے اندر کافی بد بو تھی۔ کنوئیں کا منہ خاصا کشادہ ہے اِس لیے گھٹن اور گیس بھرنے کا امکان کم تھا۔ سائمن نے رسّی کا ایک سِرا چرخی میں سے گزارا۔ پھر اُس کی مضبوطی جانچنے کے لیے زور زور سے جھٹکے دیے۔ بلاشبہ اُس کی مضبوطی قائم تھی۔

سائمن نے میرے بازوؤں کے نیچے سے رسّی گزار کر مجھے بڑے اچھے طریقے سے باندھ دیا کہ کسی حادثے کی صورت میں، وہ مجھے گرنے سے محفوظ رکھے۔ میں قدم قدم نیچے اُترنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی۔ سیڑھیاں بہت کشادہ اور مناسب فاصلے سے دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے اُتر رہی تھیں۔ ہر سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے میں احتیاطاً لاٹھی سے سیڑھی کو ضرب لگا کر جانچتا کہ وہ صحیح ہے یا نا قابلِ بھروسا۔ کیا پتا کہیں کوئی چال نہ ہو ...... کوئی پوشیدہ پھندہ۔

''اندازہ کرو کہ یہ مشق میں ہر قدم پر کر رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں ایک ٹارچ تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف میں احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھتا اور دوسری طرف ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیوں کے ساتھ والی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دیوار بھی بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر تیسری طرف ہر سیڑھی کو گن رہا تھا۔ میرے ذہن میں ۳۸ کا ہندسہ تھا۔ یہی کچھ کرتے ۳۸ ویں سیڑھی آ گئی۔ میں نے خوب غور سے کنوئیں کی اندرونی دیواروں کو دیکھا لیکن اِن میں کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ اِس سے آگے اُترائی کا سفر جاری تھا اور پینتالیس کے بعد سیڑھیاں ختم! جب کہ کنوئیں میں پانی کی تہ اب بھی ٹارچ کی روشنی میں کہیں دور تھی۔

’’میں دوبارہ اوپر کی جانب جانے لگا اور ۳۸ ویں سیڑھی پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ لاٹھی پیروں میں رکھ ٹارچ دو سیڑھیاں اُوپر رکھی اور ہاتھ سے دیوار ٹٹولنے لگا۔ ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک جگہ دیوار کا حصّہ باقی دیوار کی سطح سے مختلف لگا۔ میں نے ٹارچ اُٹھائی اور غور سے دیکھنا شروع کیا۔ کنوئیں کی اندرونی دیوار میں بڑے بڑے ناہموار پتھر نصب تھے مگر ایک پتھر کے چاروں طرف سیمنٹ کا حاشیا سا بنا ہوا تھا۔ میں نے اُس پتھر کو غور سے دیکھا۔ مجھے اُس پر صلیب کا نشان نظر آیا۔ مزید غور کیا تو صلیب کے نشان میں آنکھیں پیوست نظر آئیں۔ گِنا تو سات تھیں۔ یقیناً میں درست جگہ پر کھڑا تھا۔ میں نے سائمن کو آواز دے کر سیمنٹ اُکھاڑنے والا نوک دار آلہ منگایا۔ وہ فوراً لے آیا۔

’’سائمن رسی اور ٹارچ سنبھالے تقریباً چوتھی پانچویں سیڑھی پر کھڑا تھا۔ میں نے سیمنٹ پر چوٹ لگائی تو وہ پہلی پر ہی اُکھڑ گیا۔ میں بہت احتیاط سے سیمنٹ اُکھیڑنے لگا۔ جلد ہی چاروں اطراف صاف ہو گئیں اور سامنے ایک ایسا پتھر ظاہر ہوا جس میں انگلیاں پھنسا کر آسانی سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے سائمن کو کامیابی کا اشارہ کیا اور انگلیاں پتھر کے دونوں اطراف پھنسا کر ہلکا سا زور لگایا۔ پتھر آسانی سے میرے ہاتھوں میں آنے لگا۔ وہ وزن میں بہت ہلکا تھا۔ میں نے آرام سے اُسے نِکالا اور اپنے نیچے والی سیڑھی پر احتیاط سے رکھ دیا۔ پھر میں اُس جگہ سے کچھ پیچھے ہٹ گیا کہ مُبادا مدتوں بند رہنے سے کوئی زہریلی گیس ہو تو نکل جائے۔

’’ہاں! ایک بات بتانا میں بھول گیا۔ میں نے کنوئیں میں سے بدبو آنے کا ذکر کیا تھا۔ جب اُس کا منہ کھولا تو جیسے جیسے میں نیچے اُترا، ویسے ویسے بدبو تیز تر ہوتی گئی۔ بہرحال جیسے ہی میں پیچھے ہوا، اُوپر سے سائمن کی آواز آئی۔

’’ذرا رُکیے۔‘‘ اور فوراً اُوپر کو لپکا۔ میں کان لگائے کھڑا رہا۔ کنوئیں کی منڈیر کے آس پاس سائمن کے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دو چار منٹ میں واپس آ کر کہنے لگا۔

’’جناب! مجھے اُوپر سے کوئی جھانکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بڑا سا، بے ہنگم سر...... گویا کسی بڑے سے مینڈک کے سر کا سایہ لیکن جناب میں سڑک تک دیکھ آیا۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔

’’میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور خداوند کا نام لے کر ٹارچ کی روشنی اُس نئے ’دریافت شدہ‘ سوراخ میں ڈالی۔ گھپ اندھیرے میں روشنی سے کچھ تھیلیاں اُوپر نیچے رکھی دکھائی دیں۔ میں نے دایاں ہاتھ بڑھا کر سامنے والی تھیلی اُٹھانے کی کوشش کی۔ وہ خاصی وزنی تھی۔ میں ٹارچ نیچے رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تھیلی باہر نکالنے لگا۔ تھیلی اُوپر اُٹھتے ہی ایک ناقابلِ برداشت سڑاند میری ناک سے ٹکرائی۔ اُس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ اُسے سنبھالنے کے لیے مجھے تھیلی اپنے بازوؤں میں لینا پڑی۔ جیسے ہی میں نے تھیلی کو سینے سے لگایا تو مجھے یوں لگا کہ سخت تھیلی کے بجائے کوئی عجیب سی چیز میرے سینے سے لگی جو یکدم پھیل کر اُوپر میرے چہرے تک پہنچ گئی اور نیچے جیسے کئی ایک بازوؤں اور پیروں نے مجھے کمر سے جکڑ لیا۔ یہ سب ایک لمحے میں ہوا۔ میں نے اِس بلا سے پیچھا چُھڑانے کے لیے سر کو جھٹکا دیا اور غالباً چیخا بھی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ سائمن میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ تھیلی کو ابھی تک میں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اب واقعے کا اگلا حصّہ سائمن سنائے گا۔‘‘

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

☆☆☆

جاوید سائمن نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا:

''میں جب اُوپر سے تسلی کر کے واپس آیا تو صاحب مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں رسّی پکڑے مستعد کھڑا تھا۔ اب میں واپس اندر نہیں اُترا بلکہ منڈیر کے پاس ہی چرخی کے پیچھے سے رسّی پکڑ لی۔ پھر میں نے آواز دے کر صاحب کو مطلع کر دیا۔ میں نے مسلسل ان پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب دونوں ہاتھ سوراخ کے اندر ڈالے تو میں مزید چوکنا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ایک تھیلی صاحب کے بازوؤں میں تھی مگر یکدم ہی صاحب نے اپنا سر جھٹکنا شروع کر دیا۔ میں نے انھیں آواز بھی دی مگر دو تین مرتبہ سر جھٹکنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنا توازن کھونے لگے ہیں۔ میں نے رسّی کو مضبوطی سے تھام کر دوسرے سِرے کو اپنی کمر سے لپیٹ لیا۔ ایک دم مجھے جھٹکا لگا۔ صاحب کنوئیں کے درمیان جھول رہے تھے اور پیر سے ٹارچ ٹکرا کر نیچے گر چکی تھی۔

''میں نے حواس قائم رکھتے ہوئے رسّی کو کھینچنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں صاحب کا ہیولا نظر آنے لگا۔ میں بمشکل تمام انھیں منڈیر تک لایا۔ شکر ہے چرخی نہایت عمدگی سے کام کر رہی تھی۔ میں نے رسّی کو چرخی پر ہی کئی بَل دیے اور دونوں ہاتھوں سے صاحب کو منڈیر سے باہر نکالا۔ صاحب کے اُوپر آنے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ برداشت بدبو میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے صاحب کو زمین پر لٹایا۔ وہ بو اُس تھیلی میں سے آ رہی تھی۔''

پادری نذیر مارٹن نے ہاتھ کے اشارے سے سائمن کو روکا: ''ایک منٹ سائمن! میں پادری گلفام کو وہ حیرت انگیز بات بتا دوں کہ اِس سوراخ میں کئی تھیلیاں ہیں مگر کسی بو کا نام تک نہ تھا۔ سوائے اُس بدبو کے، جو پہلے ہی کنوئیں میں پھیلی ہوئی تھی لیکن جیسے ہی تھیلی اپنی جگہ سے ہلی اِس سڑاند نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ پھر اُوپر سے وہ جسم!'' یہ کہتے ہوئے پادری نذیر نے جھرجھری لی اور سائمن کو بولنے کا اشارہ کیا۔

''جی جناب! تو اس بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا مگر صاحب نے بے ہوشی میں بھی اسے نہایت مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ میں جلدی سے پانی کی بوتل لایا اور رومال بھگو بھگو کر صاحب کے چہرے پر پھیرنے لگا۔ پانی کے چھینٹے مارے، ہاتھ پاؤں سہلائے ...... غرضیکہ تقریباً پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ میرا نام لیا، تھیلی مجھے پکڑائی اور مجھے ایسے لگا کہ صاحب پھر سے بے ہوش ہونے لگے۔ میں نے انھیں پھر ہلایا۔ انھوں نے آنکھیں تو کھولیں مگر بالکل سپاٹ، زندگی سے عاری۔ میں نے اُٹھانے کی کوشش کی تو اُٹھ کے بیٹھ گئے مگر بالکل ایسے جیسے کوئی چابی والا کھلونا ہو۔ مجھے یہ بھی غنیمت محسوس ہوا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند بھی قدرے ڈھل چکا تھا۔ میں نے تھیلی وہیں سامان میں چھپائی اور ان کو سہارے سے کھڑا کیا۔ صاحب کھڑے بھی ہو گئے، چلنے بھی لگے، آنکھیں بھی کھُلی تھیں مگر کسی قسم کے احساس سے عاری تھے۔ میں ان کو لیے آہستہ آہستہ سرائے کی طرف چلا۔ پانچ منٹ کا فاصلہ بیس منٹ میں طے ہوا۔ سرائے کا دروازہ کھُلا تھا۔ میں آرام سے انھیں لے کر کمرے میں آ گیا۔ بستر پر لٹا کر چادر اُوڑھائی۔ صاحب کی سانس ہموار چل رہی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ میں انھیں چھوڑ کر واپس گرجا پہنچا۔ ایزل اور کینوس کے علاوہ تمام سامان سمیٹا۔ تھیلی کی بدبو مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح سامان میں رکھ تھیلی کمرے میں لے آیا۔ وہاں بہت سے کپڑوں کے اندر تھیلی کو لپیٹا تو بو قدرے کم ہونے لگی پھر بالکل ہی ختم ہو گئی۔ پو پھٹ چکی تھی۔ میں تھکن سے چور تھا۔ وہیں فرش پر لیٹ کر سو گیا۔

''صاحب کے کراہنے سے میری آنکھ کھُلی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ جلدی سے انھیں دیکھا۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ صاحب 'پانی پانی' بُڑبُڑا رہے تھے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

میں فوراً پانی کا گلاس اور چمچ لے آیا۔ قطرہ قطرہ پانی ہونٹوں سے لگایا تو انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور بہت مشکل سے بولے۔ کان لگایا تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ سُنے:

''پادری گلفام جوزف، خط، فوراً آؤ۔'' میں نے جلدی سے کاغذ پر یہ پیغام لکھا اور صاحب کو اُسی حالت میں چھوڑ کر قصبے کے اکلوتے ڈاکخانے پہنچ گیا۔ پھر واپسی پر گرجا سے ایزل اور کینوس بھی اُٹھا لایا۔ صاحب سارا دن غنودگی کے عالم میں رہے۔ کھانا بھی بہت کم کھایا۔ شام کو سورج ڈوبنے کے فوراً بعد وہی ناگوار بو کمرے میں پھیلنے لگی۔ میں نے ہر طرح کا سامان چھپائی ہوئی تھیلی پر ڈھیر کرنا شروع کر دیا مگر بے فائدہ...... بدبو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے اُس کی درزوں میں مختلف کپڑے اور کاغذ پھنسا دیے کہ بدبو دروازے سے باہر نہ جائے۔ رات کچھ اور گہری ہوئی تو ایسا لگا کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بدبو کی وجہ سے صاحب بھی کچھ ہوش میں تھے۔ ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

''محافظ''...... جب تمام باتیں پوری ہو چکیں تو یقیناً محافظ والی بات بھی درست ہو گی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کنوئیں کی منڈیر پر جو بے ہنگم، بدشکل سایہ تھا وہ یقیناً محافظ تھا، جو مجھے نظر نہ آیا مگر صاحب کو اُس نے جکڑا ...... مگر وہ ہے کیا؟ ہم سمجھنے سے قاصر تھے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صاحب کا بہت برا حال تھا۔ پو پھٹنے پر بدبو اور آوازیں ختم ہو گئیں اور ہم دونوں دوپہر تک سوتے رہے۔ پھر شام کو آپ! جناب پادری گلفام صاحب تشریف لائے اور بعد کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔''

☆☆☆

''میرے عزیز دوست گلفام جوزف! اب تو تم بھی اِن تمام جگہوں سے ہو آئے۔ تم نے میرے حالات بھی سُن لیے۔ اب تم تفصیل سے اپنا تجربہ بیان کرو۔''

پادری گلفام نے گہری سانس لی۔ اُنھوں نے بہت غور سے تمام باتیں سنی تھیں۔ اب اُن کی باری تھی۔ کھنکورا بھرتے ہوئے انھوں نے بولنا شروع کیا:

''میرے عزیز دوست! چونکہ میں ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تو میں نے بلا تامل تمہارے ایک ایک لفظ پر یقین کر لیا۔ اگر میں نے یہ سب نہ دیکھا ہوتا تو میں منہ سے تو کچھ نہ کہتا مگر...... اور ہاں!! میں نے محافظ کا معمہ بھی دیکھ لیا ہے جو تم سے حل نہ ہوا تھا۔ بہرحال، میں سائمن کی راہنمائی میں بہت آسانی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔ اُس نے مجھے بھی احتیاطاً تمہاری طرح رسّی باندھ دی تھی۔ سوراخ اُسی طرح کھلا تھا۔

''کنوئیں میں بدبو تھی مگر وہ رات والی سڑاند نہیں تھی۔ میں نے احتیاط سے تھیلی اندر رکھی۔ پتھر سے سوراخ بند کیا۔ تمہاری لاٹھی وہیں رکھی تھی، وہ بھی اُٹھا لی۔ پھر میں سکون سے اُوپر آ گیا۔ سائمن نے گیلی مٹی تیار کی ہوئی تھی۔ اب وہ نیچے اُترا تاکہ گیلی مٹی کا لیپ کر کے تمام پتھروں کی ہیئت ایک جیسی کر دے۔ میں فارغ تھا۔ یوں ہی منڈیر کی اینٹیں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے مجھے محسوس ہوا کہ اینٹوں پر اُگی جڑی بوٹیوں کے پیچھے کچھ اینٹوں کا رنگ الگ ہے۔ میں نے تجسس کی خاطر وہ بوٹیاں اُکھاڑیں تو پتھروں پر ایک شبیہ کندہ تھی۔ ایک بڑا سا مینڈک اِس طرح بیٹھا تھا گویا جست بھرنے کے لیے تیار ہو اور اُس کے نیچے لکھا تھا:

''پوشیدہ چیز کا محافظ۔''

''اچھا! تو اُوپر سے اس مینڈک محافظ ہی نے جھانکا اور مجھ پر بھی اُسی نے حملہ کیا۔'' پادری نذیر مارٹن آہستہ سے بولا اور سکون سے لمبی سانس لے کر نیم دراز ہو گیا۔

اب خزانے تک پہنچنا ممکن تھا اور آسان بھی۔ تھیلی اور محافظ کا راز سامنے آ چکا تھا۔

☆☆☆

◆◆◆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کشمیریات

بیگم تنویر لطیف چوہدری (تمغۂ امتیاز)

لا غالب الا اللہ

مقبوضہ کشمیر میں پیر پنجال کی خوبصورت وادیوں میں بھدرواہ کا دلکش شہر صاف نیلگوں آسمان کے نیچے گردوپیش کے فلک بوس پہاڑوں سے اترنے والے برفانی آبشاروں کی گود میں ایک نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے یہ میرا بچھڑا ہوا آبائی شہر ہے جس کی گلیوں کے بوسے لینے کو 1947 سے آج تک دل ترس رہا ہے۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی ہوئی اداس راتوں میں ابا جی مرحوم پروفیسر خواجہ عبدالصمد بھدرواہ کی یادیں ہمیں اپنے بچپن کے عجیب و غریب قصے سنایا کرتے تھے۔ ایک سچا واقعہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

حقیقت میں انسانیت کی تباہی و بربادی کے رقصِ ابلیس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں

آج بھی فطرت کی دل آویزیوں کے ساتھ ذہن میں تر و تازہ ہے۔ جو کچھ یوں ہے کہ سکول اور گھر کے راستے میں زعفران کے وسیع کھیت پھیلے ہوئے تھے جن کے بیچوں بیچ گلیشئرز کے برفانی پانی کی شفاف ندی بہتی تھی۔ ایک دن سب بچے سکول سے واپسی پر حسبِ معمول ندی کے نقرئی پانی میں اپنی تختیاں دھو رہے تھے کہ اچانک ندی کے پار ایک ننگ دھڑنگ بچہ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچا اور اپنا دائیاں ہاتھ پانی میں ڈبو کر بار بار چوسنے لگا۔ بچے یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوگئے اور شور مچانے لگے۔ کچھ دیر میں اردگرد کے لوگ جمع ہوگئے تو یہ انتہائی حسین و جمیل اور صحت مند بچہ اسی طرح گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا ایک غار کے اندر غائب ہوگیا۔

لوگوں نے غار کے اندھیرے میں لالٹین جلا کر ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ایک دلخراش منظر ان کے سامنے تھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ جس کی عمر ایک سال سے بھی کم تھی ایک عورت کے ہڈیوں کے پنجر سے لپٹ کر سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ اب بات کچھ کچھ لوگوں کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک نیک دل آدمی نے اس بچے کو اٹھایا اور اپنے گھر لے آیا۔ برفباری کا موسم شروع ہوا تو بکروال خانہ بدوشوں کے قافلے اپنی بھیڑ بکریوں کو ہانکتے ہوئے میدانی علاقوں جموں گورداسپور لاہور کا رُخ کرنے کے لیے بھدرواہ سے گزرنے لگے۔ ایک قافلے نے یہاں قیام کیا اور مسجد سے اعلان کروایا کہ گزشتہ برس موسم گرما میں واپسی کے سفر میں ان کی ایک حاملہ خاتون قافلے سے بچھڑ کر کہیں گم ہوئی تھی اگر کسی کو علم ہو تو ہماری مدد کرے۔ اس طرح وہ بچہ اپنے باپ کے حوالے کیا گیا۔ اللہ انتہائی مہربان کی شانِ کریمی ہے جو مُردے کو حیاتِ نو کا سبب بناتا ہے اور مامتا مر کر بھی زندہ رہتی ہے۔ اِذنِ ربّی سے وہ ننگ دھڑنگ بچہ بھدرواہ کی شدید برفباری میں کیڑوں مکوڑوں اور خونخوار جنگلی جانوروں کے درمیان بھوک پیاس کا مقابلہ کرتے خونخوار دشمنوں کی حفاظت میں زندگی کی راہیں خود ہی تلاش کرتا رہا مخلوق جب اللہ کے قریب ہوتی ہے تو وہ اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔ ازل سے ابد تک پیدا ہونے والے ہر نوزائیدہ بچے کی پہلی آواز انسان پر اللہ کے اعتماد اور نسلِ انسانی کی بقاء کے لیے اس کی مشیت و منصوبہ بندی کی دلیل ہوتی ہے لیکن اب اس طرح کی نشانیاں منظرِ عام پر نہیں آتیں کیونکہ انسان نے عالمِ اسباب سے نتائج اخذ کر کے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور شاید اللہ جل جلالہ نے بھی انسان کو اس کی عقل و خرد کے سپرد کر کے اپنا دستِ رحمت کھینچ لیا ہے۔ قرآن نے آشکار کردیا ہے کہ ''بر و بحر میں جتنا بھی فساد ہے وہ انسان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے''۔ خالقِ کائنات جو شکمِ مادر کے اندھیروں سے آغوشِ مادر کی چاندنی تک انسان کی پرورش کرتا ہے وہ معصوم بچوں اور ان کی بے گناہ ماؤں پر ظلم و ستم کیونکر برداشت کرسکتا ہے۔ لیکن آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں زمین و آسمان معصوموں کی چیخوں اور فریادوں سے لرز رہے ہیں۔ لگتا ہے یہ دنیا کسی بڑے حادثے کی طرف لڑھک رہی ہے۔

2020 کا آغاز ایک تین سالہ معصوم شامی بچے کی آخری ہچکی سے ہوا جس نے امریکی بمباری میں اپنے زخموں سے ادھڑے ہوئے جسم کے درد میں شہادت سے قبل آسمان کی طرف دیکھ کر اپنی توتلی زبان میں اہلِ زمین کے لیے ایک دھمکی آمیز پیغام چھوڑا۔ ''میں اللہ میاں سے شکایت کروں گا اور سب کچھ بتاؤں گا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا''۔

اس سے بھی خطرناک سرینگر کے طویل ترین اذیتناک کرفیو کے دوران کشمیری لڑکی کی پکار ہے جس نے گھر کی کھڑکی سے گلی میں گزرتے ہوئے اپنے کزن کے بھارتی دوست کو کہا تھا اگر ہو سکے تو دنیا کے تماش بینوں تک میری یہ فریاد پہنچا دو کہ اللہ تمہیں بھی کسی سخت لاک ڈاؤن سے آشنا کردے تاکہ تمہیں احساس ہو کہ چھ ماہ کے مسلسل لاک ڈاؤن میں بچوں عورتوں اور بزرگوں پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔ بے گھری، ہجرت اور

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

در بدری کے عذاب میں جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتے شام کے بے قصور باشندوں کے سامنے ان کے معصوم بچوں کی سمندر میں تیرتی لاشیں، بزدل بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں ہندواڑہ کے ہائی سکول کے معصوم بچوں کو کشتی میں سوار کرا کے جھیل وُلر کے عین درمیان خوفناک بھنور میں غرق ہونے والے معصوم بچوں کی چیخیں اور عفت مآب کشمیری بیٹیوں کو گھروں کے اندر گھس کر بے آبرو کرنے کی وارداتیں اس دنیا کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گی۔ ظلم، منافقت اور جھوٹ ایک وبا کی طرح پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ لیبیا، شام اور عراق کی سرزمین پر امریکہ کو کیا خطرہ تھا۔ شامیوں نے روس کا کونسا قرض چکانا تھا۔ یمن میں حوثیوں نے کونسے ایرانی مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔

افغانستان میں باراتوں پر بمباری کی غلطی کا سفاکانہ اعتراف اور صرف Sorry، گھروں کے اندر دادی کے سامنے پوتوں کے اڑتے ہوئے پرخچے اور بہو کا درخت میں لٹکا ہوا آنچل، لہو میں ڈوبے ہوئے ننھے مُنے جوتے اور صحن میں ہر طرف بکھرے ہوئے ادھ جلے کھلونے ارضِ افغانستان کے ہر گوشے میں نظر آنے والے یہ منظر بھارتی قونصل خانوں اور آسودگی میں زندگی گزارنے والے دہلی اور واشنگٹن کے لے پالک حکمرانوں کے لیے سوالیہ نشان ہیں۔ ہوشربا حقائق کی یہ سب گرہیں امریکہ اسرائیلی مفادات کی رسی سے بندھی ہوئی ہیں اور سازشوں کا ایندھن بننے والے بظاہر جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

حقیقت میں انسانیت کی تباہی و بربادی کے رقص ابلیس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں عرب و عجم کے معرکے اور دنیائے اسلام کی بے بسی کی بساط پر بشارالاسد کا انداز حکمرانی کسی اور کہانی کا پلاٹ بتارہا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے یتیم بچوں اور بیوہ ماؤں کی لاشوں پر امریکہ اسرائیل کے ہمہ پہلو مفادات کا پرچم لہرا رہا ہے۔ عراق، مصر، شام، فلسطین و حلب سے ہزاروں سال قدیم انبیائے کرام کی نشانیاں، قیمتی نوادرات، آثارِ قدیمہ کے بیش قیمت جواہر پارے، قدیم کتب کے قلمی نسخے دنیائے عرب کا دل وجگر چیر کر سب امریکہ اور تل ابیب منتقل ہو چکا ہے جن کی اس سرزمین پر نکسیر تک نہ پھوٹی۔

کہتے ہیں کہ جس بستی میں دو بدمعاش ہوں ان کے اپنے اپنے محلے ایک دوسرے کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور جب ایک بدمعاش دوسرے کو نیچا دکھا کر بستی کی بلاشرکت غیرے واحد قوت بن جائے تو پھر اردگرد کی سب بستیاں تاراج ہو جاتی ہیں۔ اس دنیا کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ دنیا جب مشرق اور مغرب کے دو بلاکوں میں منقسم تھی تو ایک دوسرے کے دباؤ کی وجہ سے ہر کہیں قدرے امن تھا۔ کچھ اقدار و تہذیب کی پاسداری بھی تھی۔ مشرق میں سوویت یونین آف رشیا کی طاقتور سلطنت اپنے بے عقیدہ اشراکی نظام کے خول میں بند اپنی خفیہ ایجنسی کے جی بی کی ظالمانہ پالیسیوں کے بل بوتے پر مشرق کے ابھرتے ہوئے سورج سے بے نیاز اور گردوپیش کے ماحول سے لاتعلق ہو کر دنیا سے اپنی بالادستی کا لوہا منوا رہی تھی تو دوسری طرف مغربی بلاک میں امریکہ اور اسرائیل کے بچھائے ہوئے منحوس سودی نظام معیشت کے سفاکانہ جال میں پھنسی ہوئی تیسری دنیا کی کمزور ریاستیں اپنے غریب عوام کے لہو سے اس عفریت کی آبیاری کر رہی تھیں۔ عربوں کے تیل کی دولت سے بذریعہ بینک اکاؤنٹ لبالب بھرے ہوئے ان کے بینک اور آسمانوں سے برستے ہوئے ڈالروں نے مصنوعی معیشت اور مصنوعی طاقت کو بے لگام کر دیا اور عقابوں کے شکار پر مکاری سے ہاتھ صاف کرنے کے سائنسی طریقے ایجاد ہونے لگے۔ ان کا مقابلہ صرف روس سے تھا جس کی بڑھتی ہوئی قوت انھیں گوارا نہ تھی۔ مہرے تلاش کرنے میں انھیں زیادہ دیر نہ لگی کیونکہ ایشائی مزاج کے مطابق حالات خود بخود بدل رہے تھے۔ ان

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

قوتوں نے روس کے اندر کی توڑ پھوڑ سے فائدہ اٹھایا جس کا آغاز خفیہ ایجنسی کے جی بی (KGB) کی اپنے ہی لوگوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کمیونسٹ پارٹی کے اندر اعلیٰ شخصیات کے ٹکراؤ اور آپس کی کردار کشی کی وجہ سے پھیلتی ہوئی عوامی بے چینی سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ باہمی نفرتوں کے ماحول میں پروان چڑھنے والے مہروں کے ذریعہ نظام انصاف، نظام تعلیم اور میرٹ کو پامال کر کے اعلیٰ مناصب کو بے وقار کیا گیا۔ انجام کار برسوں کا مستحکم نظام تہہ و بالا ہو گیا۔ اس پس منظر میں گورباچوف نے گرم پانیوں تک پہنچنے کی دیرینہ قومی آرزو کی تکمیل کے لیے افغانستان پر فوجی یلغار کرنے کی سفاکانہ غلطی کی۔ ظاہر ہے اس کا اگلا حدف پاکستان ہی تھا جہاں 48-1947 سے ہی عوام کے اذہان میں ''امریکہ تیرا شکریہ'' اور روس کے ملحدانہ فاشٹ نظام کے خلاف نفرت انگیز خوف بٹھایا گیا تھا۔ روسی فوج کشی کے خلاف ''اسلام اور پاکستان خطرے میں ہے'' کا بگل بجا دیا گیا۔

افغان قوم جو پیدائشی طور پر عسکریت پسند ہے پہلے ہی اپنے حکمرانوں کے پے در پے اندھے قتل کی وجہ سے سراپا احتجاج تھی ہتھیار بند ہو کر مقابلے کے لیے صف آراء ہوگئی جذبہ جہاد سے متاثر ہو کر عرب تنظیم القاعدہ کے نام سے اسامہ بن لادن کی قیادت میں اپنے سارے وسائل اور افرادی قوت کے ساتھ افغان جہاد میں شامل ہوگئی۔ پاک فوج کی خفیہ ایجنسیوں کو بھی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بازو آزمانے کا موقع مل گیا۔ ملکی سلامتی اور مستقبل کے خطرات کی پیش بندی کے لیے یہ ایک ناگزیر فیصلہ تھا۔ جنرل اختر عبدالرحمن، جنرل حمید گل کی شاندار حکمت عملی اور میجر عامر جیسے جانبازوں کی بے مثال بہادری اور سنگلاخ پہاڑوں، دروں اور خطرناک تنگناؤں میں حملہ آوروں کو گھیر گھیر کر پسپا کرنے کی دھوم دنیا بھر کے فوجی حلقوں میں زیر بحث آنے لگی۔ پانسہ پلٹتے دیکھ کر امریکہ نے بھی طالبان پر اپنے سٹنگر میزائلوں کی بوچھار کر دی اور ڈالر مدرسہ حقانیہ اور مذہبی جماعتوں کے ذریعہ افغانستان کے میدان کارزار میں اترنے لگے۔ افغان مجاہدین اور پاکستانی سرفروشوں نے کسی ٹریننگ کے بغیر سٹنگر میزائل کندھوں پر رکھ کر کارروائیاں شروع کیں تو یورپ کی چیخیں نکل گئیں۔ سب دم بخود ہو کر معاملات کا جائزہ لینے لگے۔ روسی افواج جو منگول جانبازوں کی عسکری تاریخی روایات کی امین تھیں پورے اعتماد کے ساتھ میدان کارزار میں اتری تھیں لیکن اب کے بار ان کا مقابلہ بالکل مختلف قسم کی قوتوں سے تھا۔ جن کی پشت پر جنرل ضیاء الحق جیسے نظریاتی حکمرانوں کی تائید و طاقت تھی۔ ان کی آنکھوں میں مسلم امہ کی نشاۃ ثانیہ، احیائے شوکت اسلام اور آزادی کشمیر کے خواب سجے تھے اور اب یہ خواب حقیقت بن کر مسلم امہ کی آنکھوں میں اتر رہے تھے۔

روس کے بحری بیڑے، ایٹمی قوت کے پلانٹ، میزائلز، سپٹنکس، سائنسی ترقی، چاند تاروں پر کمندیں ڈالنے کی صلاحیت سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا لیکن روسی فوج ان سنگلاخ پہاڑوں میں ہمالیہ جیسی قوت ایمانی والے خرقہ پوش جانبازوں کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کر کے واپس جا چکی تھی۔ اس واپسی کے ساتھ ہی سوویت یونین جیسی دیوہیکل قوت تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر چکی تھی اس کی کوکھ سے قازقستان، کرغستان، ازبکستان، تاجکستان جیسی اسلامی ریاستیں فاشٹ جبر سے نکل کر آفتاب آزادی کی سحر نو سے فیضیاب ہو چکی تھیں یہاں تک تو حیرت انگیز طور پر سب اچھا تھا لیکن انجام کار یہ سب کچھ عالم اسلام کی تباہی و بربادی اور ہولناک خونریزی کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ جبکہ تیس لاکھ بے لوث اور بہادر مجاہدین کی شہادتوں اور نوجوانوں کی قربانیوں سے دنیا کی واحد سپر پاور کے ظلم اور سفاکیت کا سورج طلوع ہوا۔ روسی فوجیں تو دریائے آمو کے پار دھکیل دی گئیں اور جنرل اختر عبدالرحمن جنرل حمید گل کی شجاعت قائدانہ صلاحیتیوں، عظیم الشان حربی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

منصوبہ بندی اور پیشہ وارانہ تربیت کی فقید المثال صلاحیتوں پر یورپ میں کتابیں لکھی گئیں اور عسکری ادب تخلیق ہوا۔ ''فاتح'' کے نام سے پاکستانی جرنیلوں پر لکھی گئی کتاب کا اردو ترجمہ مقبول عام ہوا لیکن یہیں سے اس عالمگیر خوف کا آغاز ہوا جو آنے والے انقلاب کے تخمینے بنا رہا تھا۔ مسلم امہ کی نئی نسل اپنی تاریخ کے اوراق کھنگال رہی تھی کہ تاریخ اسلام کے مایہ ناز کردار صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق سمیت لالوکھیت کے آسمان پر ہوا میں اڑا دیے گئے اس طرح مستقبل میں لکھی جانے والی تاریخ عالم کے ایک زریں باب کا عنوان بدل دیا گیا۔ اگر احساس ''کبریائی'' اور رعونتِ شداد میں "The end of History" جیسی کتابیں لکھوانے کے بجائے نئی ابھرنے والی واحد سپر پاور عملیت پسندی، عقل و خرد اور انصاف کے ساتھ "لاتثریب علیکم الیوم" والے فلسفہ حیات سے آشنا ہوتی اور سمندر پار کی مغربی قوتیں بیش قیمت قربانیوں اور شجاعت کے اعتراف میں مشرق میں ابھرنے والی اس نئی قوت سے سمجھوتہ کر کے دنیا کے لیے حقیقی امن اور احترام آدمیت کا نیا دستور مرتب کرتی تو نسل انسانی کے مستقبل کے لیے ایک بہتر دنیا تشکیل پا سکتی تھی جس کے سائے میں انسانیت پھلتی پھولتی لیکن بدلتی ہوئی دنیا میں تہذیبوں کے ٹکراؤ کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

وہ دنیا جہاں نہ وہ حقیقی قدرتی حسن رہا نہ سچا عشق بلکہ انسان کے شرف کا سارا بھرم مادہ پرستی، تصنع اور خود غرضانہ منافقت کی نذر ہو گیا ہو جہاں "I Love You" کا مطلب ہو ''مجھے بھوک لگی ہے'' وہاں تیسری دنیا کی سود میں گروی رکھی ہوئی غریب اقوام کے خوابوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ سودی معیشت آقا اور غلام کی معیشت ہوتی ہے اور سود خور اپنے سارے مقاصد اصل زر سے ہی حاصل کر کے مقروض کو ہر دم بڑھتے سود کی صلیب پر لٹکائے رکھتا ہے، اس کہانی کا بھی یہی انجام ہوا۔ پاکستان، افغانستان اور عالم اسلام کی بہادر اور بلند کردار ماؤں کی گودیں اجڑیں بیواؤں کے سہاگ قربان ہوئے۔ پورے پورے خاندان تباہ ہوئے اور ثمرات سمیٹنے والا کردار تماشائے لبِ بام تالیاں بجاتا رہا۔ اب تاریخ کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ پرانے شکاری نئے جال بننے لگے۔ ملا عمر کی قیادت میں افغانستان نے صدیوں میں پہلی بار سکھ امن اور پاکیزہ ماحول میں سانس لیا تھا اور دنیا کو قانون کی حکمرانی کے نئے اسلوب متعارف کروائے جا رہے تھے۔ شکوک و شبہات کا غبار چھٹ رہا تھا۔ پاکستانی اور افغانی بغلگیر ہو رہے تھے۔ اجنبیت کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ سماجی، ثقافتی، تاریخی اور کاروباری رابطے قریب آ رہے تھے۔ عجیب فراوانی شوق کا سماں تھا کہ اچانک نیویارک میں ''نائن الیون'' کا واقعہ رونما ہو گیا۔

دنیا کو معلوم ہے کہ اس دن Twin Towers میں کام کرنے والے تمام اسرائیلی یہودی ملازم چھٹی پر تھے۔ اس دن اسرائیلی وزیر اعظم کا طے شدہ دورہ امریکہ عین موقع پر منسوخ کر دیا گیا تھا اور بغیر کسی تحقیقات کے واقعہ کی ذمہ داری القاعدہ پر ڈال دی گئی۔ جو کبھی امریکی حکمرانوں کی آنکھوں کے تارے تھے اب انہی کی جرات و استقامت اور یقین محکم کے نادیدہ خوف سے خوامخواہ لرزہ براقدام تھے۔ کاش جنرل مشرف اپنی زندگی کی سب سے تاریک رات اللہ پر بھروسہ کر کے اور اسی کی مدد مانگ کر صبح تک ٹال سکتے اور صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی عبوری حکومت کے قیام اور نوے دن کے اندر انتخابات کا اعلان کر کے گھر چلے جاتے لیکن تاریخ اگر مسلم عوام، پاک فوج کے اعلیٰ دماغوں اور جانیں قربان کرنے والے عام سپاہیوں کی مٹھی میں ہوتی تو میدان کارزار میں جیتی ہوئی جنگیں مذاکرات کی میز پر نہ ہاری جاتیں۔ جنرل مشرف کی ایک ''ہاں'' نے کایا ہی پلٹ دی۔ ٹوِن ٹاورز (Twin Towers) کا سارا ملبہ القاعدہ اور طالبان پر ڈال دیا گیا۔ بتیس لاکھ گمنام پاکستانی افغانی اور اسلامی ممالک کے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

شہداء کی لاشوں پر امریکی اتحادی نیٹو افواج کا پرچم لہرادیا گیا۔ طالبان کی حکومت ختم کرکے ایک کٹھ پتلی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ بھائی کو بھائی سے لڑانے کی فنکاری اپنے جوہر دکھانے لگی، جامعہ حفصہ پر یلغار کے واقعہ نے خرمن میں ایسی چنگاری سلگائی کہ سوات کے شہید بچوں کا انتقام لینے کے لیے صوفی محمد کے مسلح قافلے اسلام آباد کا رخ کرنے لگے جب روکا گیا تو یہ سارے ملک میں پھیل گئے اور بلی چوہے کا کھیل شروع ہوگیا۔ چوک چوراہے، بستیاں، مسجدیں، امام بارگاہیں، سکول سب خون مسلم میں نہائے گئے۔ ہندوستان خاموش تماشائی کیسے رہتا۔ کشمیر اس کے ہاتھ سے جا رہا تھا۔ امریکہ کو بھی چین کے خلاف اب ہندو خون چاہیے تھا۔ ماضی قریب کا کامیاب تجربہ ان کی مٹھی میں تھا۔ چنانچہ افغانستان میں بھارت کے قونصل خانے کھول کر اپنے مفادات کی آبیاری ہندو بنیوں کے حوالے کرکے انھوں نے اپنی جارحانہ کارروائیوں کا رخ ابھرتے ہوئے عرب ملکوں کی طرف کرلیا۔ تورہ بورہ جہاں سے غازیوں کے قافلے اسلام بچاؤ اور فتح کی نوید لے کر نکلے تھے، بموں کی ماں استعمال کرکے ریزہ ریزہ کردیا گیا اور پھر کھنڈرات کے ڈھیر سے اتحادیوں کے پہرے میں افغانستان کی قیمتی معدنیات پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ پل چرخی جیل جہاں پوری افغان جنگ میں کوئی بے ہودگی نہیں ہوئی تھی مظلوم عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کی چیخوں سے گونجتی رہی۔ القاعدہ کی عرب شہزادیاں زنجیروں سے باندھ کر بچوں سمیت عقوبت خانوں میں بند کی گئیں اور ان کے سامنے ان کے بہادر مردوں کو شہید کیا گیا۔ عافیہ صدیقی جیسی نازک خاتون کو دوران سفر بچوں سمیت اٹھا لیا گیا، امریکی فوجوں پر حملے کا مضحکہ خیز الزام لگا کر گوانتا موبے کی بدنام زمانہ جیل میں بند کردیا گیا۔ ایک بچہ دم توڑ گیا اور برسوں بعد ایک مخبوط الحواس بچی کو جو اجنبی زبان بولتی تھی عافیہ صدیقی کی بہن کی دہلیز پر رات کے اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا۔ بھارت جسکا افغان جنگ میں کوئی کردار نہیں تھا اپنے قونصل خانوں کے ذریعے پاکستان کے کوچہ و بازار میں اپنے زرخرید گماشتوں کے ذریعے بارود بھرتا رہا۔ بالآخر جنرل راحیل شریف اور سول قیادت کے دوٹوک فیصلے نے افواج پاکستان کی جراتمندانہ کارروائیوں سے دہشت گردی کے اس نئے طوفان کا صفایا کیا اور دنیا سے ایک نئے زاویے میں اپنی پیشہ وارانہ عسکری صلاحیتیوں کا لوہا منوایا اور پاک فوج دنیا کی صف اول کی افواج میں اپنی عظمت کے پرچم کے ساتھ ابھری۔

اس کہانی کا آخری سبق یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی حکومتوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے اور اپنے قومی مفادات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایران عراق جنگ آٹھ برس تک رہی اور خون مسلم کی ندیاں بہتی رہیں لیکن مفادات اسلام دشمن قوتوں نے سمیٹے۔ جس دن صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا اس دن ان کی پہلی طویل میٹنگ خاتون امریکی سفیر سے ہوئی لیکن انجام کار ان کی گردن میں پھندا انھی ہاتھوں نے لگایا۔ پاکستانی عوام تو ہر دور میں آزمائشوں کی صلیب پر لٹکے رہے۔ اوجڑی کیمپ کا روح فرسا واقعہ کیوں ہوا؟ بلیک واٹر کے کارندے کس کی اجازت سے سرزمین پاک پر اتر کر پراسرار طور پر غائب ہوگئے۔ بلیو پاسپورٹ کی کھیپ کیوں اور کس نے ایشو کی۔ امریکن اسلحہ سے بھرے ہوئے کنٹینر بندرگاہ سے اترتے ہی کراچی شہر میں کہاں غائب ہوگئے۔ اس سازش میں کون شامل تھا اور یہ اسلحہ پاکستانی عوام کے خلاف کس طرح استعمال ہوا۔ رمز فیلڈ کی آئل ریفائنری میں اپنی اولادوں کو بھرتی کروا کر کس کس نے کیا کچھ کھویا اور کیا پایا۔ یہ سب سوالات اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنا شافع جواب آنے تک گردش کرتے رہیں گے۔ پاکستان کی آئندہ نسلوں کو ایسی گھناؤنی سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اصل تحقیقات طلب اور احتساب کے زمرے میں آنے والے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

معاملات تو یہ تھے جو پسِ پشت ڈال دیئے گئے کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست وطن عزیز کی حرمت اور پاکستانی عوام سے تھا۔لیکن حکومت گراؤ اور پھر حکومت بناؤ اور حکومت بچاؤ کے کھیل میں گروہی دشمنیاں اور نفرتیں کاشت کرنے کے سوا ہماری کوئی واضح داخلہ پالیسی نہیں رہی۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہم نے سیاسی مخالفت میں رحمائُ بینکم و اشداء علی الکفار کے قرآنی حکم سے سرتابی کی اور آپس میں رحم کرنے والے اور کفار کے معاملے میں فولاد کی طرح سخت ہونے کی بجائے اس کے الٹ عمل کیا کاش ابھی نندن جیسا نرم گوشہ ہم اپنے مخالفین کے لیے بھی رکھتے؟ قوم نفرتوں کے سیلاب میں تقسیم در تقسیم ہو رہی ہے۔ ہر ناکے پر دشمن کے گماشتے براجمان ہیں اور اب یہ ناکے پاؤں سے سرک رہے ہیں۔لگتا ہے مشیت الٰہی سے بغاوت کا حساب ہر جگہ ہر منافق اور ظالم کا تعاقب کر رہا ہے۔آج سارے ظالم پریشان و سراسیمہ ان جانے اور ان دیکھے دشمن کے سامنے رکوع میں کھڑے ہیں۔کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کب اور کہاں سے اس کے پھیپھڑوں میں گھس کر وار کر دے گا۔انسان انسان سے خوفزدہ ہیں۔وہ جنہوں نے عالم اسباب سے نتائج اخذ کر کے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اپنی عقل و دانش سمیت سر پکڑ کر بیٹھے ہیں۔نیو یارک میں قبرستان کی سی وحشت ہے سارے طاقتور اتحادی موت کی گنتی میں مصروف ہیں۔سب تہذیبیں ٹکراؤ سے پہلے ہی ملیا میٹ ہو گئیں۔دنیا پر قیامت کے سکوت کا عالم ہے۔بزرگ بوجھ بن گئے ہیں۔سکولوں، تھیٹروں، قہجہ خانوں۔کیسینوز پر تالے پڑے ہیں۔پارک ویران، ریلوے سٹیشن، ہوائی اڈے خاموش ہیں۔مارکیٹیں کانپ رہی ہیں۔عبادت گاہوں میں عبرت بین کر رہی ہے۔سود پر چلنے اور پھلنے پھولنے والی معیشتیں زمین بوس ہو رہی ہیں اور توبہ کے دروازے بند ہیں "The End of History" لکھوانے والے اپنی تاریخ کے آخری باب سے خوفزدہ ہیں۔اب شامی بچے کی لہو میں ڈوبی ہوئی فریاد اپنا جواب مانگ رہی ہے۔''میں اللہ میاں کو سب کچھ بتاؤں گا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا'' اور سرینگر کی اس بیٹی کو کرب میں ڈوبتی ہوئی اپنی پکار کا مجسم جواب نظر آ رہا ہے۔''اے اللہ پوری دنیا کے تماش بینوں اور ظالموں کو اس لاک ڈاؤن سے آشنا کر دے جو ہمارے اوپر کئی ماہ سے مسلط ہے''۔آج امریکہ کے جارج فلائیڈ کی درد میں ڈوبی ہوئی آخری ہچکی ''میں سانس نہیں لے سکتا، میں سانس نہیں لے سکتا'' پوری دنیا کے آزاد انسانوں کی سانسوں میں اتر گئی ہے۔واشنگٹن کے وائٹ ہاؤس کے چنگھاڑتے چیرتے پھاڑتے کتوں سے دہلی اور سرینگر میں بکھری لاشوں اور جلتے مکانوں تک آسمان کا صبر ٹوٹ رہا ہے۔زمین کا دم گھٹ رہا ہے۔کالوں اور گوروں، عرب و عجم، برہمن اور غیر برہمن، اسرائیل و فلسطین میں تار تار بے ظلم اور اخلاقی پستی کے اندھیروں میں گمشدہ دنیا آگ اور خون کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتی اپنی نامعلوم منزل کو تلاش کر رہی ہے۔مدینہ میں گنبدِ خضریٰ چپ ہے۔ اس ہولناک خاموشی میں تمام جہانوں کی رحمت، محبت، مروت، مودت، دردمندی، احساس، ترحم اور غمگساری کا نور ایک نئے جہان کی نئی نسل کا انتظار کر رہا ہے۔مکہ میں کعبۃ اللہ پرندوں کے طواف میں عجز آدم اور پیاس پدر میں بلکتی ہوئی اماں حاجرہ کی ممتا کے نقوش ڈھونڈ رہا ہے۔لگتا ہے ننھے منے معصوم شہیدوں کی ساری حرماں نصیب ماؤں کے آنچل مقام ملتزم پر اپنے آنسوؤں کا حساب مانگ رہے ہیں اور اس سکوتِ مرگ میں زمین و آسمان پر چوٹ لگ رہی ہے۔

لمن الملک الیوم

آج کس کی بادشاہی ہے؟

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

عفت بتول

ایڈز بیماری یا عذاب

فواد کی دوستی اپنے سے بڑی عمر کے بچوں سے تھی۔ اس کے ماں باپ دونوں دن رات محنت مزدوری میں لگے رہتے لہٰذا اس پر کڑی نظر نہ رکھ سکے۔ چند دن سے وہ کچھ چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ اُسے ہلکا بخار اور سُستی رہنے لگی۔ اس کا وزن تیزی سے گھٹنے لگا۔ ایک دن کھانا کھاتے پانی پینے کے لیے اُٹھا اور وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ اسے ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرتے رہے مگر اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کے ٹیسٹ کروائے تو پتہ چلا کہ اُسے ایڈز ہے۔ جو ایک لاعلاج اور مہلک بیماری ہے۔ تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ فواد نشے کا عادی تھا۔ ادویات کا نشہ کرتے کرتے خود کو نشے کے ٹیکے لگانے لگا۔ کسی متاثرہ سرنج سے ایڈز کا خطرناک وائرس اس کے خون میں شامل ہو گیا۔

فواد کی عمر صرف چھبیس برس ہے اور وہ اپنے ماں باپ کا سہارا بننے کے بجائے ان کے لیے آزمائش بن چکا ہے۔ یہ پورا خاندان سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ طعنے اور رسوائی ان کا مقدر بن گئے ہیں۔

اُس کے دانت گر چکے اور بال سفید ہو گئے ہیں۔ جسم

بعض اوقات مریض اس بیماری کی دہشت سے ہی وقت سے پہلے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

زخموں اور خراشوں سے چھلنی ہوگیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کی پُرانی تصویر دکھائی جس میں وہ ایک خوبرو نوجوان تھا لیکن اس کی حالیہ تصویر پر ایک ستر سالہ بوڑھے کے مانند تھی۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی نے اس کے ساتھ دھوکا کیا حالانکہ اس نے خود اپنی زندگی سے کھیلا ہے۔ کاش وہ جانتا کہ زندگی اللہ کی امانت ہے اور امانت کو مالک کی مرضی کے مطابق ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

ایڈز دنیا کا خطرناک ترین مرض ہے۔ اس سے متاثرہ شخص کا مدافعتی نظام تباہ ہوجاتا ہے۔ وہ معمولی جراثیم کا مقابلہ بھی نہیں کر پاتا۔ یہ جنسی بیماری ہے جو بعدازاں خون کے انتقال کے باعث دوسروں تک منتقل ہو سکتی ہے۔ جو Human immuno deficiency virus (HIV) سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وائرس انسان کے جسم میں بننے والے سفید خلیوں کو تباہ کر دیتا اور بیماریوں اور جراثیم کے خلاف مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جان لیوا مرض ہے اور جان بھی اس طرح لیتا ہے کہ انسان سسک سسک کر زندگی گزارتا اور پھر عبرتناک موت مرتا ہے۔ HIV کو آپ ایڈز کی ابتدا اور ایڈز کو HIV کی انتہا کہہ سکتے ہیں۔

Association of People living with HIV (ISB) ایسوسی ایشن آف پیپل لونگ ود ایڈز (ایچ آئی و) میں بطور کاؤنسلر کام کرنے والی خاتون مریم صفدر نے بتایا کہ ایڈز کے مریض خود کو سب سے چھپاتے پھرتے اور اسے اپنے لیے لعنت تصوّر کرتے ہیں۔

توقیر نامی ایک مریض اپنی تمام تر ناپسندیدہ سرگرمیوں پر نادم ہے۔ اپنے گھر میں شریک حیات کے ہوتے ہوئے وہ غیر محتاط اور غیر فطری تعلقات رکھتا تھا۔ اس کی بیوی اس کی حرکات سے تنگ آ کر کئی بار میکے گئی لیکن پھر بھی اس کے اندر کا شیطان اُسے گناہ پر اُکساتا رہتا۔ توقیر کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی پاک باز بیوی کو بھی گھناؤنے مرض میں مبتلا کر دیا۔ باقی تمام مریض اپنا نام چھپانے کا کہہ رہے تھے لیکن توقیر کا کہنا تھا کہ اس کا نام ظاہر کیا جائے تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ اس نے قارئین سے اپیل کی کہ وہ اس کی خاطر اللہ سے معافی طلب کریں تاکہ اس کی یہ زندگی تو اس کے لیے سزا ہے ہی، آخرت کچھ آسان ہو جائے۔

حق نواز نامی ایک مریض کا کہنا ہے کہ لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر کوئی گناہوں کے نتیجے میں اس بیماری کو نہیں بھگت رہا۔ کئی افراد کو بدنصیبی اس مقام پر لے کر آئی ہے۔ نفرت تو ان ذرائع سے کرنی چاہیے جو اس مرض کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ حق نواز نے دندان ساز سے دانتوں کا علاج کرایا اور اس کے بعد وہ بیمار رہنے لگا۔ تحقیق و تفتیش سے پتہ چلا کہ وہ ایچ آئی وی پازیٹیو ہے۔ اس کے سب رشتے دار اُسے چھوڑ گئے۔ وہ کہتا ہے زندگی کا تو کسی کی بھی بھروسا نہیں البتہ ایڈز کے مریض جو تکلیف دہ زندگی گزارر ہے انھیں اللہ سے معافی مانگنے کا اور توبہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اللہ معاف کرتا اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

میں نے دیکھا ان مریضوں میں موت سے زیادہ اللہ کا خوف ہے۔ وہ بات بات پر اللہ سے معافی مانگتے ہیں۔ ہمیں پتا چلا کہ بہت سے مریض خودکشی کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ مر کر ان کی تکلیف ختم ہو جائے۔ ایک مریض جس نے نام ظاہر کرنے سے منع کیا، کہہ رہا تھا کہ میں سوچتا ہوں اگر موت نہ ہوتی تو میں کس آس پر جیتا؟ یہ مایوسی اسے ایڈز میں مبتلا ہونے کے بعد ہوئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گناہ کیا وہی ہے جو نظر آ جائے؟ کیا وہ سب لوگ گناہ نہیں کر رہے جنہوں نے محض سستے علاج کے نام پر بے گناہ سادہ لوگوں کو ایڈز تحفے میں دے دیا۔

عبدالغفور کو عطائی کی لاپروائی نے ایچ آئی وی پازیٹیو

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کر دیا۔ وہ معمولی نزلہ زکام کے علاج کے لیے اپنے گاؤں کے مشہور ڈاکٹر طالب حسین کے پاس گیا جو لوگوں کی نظر میں بڑا باصلاحیت اور ماہر ڈاکٹر تھا لیکن درحقیقت وہ کسی ڈاکٹر کا ڈسپنسر رہنے کے بعد بطور ڈاکٹر سرگودھا کے ایک دور دراز گاؤں میں اپنا چھوٹا سا کلینک بنا کر بیٹھ گیا۔ وہ بظاہر ایک ہمدرد اور نیک صفت انسان گاؤں کے مسکین اور ضرورت مند افراد کو مفت دوا بھی دیتا لیکن ایک ہی سرنج کے استعمال سے اس نے عبدالغفور جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کو موت سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ اب ہم اس کو مسیحا کہیں یا قاتل؟

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ایڈز انسان تک بن مانس کے ذریعے پہنچا۔ جنوبی افریقا کے لوگ بن مانس کا شکار کرتے اور اس کا گوشت کھایا کرتے۔ دورانِ شکار کسی شکاری کو زخم آنے سے بن مانس کا خون اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ ستر کی دہائی میں امریکا بھی ایڈز کا مریض پایا گیا جس کی کیس ہسٹری سے پتہ چلا کہ وہ ہم جنس پرست تھا۔

۲۰۱۷ء میں دنیا میں ۳۶.۹ ملین ایڈز کے مریض تھے۔ ان میں سے ۱.۸ ملین ۱۵ سال تک کے بچے تھے۔ ایک دن میں ۵۰۰ نئے مریض اندازاً رجسٹر کیے جاتے ہیں۔

پاکستان دوسرا بڑا مسلم ملک ہے جہاں یہ مرض پھیل رہا ہے۔ اگرچہ یہاں مریضوں کی تعداد کم ہے لیکن پھیلنے کا تناسب دن بدن بڑھ رہا ہے۔ کسی اسلامی ملک میں ایسے مرض کا یہ تناسب بے حد شرمناک ہے۔ پاکستان ایڈز کنٹرول پروگرام کے تخمینے کے مطابق پاکستان میں ایک لاکھ بیس ہزار افراد ایچ آئی وی پازیٹیو ہیں۔ جن میں ۱۷۰۰۰ ظاہر باقی گم شدہ۔ منیجر کمیونیکیشن پنجاب ایڈز پروگرام سجاد حفیظ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں خلیجی ممالک سے پہلا مریض پاکستان آیا۔ اسی سال ایک خاتون اور اس کا بچہ ایچ آئی وی پازیٹیو پایا گیا۔

ان کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ اس وقت پاکستان میں ایڈز کے مریضوں کی تعداد تقریباً ۸۰۰ ملین ہے۔ زیادہ تر متاثرہ افراد دیہہ/دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیشنل ایڈز پروگرام کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں ۷۵۰۰۰، سندھ میں ۶۰,۰۰۰ کے پی کے میں ۱۶,۳۲۲/ اور بلوچستان میں ۵۲۷۵ اس کے علاوہ اسلام آباد میں ۶,۶۷۵ ایڈز کے رجسٹرڈ مریض پائے جاتے ہیں۔

سندھ ایڈز کنٹرول پروگرام کے مطابق کراچی میں ایڈز کے مریضوں کے تعداد سب سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ تاحال پاکستان کے عام طبقے میں یہ بیماری عام نہیں بلکہ تین طبقات اس کا شکار ہیں۔

سرنج کے استعمال سے متاثرہ افراد، عطائیوں اور غیر فطری تعلقات رکھنے والے۔ لاہور میں چھے ماہ سے باقاعدہ ایڈز کی دوا لینے والے لوگوں کی تعداد ۱۷۰۰ کے قریب ہے جن میں ۱۲۱۰ مرد اور ۴۱۵ کے قریب خواتین ہیں۔

خواتین میں زیادہ تر وہ خواتین شامل ہیں جنہیں ان کے شوہر یا کسی عطائی کی لاپروائی نے ایڈز میں مبتلا کیا۔ تاہم قلیل تعداد ایسی خواتین کی بھی ہے جو جسم فروشی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

جیلوں میں مقید قیدیوں کے اندر بھی یہ بیماری پائی جاتی ہے۔

صوبہ سندھ میں ۵۰۰ سے زائد افراد میں ایڈز کی تشخیص کے بعد جہاں حکومت سندھ متحرک ہوئی اور محکمہ صحت سندھ و ایڈز کنٹرول پروگرام سندھ نے بیماری کی روک تھام کے لیے اقدامات کیے، پنجاب ایڈز کنٹرول پروگرام نے بھی ایڈز کی پھیلاؤ کو روکنے کے لیے جنگی بنیادوں پر کام شروع کر دیا۔ پنجاب کنٹرول پروگرام ان تمام "ہائی رسک گروپس" جو اس بیماری کو پھیلانے میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں پر خصوصی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ پنجاب بھر میں ۳۶/ایچ آئی

www.pakistanipoint.com

وی/ایڈز مفت مشاورتی تشخیصی مراکز اور والدین سے بچوں میں ایچ آئی وی کی منتقلی سے بچاؤ کے مراکز شامل ہیں۔

بیماری کے پھیلاؤ میں عطائیت کا بہت اہم کردار ہے۔ اس کے سدِباب کے لیے ڈسٹرکٹ ہیلتھ اتھارٹیز اور پنجاب ہیلتھ کیئر کمیشن کے اشتراک سے جون میں، گجرات، چنیوٹ اور وہاڑی میں عطائیوں کے اڈوں پر چھاپے مار کر اڈّے بند کروائے گئے۔

پنجاب بھر کے ۳۸ جیلوں میں قیدیوں کے طبی معائنے کا کام بھی جاری وساری ہے۔ صوبہ پنجاب کے ۳۶/اضلاع میں ایڈز کے ۸۳۰۰ مریض زیرِ علاج ہیں۔ ان اضلاع میں گجرات، ملتان، فیصل آباد اور ڈی جی خان نمایاں ہیں۔

مضمون کی تیاری کے دوران ایڈز پروگرام کے وفاقی اور صوبائی دفاتر میں فون کالز کیں۔ ان فونز پر ایڈز سے متعلق ہر زبان میں معلومات فراہم کرنے کی ریکارڈنگ چلتی ہے۔

ایک سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ ایچ آئی وی اور ایڈز میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب ہمیں ڈاکٹر نسیم اختر سے ملا کہ ایچ آئی وی دراصل ایک وائرس کا نام ہے۔ یہ جسم میں داخل ہو جائے تو اس کا ابتدائی طور پر ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایڈز لاحق ہو گیا لیکن ایچ آئی وی جسم میں داخل ہو کر تیزی سے نشوونما پاتا ہے اور مختلف بیماریاں حملہ آور ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب بیماریاں اس قدر بڑھ جائیں کہ جسم میں ان کے مقابلے کے لیے مدافعتی جرثومے موجود نہ رہیں تو ایڈز لاحق ہو جاتا ہے۔ ایڈز دراصل ایک نہیں بے شمار بیماریوں کا مجموعہ ہے۔ ایچ آئی وی پازیٹیو کا مریض اس سے نہیں بلکہ مدافعتی نظام ختم ہونے کے باعث مختلف بیماریوں جن میں ٹی بی اور کئی قسم کے کینسر شامل ہیں سے مرتا ہے۔ ان علامات میں تھکن۔ بھوک کا نہ لگنا فنگل انفیکشن لمبے عرصے تک بخار، ہاتھ پاؤں کا جلنا جلد کی بیماریاں، نظر کمزور ہونا۔ ہیضہ ہونا وزن کم ہونا، مُنہ کے اندر چھالے بار بار بننا وغیرہ شامل ہیں۔ خیال رہے ان تمام علامات کا علاج کے بعد ٹھیک نہ ہونا خطرناک بیماری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ایڈز لا علاج ہے۔ اس سے کیسے بچا جائے؟ جس طرح سیلاب کے آنے سے پہلے کا خوف لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل ہونے پر آمادہ کر دیتا ہے اسی طرح اس بیماری کا خوف اور اس کی تباہ کاری کی جانکاری لوگوں کو اس سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناتے خوفِ خدا دل میں پیدا ہونے سے اس عذاب نما بیماری سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ جو اس دلدل میں پھنس چکے، انھیں چھپا کر رکھنے کے بجائے ان کے انجام سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ ایڈز کے مریض سے نفرت ہرگز نہ کریں۔ ان سے عبرت ضرور حاصل کریں۔

عطائیوں اور حجاموں کو ایڈز کے بارے میں معلومات فراہم کرنی چاہئیں اور اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیے کہ عطائی آلۂ جراحت یا سرنج بار بار استعمال نہ کرے۔ حجام ایک ہی بلیڈ سے بہت سارے گاہکوں کی شیو نہ بنائے۔ خواتین ایک دوسرے کے زیورات دیکھ بھال کر استعمال کریں کہ ان میں سے کوئی خون آلودہ نہ ہو۔ ناک کان وغیرہ چھدواتے وقت خاص خیال رکھا جائے کہ جو آلہ استعمال کیا جا رہا ہے وہ بار بار استعمال شدہ تو نہیں۔

اپنا ہیئر برش (کنگھی) اور ٹوتھ برش الگ رکھیں۔ ذیل میں ان چیزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے ایڈز نہیں پھیلتا۔

۱۔ پیشاب اور پاخانے سے
۲۔ چھینک یا جمائی لینے سے
۳۔ اکٹھے کھانا کھانے سے
۴۔ بغل گیر ہونے سے
۵۔ لباس یا تولیہ استعمال کرنے سے۔

پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی اقدار کی پستی کے باعث جہاں دنیا بھر میں یہ بیماری پھیل رہی، وہیں پاکستان میں بھی اس کی شرح میں روز بروز اضافہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

شہ پارے

☆ جتنا وقت اور پیسہ بچوں کو مسلمانوں کے سائنس پر احسانات رٹانے میں صرف کیا جاتا ہے، اس کا دسوں حصہ بھی بچوں کو سائنس پڑھانے میں صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوتا۔

☆ میرا تعلق اس بھولی بھالی نسل سے رہا ہے جو خلوصِ دل سے سمجھتے ہیں کہ بچے بزرگوں کی دعاؤں سے پیدا ہوتے ہیں۔

☆ اب تم جن نظروں سے مرغی کو دیکھنے لگے ہو ویسی نظروں کے لیے تمہاری بیوی برسوں سے ترس رہی ہے۔

☆ اندرون لاہور کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک طرف سے عورت آ رہی ہو اور دوسری جانب سے مرد، تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش بچتی ہے۔

☆ سمجھ دار آدمی نظر ہمیشہ نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے۔

☆ مونگ پھلی اور آوارگی میں یہ خرابی ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ختم کیسے کرے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہو رہا۔ صحت کے مسائل کا تعلق زمینی آلودگی کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کے فرق کو بالائے طاق رکھنے سے بھی ہے۔ ہمیں محتاط رہنا چاہیے لیکن ہمیں ایڈز کے مریضوں کو حقارت یا نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ معروف مذہبی سکالر مفتی مانک Menk جن کا تعلق جنوبی افریقا سے ہے، کا کہنا ہے:

''ہمیں ایڈز کے مریض کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے۔ میں نے کئی ایڈز کے مریضوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اللہ کے قریب ہوتے دیکھا۔ انھوں نے اللہ سے معافی مانگی توبہ کی اور اللہ کی قربت حاصل کی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر کوئی اس مرض میں مبتلا ہوا ہے تو یہ اس کے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ میں چند ایسے متقی لوگوں سے ملا ہوں جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جبکہ انھیں ایڈز تھا۔''

جب کوئی انسان کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس پر اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے نہ کہ اس کے گناہوں کی سزا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر کوئی فاحشہ عام لوگوں میں پھرنے لگے اور لوگ فحش حرکات کرنے لگیں تو ایسے قبیلے پر ایسی بیماریاں ظاہر ہوں گی جو اس پہلے کسی نے نہ دیکھی نہ سنی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔''

ایک مسلمان کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ خود کو اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بتائے گئے راستے پر چلائے۔ اللہ ہمیں ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔

☆☆☆

مریم شہزاد

آئینہ زندگی

مکافاتِ عمل کا پہیہ کبھی نہیں رُکتا... جو بویا وہ کاٹنا ہی پڑتا ہے

"مجھے مشترکہ خاندان میں نہیں رہنا۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟" اقصیٰ نے بے بسی سے کہا۔

"اور میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آخر سب کے ساتھ رہنے میں تمہیں مسئلہ کیا ہے؟" عفان نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"مسئلہ ابھی نہیں ہے مگر مستقبل میں ضرور ہوگا۔"

"ارے واہ بھئی، تم نجومی کب سے ہوگئیں؟ تمہیں پہلے ہی پتا چل گیا کہ مسئلہ ضرور ہوگا۔"

"آپ سنیں گے تو آپ کی سمجھ آئے گا نا مگر آپ کو تو سننا ہی نہیں۔" وہ منہ پھلا کر بولی تو عفان جو اُسے کئی دن سے ٹال رہا تھا آج اپنی بات پر ڈٹے دیکھ کر سننے میں ہی عافیت جانی۔

"اچھا بتاؤ، کیا پریشانی ہے؟"

اقصیٰ نے اسے متوجہ دیکھا تو موقع ہاتھ سے جانے نہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

آج کی نسل ماں باپ کے ساتھ رہنے سے کتراتی ہے۔ بچیوں کو لگتا ہے کہ گھر کے بڑے ان کی زندگی میں مخل ہوتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر گھر میں بزرگوں کی سرپرستی کے زیر سایہ اولاد پروان چڑھے تو ایک صحتمند معاشرہ جنم لیتا ہے۔ نسلِ نو کی آنکھیں کھولتی یہ کہانی آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

دیا۔

”دیکھیں مجھے کسی سے کوئی پریشانی نہیں۔ سب بہت اچھے ہیں۔ بھائی بھابی، ان کے بچے، امی ابو مگر......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جب سب ہی اچھے ہیں تو یہ اگر مگر کہاں سے آگیا؟“

”مگر یہ کہ اب ہمارا ایک بیٹا بھی ہے اور دوسرا اس دنیا میں آنے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جو بچے مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے ہیں وہ بہت بدتمیز ہوجاتے ہیں۔“

”ارے! یہ کیا نئی منطق نکالی تم نے؟“ عفان نے اس کی بات سن کر حیرانی سے کہا۔

”آپ میرے بھیا اور بھابھی کے بچوں کو دیکھیے۔ شروع سے ہی الگ گھر میں رہتے ہیں۔ کتنے تمیزدار اور سلجھے ہوئے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان کے معاملے میں بول سکے۔“ اس نے اپنے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

”بے شک اس وقت مجھے بھی بہت غصہ آیا تھا کہ امی ابو اتنا پیار کرتے ہیں اُن سے۔ میری تو کتنی جان تھی ان میں اور بھابھی نے الگ رہنے کا مطالبہ کردیا تھا۔ اب ہفتے میں ایک بار ہی ملاقات ہوتی ہے، مگر ان کی تربیت دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔“

”اب کیوں ٹھیک لگ رہا ہے؟“ عفان نے طنز کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کاشف بھائی (جیٹھ) کے بچوں کو دیکھیں۔ وہ کیسے بدتمیز ہورہے ہیں۔ ہر وقت چیخ پکار، کھیل کود۔ چلیں مان لیا کہ اگر بچے یہ سب نہ کریں تو کیا بڑے کریں گے؟ مگر ایک بات اور جو زیادہ پریشان کن ہے وہ یہ کہ ہم، آپ سمیت ہر کوئی ان کے معاملے میں بولتا ہے۔ کبھی بھابھی (جیٹھانی) کسی چیز سے منع کردیں تو امی (ساس) دے دیتی ہیں۔ ابو غصہ کریں تو آپ لاڈ اُٹھانے لگ جاتے ہیں۔ ہو تو سب بچوں کی محبت میں ہی رہا ہے مگر اس کے بُرے اثرات کا ابھی کسی کو اندازہ نہیں۔ بھابھی بے چاری کی تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ وہ بچوں کو کیسے سمجھائیں۔ مہمانوں کے سامنے وہ شرمندہ ہوجاتی ہیں۔ سب ان کی تربیت پر ہی انگلی اُٹھاتے ہیں۔“ اقصیٰ نے اپنی بات تفصیل سے سمجھائی تو عفان بھی سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ اسے لگا کہ اقصیٰ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔

”مگر ابھی تو عالیان صرف ایک سال کا ہے۔ دو بچوں کے ساتھ اگر ہم الگ گھر لیتے ہیں تو تم اکیلی کیسے سنبھالو گی؟“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یقیناً مشکل تو ہے، مگر بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کرنا پڑے گا۔ اللہ آپ کی کمائی میں برکت دے گا اور میں کسی کو کام کے لیے رکھ لوں گی۔“ اقصیٰ سب سوچ کر بیٹھی تھی۔

”اور جب تم اسپتال ہوگی تو عالیان کہاں رہے گا۔“

”اوہو، ہم کوئی الگ تو نہیں ہورہے سب سے۔ آپ نے بھی یہاں روز چکر لگانا ہے ان شاءاللہ اور میں بھی ہر دو دن بعد آتی جاتی رہوں گی۔ اس طرح عالیان کو عادت رہے گی یہاں کی۔“

”ٹھیک ہے سوچتے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں امی ابو

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سے بات کرنے کی۔'' عفان نے نیم رضامندی سے کہا۔
ایک ہفتہ تو اس نے سوچنے اور امی ابو سے بات کرنے کے لیے الفاظ جمع کرنے ہی میں لگا دیے۔ اقصیٰ روز ہی اس سے پوچھتی۔
''آپ نے بات کی؟'' اور وہ نہیں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ آخر ایک دن اس نے ہمت کر ہی ڈالی۔
''کیوں بیٹا! ہم نے تو شہزادیوں کی طرح رکھا ہے اپنی بہوؤں کو، پھر کیوں؟'' وہ حیران رہ گئے۔
''نہیں نہیں امی۔ خدانخواستہ آپ دونوں سے کوئی شکایت نہیں۔ اصل میں اقصیٰ کی سوچ کچھ الگ ہے۔'' عفان نے پوری بات سمجھائی۔
''اچھا! تو اس کا خیال ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام بچوں کے لیے ٹھیک نہیں۔'' ابو نے پوچھا۔
عفان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اور تم...... تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟''
''برا نہ مانیے گا، مگر مجھے لگا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔''
''تم بھی تو ساری زندگی مشترکہ خاندان میں رہے ہو۔ ایسا لگتا ضرور ہے کہ شاید بچے بگڑ رہے ہیں، مگر یہ سچ نہیں۔ جو بات مل جل کر رہنے میں ہے وہ اکیلے میں نہیں۔ تم اور تمہارے بھائی بہن...... کیا وہ بھی بدتمیز ہوئے؟''
''وہ زمانہ اور تھا۔ اب بہت فرق ہے۔'' عفان نے ادب سے قائل کرنے کی کوشش کی۔
''تو گویا تم فیصلہ کر کے آئے ہو۔ جیسے تمہاری خوشی۔'' ابو کو اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ اب کچھ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔''
امی نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر انھوں نے اشارے سے روک دیا۔
''آپ دونوں ناراض تو نہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''نہیں بیٹا! جہاں رہو، خوش اور آباد رہو۔ ہمیں تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں۔'' انھوں نے دل پر پتھر رکھ کر دل سے دعا دی۔
عفان نے اقصیٰ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اتنی آسانی سے سب ٹھیک ہو جائے گا اسے اُمید نہ تھی۔
''ہم قریب ہی گھر لیں گے۔'' عفان نے واضح کیا تو اقصیٰ نے تائید کی۔ جلد ہی انھوں نے گھر کے پاس ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا۔ اقصیٰ نے سادگی اور نفاست سے گھر کی سجاوٹ کی اور ایک کام والی بھی رکھ لی۔ شروع کے دن بہت بوریت میں گزرے۔ وہ روز ہی سسرال چلی جاتی، مگر پھر بیٹی کی شکل میں ننھی پری کے آ جانے پر اس کی مصروفیت بڑھ گئی اور دل بھی بہل گیا۔ اب سسرال جانے کا دورانیہ بڑھنے لگا۔ اکثر بچوں کو اکیلے سنبھالنے میں اسے کافی دشواری پیش آتی مگر اچھی تربیت کی دھن میں وہ سب برداشت کرتی چلی گئی۔
وقت گزرتا گیا۔ بچے اسکول جانے لگے۔ دادی کے ہاں ہفتے میں ایک ہی بار جانا ہوتا۔ دادا، دادی اور سب لوگ اس کے بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، لاڈ اُٹھاتے، مگر اقصیٰ نجانے کیوں الجھی سی جاتی۔ اسے لگتا اس کے بچوں میں وہ بات نہیں جو جیٹھ کے بچوں میں ہے۔ وہ اب بھی سب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ کبھی وہ خود کو سرزنش کرتی اور اپنے دل کو تسلی دیتی...... بدتمیز بھی تو ہو رہے ہیں۔ کبھی دادی کے گلے میں جھول گئے تو کبھی دادا سے ضد پکڑ لیتے ہیں کہ دکان تک لے کر چلیں، جبکہ اس کے بچے تمیز سے جا کر سب کو سلام کرتے اور کبھی فالتو بات نہ کرتے۔ سب سے ہنستے بولتے، مگر...... کہیں کچھ کمی تھی۔
یہ مگر جانے کہاں سے آ جاتا؟ شاید ایک اجنبیت کی دیوار سی کھڑی ہو رہی تھی دادا دادی اور پوتا پوتی کے درمیان۔ جیسے وہ مہمان ہوں۔ کبھی لگتا کہ شاید اُس سے غلط فیصلہ ہو گیا مگر پھر وہ فوراً ہی اس خیال کو اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیتی۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اب بچے بھی آہستہ آہستہ تعلیمی مدارج طے کرتے جا رہے تھے۔ پرائمری ختم ہوئی تو قرآن پاک بھی مکمل ہو گیا۔ بہترین اسکول کی وجہ سے پڑھائی بھی اچھی خاصی مشکل تھی جس کی لیے ٹیوشن بھی لازمی ہو گئی۔ دادی دادا سے ملاقات میں بھی وقفہ بڑھنے لگا اور امتحانات کی وجہ سے تو پورا مہینہ ہی نکل گیا۔ جب وہ ساس کے گھر جانے کے لیے تیار ہوئی تو بچے راضی نہ تھے۔ انھیں سمجھا بجھا کر لے گئی۔ وہ وہاں بھی منہ بنائے موبائل لے کر الگ بیٹھ گئے۔ عجیب بے زار اور اُکتائے ہوئے۔

جیٹھ کے بچوں سونیا اور سکندر نے زبردستی انھیں اپنے ساتھ کھیل میں لگایا اور پھر اتنا مزا آیا کہ واپس آنے کو دل ہی نہ چاہا۔ آج اقصیٰ کو وہ بچے بدتمیز بھی نہیں لگ رہے تھے۔ دونوں ہی بہت سنبھلے ہوئے، بھاگ بھاگ کر دادا دادی کے کام کر رہے تھے۔ عالیان اور فضا وہاں رات گزار کر بہت خوش تھے۔ ان کا واپس آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''ہم ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ جیسے سونیا اور سکندر رہتے ہیں۔'' عالیان کا سوال اقصیٰ کو چونکا گیا۔ ابھی وہ جواب سوچ ہی رہی تھی کہ فضا کے سوالوں سے مزید پریشان ہو گئی۔

''امی اتنا مزا آتا ہے مل کر رہنے میں۔ دادا دادی نے اتنی ساری باتیں کیں۔ ہم پہلے تو ان کے ساتھ ہی رہتے تھے نا۔ اب کیوں نہیں رہتے؟ کیا آپ کا اور ابو کا جھگڑا ہو گیا تھا دادا دادی سے؟''

''اُف! ایک اور سوال۔'' اقصیٰ نے ڈوبتا دل سنبھالا۔

''ہمارا کمرا ابھی ہے وہاں اب تک۔ وہ تو اتنا بڑا گھر ہے۔'' بچے اپنے سوالوں کے جواب چاہتے تھے۔

''بتائیں نا امی، ہم کیوں ساتھ نہیں رہتے، کیا ہوا تھا؟''

''میں چاہتی تھی کہ تم دونوں بہت اچھے بچے بنو۔'' اقصیٰ نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ سونیا اور سکندر بھائی گندے بچے نہیں۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ اب تو ہم ہر ہفتے رہنے جائیں گے۔''

اقصیٰ نے بھی ہامی بھر لی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی محبتیں تو ساتھ رہنے سے ہی بڑھتی ہیں۔ بچپن تو گزر ہی جاتا مگر اب بھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا فیصلہ درست تھا یا غلط؟

☆☆☆

وقت گزرتا گیا۔ بچے شادی کے قابل ہو گئے تو فضا نے مشترکہ خاندانی نظام میں رہنے کی ہی خواہش کی۔ عالیان کی بیوی بھی بہت اچھی تھی اور اب پیارا سا پوتا علی دن بھر دادا، دادی کا دل بہلائے رکھتا۔ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے اور اس کی پیاری شرارتوں پر واری صدقے جاتے۔

ایک دن ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کی بہو لائبہ عالیان سے کہہ رہی تھی۔

''امی ابو دونوں بہت اچھے ہیں مگر علی کی بہترین پرورش کے لیے ہمیں الگ گھر میں رہنا ہوگا۔ ان کا لاڈ پیار علی کو بگاڑ دے گا۔''

''میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ امی ابو بھی دادا دادی سے اسی لیے الگ ہوئے تھے۔ انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں آج ہی اُن سے بات کرتا ہوں۔''

عالیان کا جواب سن کر اقصیٰ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ زندگی عمر کے اس حصے میں آ کر آئینہ دکھائے گی یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے آنے والے وقت اور تنہائی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

◆●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پطرس بخاری

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے:

"لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکابازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر، جاگے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اُٹھی ہوں گی۔ بہتر آوازیں دیتا ہوں۔

"اچھا! اچھا! تھینک یو!...... جاگ گیا ہوں!...... بہت اچھا! نوازش ہے!"

آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے، زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو بھلا ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے، پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی، تو طوفان تھا۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں، کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا کہ آج پتہ چلائیں گے، یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی، تو فکر سی لگ گئی کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو پڑوسی کو آواز دی۔ ''لالہ جی!...... لالہ جی؟''

جواب آیا۔ ''ہوں۔''

میں نے کہا: ''آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟'' کہنے لگے:

''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟''

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے، چونک کر پوچھا۔

''کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟''

کہنے لگے۔ ''تین...... تو...... نہیں...... کچھ سات...... ساڑھے سات...... منٹ اُوپر تین ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا، یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اُٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اُٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیرزادے ہیں، کوئی مذاق ہے، لاحول ولاقوۃ۔''

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و تشدد کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح دس بجے اُٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہاسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی، ''مسٹر!''

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا،

''یہ آپ گا رہے ہیں؟'' (زور ''آپ'' پر)

میں نے کہا، ''اجی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمائیے؟'' بولے، ''ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔ بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔'' دل نے کہا، ''او نابکار انسان، دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔ صاحب، خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔''

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت بھینچ لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد سب ہی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کوئی سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا پھر 15 اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا، لیکن

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے ہی کیوں نہ اُٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اُٹھنا تو لغویات ہے البتہ پانچ، چھے، سات بجے کے قریب اُٹھنا معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اُٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر سے ہی کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہوگئے۔

چلتے چلتے خیال آیا، کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟

ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ ''لالہ جی!''

انھوں پتھر کھینچ مارا ''یس!''

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی، صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھے بجے یعنی جس وقت چھے بجیں......

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: ''جب چھے بج چکیں تو...... سنا آپ نے؟''

چپ۔

''لالہ جی!''

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ ''سن لیا سن لیا۔ چھے بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس۔''

''ہم نے کہا ب...... ب...... ب...... بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔''

توبہ! خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھے بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلافات ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اُوپر سے اُتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا یا خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں، نہ میں۔ کیا پتہ، لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو۔ یا اس دن چھے دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو، کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ ''آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اُٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کے بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے، ''تو میں آپ کو روز چھ بجے جگا دیا کروں نا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں، ہاں، واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شک۔''

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کرلیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارننگ'' کیا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا، لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اُٹھے۔ دل سے کہا کہ ''دل بھیا، صبح اُٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا، ''اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا، ''سچ کہتے ہو یار، یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اُڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتگی طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔''

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی لحاف کی اوٹ میں کرلیا اور پھر سوچنے لگے......

''خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں، نہ خدا کا ڈر اور نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کرلیں گے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی (لحاف کانوں پر سرک آیا)......تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں......بہت ہی پہلے......یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے۔ کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اُٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔ (لحاف سر پر) بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے...... (آنکھیں بند)......تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتابیں پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے لیکن ٹھیک ہی رہے گا شیکسپیئر...... نہیں ورڈز ورتھ......لیڈی میکبتھ......دیوانگی......سبزہ زار......سنجر سنجر......باد بہاری......صید ہوس......کشمیر...... میں آفت کا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پرکالہ ہوں۔

یہ معمہ اب مابعد الطبعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ ”مسٹر! صبح میں نے آپ کو پھر آواز دی تھی، آپ نے جواب نہ دیا؟“

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا، ”اوہو۔ لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔“

بولے، ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں..... اس کے بعد!.....کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے ہی نہیں۔“

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پہ تیوریاں چڑھائے غور وفکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکا یک ایک مجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا، ”ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اس وقت......اے......اے، نماز پڑھ رہا تھا۔“

لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھے بجے، جگانا نمبر دو دس بجے، اس دوران لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ”ہمارا فرق ناز محو بالش کمخواب“ ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہیں، کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو، نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک

☆ مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

☆ جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔

☆ دشمنوں کے حسب عداوت تین درجے ہیں: دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔

(مشتاق احمد یوسفی)

آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو!

تم جاگو موہن پیارے

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو، آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں، دلآویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت ”سانوری صورت توری من کو بھائی“ کے ساتھ ہی شرم وحجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے ”مسٹر! مسٹر!“ کی آواز اور دروازے کے دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑویوں کے گرنے، دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کُلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ضمیر کی جنگ

محمد ہشام

گاڑی سے پشت ٹکائے وہ بہت دیر سے زمین کو گھور رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے احساسات مر چکے ہوں۔ اسے لگا شاید وہ شرمندگی اور بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتا جا رہا ہے۔ اس کے اندر سناٹا تھا اور وہ بھی ایسا کہ جیسے سینکڑوں لاؤڈ اسپیکر شور کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گئے ہوں۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ ایک معروف سڑک تھی اور گاڑیوں کا بہت شور بھی تھا لیکن اس کے اندر بھیانک خاموشی تھی۔

اسے اپنے آس پاس تک کی خبر نہ تھی۔ وہ گاڑی سے پشت ٹکائے اردگرد سے بے نیاز بس زمین کو گھور رہا تھا۔

اس کے اندر ایک جنگ سی جاری تھی جس کا سپہ سالار اس کا اپنا ضمیر تھا اور مخالف وہ خود۔ اس کے دماغ میں ماضی کی فلم چل رہی تھی۔ وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے والد اکرام اللہ گوندل نے اسے اسکول میں داخل کروانے سے پہلے مدرسے میں داخل کروا دیا۔ تاکہ بچہ دینی تعلیم کی سمجھ بوجھ حاصل کر سکے۔

وہاں سے اس نے ناظرہ کے ساتھ ساتھ اسلام کی ابتدائی باتیں اور روزمرّہ کی دعائیں اپنے ذہن میں محفوظ کیں اور اس کے بعد عصری تعلیم کا دور شروع ہوا۔ پڑھائی میں وہ تیز تھا اور دلچسپی بھی لیتا۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ چوہدری اکرام اللہ کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ بینک بیلنس بھی سوا تھا۔ ان کے اکلوتے بیٹے جاذب کے لیے دو گاڑیاں ہمہ وقت تیار رہتیں۔ وہ اسکول جاتے وقت ٹو ڈی میں جانے کی ضد کرتا اور کسی دوسری جگہ جانے کے لیے ریبورن پر جاتا۔

ہم عصروں میں اس کا لباس اور کھانا سب سے بہترین ہوتا۔ اس کی جیب میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت بہت سے پیسے ہوتے۔ وہ جس چیز کی طرف اشارہ کرتا چوہدری اکرام اللہ لمحوں میں وہ خرید لیتے۔ جاذب کے پاس مہنگے سے مہنگا کھلونا تھا۔ اس کے کزن اور اسکول کے ساتھی اس کی شاہانہ زندگی پر رشک کرتے تھے۔

وہ لائق اور ذہین تھا۔ آگے بڑھنا جانتا تھا، آگے بڑھتا رہا اور پڑھائی مکمل کرنے کے بعد باپ کا کاروبار سنبھالنے

دنیاوی معاملات میں اُلجھے ایسے گھرانے کی کہانی، جہاں سب نعمتیں تو موجود تھیں مگر انھیں شکر کرنا یاد نہ تھا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

لگا۔اس کے باپ نے اسے تمام داؤ پیچ سکھائے۔ مارکیٹ کا اُتار چڑھاؤ اور تیزی مندی کی کیفیات سے آگاہ کیا۔ زندگی گزارنے کا ڈھب اور اس کا پس منظر واضح کر دیا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا۔ منزلوں پہ منزلیں طے کرتا ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ شہر کے معززین اور کاروباری حلقوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ملک کے چیدہ چیدہ لوگ اس کا دم بھرتے۔ ہزاروں ملازمین اس کی مختلف فیکٹریوں میں کام کرتے۔

اس کی شادی ایک پڑھے لکھے، مالدار اور جدت پسند خاندان میں ہوئی۔ شادی میں ملک کے نامور لوگ مدعو کیے گئے۔ دارالحکومت کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ولیمے کی تقریب سجائی گئی۔ وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ کسی تقریب میں جاتا تو لوگ دونوں کی جوڑی کو سراہتے اور تعریفوں کے پل باندھ دیتے۔ وہ خود تو مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا ہی لیکن اس کی بیوی بھی خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔

بہت جلد وہ اپنے ہم عصروں سے آگے نکل گیا۔ بزنس کی دنیا میں اس کا قد اتنا بڑھا کہ پرانے دوست اب اسے بونے لگتے۔ اسکول و کالج کے ساتھی اس کی کمپنی میں نوکری کے لیے آتے لیکن باوجود کوشش کے اس سے ملاقات نہ کر پاتے۔ اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا......؟

ایک دن اس کا نہایت قریبی دوست عرشمان اس سے ملنے آیا۔ عرشمان اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک کا گہرا اور بہترین دوست تھا۔ ان دونوں کی دوستی مثالی رہی تھی لیکن جاذب اپنے بزنس میں اتنا اندر تک چلا گیا کہ عرشمان کی یاد ایک بھولی بسری کہانی کی مانند ہوگئی۔ اب دس برسوں بعد عرشمان کینیڈا سے اسے ملنے آیا تھا۔ کینیڈا جانے کے ایک ڈیڑھ سال تک دونوں کا رابطہ رہا۔ جاذب کی طرف سے لاپروائی برتنے کی وجہ سے عرشمان نے رابطہ کم کر دیا۔ آہستہ آہستہ ان کا آپس میں رابطہ بالکل ہی ختم ہوگیا۔

عرشمان جاذب کے دفتر کی انتظارگاہ میں بیٹھا بلاوے کا منتظر تھا۔ اسے یہاں بیٹھے پون گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔

’’سر! آپ اندر جا سکتے ہیں۔‘‘ ریسیپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اس کی یادوں کا تسلسل توڑا۔ وہ چونکا اور جاذب کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کا دل عجب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پچھلے دس برسوں میں خیالات اور واقعات میں کتنا بدلاؤ آیا ہے۔ جانے وہ اور جاذب اب کس طرح ملیں گے؟ کیا کالج کی طرح بے تکلفی سے گلے لگ کر ایک دوسرے کو خوب صلواتیں سنائیں گے یا مصنوعی رکھ رکھاؤ اپناتے ہوئے بس ہاتھ ملانے اور ایک دوسرے کی طرف روایتی مسکراہٹ اچھالنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

انھی خدشات میں کھویا وہ دروازہ کھولنے لگا تو ہینڈل تک ہاتھ جانے سے پہلے ہی دوسری طرف سے کھل گیا۔ سامنے جاذب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دونوں بغلگیر ہوئے اور ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپانے لگے۔

’’ویسے کبھی سوچا نہیں تھا کہ تم مجھے یوں بھول جاؤ گے۔‘‘ عرشمان شکوہ کناں تھا۔

’’معاف کر دینا میرے یار! دراصل کاروبار میں ایسا پھنسا کہ وقت ہی نہیں مل پاتا۔‘‘

’’کبھی سگے رشتے داروں سے بھی ملتے ہو یا......؟‘‘ عرشمان آج سب حساب بے باق کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔

جاذب نے ایک بار گہری نظر سے اسے دیکھا اور پھر ایک طویل سانس لے کر نظریں جھکا دیں۔ عرشمان پہلے تو خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کچھ توقف کے بعد اس نے لب کشائی کی۔

’’میں کینیڈا میں اچھا خاصا کماتا ہوں۔ پاکستان کے بہت سے امیر خاندانوں سے زیادہ بینک بیلنس رکھتا ہوں لیکن میں رشتہ داروں اور یار دوستوں کو کبھی نہیں بھولا۔ کامیابی کا مزہ ہی کیا جب ہمارے اپنے ساتھ نہ ہوں۔ میں روزانہ کسی نہ کسی کو فون کر کے حال احوال لازمی دریافت کرتا ہوں، چاہے کچھ منٹ ہی سہی، لیکن جاذب! تمہیں کیا ہوا؟‘‘

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جاذب لاجواب خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاس عرشان کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔

''دیکھو جاذب! یہ بات یاد رکھو کہ ہمیں خاص طور پر اپنے ان رشتہ داروں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے جو ضرورت مند ہیں۔ یہاں پاکستان میں تمہیں پتا ہے لوگ کس طرح اپنا گزارہ کرتے ہیں؟'' عرشان ذرا آگے کو جھک گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''یہاں کئی لوگوں کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہیں۔ جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے انھیں سوکھے ٹکڑے حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف لگتا ہے۔''

جاذب مستقل خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا یا شاید اب ایسا بن چکا تھا۔ اس کے پاس رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ زندگی کی دوڑ میں وہ کامیاب بزنس مین تو بن گیا تھا لیکن شاید ایک کامیاب اور کامل انسان نہیں بن پایا تھا۔ عرشان تو چلا گیا لیکن وہ جاتے جاتے جاذب کے لیے لامتناہی سوچوں کا دَر وا کر گیا۔

اسی رات اس کی زندگی میں جیسے بھونچال آ گیا۔ اس کے باپ چوہدری اکرام اللہ کو دل کا دورہ پڑا۔ گھر والے اُسے مہنگے اسپتال لے کر بھاگے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ معززینِ شہر تعزیت کے لیے آتے اور رسمی وروایتی دکھ بھرے دو چار لفظ بول کر چلے جاتے۔

جاذب نے دیکھا کہ اس کے وہ رشتے دار، جو اس سے کم حیثیت کے تھے، جنھیں اُس نے ہمیشہ نظر انداز کیا، آج وہ سب اس کے بنگلے میں جمع تھے۔ تجہیز وتکفین کے انتظامات بھی وہ اپنی نگرانی میں دیکھ رہے تھے۔ اس کے چچا ابرار اور خالو شفقت حسین نے تمام معاملات سنبھال لیے۔ اس کے وہ کزن جنھیں آج سے پہلے وہ درخورِ اعتنا بھی نہ جانتا تھا، بھاگ بھاگ کر سارے کام نمٹا رہے تھے۔ دُور سے آنے والے مہمانوں کے رہنے کا انتظام، ان کا کھانا پینا وغیرہ سب انھوں نے بغیر کسی کے کہے یا لالچ کے، اپنے ذمے لے لیا تھا۔

☆☆☆

جنازے کا وقت مقرر ہوا۔ اس کا باپ جسے لوگ چوہدری اکرام اللہ گوندل کے نام سے جانتے تھے، لمحوں میں ایک میت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا نام، شناخت سب پس پردہ جا چکی تھی۔ آخر کار غسل دے کر جنازہ اُٹھایا گیا اور سب جنازگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مولوی صاحب آئے اور جنازے کا طریقہ مختصراً بیان کرنے کے بعد میت کی طرف رُخ کر قبلہ رُو کھڑے ہو گئے۔ جاذب سب سے اگلی صف میں تھا۔ جنازے میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوئے تھے۔ جاذب دل ہی دل میں اپنے والد کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ مسجد میں سپارہ پڑھنے جاتا تھا تو مولوی صاحب نے ایک بیان میں کہا تھا کہ جنازے میں زیادہ لوگوں کا شامل ہونا مرنے والے کی خوش بختی ہے۔ وہ اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی بخشش اور مغفرت کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔

بلند آواز سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور وہ خیالوں سے واپس آیا مگر 'سبحانک' کے بعد وہ خالی ذہن اور بند زبان لیے ہکا بکا کھڑا تھا۔ یہ کیا......؟ اس کے دل ودماغ میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ آنکھ بند کر کے یاد کرنے لگا لیکن......

اتنے میں دوسری ندا آئی...... اللہ اکبر...... درود شریف بھی جیسے تیسے پڑھ لیا گیا۔ ابھی وہ شش وپنج میں ہی تھا کہ پھر اللہ کی بڑائی وبزرگی کی ندا آئی...... اللہ اکبر......

اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اسے تو نماز جنازہ کی ابتدا تک یاد نہ تھی۔

ایک بار پھر صدا بلند ہوئی...... اللہ اکبر...... اور سلام پھیر دیا گیا۔ وہ ابھی تک ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کیا واقعی اس کا باپ خوش نصیب تھا یا...... بدنصیب!

◆◆◆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ہلکی پھلکی تحریر

پروفیسر محمد ضیاء المصطفیٰ

سرِ راہ

زندگی کے سفر میں انسان بہت سے تجربات سے گزرتا ہے مگر بس سفر میں ہونے والے مشاہدات کا اپنا ہی لطف ہے دورانِ سفر جہاں بہت سے واقعات انسان کو بوریت سے بچاتے ہیں وہاں بعض اوقات ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا ''دانشور'' حسبِ توفیق بوریت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

فرض کیجیے آپ سیٹ نمبر چودہ پہ تشریف رکھتے ہیں تو سیٹ نمبر پندرہ پہ بیٹھا شخص گفتگو کا آغاز مختلف طریقوں سے کرے گا۔ مثلاً وہ کہے گا: ''جناب! مہنگائی نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے، غریب بندہ جائے تو جائے کہاں؟'' یا وہ یوں تمہید باندھے گا: ''آج گرمی بہت ہے...... خیر...... محکمہ موسمیات نے آئندہ ہفتے بارشوں کی پیش گوئی کردی ہے'' اور تیسرا خطرناک حملہ کچھ اِس طرح ہوگا کہ وہ گنڈیریوں کا پیکٹ آپ کی طرف بڑھا کر کہے گا...... ''لیجیے جناب!'' اگر آپ نے شوگر کا بہانہ کیا تو وہ قدرتی پھل کے بے ضرر ہونے پہ ایسا ضرر رساں خطبہ ارشاد فرمائے گا کہ آپ نصف خطاب سے قبل ہی گنڈیری اُٹھانے پہ مجبور ہو جائیں گے...... آپ نے گنڈیری اُٹھالی...... بس اب آپ کا کام ختم اور گنڈیری والے صاحب کا شروع۔

آپ تین گھنٹے کے اس سفر میں اُس کی ہر بات سننے اور

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دورانِ سفر بعض اوقات ایسے لوگ مل جاتے ہیں جنہیں برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے

حوصلہ افزائی میں سر ہلانے کے اخلاقی طور پر پابند ہیں...... باامرِ ضرورت ''درست، بجا، بہتر، جی بالکل'' بھی کہنا پڑے گا اور خاص موقعوں پر حسبِ استطاعت قہقہہ بھی لگانا پڑے گا۔

گزشتہ روز مجھے ملتان سے بھکر جانے کا اتفاق ہوا۔ بس میں سوار ہوا۔ دیکھا تو ساتھ والی سیٹ پر ایک نہایت خوش لباس، ادھیڑ عمر شخص براجمان، اخبار پر نظریں جمائے کچھ چبا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اخبار رکھ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے پھر میری طرف دیکھ کر ہلکا سا کھانسے کہ گلا صاف ہو جائے، مجھے پتا چل گیا کہ کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہونے والا ہے...... اس کے بعد فوراً بولے: ''سیاست دان'' اتنے بھی بُرے نہیں، جتنا عوام نے سمجھ رکھا ہے، کسی بھی شریف آدمی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانا، ہمارا قومی مزاج بن چکا۔'' اہلِ سیاست کی مختصر شان بیان کرنے کے بعد وہ سیدھے اپنے بڑے بیٹے کے تذکرے پر آگئے جو پٹوار کا کورس کر رہا تھا اور مستقبل قریب میں پٹواری بن کر وسیع پیمانے پر لوگوں کے 'کام' آنے والا تھا......

اتنے میں انھوں نے ایک چاکلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اتمامِ حجت کے لیے ہلکا پھلکا انکار کیا اور پھر لے کر کھالی...... انھوں نے اب باقاعدہ طور پر اپنا تعارف بہت سے سابقوں اور لاحقوں سے کرایا (یہی وجہ ہے کہ ان کا اصل نام مجھے بھول گیا) بعدازاں فخریہ بتانے لگے کہ وہ موضع قاضی کوٹ کے پٹواری ہیں۔

اس دوران میں کنڈیکٹر جب بھی پاس سے گزرتا تو پٹواری صاحب باآواز بلند فرماتے: ''اے سی کی کولنگ ٹھیک کرو ورنہ میرا کرایہ واپس کڈو۔'' اپریل کے مہینے میں وہ اتنی گرمی گرمی کر رہے تھے کہ گویا پچھلی گرمیاں امریکی ریاست فلوریڈا میں گزار آئے ہوں۔

ایک مرتبہ پھر گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے فرمانے لگے: ''انشاء اللہ تینوں بیٹوں کو پٹواری بناؤں گا...... اور یہ تو تین ہیں۔ اگر گیارہ بھی ہوتے تو قسم ہے ربِ ذوالجلال کی، سب کو ایک ایک کر کے پٹواری بناتا۔'' (فرطِ جذبات سے پٹواری صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... اللہ اللہ)

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انھیں نیند آنے لگی۔ پہلے جزوی اور پھر کلی طور پر مجھ پر گر گئے۔ حاضرِ سروس پٹواری کا بوجھ اُٹھانا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا مگر انھیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایک عدد چاکلیٹ لے کر کھا چکا تھا......

عالمِ بے بسی میں اِدھر اُدھر ایسے دیکھنے لگا جیسے نالائق سیاست دان، ریٹرننگ آفیسر کے سامنے تیسرا کلمہ سناتے ہوئے بھول جانے پر...... یہ تو اللہ بھلا کرے مُرغ چنے والے کا کہ اُس نے گاڑی میں آتے ہی ایسی دلدوز صدا لگائی کہ صاحب بڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے اور میری سانس بحال ہوئی۔

قدرت مجھ پہ مہربان ہو چکی تھی چنانچہ ان کا سٹاپ آ گیا۔ اُترتے ہوئے کہنے لگے:

''لو جی آپ سے تو کچھ پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔ اپنا تعارف تو کروایے۔'' میں نے نام بتایا تو کہنے لگے:

''کیا کرتے ہیں؟'' میں نے بتایا:

''کالج میں پروفیسر ہوں۔'' دلاسہ دینے کے انداز میں بولے ''...... چلو، ویہلا رہنے سے تو بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر بس سے اُتر گئے......

☆ مسلمان کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں

☆ محبت اندھی ہوتی ہے، چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں، بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہوتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ظلم پہ سہے گر....

کرائم رپورٹر جاوید راہی

''جون جولائی کا حبس اور آگ برساتا سورج گورنمنٹ کالونی کے بہبود آبادی دفتر کے باہر چاروں جانب لڑکے اور لڑکیاں خالی آسامیوں کی کل تیرہ مختلف نشستوں کے لیے سینکڑوں اُمیدوار ایک دوسرے سے آگے جانے کی کوشش میں پریشان تھے۔ قطار میں کھڑے پیچھے والے لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کس آسامی کے لیے انٹرویو دینے آیا ہوں؟

''سپر وائزر کے لیے۔'' میں نے مختصر جواب دیتے ہوئے دوبارہ گیٹ کی طرف دیکھا جہاں دھینگا مشتی پروگرام عروج پر تھا۔

آخر میں بھی گیٹ عبور کر کے اندر ہال میں پہنچ گیا۔ وہ لڑکا بھی میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ ایک طرف خواتین کا انٹرویو لینے والا گروپ بیٹھا تھا دوسری طرف بڑے سے ہال میں مردوں کے لیے انتظام تھا۔ میرا نام پکارا گیا۔ میں نے تین ممبران کے سامنے پہنچ کر ان کے سوالات کا جواب دیا۔ اس کے بعد مجھے ڈاک میں رابطہ کرنے کا کہا گیا۔ میں دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

پیاس کے مارے گلا خشک ہو رہا تھا۔ ایک طرف شربت کی ریڑھی پر رش لگا ہوا تھا۔ میں نے بھی ایک گلاس کا آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگا۔ ابھی میرا نمبر نہیں آیا تھا کہ وہی میرے پیچھے لائن میں لگا لڑکا پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی شربت کا کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بس جی رسمی کارروائی پوری کر رہے ہیں۔ جنہیں رکھنا

تھا وہ تو فیصلہ پہلے ہی ہو چکا۔'' میں نے تائید میں سر ہلایا اور شربت والے کا بڑھایا ہوا گلاس پکڑتے اس سے پوچھا:

''آپ نے کس عہدے کے لیے انٹرویو دیا ہے؟''

''گریجویشن کر کے نائب قاصد کی آسامی کے لیے قسمت آزمائی کر رہا ہوں۔'' اس کے لہجے کی کڑواہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بے روزگاری سے خاصا دلبرداشتہ تھا۔

اس نے گلاس خالی کر جیب سے پچاس کا نوٹ نکالتے

ایک ایسے نوجوان کی کہانی جو عشق میں سیدھا راستہ اور شرافت کی زندگی بھلا بیٹھا

شربت والے کو دیتے ہوئے دو گلاسوں کے پیسے کاٹنے کو کہا۔ میں نے روکا مگر اس نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کر دیا۔

شہر کی جانب جانے والے بہت سے چنگ چی رکشے آوازیں لگا رہے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''شہر یا بس اسٹینڈ؟''

میں نے کہا: ''شہر میں۔''

''میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔'' پھر ہم دونوں ایک رکشے میں پیچھے بیٹھ گئے۔

''آپ کا نام؟'' اس نے بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا۔

''عامر علی''۔ میں نے بتایا اور تمہارا؟

''پرویز احمد''۔ اس نے اپنی فائل سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم دونوں نے ایک دوسرے بارے میں بہت کچھ جان لیا اور شہر اسٹاپ پر ہم نے ایک دوسرے سے نمبروں کا تبادلہ کیا اور الگ ہو گئے۔''

☆☆☆

عامر علی جیل میں کھڑے میرے پوچھنے پر اپنی زندگی کے تاریک باب اُلٹ رہا تھا۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میرے اور پرویز کے درمیان جو بے روزگاری کا پُل قائم تھا، اس پر آتے جاتے کئی ماہ ہو گئے۔ اس دوران ہمارے بہت سے دن رات مشترکہ ہو گئے۔

ایک روز پرویز کا فون آیا اسے کسی فیکٹری میں حساب کتاب کی چھوٹی سی ملازمت مل گئی تھی اور وہ بڑا خوش تھا۔ مجھے بھی اس نے اُسی فیکٹری میں ڈیلی اُجرت پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں پہلے ہی بے روزگاری اور گھر والوں کی طعنہ زنی کے ہاتھوں تنگ تھا لہٰذا فوراً ہامی بھر لی اور اس کے پاس چلا گیا۔

یہاں ہوزری کا کام ہوتا تھا۔ مشینوں کے علاوہ ہاتھ سے کرنے والے بھی بہت سے کام تھے۔ خواتین والے حصے میں پیکنگ کا کام ہوتا۔ یہاں ہر عمر کی خواتین کام کرتیں۔ وہاں مرد حضرات کا جانا منع تھا۔ صرف چند مرد حضرات اسٹاک وغیرہ اور دیگر ایسے کام سرانجام دیتے۔

دو ماہ تک میں کئی شعبوں میں کام کرتا رہا مجھے کمپیوٹر کی سوجھ بوجھ تھی۔ پروڈکشن منیجر نے میری ڈیوٹی اُوپر والے کاموں سے ہٹا کر پیکنگ والے شعبہ میں لگا دی۔ چونکہ میں پرویز بھائی کے ساتھ کوارٹر میں رہ رہا تھا اور کھانا بھی ہم دونوں اکٹھے کھاتے سامان کی ادائیگی بانٹ لیتے۔ گو کہ تنخواہ قلیل تھی مگر نہ ہونے سے تو بہتر تھا۔

خالہ رضیہ جس محلہ میں رہتی وہاں کی دو لڑکیاں سمیرا اور زینب بھی اس کے ہمراہ میری طرح روزانہ آمدن کی بنیاد پر کام کے لیے آتی تھیں۔ خالہ سے میری واقفیت یہاں آتے ہی اس پیکنگ کھاتہ میں ہوئی تھی۔ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس جا چکا تھا۔ یہ بے چاری اپنے تین چھوٹے بچوں کی کفالت خود کر رہی تھی۔ سمیرا اور زینب دونوں اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتی تھیں اس لیے ان کے پر پُرزے نہیں نکلے تھے ورنہ تو اللہ کی پناہ تھی اُدھر۔

زینب مجھے پہلے ہی دن سے اچھی لگی اور میں کسی نہ کسی بہانے اسے مخاطب کرنے لگا تھا مگر وہ صرف مطلب کی بات کا جواب دیتی تھی۔

ایک دو بار خالہ رضیہ نے میرا اس طرح زینب میں دلچسپی لینا محسوس تو کیا مگر جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ زینب کو شیشے میں اُتار کر ہی دم لوں گا۔ اس بات کا تذکرہ میں نے پرویز بھائی سے بھی کیا تو اس نے منہ بناتے کہا کہ عامر یہ لڑکیاں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔ ایک دن خود ہی دوستی کا ہاتھ بڑھا دے گی۔ فکر نہ کرو۔'' اس نے بستر پر کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

آخر کار میری بے چینی پر خالہ رضیہ کو ترس آ گیا۔ اس نے بنڈل رکھتے ہوئے مجھے آہستگی سے مخاطب کیا: ''عامر بیٹا۔''

''جی خالہ''! میں نے ہاتھ روکتے اس کی طرف دیکھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

’’زینب تمہاری شکایت کر رہی تھی مجھ سے‘‘۔
میں گھبرا گیا اور آنکھیں چرا لیں۔
’’وہ بہت مجبوری کے تحت یہاں کام پر آتی ہے ورنہ اس کے گھر والے تو......‘‘
بات ادھوری چھوڑتے وہ گودام کھاتہ سے باہر چلی گئی۔
تمام رات میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ رہ رہ کر مجھے خالہ رضیہ کی بات پریشان کر رہی تھی کہ زینب تمہاری شکایت کر رہی تھی۔ میں نے ایسا کیا کیا تھا جو اس نے میری شکایت کر دی۔ کسی کو دیکھنا یا دل میں رکھنا تو کوئی جرم نہیں۔
پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ صبح جلدی تیار ہو کر میں فیکٹری پہنچ گیا کیونکہ تمام لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے یا گھومتے پھرتے مل جاتے اور سائرن بجتے ہی اپنے اپنے شعبوں کی طرف چل پڑتے۔ زینب اور سمیرا اکیلی باہر کی دیوار کے سائے میں کھڑی تھیں۔ میں بلا جھجک دونوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔
اللہ جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آ گئی۔ میں نے زینب کو براہ راست مخاطب کرتے پوچھا۔
’’جناب مجھ سے کوئی شکایت؟‘‘
وہ اس اچانک حملہ پر گھبرا گئی۔
’’جی نہیں تو۔‘‘ اس کی گھبراہٹ پر سمیرا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور برجستہ درمیان میں کود پڑی۔
’’اس سے بڑی شکایت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو دل میں ہے اس کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے؟ یوں گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہتے ہو۔ یہ آپ سے کچھ نہیں کہتی۔‘‘ سمیرا نے اشارہ زینب کی طرف کیا۔
’’دیکھیں میرے دل میں آپ دونوں کے لیے بڑی عزت اور جگہ ہے۔‘‘ میں واقعی گھبرا گیا۔
’’اچھا اب جلدی سے بتا دیں کہ زینب آپ کو کیوں اچھی لگتی ہے؟‘‘ سمیرا نے شرارت سے پوچھا۔
’’سمیرا! انھیں خود بھی کچھ بولنے دیں یا آپ ہی سب کچھ کہیں گی؟‘‘ مجھے یکدم پرویز بھائی کی بات یاد آ گئی کہ زینب جان بوجھ کر اپنی اہمیت بڑھا رہی ہے۔ میں کچھ اور بولتا مگر خالہ رضیہ کھانے کا ڈبا سنبھالتے سیدھی ہمارے پاس آ رُکی۔ ’’ہاں جی کیا مسئلہ چل رہا ہے؟‘‘
’’وہی خالہ شکایت والا‘‘ میں نے ہنستے ہوئے جواباً کہا۔
’’ہاں پوچھ لو خود زینب سے۔ یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے آتے جاتے گھورتا رہتا ہے‘‘۔
’’خالہ جی کھانے والی نہیں، پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوں۔‘‘ اس سے پہلے کہ بات کچھ اور آگے بڑھتی، اچانک سائرن کی آواز پر واچ مین نے اندر سے گیٹ کی زنجیر گرا دی اور تمام ملازمین اپنے اپنے کھاتوں کی طرف بڑھ گئے۔
زینب اور میں آشنائی کے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ بہت اچھی اور کم گو لڑکی تھی۔ دو ماہ کی رفاقت میں صرف دو چار بار ہم دونوں موٹر سائیکل پر اِدھر اُدھر سیر کرنے اور بریانی برگر تک محدود رہے۔ نہ میں نے اس سے زیادہ کی خواہش کی اور نہ اس کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی ہوئی۔ سمیرا اور خالہ رضیہ ہماری اس دوستی سے آگاہ تھیں۔ میں اس کے انکار کے باوجود کچھ نہ کچھ اس کے لیے لے آتا جو وہ پس و پیش کے بعد رکھ لیتی۔ زینب کی ایک بہن اور ایک بھائی تھے۔ دونوں اس سے چھوٹے تھے اس لیے وہی ان کی کفیل تھی۔
ایک روز وہ بہت پریشان دکھائی دی۔ میرے اصرار پر کہنے لگی کہ والد صاحب پر غبن کا الزام لگا اور وہ جیل چلے گئے۔ ان کا مقدمہ لڑنے کے لیے اس نوکری کا سہارا لینا پڑا اور اب وکیل بقایا کا تقاضا کر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وکیل کو دس ہزار روپے دینے ہیں اور ابھی مشکل سے تین ہزار اکٹھے ہوئے ہیں۔ زینب کی بات سے میرے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ میرے مالی حالات بھی ایسے ہی تھے کیونکہ زیادہ تر تنخواہ کا حصہ میں زینب پر ہی خرچ کر ڈالتا تھا۔ بہرحال میں نے اسے مطمئن تو کر دیا مگر سات ہزار کیسے

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
WAQAR AZEEM

آئیں گے؟ اسی سوچ میں غلطاں رہا۔ رات کو میں نے پرویز بھائی سے پوچھا تو اس نے دو ہزار دینے کا وعدہ کیا۔

صبح ڈیوٹی پر آتے ہی میں نے بہت سے قافیے جوڑے مگر بات کوئی بنی نہیں کے مصداق آگے سوچنے لگا۔ فیکٹری میں کوئی گڑبڑ کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ سکیورٹی بہت سخت تھی۔ چاروں جانب کیمروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوئی چیز اندر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

اُدھر میں نے زینب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں ضرور اس کی مدد کروں گا۔ پرویز بھائی نے حسب وعدہ دو ہزار دے دیے۔ اب مزید پانچ ہزار کا مسئلہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جو میرے دل میں خیال آیا وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔

فیکٹری میں ہم سے بڑے عہدے پر فائز ورکروں کے لیے اے لائن کی طرف جانا پڑتا کیونکہ وہ سب سے آخر میں تھی۔ ہمارے لیے تو اُوپر نیچے تین منزلہ کوارٹر تھے جبکہ ان کے لیے مالکان نے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے گھر الگ بنا کر دیے ہوئے تھے۔ جو فیصلہ میں نے کیا گو کہ بڑا ہی گھٹیا تھا مگر زینب کے لیے میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔

ایک رات جب مجھے یقین ہو گیا کہ پرویز سو چکا تو میں چپکے سے اُٹھا اور کوارٹر باہر سے بند کرتا ہوا باہر نکل آیا اور پیچھے سے گھوم کر اے لائن کے پچھواڑے آ پہنچ گیا۔ یہاں سب اپنے گھر کی خود نگرانی کرتے تھے۔ کوئی چوکیدار نہ تھا۔ چاروں جانب خاموشی تھی۔ میں ایک مناسب گھر کو ذہن میں رکھتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ چند پل اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں نے دیوار کے اُوپر ہاتھ جماتے ہوئے ایک جست بھری اور اس کے اُوپر چڑھ گیا۔ دونوں جانب ایک ہی طرح کی اونچائی تھی۔ مجھے اندر اُترنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چھوٹا سا دالان تھا جسے میں کوئی آواز کیے بغیر عبور کر گیا۔

ایک کمرے میں گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ کے مارے میرا برا حال تھا۔ دوسرے کمرے میں گھر کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارتے مجھے دراز میں سونے کے چین اور بندے پڑے مل گئے۔ دوسرے دراز میں چھوٹا سا پرس تھا جس میں کچھ پیسے پڑے تھے۔ میں نے اسی کو غنیمت جانا اور دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتا ہوا کمرے سے نکل کر دوبارہ دالان میں آ گیا۔

دروازے کی اندرونی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کھولا اور باہر نکل آیا۔ سب کچھ ٹھیک پا کر میں تیز تیز قدم اُٹھاتا مزدوروں کے کوارٹروں کی طرف چل پڑا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے لمبے لمبے سانس لیے اور آگے بڑھ گیا۔ اپنے کوارٹر میں آ کر میں نے خود کو بستر پر گراتے پرویز بھائی کی طرف دیکھا جو بدستور سو رہا تھا۔ جب میرا ذہن کچھ سوچنے کے لائق ہوا تو مجھے خود پر یقین نہ آیا کہ میں کیا کر آیا ہوں؟ بہرکیف میں نے پرس کھول کر اس کے اندر پڑی نقدی کا جائزہ لیا۔ وہ سات ہزار تین سو روپے تھے۔ پرس میں نے پھاڑ کر واش روم کے گٹر میں بہایا، چین بندے سنبھال کر رکھ لیے اور سو گیا۔

اگلی صبح ڈیوٹی پر آ کر میں نے سات ہزار روپے زینب کو دیتے ہوئے کہا کہ جلد ہی وکیل کے سپرد کر دینا تاکہ والد کا مقدمہ لڑنے میں وہ کوئی تاخیر نہ کرے۔ زینب نے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور شکریہ کے ساتھ روپے پکڑ لیے۔ دو ہزار پرویز بھائی کو لوٹا دیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔

چھٹی والے دن میں نے وہ چین اور بندے سنار کو دیے اور بدلے میں زینب کے لیے بالیاں لے لیں۔ شام کو اس کے گھر فون کر کے اسے ملنے کی بات کی تو اس نے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ میں پہلے بھی ایک آدھ بار اس کے ساتھ جا چکا تھا اس لیے بے جھجک پہنچ گیا۔ زینب کی والدہ پہلے سے بھی زیادہ محبت سے پیش آئیں اور چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ میں نے جیب سے بالیاں نکالیں اور بڑی اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زینب

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی پھر وہ یکدم خوشی سے بے قابو ہوتے مجھ سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

ہماری زندگی اب نئے راستے پر گامزن تھی۔ میں زینب کے والد کا مقدمہ اب خود لڑ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ زینب کو میں نے فیکٹری سے ہٹا لیا تھا اور خود بھی نوکری چھوڑ کر زینب کے محلہ میں ایک کرائے کا مکان حاصل کر لیا۔

اس مکان سے تھوڑے فاصلے پر کریانہ اسٹور تھا جس سے تھوڑی بہت واقفیت بن گئی۔ اس کے بینچ پر بیٹھ کر محلہ کے اور بھی لوگ اخبار پڑھتے میں بھی چلا جاتا۔ ادھر ہی ایک رکشہ والے سے سلام دعا ہو گئی جو دوسری گلی میں رہتا تھا۔ چوری چکاری سے خرچہ تو چل رہا تھا مگر زینب کی فرمائشیں اب آگے آگے بھاگنے لگی تھیں۔ مجھے کام کرنے کی اشد ضرورت پیش آ گئی تو میں نے رکشہ ڈرائیور بلو سے بات کی۔ اس نے آٹو دہاڑی پر لے کر دینے کا مشورہ دیا۔ میں چونکہ اچھا ڈرائیور بھی تھا اس لیے یہ بات میرے دل کو لگی اور میں رکشہ چلانے لگا۔

دو چار دن ذرا مشکل پیش آئی پھر میں ٹرینڈ ہو گیا۔ پہلے پہل علاقوں کی نشاندہی پریشانی کا مسئلہ بنی پھر کچھ سواریوں سے اور کچھ پوچھ پاچھ سے کام نکلنے لگا۔ رکشہ چلانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ گھروں اور علاقوں کو تاڑنے کا موقع مل گیا۔

ایک بار اعوان ٹاؤن کی ایک سواری اُٹھائی اور ڈوبن پورہ سے ہوتا ہوا کھڑاک نالہ پار کر رہا تھا کہ آگے پولیس ناکے پر چیکنگ کی وجہ سے مجھے رکنا پڑا۔ لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ میری نظر پیچھے پڑی تو سواری غائب اور ایک شاپر کونے میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیا تو میں نے وہ بڑا سا شاپر اُٹھا کر اپنے پیروں میں رکھ لیا اور رکشہ آگے بڑھا دیا۔

خالی رکشہ دیکھ کر ایک سواری نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے چلنے کو پوچھا مگر میں فراٹے بھرتا آگے نکل آیا۔ ایک گلی میں رُک کر میں نے شاپر کھولا۔ اُوپر کپڑے اور نیچے چرس کے بڑے بڑے پیک ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی منشیات فروش تھا اور یا تو یہ چیکنگ اس کے لیے تھی یا روٹین کا ناکہ تھا مگر وہ ڈر کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

میں شاپر سنبھالتا گھر کی طرف چل پڑا۔ رکشہ روک کر شاپر اُٹھایا اور اپنے کمرے میں اسے چھپا کر دوبارہ کام پر نکل پڑا۔ اصل میں مجھے اس سواری کی تلاش تھی مگر شام تک مجھے وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ رکشہ چھوڑ کر میں گھر آ گیا اور پھر سے اس شاپر کا جائزہ لیا۔ وہ بیس ٹکڑے تھے۔ بڑے بڑے اور ان کا وزن دس بارہ کلو سے کم نہ تھا۔

کئی دن تک میں اسے گھر میں چھپائے رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ چرس میری ملکیت بن چکی تو میں اسے ٹھکانے لگانے کا سوچنے لگا۔ میرے کئی پیٹی بھائی چرس کے عادی تھے۔ ایک لڑکا عنصر تھا جسے میں نے پوچھا کہ وہ چرس کہاں سے لیتا ہے؟ اس نے بتایا کہ گوالمنڈی میں ایک ملنے والا فروخت کرتا ہے، کیوں خیر ہے؟ اس نے برجستہ پوچھا۔

نہیں بس یونہی پوچھا تھا۔ پھر میں نے اس سے چرس بیچنے والے کا پورا پتا لیا اور دوسرے دن ایک ٹکڑا رکشہ میں سیٹ کے نیچے رکھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہاں اُسے ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ کباڑیا بازار میں مل گیا۔ اُسے اعتماد میں لے کر بات کی تو اس نے مال دکھانے کا کہا۔ میں نے سیٹ کے نیچے پڑا چرس کا چھتر نکال کر اسے دکھایا تو وہ مال لینے کے لیے تیار ہو گیا۔

شام کو ایک جگہ کا تعین اس نے کیا اور میں شاپر لے کر پہنچ گیا۔ وہ ایماندار اور کاروباری تھا۔ اس نے اس ساری چرس کے مجھے چالیس ہزار دیے۔ اتنی رقم زندگی میں پہلی بار نصیب ہوئی تھی۔ تمام رات میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ اسے کس طرح استعمال کروں؟ پہلے سوچا آدھی گھر بھیج دوں اور باقی خود اور

زینب پر خرچ ڈالوں پھر کچھ سوچ کر گھر کا خیال دل سے نکال دیا اور زینب پر دل کھول کر روپیہ لٹاتا رہا۔

رکشہ تو صرف دکھاوے کے لیے تھا۔ اصل میں تو میرے اندر کہیں بڑا ہاتھ مارنے کی جستجو چل رہی تھی۔ رکشہ ڈرائیوں کے ساتھ رہ کر ہر بُری جگہ اور بُرے لوگوں کا پتا چل گیا تھا۔ اُن چالیس ہزار سے ایک ریوالور بھی خرید لیا تھا میں نے۔ کسی کو ساتھ ملانے کی بجائے میں اکیلا ہی کوئی واردات کرنے کے بارے میں پلان کر رہا تھا۔ اس دفعہ جو گھر میں نے ذہن میں رکھا ہوا تھا وہ کسی سرکاری آفیسر کا تھا۔ دو چار بار اس کا جائزہ لیا۔ گھر میں ایک خاتون دو بچے اور شاید ایک نوکر تھا۔ آج میرا مکمل منصوبہ تھا کہ رکشہ کسی جگہ چھوڑ کر خود اس گھر میں داخل ہو جاؤں۔

ایک محفوظ جگہ پر رکشہ کھڑا کیا اور دوکاندار کو یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ ابھی آتا ہوں۔ وہ گھر دو تین گلیوں کو پار کر کے آتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں ڈکیتی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں تو بڑے اعتماد کے ساتھ باہر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

دروازہ کھولنے والا پانچ سالہ لڑکا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اسے بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اندر کی طرف لپکا۔ گھر کی مالکن کو میں نے بارہا دیکھ رکھا تھا۔ وہ بیٹی کو گود میں لیے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں پکڑے پستول اور اپنے بچے کا بازو دیکھ سکتے میں آ گئی۔ میں نے آہستہ آواز میں کہا کہ اگر شور مچایا تو اسے گولی مار دوں گا۔ جلدی اُٹھو اور سب کچھ نکالو۔

وہ بچی کو ساتھ لگائے تیزی سے اُٹھی اور میرے آگے ایک کمرے کی طرف چل پڑی۔ سامنے لوہے کی الماری رکھی تھی۔ اس کے پٹ کھول کر اُس نے سونے کے زیورات اور نقدی میرے حوالے کرتے ہوئے بیٹے کو کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے دروازہ باہر سے بند کرتے اس کو وارننگ دی اگر کوئی گڑبڑ کی تو مجھ سے کسی نیکی کی توقع نہ رکھنا۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ کچھ نہیں کرے گی۔

میں پلٹ کر دروازے کی جانب گھوما تو سامنے گھر کا ملازم سبزی والا تھیلا پکڑے حیرانگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ریوالور جو نیفے میں چھپا لیا تھا فوراً نکالا اور اس کی جانب بڑھا جو دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے گھبراہٹ میں اس پر فائر داغ دیا۔

گولی اس کے سر پر لگی اور وہ میرے پیروں میں لڑھک گیا۔ گولی کی آواز اور اس کے چیخنے پر آس پاس کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں ایک طرف بھاگا جا رہا تھا اور وہ میرے پیچھے چور چور کرتے چلے آ رہے تھے کہ سامنے سے آنے والی اینٹ میرے سر پر لگی اور میں زمین پر گر پڑا۔ ریوالور میرے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گرا۔

پیچھا کرنے والوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا اور میرا پورا جسم لہولہان ہو چکا تھا اگر بروقت پولیس کی گاڑی نہ پہنچ جاتی تو لوگ مجھے مار مار کر ختم کر ڈالتے۔

مجھے اسپتال لایا گیا۔ میں نیم بے ہوش تین دن تک پڑا رہا۔ پولیس نے میرے ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا کر اسپتال کے بستر پر حراست میں لے رکھا تھا۔ جب میں ذرا سا بولنے اور اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوا تو میری انکوائری شروع ہو گئی۔ میں نے جو کچھ بھی آج تک کیا تھا سب کچھ سچ سچ بتا دیا مگر اس کے باوجود ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ قتل تو مجھ سے ہو چکا تھا اس گھر کے ملازم کا۔ ڈکیتی، چوری اور قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔

زینب کے چکر میں اور اس کے والد کو بچاتے میں خود سر تک غلاظت کی دلدل میں دھنس چکا۔ ستم یہ کہ زینب نے مجھ سے کسی بھی قسم کی جان پہچان سے انکار کر دیا۔'' آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے ہاتھ سے صاف کیا اور اپنا سر جیل کی سلاخوں سے ٹکا دیا۔

☆☆☆

مُلا واحدی

ایک نام، ایک جہان

محمد حامد سراج

کتاب ایک ایسی دنیا ہے جس میں ایک مکمل دنیا پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حویلی ہے جس کے اندر دالان ہیں، کمرے، راہداریاں، باغات، انسان، ان کی عادات، رویے، غم، خوشیاں، موت، زندگی، حالات واقعات، محبتیں، نفرتیں کدورتیں، اک جہان حویلی کے اندر سانس لیتا ہے۔ یہ سب حویلی کے اندر کا منظر نامہ ہے۔ کتاب بھی ایک ایسی حویلی کے مانند ہے جو ہر کسی کے لیے اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔

کچھ لوگ باہر سے ہی گھوم پھر کر دم بہ خود کہتے ہیں کہ کیا عظیم الشان حویلی ہے۔ انھیں کیا معلوم حویلی کے اندر کیا ہے؟ دروازہ کھلے گا تو معلوم پڑے گا کہ اندر کی دنیا کیا ہے؟ بعینہ کتاب ہر شخص کے لیے اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔ وہ جن کے لیے دروازہ کھول دے، وہی اس دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔

میں نے آج ملا واحدی کی کتاب ''میرا افسانہ'' پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر میں ورطۂ حیرت میں تھا۔ یہ کون لوگ ہیں جو ہم میں سے ہی ہیں لیکن امر ہو جاتے ہیں۔ وقت کے نقشہ پر اپنی پختہ لکیر کھود کر اس میں اپنی زندگیاں رکھ جاتے ہیں۔ جو آنے والے زمانوں میں بھی قندیل بنی روشنی کا استعارہ رہتی ہیں۔ میں دو زانو ملا واحدی کے سامنے بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا، انھیں سنتا رہا۔ وہ بول رہے تھے اور وقت کے طاقچے میں اپنی باتوں کے موتی بانٹتے چلے جا رہے تھے۔

ماں باپ کا رکھا ہوا میرا نام محمد ارتضیٰ ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک صاحب ظہیر احمد زاہدی ہم جماعت

ادبی دنیا کے سنہری دور میں جگمگاتے ایک ستارے کی حیات کا دریچہ وا کرتی نادر تحریر

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

تھے۔ ان کے چچا مشتاق احمد زاہدی کے مضامین کا مجھ پر رعب تھا۔ زاہدی صاحب آخر میں تو بہاولپور کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے، لیکن اس وقت نیا نیا بی اے پاس کیا تھا اور مخزن لاہور اور زمانہ کانپور وغیرہ ماہوار رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے۔ مضمون نویسی کا شوق میرے اندر بھی پیدا ہو چلا تھا۔ میں نے ظہیر احمد سے مذاقاً کہا، تم ''زاہدی'' میں ''واحدی۔'' وہ مذاق کچھ اس درجے سازگار رہا کہ میں ''واحدی'' ہی بن گیا۔ سب دوست واحدی کہنے لگے۔ پھر جب خواجہ حسن نظامی صاحب سے تعلقات بڑھے تو انھوں نے واحدی عرف کو پکّا کر دیا۔ علامہ اقبالؒ کو یہ عرف بے حد پسند تھا۔ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ اقبال نام مشہور ہو چکا ہے، ورنہ میں تم سے تمہارا عرف چھین لیتا۔

نظام المشائخ جاری ہوا تو لوگوں نے واحدی کے ساتھ مولوی اور مولانا لکھنا شروع کیا۔ اس سے طبیعت گھبراتی تھی کہ ہُوں خاک نہیں اور کہلاؤں مولوی، مولانا۔ لہٰذا سوچا کہ لفظ کوئی لگانا ہی ہے تو مُلّا کا لفظ لگایا جائے۔ میرا خیال تھا کہ مولوی، مولانا کہلانے سے بہتر ہے کہ مُلّا کہلاؤں اور اب تو میری شناخت لفظ ''مُلّا'' سے ہوتی ہے۔

میں ۷ار رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ بمطابق ۱۷ر مئی ۱۸۸۸ء کو جُمعے کے دن، صبحِ صادق کے وقت، بھائی میر سلطان علی والے مکان واقع کوچۂ چیلاں، گلی مسجد کالے خان میں پیدا ہوا۔ یہ مکان ۱۳۰۵ھ تک میرے والد کا تھا۔ پھر والدِ ماجد نے اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے میر سلطان علی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ گلی مسجد کالے خان کے کل مکان فوجدار خانیوں کے تھے۔ صرف ایک کٹہرا حافظ غیاث الدین کی ملکیت تھا جس میں چمار بستے تھے۔ ان چماروں سے ہمارا آپس داری کا سا معاملہ تھا۔ وہ ہمارے کام آتے تھے، ہم ان کے کام آتے تھے۔ کل مکانوں کو بیچ میں دروازے اور کھڑکیاں چھوڑ کر ایک دوسرے سے ملا رکھا تھا۔ گلی

مسجد کالے خان کے باہر بھی بائیں جانب سڑک پر دور تک فوجدار خانیوں ہی کی جائیدادیں تھیں۔ کھڑکیاں اور دروازے ان تک بھی پہنچتے تھے۔ گلی مسجد کالے خان کے سامنے بھائی سیّد ابوالحسن کا عظیم الشان مکان تھا اور وہ مکان جسے والد ماجد نے میری پیدائش کے بعد تعمیر کرایا تھا۔

میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اس میں دیکھا، اور پچاس سال مسلسل اُسی میں رہا اور وہیں سے ۱۹۴۷ء میں کراچی منتقل ہوا۔ یہ بھی محلے کا بڑا مکان تھا، مگر بھائی سید ابوالحسن کے مکان کے برابر بڑا نہیں تھا۔ ۱۸۷۶ء میں میرے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

والدین کے ہاں سید محمد اقبال پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں اللہ تعالیٰ نے انھیں واپس بلا لیا اور بارہ برس میرے والدین اولاد کو ترستے رہے، حتیٰ کہ ایک لڑکی کو متبنٰی کرنا پڑا۔ یہ دور اولاد سے گھبرانے کا نہیں، اولاد کی قدر کا تھا۔ دعائیں دی جاتی تھیں کہ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو، اولاد کے کھیڑے بسیں۔ بارہ برس تعویذ گنڈوں میں کٹے۔ سنا ہے پھوپی حضرت بیگم کے شوہر، پیرجی حافظ سید عبدالوہاب رات کے بارہ بجے جمنا میں جا کھڑے ہوتے اور ختم پڑھتے تھے۔ آخر ایک روز میرے والد کے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ نے دعا کی کہ یا اللہ! محمد مصطفی کو بیٹا عنایت کر۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سال مجھے دنیا میں بھیج دیا۔

چونکہ بہت ترسا کر مجھے بھیجا تھا، میری پیدائش پر غیرمعمولی خوشیاں منائی گئیں۔ ناز و نعم کے ساتھ پرورش ہوئی۔ تعلیم کے لیے روپیہ جمع کیا جانے لگا۔ ماں باپ اپنے اُوپر خرچ نہ کرتے لیکن مجھ پر خوب خرچ کرتے۔ والد ماجد کرشن ملز اور دلّی کلاتھ ملز کے حصص خریدتے رہتے تاکہ میری تعلیم میں کبھی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

چمڑے کا سوٹ کیس اور ہولڈال Holdall تو بڑی چیزیں ہیں، والد ماجد دلّی سے باہر جاتے یا باہر سے دلّی تشریف لاتے تھے، تو کپڑوں کے لیے ٹاٹ کا بیگ ہوتا۔ بستر سُتلی سے باندھا جاتا اور گھر سے اسٹیشن اور اسٹیشن سے گھر، بغل میں بستر دبائے اور ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا لٹکائے چلے جاتے اور چلے آتے۔ سواری اور قلی کا لینا ان کے نزدیک بیماری کی علامت تھی۔

نہر کے ایک ڈپٹی مجسٹریٹ تھے، سید محمد، میرٹھ کے باشندے، اور اخبار البشیر، اٹاوے کے خاص مضمون نگار۔ انھوں نے مجھے تار بھیجا کہ تمہارے ابا انتقال کر گئے۔ یہ تار ۳۱/دسمبر ۱۹۰۱ء کی شام کو ملا۔ والدہ نے اسی وقت پھوپھا عبدالوہاب اور میر سید علی سے درخواست کی کہ جائیں اور تجہیز و تکفین کر آئیں۔ تیسرے دن وہ دونوں واپس آئے، مگر عقدہ نہ کھلا کہ موت کا سبب کیا تھا؟ یکایک بیمار ہوئے تھے یا زہر دے دیا گیا تھا۔

والد کے انتقال سے میری تعلیمی رفتار بگڑ گئی۔ لشتم پشتم مڈل کا امتحان دیا اور فیل ہوا۔ وہ مڈل کا آخری امتحان تھا جو یونیورسٹی کی طرف سے لیا گیا تھا۔ دوسرے سال اسکول نے نویں میں بھیج دیا اور تیسرے سال دسویں میں لیکن اب میرا دل نصاب کی کتابوں سے گھبراتا اور سرسید احمد، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی وغیرہ کی کتابوں میں لگتا تھا۔ والد کی تنخواہ تو انتقال کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی، فقط جائیداد کا کرایہ اور ملوں کا منافع آتا تھا۔ والدہ نے اس آمدنی میں سے دس روپے ماہوار میرا جیب خرچ مقرر کر دیے تھے۔ دس میں سے پانچ روپے میں کتابیں خریدنے پر خرچ کرتا رہتا تھا۔

دسویں جماعت کا طالب علم ہو کر دلّی کے ماہنامہ زبان، امرتسر کے سہ روزہ وکیل اور لاہور کے ہفتہ وار وطن اور روزنامہ پیسہ اخبار میں مضامین بھیجنے کا آغاز کیا۔ میری والدہ نے ایک دفعہ بھائی قاری سرفراز حسین سے فرمایا، ''ذرا مدرسے جا کر پوچھو تو کہ ارتضیٰ مدرسے میں کیسا ہے؟'' غیر تربیت یافتہ اساتذہ خواجہ شہاب الدین، مرزا احمد بیگ، ماسٹر امتیاز حسین، ماسٹر ذاکر حسین، مولوی آفتاب حسین (دلّی کے شیعہ طبیب مولوی سیّد محمد کے والد)، مولوی رحمت اللہ، مولوی عمر علی، مولوی نجم الدین وغیرہ جا چکے تھے اور تربیت یافتہ استاد آ چکے تھے۔ مولوی فضل الدین بی اے، بی ٹی ہیڈ ماسٹر تھے۔ قاری سرفراز حسین نے ان سے میرا حال دریافت کیا۔

قاری صاحب اور فضل الدین صاحب اسکول میں ہم جماعت رہے تھے۔ فضل الدین صاحب نے مسکرا کر کہا: ''ان کی آوارگی روز افزوں ترقی پر ہے'' اور یہ کہہ کر مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے، کیونکہ میں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کیسا بھی رہا ہوں، مگر آوارہ، عمر کے کسی حصے میں نہیں رہا۔ آوارگی سے مجھے مناسبت نہیں ہے۔ میرا چہرہ متغیر دیکھا تو مولوی فضل الدین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ طالب علمی کے زمانے میں مضمون نگاری کرنا بھی آوارگی ہے۔ میرے چہرے کی سرخی ہلکی ہوئی، لیکن میں نے دل میں کہا:

کہ ایں آوارہ کُوئے بتاں آوارہ تر بارہ

یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہے کہ مسلمان پیدا کیا گیا اور پھر امتحانوں میں نہیں ڈالا گیا۔ حدیث ہے کہ، ''ہر بچہ فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے پھر اُس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' [صحیح بخاری]

مجھے نہ ایسے ماں باپ سے سابقہ پڑا، جو میری اسلامی فطرت بگاڑ دیتے اور نہ ایسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ ایم اے، بی اے اور بیرسٹر سب اپنی اسلامی فطرت بگاڑ لیتے ہیں۔ خطرناک ماحول سے گزر کر بھی بعض حضرات اسلامی فطرت کو مرنے نہیں دیتے۔ اس کا انحصار ظرف پر ہے۔ میرا ظرف غالباً خطرناک ماحول سے گزرنے اور امتحانوں میں ڈالے جانے کے قابل نہیں تھا۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ امتحانوں میں نہ پڑ کر بچپن سے بڑھاپے تک اسلامی فطرت کو زندہ رکھوں۔ مجھے عمر کے کسی دور میں بری کتابوں اور برے انسانوں کی صحبت نہیں ملی۔ کتابیں میں ساری عمر پڑھتا رہا۔ میری تعلیم آج بھی ختم نہیں ہوئی لیکن میں نے جوانی میں بھی ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی عبدالحلیم شرر کے چند ناولوں کے سوا کسی ناول کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صحبت مجھے ملی، بچپن میں بھائی محمد ادریس، مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی اور قاضی لطیف الحق حقی کی اور جوانی میں خواجہ فضل احمد شیدا، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، مولانا عارف ہسوی، مولانا نیاز فتح پوری اور بھیا احسان الحق کی۔ بڑھاپے میں صحبت کے اثر کا سوال نہیں رہتا اور مجھے تو نظام المشائخ کی مدیری نے جوانی ہی میں بوڑھا کر دیا تھا۔

جوانی آئی تو ایک دینی اور ثقہ رسالے کی ایڈیٹری ساتھ لائی۔ جوانی مجھ پر نہیں چھائی، میں نے اُسے مغلوب کر لیا۔ رسالے کی ایڈیٹری کی وجہ سے حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری، حضرت اکبر الٰہ آبادی، علامہ شبلیؒ، علامہ اقبالؒ، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، میر غلام بھیک نیرنگ، حکیم اجمل خان، حکیم رضی الدین، حکیم نابینا، مفتی کفایت اللہ، نواب غلام نصیر الدین (بدھن)، غلام نظام الدین (خاکسار) جیسے حضرات سے ملاقاتیں رہی تھیں۔

عربی زبان پوری طرح نہیں سیکھی اور دینی علوم پوری طرح نہیں حاصل کیے، مگر عربی زبان سیکھنے اور دینی علوم حاصل کرنے کی کوشش مسلسل کرتا رہا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب صدر مدرّس، مدرسۂ امینیہ سے کہہ کر مدرسۂ امینیہ کے محنتی طلبہ عربی سکھانے اور دینی علوم پڑھانے کے لیے لگائے۔ مولانا محمد اسحاق رام پوری سے بھی پڑھا اور پھر ان کے شاگردِ رشید مولانا محمد ایوب صاحب کی تقریریں پینتیس (۳۵) سال مسلسل سنیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میری طرف اس وقت متوجہ ہوئے، جب وہ اپنے دورِ ''روشن خیالی'' کی تصنیفات کو دیا سلائی دکھا چکے تھے۔ مولانا نیاز فتح پوری جس زمانے میں میرے یہاں رہے، اس زمانے میں نماز روزے کے بڑے پابند تھے۔ جوش ملیح آبادی نے تشریف لا کر مجھے اپنے رنگ میں نہیں رنگا، بلکہ میرے پاس اُٹھنے بیٹھنے سے وہ مولانا محمد ایوب صاحب کی تقریروں کے شائق ہو گئے۔

اعمال میرے ناقص ہیں مگر ایمان ناقص نہیں۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اللہ تعلیم و تربیت کا رُخ نہ موڑتا تو مجھ جیسے معمولی ظرف کے انسان کو بھلا یہ نعمت کیا میسر آتی؟ میری زندگی کا کوئی دور الحمدللہ شکوک اور شبہات میں نہیں گزرا۔ حقِ معرفت تو بڑی چیز ہے، میں اپنی ادنیٰ سی حیثیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے وجود اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا فقط اتنا قائل ہوں کہ میری عقل باور نہیں کرتی کہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

کائنات کا کارخانہ بغیر کسی کے چلائے چل رہا ہے۔ اپنے آپ کو مثلِ حباب، بلکہ مثلِ خواب محسوس کرتا ہوں، اور حقیقی ہستی اُسی واجب الوجود کی مانتا ہوں۔ نیز عقل باور نہیں کرتی کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ جن کا لایا ہوا قرآنِ پاک اور جن کے اسوۂ حسنہ کا پورا ریکارڈ سامنے موجود ہے، نبوت کا (معاذ اللہ) جھوٹا دعویٰ کر سکتے تھے۔ میں نے معمولی قسم کے اچھے آدمیوں کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا، حضور ﷺ تو اچھوں کے سردار تھے، حضور ﷺ سے اچھا انسان تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب سے دوسری دفعہ ملنے کے بعد میں نے ان کے ہاں اور انھوں نے میرے ہاں جانا آنا شروع کر دیا۔ نواب بدھن کی محل سرا اور میرے مکان میں پون میل کا فاصلہ تھا بلکہ اور کم۔ خواجہ صاحب حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلقین اور متوسلین میں سے تھے۔ سلطان المشائخ نے شادی نہیں کی تھی۔ حضرت کی درگاہ کی دیکھ بھال کرنے والے حضرت کی اولاد نہیں ہیں۔ حضرت کے قریبی عزیزوں اور ممتاز مریدوں کی اولاد ہیں۔ ان لوگوں کی حالت وہی ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی تمام درگاہوں کے متعلقین اور متوسلین کی ہے۔ نسب کے اعتبار سے یہ حضرات کتنے بھی اُونچے ہوں، فقط نسل کا نام لینے سے اُونچائی پر ٹھہر نہیں سکتے۔ خواجہ صاحب کے جدِ اعلیٰ مولانا سید محمد، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے حقیقی نواسے اور حضرت سلطان المشائخ کے منہ بولے بیٹے تھے لیکن خواجہ صاحب کی ولادت سے بہت قبل خواجہ صاحب کا خاندان بھی درگاہِ حضرت سلطان المشائخ کے دوسرے خاندانوں کی طرح برگزیدگی کھو چکا تھا۔ پھر طرہ یہ کہ بارہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے باپ اور ماں کے سائے سے محروم کر دیا۔ بڑے بھائی خواجہ سید حسن علی نے کچھ سنبھالا، کچھ نہیں سنبھالا۔ بچپن نہایت عسرت کے ساتھ کٹا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے بعد تو خواجہ صاحب کو درگاہ کی آمدنی کی حاجت کیا تھی، لیکن اس آمدنی نے ان کا ساتھ والدین کا انتقال ہوتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ درگاہ کی آمدنی بڑے بھائی ہی کے واسطے کافی نہیں تھی۔

ایک مرتبہ خواجہ صاحب راجا نوشاد علی خان، تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ) کو درگاہِ حضرت سلطان المشائخ کی زیارت کروانے لے گئے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہائش ترک کر رکھی تھی اور دلّی میں میرے ہاں رہتے تھے۔ اس لیے میں بھی ساتھ تھا۔ درگاہ شریف کے دروازے پر جوتوں کی رکھوالی کرنے والے موجود ہوتے تھے۔ ہم سب نے جوتیاں ان کے سپرد کیں اور واپس آ کر رکھوالوں کو کچھ دینے کی غرض سے خواجہ صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اکنّی یا دونی دینی چاہتے تھے۔ ہاتھ میں روپیہ آ گیا اور خواجہ صاحب نے روپیہ ہی دے دیا اور راجا صاحب سے فرمایا کہ بچپن میں مجھے بھی یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں ایک ایک پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔

میں جب ملا تو خواجہ صاحب جوتوں کی رکھوالی سے ترقی کرتے کرتے اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسۂ دینیات میں کچھ پڑھا کر اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے مضامین دلّی کے رسالے زبان، کانپور کے رسالے زمانہ اور لاہور کے رسالے مخزن جیسے بلند پایہ ماہناموں اور اٹاوے کے اخبار البشیر ہ، امرتسر کے اخبار وکیل اور لاہور کے اخبار وطن جیسے بااثر پرچوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے اور ملک میں خاصی شہرت ہو چلی تھی۔ مولانا ابو الکلام، مولانا عبداللہ عمادی، میر بشارت علی جالب، مولوی انشاء اللہ خان، میر غلام بھیک نیرنگ، علامہ اقبالؒ، علامہ شبلیؒ اور مولانا شاہ سلیمان کے مرتبے کے حضرات ان سے ملاقات کرنے آتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان کے استقبال میں شرکت کے لیے علی گڑھ بلایا تھا۔

مئی، جون ۱۹۰۸ء سے مئی، جون ۱۹۰۹ء تک خواجہ صاحب نے مجھے زیرِ تربیت رکھا۔ میری عمر اکیس (۲۱) برس تھی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اور خواجہ صاحب اکتیس (۳۱) برس کے تھے۔ بڑھاپے میں دس برس کا فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن اکتیس برس اور اکیس برس کی عمروں میں تراشیدہ انسان اور ناتراشیدہ نوجوان کا فرق تھا۔ اُسی وقت کا اثر ہے کہ میں اپنے سے بیس سال بڑے مولانا راشد الخیری کو تو اپنا دوست کہتا ہوں، مگر خواجہ صاحب کے صرف دس برس بڑے ہونے سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ مجھے دوست ضرور کہا کرتے تھے، میں نے اُن کے واسطے دوست کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سر پر ہاتھ دھرا تھا۔ وہ مرتے دم تک میرے بزرگ ہی رہے۔

علامہ اقبالؒ اُس زمانے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اقبال کو ''شیخینِ پنجاب'' کہا کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ سے میری پہلی ملاقات مسلم ہائی اسکول، انبالہ کے افتتاح کے موقعے پر ہوئی۔ مجھے اور خواجہ صاحب کو میر نیرنگ نے بلایا تھا۔ وہ بانیانِ اسکول میں تھے۔ علامہ اقبال پٹیالے سے آئے تھے۔ پٹیالے میں نواب ذوالفقار علی خان وزیر اعظم تھے۔ علامہ اقبال ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی علامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فرمایا:

''خواجہ صاحب! ذوالفقار نے تاکید کر دی ہے کہ اکیلے واپس مت آنا، خواجہ حسن نظامی کو ساتھ لے کر آنا۔''

خواجہ صاحب نے میری معذوری بتائی کہ یہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ولی ہیں۔ انھیں فلاں تاریخ کو ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں جائیداد کی آمدنی و خرچ کا حساب پیش کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج دلّی کے نام تار بھیج دیا اور تاریخ بدلوا دی۔ پھر میں اور خواجہ صاحب سات آٹھ دن نواب ذوالفقار علی خان کے ہاں دن رات علامہ اقبال کی صحبت میں رہے۔ علامہ اقبال نہایت سادہ مزاج اور بے تکلف انسان تھے۔ سات آٹھ ہی دن میں انھوں نے مجھے یہ بچکانہ اور گستاخانہ سوال کرنے کی جرأت بخش دی کہ ''ڈاکٹر صاحب! کیا بات ہے، آپ جیسا لکھتے ہیں، ویسا بولتے نہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر منہ نہیں بگاڑا، میری طرف سے رخ نہیں پھیرا بلکہ ہنس کر فرمایا: ''جتنی محنت لکھنے میں کرنی پڑتی ہے، اتنی بولنے میں بھی کرنے لگوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ بولتا میں انگریزی بھی بے پروائی سے ہوں مگر لکھتے وقت انگریزی اور اُردو دونوں کے الفاظ کو اس طرح تراشتا ہوں جس طرح شیشے سے نگینہ تراشا جاتا ہے۔''

میں علامہ اقبال سے ایک دفعہ لاہور کی پرانی انارکلی میں بھی ملا تھا، جہاں ان کا وکالت کا دفتر تھا۔ ان دنوں شیخ عبدالقادر بھی کہیں نزدیک ہی رہتے تھے۔ دلّی سے واپس آ چکے تھے۔ علامہ اقبال نے شیخ عبدالقادر کو اپنے دفتر بلوا لیا۔ میں اور خواجہ صاحب، غلام غوث صمدانی کی شادی سے فارغ ہو کر کھڑے کھڑے جالندھر سے ''شیخینِ پنجاب'' سے ملنے لاہور چلے گئے تھے۔ شام تک چاروں دفتر کے کمرے میں بیٹھے۔ شام کو ''شیخینِ پنجاب'' نے اسٹیشن پہنچا دیا اور خدا حافظ کہا۔

اس کے بعد میری ملاقات علامہ اقبال سے ہمیشہ اپنے ہی گھر پر ہوئی۔ ایک دفعہ وہ میرے ہاں مہمان بھی رہے۔ ویسے دلّی کا پھیرا کرتے تو میرے یہاں آتے ضرور تھے۔

مجھے یاد آیا یورپ کے ایک عظیم المرتبہ شخص کا قول ہے کہ جسے دو چیزیں میسر آ جائیں، اُس کی زندگی، زندگی ہے۔ ایک تو ایسا شغل جس سے اس کی طبیعت کو مناسبت ہو؛ دوسرے، ایسی بیوی جو اسے پسند کرتی ہو۔ بچے ہمیشہ کس کے ساتھ رہتے ہیں، ''دھی جوائی لے گئے اور بہوویں لے گئیں پوت۔'' خانگی زندگی بچوں کو بھی تو گزارنی چاہیے اور خانگی زندگی بیوی کے ساتھ یا خاوند کے ساتھ ہی گزرتی ہے۔ بیوی اور خاوند کا رشتہ سارے رشتوں کو پرے بٹھاتا ہے۔ اتنی پائیداری نہ ماں باپ کے رشتے میں ہے اور نہ اولاد کے رشتے میں، جتنی خاوند اور بیوی کے رشتے میں ہے۔ ماں باپ پال پوس کر دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور بچے ماں باپ کو چھوڑ کر

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دوسروں کے ہو جاتے ہیں۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ دنیا اسی طرح چل رہی ہے اور اسی دستور کی وجہ سے قائم ہے۔ ناپائیداری خاوند اور بیوی کے رشتے میں صرف ایک ہے کہ ماں باپ اور بچے بدلے نہیں جا سکتے، خاوند اور بیوی بدلے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ محمود جہاں بیگم ۱۹۱۲ء میں میرے ہاں آئی تھیں، ۲۱؍دسمبر ۱۹۱۹ء کو اللہ تعالیٰ کے ہاں چلی گئیں۔

سال ڈیڑھ سال میں نے انھیں یاد رکھا، ۱۹۲۱ء میں دوسری شادی کر لی۔ سال ڈیڑھ سال اتنا یاد رکھا کہ گویا دوسری شادی نہیں کروں گا۔ رابعہ، جن کے پیدا ہونے میں محمود جہاں بیمار پڑی تھیں، تین مہینے بے غوری کا شکار رہی تھیں۔ محمود جہاں کے انتقال کے بعد رابعہ پر بے دریغ روپیہ لٹایا۔ انا بھی مقرر کی اور آیا بھی۔ ڈاکٹر آئی ٹی متر اضرورت پر تو آتے ہی تھے، ویسے بھی ان سے طے تھا کہ ہفتے وار پھیرا کریں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن (جو آخر میں قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کے معالج تھے) انھیں مہینے کے مہینے دکھایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مسز رینگ (دلّی زنانہ میڈیکل کالج کی پرنسپل) تیسرے مہینے معائنہ کرتی تھیں۔ ان صاحبزادی کے متعلق ڈاکٹر کرنل عبدالرحمن فرمایا کرتے تھے کہ اس پر روپیہ اور انرجی فضول کھو رہے ہو، یہ جیئے گی نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رابعہ اب چھیالیس برس کی ہیں۔ غرض رابعہ کے خاصے ٹھاٹھ رہے۔ زاہدہ کی پرورش بھی امیرانہ شان سے ہوئی۔ مولانا راشد الخیری نے میری اس کیفیت سے کام لیا اور رہائشی مکان جس کا معاوضہ پاکستان میں پچاس ہزار روپے ملا، ان دونوں بچیوں کے نام کرا دیا۔ مولانا نے کہا: ”تم باقی تمام جائیداد باوا کی ختم کر چکے، رہائشی مکان بھی نیگ لگا دو گے۔“

اخراجات ناجائز نہیں تھے۔ بس اچھا کھاتا، اچھا پہنتا اور آسائش و آرام اور ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ مہمان داری کا بھی شوق تھا۔ مجھے علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا سلیمان پھلواری، علامہ اقبالؒ جیسے بلند مرتبہ حضرات کو مہمان بنانے کا شرف نصیب ہوا ہے۔ میر غلام بھیک نیرنگ مقدمات کی پیروی کرنے مہینے میں ایک دو دفعہ انبالے سے آیا کرتے اور میرے ہاں ٹھہرتے۔ مولانا ظفر علی خان دوسرے تیسرے مہینے دلّی تشریف لاتے اور میرے مہمان ہوتے تھے۔ مولانا نیاز فتح پوری چھ مہینے مسلسل مہمان رہے اور مولانا عارف ہسوی بیس برس۔ ویسے بھی دوپہر اور شام کے کھانوں میں کوئی نہ کوئی مدعو ہوتا تھا۔ میں نے اُس دور میں کھانا تنہا کبھی نہیں کھایا۔ جب ہی سے مردانے میں کھانا کھانے کی عادت ہے۔

دوسری شادی میں نے ۱۹۲۱ء میں امام صاحب، عیدگاہ فرید آباد، ضلع گوڑگاؤں (سیّد عبدالمجید) کی بیٹی سیّدۃ النساء بیگم سے کی۔ سیّدہ کے بڑے بھائی سید صغیر علی، ایم اے اپنی طالب علمی کے زمانے میں میرے استاد رہے تھے۔ وہ اُردو مڈل پاس کر کے دلّی آ گئے تھے اور دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُردو مڈل پاس کرنے والوں کا حساب اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں سید صغیر علی سے حساب سیکھتا تھا۔

میں سال ڈیڑھ سال جو پہلی بیوی کا سوگ مناتا رہا، اس سے میرا کاروبار بگڑ گیا تھا۔ نظام المشائخ کے سوا کل پرچے بند ہو گئے تھے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کوچۂ چیلاں کو رسالوں اور اخباروں کا قبرستان کہا کرتے تھے۔ اس قبرستان میں میرے پرچوں سے زیادہ کسی کے پرچے دفن نہیں ہیں۔ کاروبار سے جی ہٹ گیا تھا اور اخراجات اس سال ڈیڑھ سال کے آخری میں بالکل بحالتِ مجبوری کم ہوئے تھے۔ دوسری شادی کے وقت میں لکھ تھا۔ دوسری بیوی کا پورا دور مالی دشواریوں میں گزرا۔ اُس نے میرے گھر میں عیش نہیں دیکھا مگر سیّدۃ النساء دین دار بیوی تھیں۔ میرے گھر پہنچتے ہی انھوں نے عشاء کی نماز پڑھی تھی۔ جو بیوی اتنی خدا پرست ہو کہ دلہن بنے میں بھی نماز سے غفلت نہ برتے، وہ حرفِ شکایت زبان پر کیسے لا سکتی تھی۔ سیّدۃ النساء کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا۔ مرض الموت میں پروفیسر بشیر علی انھیں فرید آباد

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

لے گئے تھے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان وہ دو لڑکوں کی ماں بن چکی تھیں۔ ایک لڑکا حسین مصطفی ان کے سامنے مر گیا، دوسرا حسن مصطفی ان کے پاس تھا۔ رابعہ بھی سوتیلی ماں کی گود میں پلی تھیں۔ سوتیلی ماں دم توڑنے لگیں تو انھیں رابعہ کی یاد آ گئی جو دلّی میں میرے پاس تھی۔ سیّدۃ النساء کے کسی عزیز نے پوچھا: ''سیّدہ! تمھیں حسن مصطفی زیادہ عزیز ہے یا رابعہ؟'' سیّدۃ النساء نے جواب دیا: ''رابعہ۔'' سیّدۃ النساء اس طبیعت کی بیوی تھیں۔

حسن مصطفی بھی ماں کے انتقال کے بعد بیمار پڑ گئے۔ ان کے لیے انّا اور آیا رکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ ان کی خدمت میں نے خود کی۔ اپنی میز کرسی کے پاس ان کا پنگوڑہ رکھوا لیا۔ لکھنا پڑھنا بھی کرتا رہتا اور انھیں بھی سنبھالتا تھا، مگر وہ بچے نہیں، اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے بیٹے ماسٹر رضاء اللہ، اسسٹنٹ انجینئر، ریاست بہاول پور اسی زمانے میں پینشن لے کر آئے تھے۔ انھوں نے میرے ہاں تشریف لانا شروع کیا اور کہا: ''یہ انہماک جو تم اس معصوم کے ساتھ برت رہے ہو، مجھے تمھارے قریب کھینچ لایا ہے۔''

میری تیسری بیوی کا نام منظور فاطمہ تھا۔ منظور فاطمہ کے بھائی محمد نبی خان ریاست دتیا میں ملازم تھے۔ منظور فاطمہ ان ہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدۂ احتشام علی کے ذریعے منظور فاطمہ سے میرا رشتہ ٹھہرا تھا۔ وہ اخبارات اور ماہنامے پڑھتی تھیں اور مجھے جانتی تھیں۔ محمد نبی خان، منظور فاطمہ اور اپنی والدہ کو لے کر فیض آباد آ گئے تھے۔ ڈاکٹر احتشام علی کے مکان پر میرا نکاح ہوا۔ میں نکاحِ ثانی کی طرح ثالث کرنے کے معاملے میں ڈانوا ڈول نہیں رہا۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری بیوی نے رحلت کی، ۱۹۲۴ء ہی میں نکاح کر لیا۔

پہلی شادی کے وقت میری عمر تیئس (۲۳) سال، دوسری کے وقت اکتیس (۳۱) سے کچھ اُوپر اور تیسری شادی کے وقت پینتیس (۳۵) اور چھتیس (۳۶) کے درمیان۔ پہلی بیوی کے انتقال سے کاروبار کو جو زخم لگا تھا، اس کے اندر مال کی قابلیت باقی تھی۔ کاروبار دوسری بیوی ہی کے سامنے پنپ چلا تھا۔ تیسری بیوی کے دور میں لہر بہر عود کر آئی۔ پچھلے پرچے تو دوبارہ نہیں نکلے، ماہنامہ ادیب اور ماہنامہ فردوس اس دور میں جاری ہوئے لیکن ان کا میں صرف ایڈیٹر تھا، مالک نہیں۔ مالک ادیب کے مسٹر فصیح الدین ای اے، سیکریٹری ہارڈنگ لائبریری، دہلی تھے اور فردوس کے مالک خان بہادر حبیب الرحمن او بی ای، مینجنگ ڈائریکٹر الائیڈ ٹریڈنگ کارپوریشن، کراچی۔ البتہ کتابوں کی تجارت نے خوب ترقی کی اور منجن اکسیر دنداں کا اشتہار دے کر کتابوں کے ساتھ دواؤں کی تجارت کی بنیاد ڈال دی گئی۔ منجن کا نسخہ ۱۹۱۳ء سے موجود تھا مگر اس سے فائدہ اُٹھانے کا خیال منظور فاطمہ کے دور میں پیدا ہوا۔

کتابوں کا میں پبلشر تھا۔ مصنفوں سے کتابیں لکھواتا اور شائع کرتا تھا۔ مولانا راشد الخیری کی تصنیف 'شامِ زندگی' کے میں نے اٹھارہ ایڈیشن شائع کیے۔ اور بھی متعدد تصانیف شائع کیں۔ خواجہ حسن نظامی کی عام فہم تفسیر القرآن کے حقوقِ اشاعت مجھے حاصل ہیں۔

روپے سے بے نیازی کا عالم منظور فاطمہ کے دور میں بھی حسبِ سابق رہا۔ روپیہ اِدھر آیا، اُدھر گیا۔ روپے کو سینت کر رکھنا نہیں جانتا۔ طبیعت اور فطرت سے مجبور تھا اور چونکہ خرچ کرنے سے ضروریات رکتی نہیں تھیں، طبیعت پر قابو پانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسری بیوی کے دور میں جو جھٹکا لگا تھا، وہ کاروبار سے غافل ہو جانے کے باعث لگا تھا۔ محنت کرتا رہوں تو اللہ تعالیٰ میری ضرورتیں ضرور پوری کر دیتا ہے اور ہاتھ تنگ نہیں ہونے دیتا۔ یہ طبیعت آخر وقت تک نہیں بدلی۔ ابتدائے عمر میں بدل جاتی تو شاید بدل جاتی۔ بوڑھے طوطے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سبق کہاں سیکھتے ہیں، طبیعت بدل بھی لیتا مگر تقدیر تو نہیں بدل سکتا تھا۔ میری تقدیر یہ تھی کہ تانبے کا چمچہ لیے پیدا ہوا تھا۔ تانبے کا چمچہ منہ سے کبھی نہیں چھٹا اور چاندی کا چمچہ منہ کو کبھی نہیں ملا۔ منظور فاطمہ کثیر الاولاد ہیں۔ ماشاء اللہ چار لڑکوں اور سات لڑکیوں کی ماں۔ موروثی جائیداد ان بچوں نے نہیں پائی مگر جائیداد نہ پانے سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ سب الحمدللہ اتنے کامیاب ہیں کہ انھوں نے مجھے ایسے مکان میں لا بٹھایا جو میرے دلّی کے رہائشی مکان سے بہتر اور آرام دہ ہے۔ اولاد کی کثرت سے میں نالاں نہیں، شاداں ہوں۔

یہ تحریر، ممکن ہے بچوں کی نظر سے میرے مرنے کے بعد گزرے۔ میری موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ اس تحریر کو Dying Declaration (مرتے وقت کی وصیت) سمجھنا چاہیے۔ میری تمنا ہے کہ میرے بچے جس طرح مجھ سے کبھی نہیں روٹھے، اسی طرح آپس میں نہ روٹھا کریں اور ماں سے روٹھنے کا تو اسلام نے حق ہی نہیں دیا۔ دوسرے بھائی بہن سے بھی حسنِ سلوک کی اسلام نے تاکید کی ہے۔ (افسوس ۲۱ فروری ۱۹۶۷ء کو ان بچوں کی ماں کا بھی انتقال ہوگیا)۔

میں بچوں کو براہِ راست (Direct) نصیحتیں کرنا نہیں جانتا، بچے مجھ سے کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو صرف اُس وقت جب وہ کچھ پوچھیں یا اُس وقت جب میرے ملنے والے جمع ہوں اور میں ان کے سوالوں کے جواب دے رہا ہوں۔ میں اپنے ملنے والوں سے ایسی باتیں نہیں کرتا، جنہیں بچوں سے چھپایا جائے۔ مجتبیٰ اور مقتدیٰ چار پانچ برس سے تو چکلالہ اور اسلام آباد میں ہیں۔ دلّی اور کراچی میں تھے تو اس قسم کی مجالس میں خود پہنچ جایا کرتے تھے۔ عیسیٰ رضا گاہے گاہے آ بیٹھتے ہیں۔ میں نے بچوں کے سامنے ایک تو اپنا نمونہ برا نہیں پیش کیا۔ دوسرے جو مضامین اور تاثرات لکھتا رہتا ہوں، ان کے حقیقی مخاطب میرے بچے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ان سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ اتنی نصیحتیں زبانی کر بھی نہیں سکتا تھا، جتنی تحریروں میں آ گئی ہیں۔ یہ مضامین اور تاثرات میں نے ساٹھ سال کی عمر ہو جانے کے بعد لکھے ہیں۔ یہ میری معلومات اور تجربات کا نچوڑ ہیں اور میری بصیرت اور میرے وجدان کا عطر ہیں۔

میرے سب لڑکے لڑکیاں بہ فضلِ تعالیٰ دین دار اور پابندِ مذہب ہیں۔ بچوں سے اپنے تعلق خاطر کا اندازہ خود مجھے صرف دو مواقع پر ہوتا ہے۔ ایک جب بچہ بیمار ہو، دوسرے جب وہ رات کو گھر دیر سے آئے۔ بچوں کی بیماری سے میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں اور بچوں کو دیر میں آنا میری نیند اُڑا دیتا ہے۔ حواس باختگی اتنی بڑھی ہے کہ مجھے لکھنے پڑھنے سے معذور کر دیتی ہے اور نیند کا اُڑنا بھی کم از کم ایک دو دن لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ گویا نیم مردہ ہو جاتا ہوں۔ اب لکھنا پڑھنا ہی میری زندگی ہے۔

میری بیویوں میں کوئی بیوی بھی لکھنے پڑھنے میں میری معاون نہیں بن سکی البتہ منظور فاطمہ نے کراچی پہنچنے کے بعد سے لکھنے پڑھنے کی فرصت مجھے دے دی ہے۔ میں نے کراچی کے اٹھارہ سال میں جتنا لکھا پڑھا، اتنا دلّی کے ساٹھ سال میں نہیں لکھا پڑھا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا تھا اور وہ حکم قیامت تک برقرار رہے گا اور وہ حکم قیامت تک مسلمانوں کے لیے سبق ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی ۲۳ ویں آیت میں ارشاد ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔

(ترجمہ): کہہ دو کہ میں اس کا تم سے صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (تو چاہیے)۔ (الشوریٰ: ۲۳)

میری بھی بس یہی تمنا ہے کہ میرے بچوں کا آپس میں برتاؤ کبھی خراب نہ ہو اور وہ باقی کنبے کے ساتھ بھی شریفانہ زندگی گزاریں، ورنہ نہ دنیا میں عزت پا سکیں گے اور نہ عقبیٰ میں۔ دنیا میں ان کی ہوا اُکھڑ جائے گی اور عقبیٰ میں سزا ملے گی۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

دلہن کی تیاری آپ نے کر لی ہے یا...

جمیل یوسف

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اپنی پسند سے شوہر کا انتخاب کرے... ایسی شگفتہ تحریر جو آپ کو مسکرانے پر مجبور کر دے

"اے ہے، کچھ خیال بھی ہے۔ آپ تو دن بھر بس دوستوں میں جھک مارتے رہتے ہیں۔ دوستوں سے فرصت ملی تو کتابوں میں سر دے لیا۔ کچھ اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے؟"

"کیوں کیا بات ہوگئی ہے۔ خیر تو ہے؟"

"آپ کو گھر کا کچھ خیال ہو، تو آپ کا دھیان ادھر آئے۔"

"ادھر کس طرف، بات کیا ہے؟"

"گھر کے مالک کو کچھ تو گھر کا خیال ہونا چاہیے۔"

"کون گھر کا مالک؟ یعنی آپ کا مطلب ہے میں اس گھر کا مالک ہوں۔ سبحان اللہ! یہ خبر تو آج پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔ ضرور کوئی ہنگامی حالت ہے جو اتنی انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔"

"آپ تو ایسے ہی بات سے بات نکالتے رہتے ہیں۔ کام کی بات نہیں کرتے۔"

"اچھا اب خدا کے لیے بتاؤ بھی، بات کیا ہے آخر؟"

"بیٹی جوان ہوگئی ہے اور آپ کو کچھ فکر ہی نہیں۔"

"بیٹی جوان ہوگئی ہے اور مجھے فکر نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا، اس میں فکر کی کون سی بات ہے؟"

"یعنی آپ کو اس میں فکر کی کوئی بات ہی نظر نہیں آتی؟"

"فکر کی آخر کون سی بات ہے جو بیٹی کی جوانی کے کارن مجھے لاحق ہو جانی چاہیے۔ فکر تو تب تھی جب وہ چھوٹی بچی، معصوم اور ناسمجھ تھی۔ اسے اپنے برے بھلے کی تمیز نہ تھی۔ اب تو اللہ کے فضل سے وہ اپنا خیال خود رکھ کر اپنے برے بھلے کو خود سمجھ سکتی ہے۔ اب فکر کی کون سی بات ہے؟"

"بات آپ کے پلے نہیں پڑ رہی، بڑے دانشور بنے پھرتے ہیں۔ اجی بیٹی کے لیے کوئی مناسب سا رشتہ تلاش کریں۔ گزرتے وقت کا پتا نہیں چلتا، یہ کام وقت پر ہونا چاہیے۔"

"یہ بھی ایک ہی کہی۔ رشتہ بیٹی کو درکار ہے اور تلاش ہم کریں۔ ہم نے تو اپنا رشتہ بھی تلاش نہیں کیا تھا، تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔"

"اب مذاق کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟ آپ کو سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔"

"کون سا مسئلہ؟"

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

''یہی بیٹی کے لیے کسی مناسب رشتے کی تلاش!''
''میں مذاق نہیں کر رہا۔ تلاش تو اس چیز کی ہوتی ہے جو گم ہو یا کم یاب ہو۔ جہاں تک کنوارے یا شادی کے خواہش مند نوجوانوں کا تعلق ہے، ان سے تو شہر بھرا پڑا ہے۔ یہ مخلوق اتنی وافر ہے کہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ بس اسٹاپوں اور لڑکیوں کی درسگاہوں کے سامنے تو ان کی باقاعدہ نمائش لگی رہتی ہے۔''
''میرا خیال ہے ڈھیر ساری کتابیں پڑھ پڑھ کر آپ کا دماغ چل گیا ہے، جو ایسی بے تکی ہانکے جاتے ہیں۔''
''بے تکی! تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، میں نے کون سی بات غلط یا خلاف واقعہ کہہ دی۔ جو کچھ میں نے کہا، کیا وہ حقیقت نہیں؟ نوجوان بلکہ ہر عمر کے مرد ہر جگہ موجود ہیں۔ لڑکی کو چاہیے کہ اپنی پسند کا ساتھی چن لے۔''
''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''
''نہایت معقول باتیں کر رہا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ہماری شادی کیسے ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کا انتخاب خود نہیں کیا بلکہ یہ کام دوسروں پر چھوڑ دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بھر نہ میری کوئی بات تمہارے پلے پڑی نہ تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں آئی۔ اب اگر بیٹی کے لیے رشتے کا انتخاب تم نے یا میں نے کیا، تو اس کے خاوند کا بھی وہی حشر ہوگا، جو میرا ہوا۔''
''بیٹی اپنے رشتے کا انتخاب خود کیسے کر سکتی ہے؟''
''بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے لیے لباس اور درزی کا انتخاب کرتی ہے، اپنے جوتے خود اپنی پسند سے لیتی ہے، اپنے رسالے اور کتابیں خود خریدتی ہے اور اپنی سہیلیاں خود چنتی ہے۔ تم سچ کہو ان چیزوں کے بارے میں کبھی اس نے تمہارا مشورہ طلب کیا یا میرے تجربے سے فائدہ اُٹھانے کی تمنا کی ہے؟ کیا اپنی سہیلیوں کے انتخاب میں وہ میری خدمات حاصل کرتی ہے؟''
''یہ سب چیزیں دوسری ہیں۔ خاوند کے انتخاب کا مسئلہ بالکل الگ ہے۔''
''کیا مطلب؟ عارضی اور وقتی استعمال کی چیزیں جن سے جان چھڑانے کے لیے کسی وقت بھی انھیں اُٹھا کر باہر گلی میں پھینکا جا سکتا ہے، یہ سب چیزیں تو وہ اپنی مرضی سے چنتی ہے مگر خاوند جس سے جان چھڑانا اتنا آسان نہیں، وہ ہماری مرضی کا پسند کرے گی۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جب وہ جوتوں اور کپڑوں جیسی معمولی اشیاء کے سلسلے میں بھی ماں باپ پر اعتماد نہیں کرتی، تو جیون ساتھی کا انتخاب ہماری صوابدید پر کیونکر چھوڑے گی۔ یہ تو سراسر خلاف عقل بات ہوئی۔''
''لگتا ہے آپ کی ساری عقل کتابوں نے چاٹ لی ہے۔''
''تم نے تو اپنی عقل کو محفوظ رکھا ہے۔ پھر یہ سامنے کی سیدھی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔ دیکھو، میں تمہیں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ خاوند تلاش کرنا اور پسند کرنا لڑکی کا انتہائی ذاتی مسئلہ ہے۔ اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ آخر دخل در معقولات اور کسے کہتے ہیں؟ ہاں البتہ اپنے لیے کوئی لڑکا پسند کر لینے کے بعد اس نے ہم سے رائے لینا ضروری سمجھا تو ہم اسے اپنے قیمتی مشورے سے مستفید کر سکتے ہیں لیکن اس طریق کار میں بھی ایک قباحت موجود ہے۔ لڑکی کو خاوند کے انتخاب کے بعد اس بات کا انتخاب کرنا ہوگا کہ اسے کس کا قیمتی مشورہ درکار ہے......؟ میرا یا تمہارا۔ تم تو جانتی ہو بلکہ پورا محلہ جانتا ہے، آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم دونوں کسی ایک چیز کے بارے میں کبھی متفق ہوئے ہوں۔''
''ہائے اللہ! آپ کی یہ گفتگو کوئی سن لے تو کیا کہے!''
''ظاہر ہے وہی کہے گا جو اس کے دماغ میں آئے گا۔ جیسے تم کچھ کہہ رہی ہو اور میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا تھا
؎ ......'میں کیا کہہ رہا ہوں تو کیا کہہ رہی ہے'
''اچھا یہ تو بتاؤ یہ مسئلہ آج یکا یک پیدا کیسے ہو گیا۔ ہماری بیٹی تو کب سے گھر میں موجود ہے؟''
''کئی دنوں سے سوچ رہی تھی اس بارے میں آپ سے بات کروں۔''

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

”حالانکہ اس بارے میں تمہیں اپنی بیٹی سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

”کیا بات؟“

”یہی کہ وہ شادی کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں۔“

”اچھا!......تو کیا وہ اپنے منہ سے بول کر کہے گی کہ میری شادی کرو؟“

”کیا وہ گونگی ہے؟“

”خدا نہ کرے، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جب اپنے نئے کوٹ کے لیے منہ سے بول کر کہہ سکتی ہے بلکہ ضد کر سکتی ہے، تو شادی کے لیے کیوں نہیں کہہ سکتی۔ چلو مجھ سے نہ سہی کم از کم تم سے تو کہہ سکتی ہے بلکہ آج کل بعض روشن خیال لڑکیاں تو اس معاملے میں اتنی خود کفیل ہوتی ہیں کہ ماں باپ سے بھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ ماں باپ کو بسا اوقات اس وقت پتا چلتا ہے جب ان کی شادی ہو چکی ہوتی ہے بلکہ کئی والدین کو تو اس خبر کا پتا اخبار کے ذریعے لگتا ہے۔“

”ہائے اللہ بدشگونی کی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسی بات ہو۔“

”یعنی خدا نہ کرے کہ شادی ہو۔“

”آپ یہ اوٹ پٹانگ باتیں ہی کرتے رہیں گے یا اس بارے میں کچھ طے بھی ہوگا۔“

”سب سے پہلے تو یہی طے ہونا چاہیے کہ لڑکی شادی کرنا چاہتی ہے یعنی اسے کسی جیون ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے یا نہیں؟“

”شادی کی ضرورت کے بارے میں بھی کوئی شک ہے؟“

”کیوں نہیں، ہر انسان کا مزاج اور اس کی ضروریات ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بیٹی شادی کے بجائے کوئی معقول کام کرنا چاہتی ہو!“

”کیا معقول کام؟“

”کئی معقول کام ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مزید تعلیم حاصل کرنا، ملازمت کرنا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور پھر مسئلے کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف تو ابھی تک تمہاری توجہ ہی نہیں گئی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہماری بیٹی شادی کے قابل ہے۔“

”تو کیا آپ اپنی لڑکی کو لولی لنگڑی سمجھتے ہیں؟“

”خدا نا کرے جو ہماری بیٹی لولی لنگڑی ہو۔ ہماری بیٹی تو ماشاءاللہ بڑی ذہین اور خوبصورت ہے، مگر ذہین اور خوبصورت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ شادی کے قابل بھی ہے۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا اس نے شادی کی تیاری کر لی ہے؟“

”شادی کی تیاری تو ہم والدین کو کرنی ہے۔“

”کیوں کیا ہماری شادی ہو رہی ہے؟“

”میرا مطلب جہیز وغیرہ کی تیاری اور دوسرے انتظامات سے ہے۔“

”جہیز اور دوسرے انتظامات، ان کا شادی سے کیا تعلق؟ یہ تو محض شادی کی ظاہری رسوم ہیں۔ میرا مطلب شادی شدہ زندگی سے ہے، اس کی مکمل تیاری لازمی ہے ورنہ ناکامی کا سو فیصد امکان ہے اور یہ تیاری شادی سے بہت پہلے ہونی چاہیے۔ جیسے امتحان کی تیاری، بہت پہلے سے شروع کی جاتی ہے۔“

”میں شادی کی بات کر رہی ہوں، آپ امتحان کی ہانکنے لگے۔“

”تم نے شادی کو کبھی امتحان نہیں سمجھا، تم میں یہ سوچنے کی اہلیت ہی نہیں۔ اسی لیے تو تم ساری زندگی ذلیل و خوار ہوتی رہی ہو۔“

”مجھے ذلیل وخوار تو آپ کرتے رہے ہیں۔“

”تو تمہاری بیٹی کو اس کا خاوند کرے گا۔“

”خدا نہ کرے میری بیٹی کو آپ جیسا خاوند ملے۔“

”خدا نہ کرے کسی کی قسمت میں تمہارے جیسی بیوی ہو۔“

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

’’اس ساری بک بک کا مقصد کیا ہے؟‘‘

’’مقصد یہ ہے کہ کیا ہماری بیٹی شادی کے لیے تیار ہے؟‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے ابھی اس کی عمر شادی کی نہیں ؟‘‘

’’عمر سے کیا ہوتا ہے، اس سے بیوی بننے کی صلاحیت خودبخود تو پیدا نہیں ہو جاتی۔ اب صرف اس بناء پر کہ بچہ پندرہ سال کا ہونے لگا ہے، اس کے ہاتھ میں میٹرک کی سند تو نہیں تھمادی جاتی۔‘‘

’’ہماری بیٹی تو بی اے کر چکی ہے۔‘‘

’’بی اے سے شادی کا کیا تعلق ہے۔ بی اے کرنے سے تو انسان محض چند کتابیں پڑھ لینے اور اپنے خیالات غلط سلط زبان میں بیان کرنے کے قابل ہو جاتا ہے بلکہ بی اے تو شادی کی ضمانت ہے، تم جانتی ہو بی اے کے معنی ہیں بیچلر یعنی کنوارا۔ بی اے کی سند تو حقیقت میں کنوارپنے کی سند ہے یعنی یہ شخص جو بی اے ہے، کنواری زندگی گزارنے کے قابل ہو گیا ہے یہ تو گویا الٹا شادی کے لیے نااہل ہونے والی بات ہوئی۔‘‘

’’اوئی اللہ! اس بکواس سے میرا سر پھٹ رہا ہے۔ شادی ہوگی تو شادی کی تیاری بھی ہو جائے گی۔‘‘

’’محترمہ! ذرا بتاؤ تو سہی، تم شادی کی تیاری سے کیا مطلب لے رہی ہو۔ آخر ایک عدد شادی تم نے بھی تو کر رکھی ہے۔‘‘

’’میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، اس موضوع پر آپ سے بات چھیڑ کر میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔‘‘

’’وہی مصیبت جس میں تم سے شادی کر کے میں گرفتار ہو گیا ہوں۔‘‘

’’آپ تو ساری زندگی یہی رونا روتے رہیں گے۔ بات بیٹی کی شادی کی ہو رہی ہے اور آپ اپنی شادی کا غم غلط کر رہے ہیں۔‘‘

’’بیٹی کی شادی بھی ہو جائے گی، وہ شادی کے لیے تیار تو ہو۔‘‘

’’تیار، تیار...... تیاری...... یہ کیا فضول رٹ لگا رکھی ہے۔‘‘

’’محترمہ! دیکھو، تھوڑی دیر کے لیے بازار جانا ہو تو اس کے لیے بھی تیاری کرنی پڑتی ہے اور یہ تو زندگی بھر کا سفر ہے اس کے لیے تو بڑی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت ہونی چاہیے۔‘‘

’’ہماری بیٹی اب شادی کی اور کیا تیاری کرے، وہ شادی کے لیے نہایت موزوں ہے۔‘‘

’’میں نے تو اسے شادی کی تیاری کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔‘‘

’’کیا مطلب؟ خدا کے لیے ذرا صاف بتایئے، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’مطلب صاف ہے، حیران ہوں تمہارے پلے کیوں نہیں پڑ رہا۔ میں نے اپنی بیٹی کو کبھی باورچی خانے میں کام کرتے نہیں دیکھا۔ کھانا وہ نہیں پکا سکتی، برتن بھی اس نے کبھی صاف نہیں کیے، کپڑے بھی نوکرانی سے دھلواتی ہے، آج تک غالباً اپنا کوئی لباس اس نے خود نہیں سیا، سوئیٹر بنتے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، درزیوں کے ہاں چکر لگا کر اپنے جوتے البتہ گھساتی رہتی ہے۔ جب صورتحال یہ ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے ابھی شادی کی تیاری کے سلسلے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔‘‘

’’میں لڑکی کو دلہن بنانے کی بات کر رہی تھی نوکرانی بنانے کی نہیں۔‘‘

’’گھر کی بیگم جب تک یہ سارے کام خود سلیقے سے کرنا نہ جانتی ہو، نوکروں سے کام نہیں لیا جا سکتا اور پھر آج کل نوکر ملتے کہاں ہیں، نوکر رکھ کون سکتا ہے؟‘‘

’’آپ کی تو ذہنیت ہی ایسی ہے۔ آپ نے تو مجھے بھی ساری زندگی نوکر سمجھا اور نوکرانیوں جیسا سلوک کیا ہے۔ اب میری بیٹی کو بھی نوکرانی بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ میری طرح یہ کسی کنگال کے پلے کیوں بندھنے لگی۔ چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ بہت ہو چکی۔ میں تو چلی۔ آپ اپنی ہانکتے رہیے۔‘‘ ◆◆◆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

حبیبہ شیراز

آخری موقع

عدالتِ اعظم کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ باہر جانے اور اندر آنے کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ منصف اعلیٰ اپنی انصاف کی مسند پر تھے۔ وہ ہمیشہ وہیں ہوتے ہیں۔ یہ جگہ کچھ عجیب تھی۔ میں نے ایسی عدالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کوئی ٹائپ رائٹر، کرسی میز اور نہ منصف اعلیٰ کے سامنے کوئی ریکارڈ تھا۔ منصف اعلیٰ سامنے تھے پر کچھ ٹھیک سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ صرف روشنی سی تھی۔ میرے اردگرد اور لوگ بھی تھے پر مجھے وہ کیوں نظر نہیں آ رہے تھے؟ آج سب کے فیصلے ہونے تھے۔ میں پریشان تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی اس عدالت میں پیش نہ ہوتا مگر مجھے ہونا پڑا۔ بالکل ویسے ہی جیسے سب تھے۔ پیروں تلے زمین جلتی محسوس ہو رہی

تھی جیسے کسی گرم تانبے پر کھڑے ہوں۔ میں پاؤں ہٹانا چاہتا تھا پر وہ ہل نہیں رہے تھے۔ مجھے اس جلن کو ہر حال میں سہنا تھا۔

میرے نام کی پکار پڑی تو دل جیسے کانوں میں دھڑکنا شروع ہو گیا۔ میں لرز رہا تھا۔ سامنے فضا میں ایک بہت بڑی اسکرین روشن ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ ہر پل میری نگرانی ہوتی رہی ہے۔ کچھ خفیہ کیمرے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے، پھر بھی میں نے ہمیشہ انھیں نظرانداز کیا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اسکرین پر بہت سے مناظر گزرے۔ میری پیدائش کا منظر، بچپن، جوانی ...... اور پھر ہر منظر اسکرین پر ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگا۔

☆☆☆

ایک کچرے کے ڈھیر پر، گندگی سے لتھڑی کسی بے گناہ

دنیاوی آلائشوں میں گھرے انسان کی کہانی، جسے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا احساس بروقت ہو گیا

www.pakistanipoint.com

کی لاش جو کسی کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ وہ لاش میں نے اپنے قبضے میں کی۔ اگلے منظر میں اس کے گھر والے میت وصول کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اس کا وجود غلاظتوں سے صاف اور خوشبوؤں سے آراستہ کر کے آخری سفر پر روانہ کرنے سے پہلے اس کا آخری دیدار کرنا چاہتے تھے۔ میرے لیے یہ 'لاش' بہت قیمتی تھی۔

"ایک لاکھ سے کم پر بات نہیں بنے گی۔" لواحقین نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ یہ آنکھیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ ایسی آنسوؤں سے لبریز، درد بھری آنکھیں میں روز ہی دیکھتا تھا۔

"وقت کم ہے۔ لاش کی حالت مزید خراب ہو جائے گی۔ پیسوں کا انتظام جلد کرلو۔" میرے کہے الفاظ آج کمرۂ عدالت میں گونج رہے تھے۔ وقت واقعی کم تھا۔ میرے بچے کی انٹرنیشنل اسکول کی فیس کی تاریخ سر پر تھی۔ شام کو انھوں نے مجھے پیسے دیتے وقت نہایت بےبسی سے دیکھا۔ کمرا اب ان کی آنکھوں پر جارُکا تھا۔ اُن کا دکھ، بےبسی، درد آج مجھے چاروں طرف نظر آرہے تھے۔ میں کچھ بولنا چاہتا تھا مگر زباں پر تالے پڑے تھے۔ مجھے اپنی صفائی میں بس اتنا کہنا تھا کہ اُس وقت میں کیا کرتا؟ بہت مجبور تھا۔ بچوں کی اتنی مہنگی فیسیں کہاں سے ادا کرتا؟ قلیل تنخواہ سے ضرورتیں کہاں پوری ہوتی ہیں؟ مگر میں یہ سب کہہ نہیں پا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے منظر میں دو بچے دوڑ کر ایک کونے میں کھڑے ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت باپ تھا، جو صرف ان کے تحفظ کے لیے فکر مند تھا۔ بچوں کی آنکھوں میں خوف تھا۔ باپ کی اذیت پر کرب نمی بن کر ان کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ یہ معمول کی واردات تھی۔ ایک آدمی کو بچانے کے لیے میں اپنی جان خطرے میں کیسے ڈالتا؟ یہ سب میں منصف اعلیٰ سے کہنا چاہتا تھا مگر کمبخت زبان تالو سے چپکی جاتی تھی۔

☆☆☆

اس سے اگلے منظر میں، میرا بیٹا میرٹ سے رہ گیا تھا۔ ایک مزدور کا بیٹا میرٹ پر تھا۔

میری بیوی بولی، "تم اپنے بیٹے کو داخلہ نہ دلوا سکو تو ایسے عہدے کا کیا فائدہ؟"

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ مزدور کی اولاد تکلیفیں سہنے کی عادی ہوتی ہے مگر میرے بیٹے کو تو ہل کر پانی پینے کی بھی عادت نہیں تھی۔ میرے ایک فون نے مسئلہ حل کر دیا۔ بیوی خوش ہو گئی اور بیٹا بھی۔

منظر ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی بیوی اور بیٹے کی طرف سفارشی نظروں سے دیکھا کہ میری تو زبان ساتھ نہیں دے رہی شاید وہی میرے حق میں کچھ کہہ دیں۔ آخر وہ سب میں نے انھی کے لیے تو کیا تھا مگر انھوں نے یوں آنکھیں چُرا لیں جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ جن کے لیے وہ سب کچھ کیا، وہ اجنبی بنے کھڑے تھے اور سوال و جواب کے پھندے میں گردن آج میری پھنسی تھی۔

اگلے منظر میں بیوی اور بیٹی کے فیس بک اکاؤنٹ سامنے آرہے تھے۔ جسم کے ساتھ چپکے چست لباس، مختلف انداز کی تصاویر پر میرے اپنے لکھے تعریفی کلمات، لوگوں کے تاثرات پر خوشی و فخر کا اظہار۔ میں حیران تھا کہ میری ان حرکات کی بھی نگرانی ہو رہی تھی جو اُس وقت میری نظر میں بہت معمولی تھیں۔ اسکرین آگے بڑھی۔

☆☆☆

اب میں بیمار تھا۔ سارا پیسہ میرے علاج پر لگ چکا تھا اور گھر والے میرے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ فلم ختم ہو گئی۔ میرے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح پھوٹ پڑا تھا۔

منصف اعلیٰ نے میرے ہر خود ساختہ جواز کا جواب دیا۔

"جو تمہارے نصیب میں رزق لکھ دیا گیا تھا، وہ پانے کے لیے تمہیں کوشش کرنے کو کہا گیا تھا۔ اسے تم اپنی تدبیر

سے بڑھا نہیں سکتے تھے مگر محنت و ایمانداری سے اس پر قناعت کرنے کی ترغیب کیا نہیں دی گئی تھی؟ ’وہ بندہ تو بچ گیا تھا‘...... میں نے سوچا۔ اگر میں مدد کے لیے جاتا تو مجھے بھی گولی لگ سکتی تھی۔ یہ سب میں کہہ نہیں پا رہا تھا۔ کاش زبان ساتھ دیتی تو میں اپنے بودے جواز بیان کرتا۔

’’ہاں وہ بچ گیا تھا۔ رب ذوالجلال یونس کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھ سکتا ہے۔ اس کے جسم میں لگی گولی کو بھی حکم ہوا تھا کہ نقصان پہنچائے بغیر جسم سے نکل جا۔ وہ کن فیکون ہے۔ اپنے کسی فیصلے کے لیے جوابدہ نہیں، مگر تم پر اپنے بھائی کی مدد فرض تھی۔ کیا تم آدم اور حوا کی اولاد میں سے نہ تھے؟ کیا تمہارا اور اس کا رب ایک نہ تھا؟ کیا تم دونوں کو اخوت کے رشتے میں نہ باندھا گیا تھا؟‘‘

’’بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

’’اور وہ مزدور کا بیٹا...... تم نے اسے اس کے جائز حق سے محروم کیا تو اس پر ترقی کے اور راستے کھول دیے گئے۔ تمہارا بیٹا جہاں سے چلا تھا، وہیں کا وہیں رہ گیا مگر تمہارا نامۂ اعمال سیاہ کر گیا۔‘‘

’’تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ کیا تمہیں یہ تعلیم نہیں دی گئی تھی؟ تم نے انھیں شتر بے مہار چھوڑ دیا۔‘‘

منصفِ اعلیٰ نے میرے ہر اعتراض کو جان لیا تھا اور جواب بھی دے دیا۔ میرا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مجھے ایک دروازے کی طرف ہانکا جانے لگا۔ میرے پاؤں میں بہت وزنی بیڑی تھی۔ اس میں پتھر بندھے ہوئے تھے۔ میں اس کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ میرے پاؤں زخمی تھے۔ رُکتا تو پیچھے سے چابک لگتا جو میری کھال اُدھیڑتا میری ہڈیوں میں کھب جاتا۔ اسی تکلیف میں ہم دروازے تک پہنچ گئے۔ اندر سے میرے بارے میں پوچھا گیا۔ مجھے لے جانے والوں نے میری چارج شیٹ پڑھ کر سنائی۔ دروازہ کھلا اور مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔ درد سے میں چیخا مگر اندر جا کر میری آواز ختم ہو چکی تھی۔ اتنا اندھیرا کہ کہیں روشنی کی ایک کرن تک نہ تھی۔ اتنا خوف کہ دل پھٹ جائے، گرمی اس قدر کہ مجھے محسوس ہوا جیسے دھیرے دھیرے میرا ماس ہڈیاں چھوڑ رہا ہو۔ ہاں میرا جسم پگھل رہا تھا اور گرم پلاسٹک کی طرح میری ہڈیوں کو جھلسا رہا تھا۔ میں نے زور سے چلّانے اور بھاگنے کی پوری کوشش کی مگر کچھ نہ کر سکا۔ اچانک میرے سامنے ایک پلیٹ لائی گئی۔ یہ میرا کھانا تھا۔ پر یہ کیا؟ کھانے کی جگہ کانٹے تھے۔ سالن کی جگہ پیپ بھری تھی۔ کراہیت سے میرا دل باہر آنے لگا۔ کسی نے زبردستی میری گردن پکڑ کر کانٹوں کے ساتھ پیپ لگا کر نوالہ میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں چیخا...... بہت زور سے چیخا اور پھر چیختا ہی چلا گیا۔

☆☆☆

میں اپنے بستر پر تھا۔ سر سے پیر تک پسینے سے بھیگا ہوا۔ میری بیوی بچوں کو لے کر میکے گئی ہوئی تھی۔ میں چیختے چیختے خود ہی خاموش ہو گیا۔ سامنے گھڑی نے بارہ بجائے۔ تاریخ بدلی۔ اُسے بدلنا ہی ہوتا ہے۔ اس نئی تاریخ کے ساتھ میں بھی بدل چکا تھا۔ وہ خواب نہیں میری اب تک کی زندگی کا حاصل تھا۔ ایک آخری وارننگ تھی میرے سیاہ ہوتے دل و دماغ کے لیے...... ایک دستک تھی میرے ضمیر پر، ایک آخری موقع تھا اس سے پہلے جب......

’’اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہوں کے بارے میں پرسش کی جائے گی اور نہ کسی جن سے۔‘‘ (سورہ رحمٰن)

ہاں ایک موقع اور قدرت مجھے دے رہی تھی اپنے گناہوں کے کفارے کا، اس تاریکی سے بچنے کا، جس میں خوف سے میرا دل بند ہو رہا تھا۔ اس حرام کے مرغ پلاؤ سے جس کے بدلے میں کانٹے اور پیپ ہمیشہ کے لیے میرے نصیب میں لکھ دیے جاتے۔

ہاں! یہ ایک اور موقع تھا اس غلاظت سے باہر آنے کا جس میں جسم و روح لتھڑ چکے تھے...... شاید آخری موقع۔ ●●

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

سفر شرط ہے...

ڈاکٹر انیس الرحمن

عشقِ اور علم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی... ایک دھائی کم ایک صدی پر محیط جنونِ علم کی بے مثال داستان

اللہ سبحان وتعالیٰ ہر شخص کو اس کی ہمت کے مطابق توفیق عطا فرماتا ہے اور اس قطرے کو، جس نے گوہر بننے کے لیے سیپ میں قید ہونا منظور نہیں کیا، لوگوں کی آنکھوں میں جگہ ملتی ہے!

ایک اور شعر کا قلندرانہ پیغام بھی، جو حصولِ علم کے سفر پر جانے کے لیے میری ہمت افزائی کرتا رہا، وہ آتش کا مندرجہ ذیل شعر ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

امریکا میں مختلف یونیورسٹیوں میں داخلے کی درخواستیں بھیجنے کے ساتھ ہی میں نے چھٹی برائے تعلیم (Study Leave) کی درخواست بھی دے دی تھی۔ یہ چھٹی گورنمنٹ سروس میں صرف ایک بار ملتی ہے اور اس چھٹی میں تنخواہ کے علاوہ پڑھائی کے لیے اچھا خاصہ الاؤنس بھی منظور کیا جاتا ہے۔ اس چھٹی کی منظوری فنانس ڈیپارٹمنٹ

سے ملتی ہے۔ اگرچہ میرے محکمہ نے تو اس چھٹی کی سفارش کر دی تھی لیکن فنانس ڈیپارٹمنٹ نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔
اس کے کچھ عرصے بعد مجھے یونیورسٹی آف الی نوائز (Illinois) سے ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ہم تمہیں ماسٹرز کی ڈگری کے لیے یونیورسٹی فیلوشپ دینے پر غور کر رہے تھے، مگر فنڈز کی کمی کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن ہم تمہاری فیس معاف کر سکتے ہیں۔ اگر آنا چاہو تو مطلع کرو۔
اگرچہ میری چھٹی برائے تعلیم تو نامنظور ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود میں نے یونیورسٹی کا کیس دوبارہ فنانس ڈیپارٹمنٹ کو پُرزور سفارش بھجوا کر، اس کی منظوری کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔

اسی زمانے میں مجھے ایک خواب آیا کہ میرے ایک بے حد عزیز بھائی کا انتقال ہو گیا اور گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ پھر ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ وہ یکایک زندہ ہو گیا۔ میں نے اس خواب کا ذکر اپنے والد سے کیا تو انھوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ تم پڑھائی کے لیے باہر جا رہے ہو۔ تمہارے جانے والے کیس میں ایک دم جان پڑ جائے گی۔

میری کوششیں رنگ لائیں اور فنانس ڈیپارٹمنٹ سے میری چھٹی برائے تعلیم کی منظوری آ گئی۔ میرے والد اس وقت تک ریٹائر ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنی آدھی پنشن کا پیشگی معاوضہ یکمشت لے لیا تھا۔ گھر کا خرچ پورا کرنے کے لیے انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ملتان روڈ پر ایک پرائیویٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ گھر کے باقی اخراجات وہ میٹرک کے امتحانات کے ذیلی ممتحن (Sub-examiner) اور صدر ممتحن (Head Examiner) کے طور پر پرچوں کو جانچنے کا کام کر کے پورا کر رہے تھے۔

جب میں نے والد کو بتایا کہ میری چھٹی برائے تعلیم منظور ہو گئی ہے اور یونیورسٹی نے میری فیس بھی معاف کر دی ہے نیز یہ کہ میرے پاس امریکا کی ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں ہیں تو

اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کی بیگم کا ذکرِ خیر ہے۔ زندگی کے لیل و نہار میں انھوں نے اپنے شریکِ حیات کا ہر قدم بھرپور ساتھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ اُردو ڈائجسٹ میں چھپنے کے مراحل میں تھا جب یہ افسوسناک خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ بشریٰ دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ڈاکٹر صاحب اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

انھوں نے اپنی آدھی پنشن کے یکمشت ملنے والے معاوضے سے مجھے ٹکٹ خریدنے کے لیے رقم فراہم کی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اپنے والد کی جگہ ہوتا تو شاید یہ کام نہ کر پاتا کہ ایک ہی بیٹا برسرِ روزگار ہوا اور وہ بھی دو سال کے لیے امریکا جا رہا۔ چار میں سے صرف دو بیٹیوں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ سات بچوں کی تعلیم اور دو بیٹیوں کی شادی کے فرض سے ابھی سبکدوش ہونا باقی تھا۔

اگست 1959ء کے اواخر میں جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھا امریکا جا رہا تھا تو مجھے 1958ء کے اوائل میں پانی کے جہاز کے عرشے والا وہ شخص یاد آیا جس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈیڑھ سال بعد تم تعلیم کے لیے بیرونی سفر پر جاؤ گے۔

ایم ایس سی کرنے کے بعد جب 1961ء میں واپسی ہوئی تو میری ترقی ٹاؤن پلاننگ کے شعبے میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئی اور کچھ ہی عرصہ بعد مجھے لاہور ماسٹر پلان پروجیکٹ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔

1967ء میں لاہور کا ماسٹر پلان ختم کرنے کے بعد مجھے اور میرے افسر مظہر منیر کو حکومتِ ہالینڈ کی طرف سے ہالینڈ کی زمینی اور ماحولیاتی منصوبہ بندی، اداروں اور ''قانون کا مطالعہ کرنے دعوت نامہ ملا۔ یہ تین مہینے کا دورہ تھا۔ اس پر مظہر منیر صاحب اور میں شروع میں اکیلے ہی گئے، لیکن بعد میں مظہر منیر صاحب نے اپنی بیگم اور میں نے اپنی بیوی اور

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ڈیڑھ سالہ بیٹی کو ہالینڈ بلا لیا۔ ہماری رہائش کا انتظام، ہالینڈ کے دارالحکومت ہیگ میں کیا گیا۔

ہیگ اپنے بے حد صاف ستھرے ساحل پر سمندر، ٹیولپ کے پھولوں اور سرسبز جنگلات کی خوش نمائی کے لیے مشہور ہے۔ ہالینڈ کا دارالحکومت ہونے کے باوجود یہ چھوٹا سا شہر اور یورپ کے سب سے بڑے گاؤں کی عرفیت سے مشہور ہے۔ یہاں دنیا کے ملکوں کی ایمبیسیوں کے دفاتر اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس واقع ہیں۔

ہالینڈ کے لوگ اپنی کنجوسی، خوش مزاجی اور نفاست پسندی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مہمان کی حیثیت سے ہماری بہت خاطر مدارت کی گئی۔ اگرچہ کھانے کو ڈبل روٹی اور ہالینڈ کا پنیر ہی ملا۔ کنجوسی کے باوجود، ہالینڈ میں جو چیزیں باافراط دستیاب ہیں، وہ وہاں کی تندو تیز ہوا، پنیر اور ماحول کی تروتازگی ہے۔

ہمیں ہالینڈ کے بارہ صوبوں کا دورہ اور وہاں کے علاقائی نشوونما کے دفاتر میں کام کرنے والے ماہرین سے متعارف کرایا گیا اور ان کے بنائے ہوئے نقشے دکھائے گئے۔ ایک صوبے کے ڈائریکٹر پلاننگ نے ہمیں پیغام بھجوایا کہ آپ کے دوپہر کے کھانے کا انتظام میں نے اپنے گھر پر کیا ہے آپ کھانا کھا کر نہ آئیے گا۔ اس دن مظہر صاحب، میں اور ہماری بیگمات نے صبح کا ناشتہ بہت ہلکا کیا، تاکہ ڈائریکٹر صاحب کے گھر دوپہر کے کھانے کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ جب ہم اُن کے گھر پہنچے تو انھوں نے بتایا کہ میں نے آپ کے کھانے کا اہتمام اپنے لان میں کیا ہے۔ لان میں گئے تو ایک میز پر بہت خوبصورت میز پوش بچھا ہوا تھا اور اس پر کئی قسم کی ڈبل روٹیاں اور پنیر رکھے ہوئے تھے!

مظہر منیر صاحب تو بہت جلد ہالینڈ کی ڈبل روٹی، پنیر کے سینڈوچوں اور کاٹنے والی تیز و تند سرد ہواؤں سے تنگ آ گئے۔

انھیں اپنی لاہور والی محفلیں اور پُرستائش زندگی کی یاد ستانے لگی۔ انھوں نے ایک ماہ بعد ہی یہ کہہ کر، کہ میں نے ہالینڈ کی زمینی منصوبہ بندی کے نقشوں، اداروں اور قانون کا سیر حاصل مطالعہ کر لیا ہے، لاہور واپسی کا پروگرام بنا لیا لیکن میرا ہیگ کے صاف ستھرے ساحل سمندر، رنگ برنگے ٹیولپ کے پھولوں، پُرسکون جنگلات سے گھری ہوئی جھیلوں میں تیرتے ہوئے راج ہنسوں کے فرحت آمیز مناظر چھوڑ کر جانے کا دل نہ چاہا۔ اس لیے میں نے مظہر صاحب سے ہالینڈ میں مزید رہنے کی اجازت چاہی جو انھوں نے بخوبی دے دی اور کہا کہ تم دورے کی مفصل رپورٹ، جو گورنمنٹ کو اس دورے کے بعد دینی تھی، یہاں ہالینڈ میں ہی لکھ لینا۔ مظہر

WAQAR www.pakistanipoint.com

صاحب کے جانے کے بعد میں نے اپنا زیادہ تر وقت، ہیگ میں انسٹیٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز (Institute of Social Studies) میں ریجنل پلاننگ کی کتابیں پڑھنے اور رپورٹ لکھنے میں گزارا۔

تقریباً دو ماہ قیام کے بعد ایک دن مجھے ایک بہت خوشگوار سرپرائز ملا۔ یہ ایسٹ ویسٹ سنٹر (East-West Center) ہونولولو، ہوائی سے آیا خط تھا، جس میں مجھے انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ فیلوشپ کی پیشکش تھی۔

اس فیلوشپ کے لیے میں نے کچھ عرصہ پہلے ایک تیر داغا تھا، جو غیر متوقع طور پر نشانے پر لگ گیا۔ اس فیلوشپ میں پاکستان سے یونیورسٹی آف ہوائی ہونولولو میں ایک ماہ کے لیے ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے بعد امریکا کی کسی بھی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے فیسوں اور رہنے کا خرچ اور پاکستان آنے جانے کا ٹکٹ شامل تھا۔

میں تو یہ بھی بھول چکا تھا کہ کب میں نے اس فیلوشپ کے لیے درخواست دی تھی۔ ایسٹ ویسٹ سنٹر کے خط کے بعد میری زندگی کا مطمح نظر یکلخت بدل گیا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اس فیلوشپ کی پیشکش سے مستفید ہونا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گورنمنٹ سے چھٹی کیسے لی جائے؟

اس مقصد کے لیے میں ہیگ میں مقیم پاکستانی سفارتکار سے ملا اور انھیں بتایا کہ مجھے انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ فیلوشپ کی پیشکش ہوئی ہے۔ یہ کافی بڑا اعزاز ہے۔ اس کے لیے بین الاقوامی سطح پر لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے اور مجھے اس سلسلہ میں آپ کی مدد درکار ہے۔ اگر آپ میری چھٹی کی منظوری کے لیے پنجاب کے وزیر برائے ٹاؤن پلاننگ اور لوکل گورنمنٹ کو ایک شفارشی خط لکھ سکیں تو میں آپ کا بے حد مشکور ہوں گا۔

سفارت کار صاحب بے حد خوش اخلاقی سے پیش آئے اور انھوں نے متعلقہ وزیر کو پُرزور سفارشی خط لکھ دیا۔ پاکستان میں میرے ایک دوست نے مجھے اطلاع دی کہ متعلقہ وزیر نے میرے کیس پر لکھا ہے کہ انیس الرحمٰن کو ایمبیسڈر کی سفارش کے مطابق پاکستان سے باہر کی چھٹی (Leave Ex-Pakistan) دے دی جائے۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے امریکا کی یونیورسٹی آف وسکونسن میں پی ایچ ڈی کے داخلے کا انتظام کیا اور داخلہ اور ایسٹ ویسٹ کے وظیفہ کی بنیاد پر پاسپورٹ پر امریکا کے ویزے لگوائے اور ایسٹ ویسٹ سنٹر نے اپنا ٹکٹ پاکستان کے بجائے ہالینڈ سے ہوائی اور وسکونسن کے لیے منگوا لیا اور اپنی بیوی بشریٰ اور بیٹی کسریٰ کو اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر خالد حمید کے پاس، ہیلی فیکس (Halifax) کینیڈا میں چھوڑتا ہوا یونیورسٹی آف ہوائی، ہونولولو پہنچ گیا جہاں مجھے نشوونما (Development) کے موضوع پر ایک ماہ کے سیمینار میں شرکت کرنا تھی اور اس کے بعد یونیورسٹی آف وسکونسن میں پی ایچ ڈی کے کورسز کے لیے رجسٹر ہونا تھا لیکن ابھی میں اس سیمینار میں شرکت کر رہا تھا کہ میرے امریکا میں رہتے ہوئے پتا پر گورنمنٹ کا خط ملا کہ تمہاری چھٹی نامنظور کر دی گئی ہے اور تم فوراً پاکستان واپس آؤ۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ چیف سیکریٹری نے متعلقہ وزیر کے سفارشی خط پر یہ ریمارکس لکھ کر چھٹی نامنظور کر دی کہ ہمیں محکمہ کے لیے پی ایچ ڈی کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں ذہنی طور پر پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، اس لیے میں نے گورنمنٹ کو ایک التجائی خط ارسال کیا اور سیمینار کے بعد وکونسن میں پی ایچ ڈی کے مضامین میں رجسٹر ہو گیا۔ بشریٰ بھی اپنے بھائی کے پاس سے کسریٰ کے ساتھ وسکونسن آ گئیں۔ میں کیونکہ وزیٹرز ایکسچینج ویزا (Visitor Exchange Visa) پر تھا اس لیے مجھے پڑھائی کے علاوہ، کام کرنے کی اجازت نہ تھی، لیکن بشریٰ کو کام کرنے کی اجازت تھی۔ اُس نے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ وہ ایتھنز میں ڈوکس آئی ڈیز (Doxides) کی شاگرد رہی تھیں، جس نے اسلام آباد کی پلاننگ کی تھی۔ بشریٰ کو وسکونسن

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

کوسٹیٹ کے پلاننگ کے محکمہ میں نوکری ملنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ صبح کسریٰ کو بیبی سٹر (Baby Sitter) کے پاس چھوڑتی ہوئی دفتر جاتی تھیں اور شام کو دفتر سے واپسی پر کسریٰ کو لیتی ہوئی گھر واپس آتی تھیں۔

پہلا سمسٹر، چھٹی کی نامنظوری اور اس پر اپیلوں اور آر جار میں گزر گیا۔ میں پی ایچ ڈی کا تہیہ کیے ہوئے تھا اور محکمہ واپس بلانے پر مصر تھا۔ خاصی ذہنی کھچاؤ کی کیفیت تھی۔ حسرت موہانی کی طرح ’ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی‘، والا معاملہ تھا۔ اسی کشمکش میں پہلا سمسٹر تمام ہوا اور میں نے دوسرے سمسٹر کے لیے بھی اپنے آپ کو رجسٹر کر لیا۔ جب گورنمنٹ کا اصرار بہت زیادہ بڑھا تو میں نے اپنا استعفیٰ لکھ کر گورنمنٹ کو بھیج دیا جو نامنظور ہو گیا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ بشریٰ کی بیماری کا سرٹیفکیٹ بھیج کر واپس نہ آنے کا عذر پیش کروں۔ بشریٰ کو الرجی (Allergy) کا عارضہ ہے۔ اس کے لیے میں نے بشریٰ کے بھائی سے، جو امریکا میں ڈاکٹر تھے، میڈیکل سرٹیفکیٹ لے کر گورنمنٹ کو ارسال کر دیا۔ اس طرح کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ پھر گورنمنٹ نے پاکستانی سفارتخانے کو خط لکھا کہ انیس الرحمٰن اور ان کی بیوی کی انکوائری کی جائے کہ کیا واقعی ان کی بیوی بیمار ہیں؟ اور یہ کہ ان کی بیوی امریکا میں نوکری تو نہیں کر رہیں؟

یہ خط جب بشریٰ کے بھائی کے علم میں آیا تو انھوں نے کہا کہ اب میں مزید میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں دوں گا ورنہ مجھ پر الزام آئے گا کہ بھائی اپنی بہن کو سرٹیفکیٹ دیتا رہا ہے۔ عجیب تناؤ کا عالم تھا۔ ایک طرف بشریٰ کے بھائی نے مزید سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری طرف پاکستان ایمبیسی کو حکم آ گیا تھا کہ اگر بشریٰ بیمار نہیں ہیں تو انیس الرحمٰن کا پاسپورٹ محدود کر کے ان کو پاکستان روانہ کر دیا جائے۔ تیسری طرف محمود علی قصوری نے جو پاکستان کے چوٹی کے بیرسٹر اور میری خالہ زاد بہن کے شوہر تھے، پیغام بھجوایا کہ انیس تم اپنی پی ایچ ڈی کی پڑھائی جاری رکھو، میں دیکھتا ہوں گورنمنٹ تمھیں زبردستی کیسے پاکستان بلواتی ہے۔

ان حالات میں، میں نے دو اقدامات کیے۔ ایک تو بشریٰ کے بھائی کو ٹیلیفون کر کے بتایا کہ یہ سمسٹر تو بہرحال مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ سرٹیفکیٹ نہیں دیں گے تو میں یہاں کسی اور سے میڈیکل سرٹیفکیٹ کے لیے درخواست کروں گا۔ اس پر خالد بھائی نے کہا کہ انیس میاں ایسی حرکت نہ کرنا۔ یہ پاکستان نہیں کہ پیسے دے کر جتنی مدت اور جس طرح کا چاہو میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کر لو۔ میں بہرحال یونیورسٹی اسپتال کے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ اس سمسٹر کی تکمیل میں ابھی ڈھائی تین مہینے باقی ہیں اور میں یہ

مکمل کرنا چاہتا ہوں، لیکن گورنمنٹ مجھے زبردستی واپس بلا رہی ہے۔ اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے، لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟

میں نے کہا کہ میری بیوی حاملہ ہیں اور ہم لوگ فیملی میں اضافہ کی اُمید کررہے ہیں۔ یہ سن کر اس نے کہا ٹھیک ہے، میں تمہیں تین مہینے کا سرٹیفکیٹ دے دوں گا اور اس نے سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ بشریٰ میری مریضہ ہیں اور حمل کی پیچیدگی کی وجہ سے وہ تین ماہ تک سفر نہیں کرسکتیں۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے کینیڈا کی شہریت اور وہاں ملازمت کے لیے بھی درخواست بھیج دی اور وہ دونوں مجھے مل گئی تھیں۔ خیال تھا کہ اگر نوبت پاسپورٹ کو محدود کرنے اور مجھے زبردستی پاکستان بھیجنے تک پہنچی تو کینیڈا ہجرت کر کے پاکستانی پاسپورٹ بطور تحفہ حکومت کو بھیج دوں گا اور میں نے یہی کیا۔ سمسٹر ختم ہوتے ہی ٹورنٹو کا سرٹیفکیٹ اور بشریٰ اور کسریٰ کے ساتھ کینیڈا جانے کی تیاری شروع کردی۔

کینیڈا جانے سے پہلے مجھے اپنے والد کا خط ملا۔ انھوں نے مجھے پاکستان واپس آنے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنے والد کی بات ٹالنے کی میری مجال نہ تھی۔ بشریٰ نے بھی میرا ساتھ دیا اور ہم نے وطن لوٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب ہم ٹورنٹو کے ہوائی اڈے پر اُترے تو امیگریشن آفسر نے پوچھا کہ کینیڈا میں کہاں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں دو، تین روز ٹورنٹو میں قیام کے بعد پاکستان واپس جارہا۔ وہ اپنے افسر کے پاس یہ بتانے گیا کہ ایک امیگرینٹ، ٹورنٹو میں محض دو تین دن قیام کے بعد پاکستان جارہا ہے تو اس نے کہا یہ اس کی مرضی ہے، لیکن کیونکہ اس کے پاس امیگریشن ویزا ہے، اس لیے تمہیں اس کے پاسپورٹ پر ہجرت کی مہر لگانی ہوگی۔

میرے پرانے پاسپورٹ پر Landed Immigrant کی مہر مجھے آج تک عہد رفتہ کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

پاکستان واپس پہنچنے کے بعد 1968ء میں میری تقرری بطور ڈائریکٹر ٹاؤن پلاننگ پشاور ریجن کردی گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے خلاف ایفی شنسی رولز (Efficency & Discipline Rules) کے تحت میری انکوائری کا اجرا کردیا گیا۔ پاکستان پہنچ کر ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوچکا تھا۔ ایک طرف تو بطور ڈائریکٹر ٹاؤن پلاننگ پشاور ریجن، مجھے اپنے فرائض سرانجام دینے ہوتے۔ یہ ریجن بہت بڑا تھا۔ اس میں سابق این ڈبلیو ایف پی کا صوبہ، راولپنڈی سول ڈویژن اور دیر اسکردو، چترال اور ہنزہ کے علاقے شامل تھے۔ دوسری طرف میری انکوائری چل رہی تھی اور مجھے انکوائیر آفیسر کی پیشیاں بھگتنا پڑتی تھیں۔ تیسری طرف فیملی کا بٹوارہ ہوگیا تھا۔ میری پوسٹنگ پشاور اور بشریٰ کی لاہور میں پنجاب ہاؤسنگ ایجنسی میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوگئی تھی، چوتھے ہم لوگ فیملی میں اضافہ کی اُمید کررہے تھے، پانچویں، بشریٰ نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے نیو مسلم ٹاؤن لاہور میں گھر کی تعمیر کا کام بھی شروع کروادیا تھا۔ اگرچہ ہمارے مالی وسائل اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کے لیے بشریٰ نے امریکا میں اپنی کمائی سے لائی ہوئی مزدا کار اور ائیر کنڈیشنز بیچ دیے۔ نیو مسلم ٹاؤن لاہور میں دو کنال کا پلاٹ میرے نام لاٹری میں نکلا تھا جس کی دس فیصد قیمت میں نے اپنے جی پی فنڈ سے نکلوا کر ادا کی تھی اور ابھی نوے فیصد قیمت ادا کرنا باقی تھی۔ اگر وہ اب دے دیتے تو پھر گھر کی تعمیر شروع کرنے کے لیے پیسے نہیں بچتے تھے۔ اس لیے اس کی ادائیگی ہم نے مؤخر کردی۔

اکتوبر 1968ء میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں، ہماری دوسری بیٹی یسریٰ سے پشاور میں نوازا اور 1969ء میں میرا تبادلہ لاہور بطور ڈائریکٹر ٹاؤن پلاننگ پنجاب کردیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بیٹے مونس سے نوازا۔ لاہور میں گورنمنٹ نے مسلم ٹاؤن میں ایک کوٹھی میرے لیے حاصل کرلی تھی! اس سے گھر کی تعمیر کی نگرانی میں آسانی ہوگئی لیکن گھر کی تعمیر شیطان

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

کی آنت کی طرح لمبی ہوگئی۔ بنیادی وجہ پیسوں کی کمی تھی۔ گھر کی تعمیر کے لیے میں نے گورنمنٹ سے گھر بنانے (House Building) اور کار خریدنے کے ایڈوانس منظور کرائے۔ اس کے علاوہ ذاتی قرضے بھی تھے۔ میری تنخواہ کا اچھا خاصہ حصہ قرضے کی ادائیگی کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ وہ میری زندگی کے شدید ترین بحران کا زمانہ تھا۔ میرے پاس اپنی کار میں پٹرول ڈالنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے اور میں نے دفتر جانے کے لیے سائیکل خرید لی تھی۔

اس مالی بحران سے نکلنے کی مجھے ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ پاکستان سے باہر جا کر نوکری کر کے یہ قرضے اُتار دوں۔ اس کے لیے میں نے سعودی عرب میں وزارت منصوبہ بندی میں ایک درخواست بھی بھیج دی تھی۔ اسی کشمکش میں 1973ء آ گیا۔ سال کے شروع میں مجھے ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے رحیم یار خان جانا پڑا۔ میں نے اپنے ایک دوست مسیح اللہ خان سے، جو پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے چیف انجینئر تھے، درخواست کی کہ وہ رحیم یار خان میں مقیم اپنے ایگزیکٹو انجینئر سے کہہ کر میرے لیے پی ڈبلیو ڈی کے ڈاک بنگلہ میں ایک کمرا مخصوص کروا دیں اور ایک کار کا انتظام کروا دیں اور یہ کہ میری بیگم بھی ساتھ ہوں گی۔

جب میں رحیم یار خان پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر ایگزیکٹو انجینئر صاحب خود مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ پی ڈبلیو ڈی کے ڈاک بنگلہ میں کوئی کمرا خالی نہیں، اس لیے میں نے آپ کے ٹھہرنے کا انتظام اپنے گھر پر کیا ہے۔

ایگزیکٹو انجینئر صاحب نے ہماری بہت خاطر مدارات کی اور ہمارے تفنن الطبع کے لیے اپنے دفتر کے اکاؤنٹنٹ شاہ صاحب کو بھی گھر پر بلایا جو ہندسوں کا زائچہ بنا کر قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ میری بیوی نے کہا میں تو ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی، غیب کا حال تو اللہ کے بعد علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔ اگرچہ میں بھی بشریٰ کی بات سے متفق تھا، لیکن میں نے سوچا، خوش وقتی کے لیے شاہ صاحب سے قسمت کا حال سننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

شاہ صاحب سے ایگزیکٹو انجینئر صاحب کے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوئی۔

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا، کیا میں آپ کو اپنی تاریخ پیدائش بتاؤں؟ اور یہ کہ مجھے خاص طور پر آپ سے اپنی زندگی کے بارے میں ایک سوال پوچھنا ہے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ مجھے آپ کی تاریخ پیدائش کی ضرورت نہیں۔ ایک تو تاریخ پیدائش صحیح نہیں ہوتی اور اگر ہو تو

پیدائش کا وقت صحیح نہیں ہوتا۔ آپ صرف اپنا پورا نام بتائیں اور کوئی سوال بھی نہ پوچھیں۔ میں اپنا حساب کتاب کر لوں تو خود آپ کو، آپ کے بارے میں بتاؤں گا۔ شاہ صاحب نے میرا زائچہ بنانے کے بعد مجھے بتایا کہ میرے حساب سے آپ اس سال کے آخر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا، شاہ صاحب! ابھی تک تو میں نے اعلیٰ تعلیم پر پاکستان سے باہر جانے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں اپنے موجودہ مالی بحران سے کب تک نکلوں گا؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ اس سال کے بعد آپ کی زندگی کے آخر تک کوئی مالی بحران نہیں دیکھ رہا! اور آپ کو پاکستان سے باہر جانے کے آثار کا اظہار کوئی چار ماہ بعد ہوگا۔

میں نے شاہ صاحب کی باتیں غیر یقینی سے سنیں اور یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ یہ جنوری 1973ء کا واقعہ ہے۔ اسی سال عید میلادالنبیؐ کے دن میں نے بڑی عقیدت سے کچھ عرضیاں ملازمت کے لیے سعودی عرب کے مختلف محکموں کو لکھیں اور خود جا کر انھیں جنرل پوسٹ آفس میں سپرد ڈاک کیا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ عرضیاں بھیجنے کے دو ہفتے بعد مجھے سعودی وزارت منصوبہ بندی کی طرف سے تقرری کا ایک خط موصول ہوا جس میں یہ لکھا تھا کہ اپنے مزید کوائف ارسال کریں تاکہ آپ کا ویزا پاکستان میں سعودی سفارتخانے کو بھیجا جا سکے۔ میں نے فوراً اپنے کوائف، منصوبہ بندی کو ارسال کیے اور ویزے کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران، مجھے شاہ صاحب کی پیش گوئی کے عین مطابق پروفیسر وید پرکاش کا خط موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ تمھیں ریسرچ اسسٹنٹ شپ (Research Assitantship) دے دی گئی ہے تاکہ تم واپس آکر اپنی پی ایچ ڈی مکمل کر سکو۔

اگرچہ پروفیسر وید پرکاش کا خط بے حد خوش آئند اور غیر متوقع تھا لیکن ان دنوں میں سعودی عرب جانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا، تاکہ ایک آدھ سال کام کر کے اپنے قرضے اُتار دوں اور اس کے بعد امریکا جا کر اپنی پی ایچ ڈی مکمل کروں۔ اس لیے میں نے پروفیسر وید پرکاش کو خط لکھ کر درخواست کی کہ اگر یہ ریسرچ اسسٹنٹ شپ ایک سال کے لیے ملتوی کر دی جائے تو میں بے حد مشکور ہوں گا۔ ان کا فوری جواب دو لفظی حکم نامہ بذریعہ تار موصول ہوا: ”منظوری کی اطلاع بذریعہ تار دو (Wire Acceptance)“۔

میں عجب شش و پنج کے عالم میں تھا۔ ایک طرف پروفیسر وید پرکاش کا اصرار اور دوسری طرف سعودی عرب کی طرف سے مکمل خاموشی۔

پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ شاید یہ نوکری کی پیشکش تو اس لیے ہوگی کہ میں نے اللہ سبحان و تعالیٰ کو اس کے حبیب کا واسطہ دے کر عرضی بھیجی تھی، لیکن اس میں شاید میری بہتری نہیں ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہٰ کی آیت 216 میں درج ہے کہ ”عجب نہیں کہ ایک بات تم کو بھلی لگے اور تمہارے لیے مضر ہو اور ایک چیز تم کو بری لگے، وہ تمہارے حق میں بہتر ہو! خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے!“ اور یہ بھی اگر پی ایچ ڈی کی یہ پیشکش ہاتھ سے نکل گئی تو نامعلوم پھر موقع ملے نہ ملے۔ میں نے وید پرکاش کو منظوری کا تار ارسال کر دیا۔

یہ تار بھیجنے کے بعد میرے مستقبل کا منظر نامہ یکلخت بدل گیا۔ اب میرے سامنے دو سال تھے۔ امریکا جانے کے لیے چھٹی کی منظوری اور امریکا جانے کے لیے کرائے کا بندوبست۔ خوش قسمتی سے اس وقت کے سیکریٹری بہت علم دوست قسم کے انسان تھے، اس لیے مجھے پاکستان سے باہر جانے کے لیے دو سال کی چھٹی ملنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ مجھے ایک سال کی پوری تنخواہ، چھ ماہ کی آدھی تنخواہ اور چھ ماہ کی بغیر تنخواہ کی چھٹی کی منظوری مل گئی۔

اب میرا دوسرا مسئلہ امریکا جانے کے کرایہ کا تھا۔ اس کے لیے میں نے 1962ء ماڈل کی فوکس ویگن کار ”برائے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

فروخت'' کا اشتہار لگا کر اپنے دفتر کے باہر کھڑی کر دی۔

1973ء تک پہنچتے تک اس کے تمام حصے ماسوائے ہارن، بولنے لگے تھے۔ اس کا انجن اسٹارٹ کرنے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ لاہور مال روڈ پر جب ٹریفک کانسٹیبل مجھے کار روکنے کا اشارہ کرتا تھا تو کار رکنے سے اس کا انجن بھی بند ہو جایا کرتا اور جب کانسٹیبل مجھے چلنے کا اشارہ کرتا تھا تو مجھے اُسی سے کار کو دھکا دے کر اسٹارٹ کروانے کی درخواست کرنی پڑتی۔

میری کار پر برائے فروخت کا اشتہار دیکھ کر کئی لوگ اسے دیکھنے آئے۔ میرا ڈرائیور جسے یہ کار اسٹارٹ کرنے کا طریقہ آتا تھا، ان ممکنہ خریداروں کو کار میں بٹھا کر دفتر کے چاروں طرف چکر لگا کر دکھاتا تھا۔ اس کار کی قیمت میں نے پانچ ہزار روپے مقرر کی تھی۔ کار پر برائے فروخت کا اشتہار لگانے کے چند روز بعد میرا ڈرائیور دو لوگوں کے ساتھ میرے دفتر آیا اور بتایا کہ میں نے ان کو آپ کی کار چلا کر دکھا دی ہے۔ یہ لوگ اسے خریدنے کے لیے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، دیکھیے ناجی یہ سیکنڈ ہینڈ کار ہے۔ اس کی قیمت کچھ اور کم ہونی چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کو کس نے بتایا کہ یہ سیکنڈ ہینڈ کار ہے؟ یہ تو فرسٹ ہینڈ کار ہے۔ سیکنڈ ہینڈ یہ تب ہو گی جب آپ اسے خریدیں گے۔ بہرحال انھوں نے میری کار خرید لی۔ اس کے کچھ روز بعد میرے ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ آپ کی گاڑی گھوسیوں نے خریدی ہے۔ وہ مجھے بھاٹی دروازے کے باہر اسے دھکا لگاتے ہوئے ملے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ تم دودھ میں پانی ملا کر بیچتے ہو۔ اب دودھ کی کمائی تم کھاؤ گے اور پانی کی کمائی یہ گاڑی کھائے گی۔

پاکستان سے امریکا جاتے وقت مجھے اسٹیٹ بینک کی عائد کردہ پابندی کی وجہ سے صرف 135 ڈالر ساتھ لے جانے کی اجازت ملی۔ اس لیے میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو، جو کینیڈا کی شہریت اختیار کر چکے تھے، لکھا کہ وہ دو سو ڈالر کا چیک پروفیسر وید پرکاش کے پتہ پر ارسال کر دیں۔ امریکا پہنچ کر، میں نے پروفیسر وید پرکاش سے پوچھا کہ ان کے پاس میرے بھائی کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی چیک تو موصول نہیں ہوا؟ انھوں نے فوراً اپنی چیک بک نکال کر مجھ سے پوچھا کتنے ڈالر چاہئیں؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے ڈالر نہیں چاہئیں۔ شاید میرا بھائی آپ کے پتے پر میرے لیے کچھ ڈالر بھیجے گا۔ انھوں نے کہا: ''میں اس شرط پر یہ چیک بک اپنی جیب میں رکھ رہا ہوں کہ جب بھی تمھیں ڈالر چاہیے ہوں تو مجھ سے لے لو گے اور تم ڈیپارٹمنٹ کی ریسرچ پر کم اور اپنی پی ایچ ڈی کے کورسوں پر زیادہ وقت صرف کرنا۔

مجھے پی ایچ ڈی کے کورس اور ریسرچ پر دو سال لگے۔ اس کے بعد پروفیسر وید پرکاش کی سفارش پر مجھے یونیورسٹی آف وسکونسن کے گرین بے (Green Bay) کیمپس میں اسسٹنٹ پروفیسر کی کل وقتی جگہ مل گئی۔ بشریٰ، تین بچوں کے ساتھ میرے امریکا آنے کے ایک سال بعد آ گئیں تھیں۔ ان کے اور تینوں بچوں کے امریکا آنے کے لیے ٹکٹوں کے پیسے بشریٰ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد حمید نے امریکا سے بھجوائے تھے جو انھوں نے بعد میں اپنی امریکا کی کمائی سے واپس کر دیے۔ طالب علم کی بیوی ہونے کی وجہ سے بشریٰ کو F-2 ویزا ملا تھا اور ان کو کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے ان کو بچوں کی نگہداشت (Baby Sitting) کا کام کرنا پڑا اور مجھے لڑکیوں کے ہاسٹلز میں رات کے محافظ کے طور پر کام کر کے گھر کا خرچ پورا کرنا پڑتا۔ جب گرین بے کیمپس پر میں نے پڑھانا شروع کیا اس وقت تک ہمیں گرین کارڈ مل چکا تھا جس کے لیے ہمیں بشریٰ کے چھوٹے بھائی ماجد حمید نے سپانسر کیا تھا اور بشریٰ کو بھی وسکونسن کے سوشل ویلفیئر کے محکمہ میں ڈائریکٹر آف پلاننگ کی جگہ مل گئی تھی۔

گرین بے، ریاست وسکونسن کے شمال میں واقع ہے۔ وہاں بے تحاشا سردی پڑتی ہے۔ میری یونیورسٹی کی تمام عمارتیں، زیر زمین سرنگوں کے ذریعے ملی ہوئی تھیں اور

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

سردیوں میں اگر باہر جانا پڑے تو ناک پر ہاتھ لگا کر محسوس کرنا پڑتا تھا کہ ناک قائم ہے یا غائب ہوگئی ہے!

گرین بے میں، میں نے تین سال پڑھایا۔ آخری سال کے دوران پروفیسر وید پرکاش نے مجھے اطلاع دی کہ وہ میرا نام اقوام المتحدہ میں سعودی عرب کے لیے مشیر برائے شہری اور علاقائی منصوبہ بندی کے طور پر تجویز کر آئے ہیں۔ نتیجتاً مجھے سعودی عرب میں خبیر اقوام المتحدہ برائے شہری اور علاقائی منصوبہ بندی کی پیشکش ہوگئی۔ اس مرتبہ قسمت نے یاوری کی اور بغیر کسی دقت کے گورنمنٹ نے میری مزید چھٹی اور یونائیٹڈ نیشنز میں میری ڈیپوٹیشن بھی منظور کر لی۔

اور یوں پروفیسر وید پرکاش میری بے شمار مکہ اور مدینہ کی حاضریوں کا ذریعہ بنے۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے!

میرا حصولِ علم کا سفر ابھی جاری ہے۔ یہ پانچ، دس برس کی کہانی نہیں، ایک دہائی کم ایک صدی کا حصہ ہے۔ یہ سفر پنگورہ میں غیر شعوری اور غیر رسمی طور پر شروع ہوا۔ بسم اللہ کی رسم سے پی ایچ ڈی کی تکمیل تک یہ سفر شعوری اور رسمی طور پر جاری رہا، اس کے بعد اس کی نوعیت شعوری اور غیر رسمی ہوگئی۔ یہ پنگورہ سے قبر تک کا سفر ہے۔

عشق اور علم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس دارِ فانی سے رحلت کے وقت اپنی اولاد کو یہ سفر جاری رکھنے کی وصیت کر جاؤں گا کہ وہ اسے جاری رکھیں اور اس دنیا سے جاتے وقت اپنی آئندہ نسلوں کو اس سفر کو رسمی اور غیر رسمی طور پر جاری رکھنے کی تلقین کرتے جائیں۔

رسمی تعلیم تو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل ہوتی ہے اور غیر رسمی تعلیم کتابیں پڑھنے، پڑھانے اور کتابیں لکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ علم جس سے بھی، جہاں سے بھی اور جس قیمت پر ملے حاصل کرنا چاہیے اور اسے بانٹنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

مجھے اپنے حصولِ علم کے سفر میں یہودیوں اور ہندو پروفیسروں سے بہت استفادہ ہوا۔ انگلستان میں جرمن نژاد یہودی سے فیضِ علم ہوا۔ یونیورسٹی آف الی نوائے میں اویکن نژاد یہودی سے فیض یاب ہوا اور یونیورسٹی آف وسکونسن میں روسی نژاد یہودی اور ہندو پروفیسر دماغ کی کشادگی کا موجب بنے۔ میں اٹھتے، بیٹھتے ان پروفیسروں، خاص طور پر پروفیسر وید پرکاش کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے بلالحاظ مذہب و ملت علم کی دولت بانٹی ہو اور حقوق العباد کی پاسداری کی ہو، انھیں اللہ سبحان و تعالیٰ کیسے دوزخ میں ڈال سکتا ہے۔

قرآنِ کریم کی سورۃ مائدہ، آیت 62 میں اللہ سبحان و تعالیٰ فرماتا ہے:۔

''جو لوگ خدا پر اور آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہ خواہ مسلمان ہوں، یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (Sabian) ان کو نہ کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے۔'' جتنی اسلامی اصولوں کی پابندی مجھے جاپان کے غیر مسلم لوگوں میں ملی ہے وہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔

جاپانی بے حد محنتی، جفاکش، صفائی پسند، ہمدرد اور راست گو ہوتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں وہ بہت ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ وہ پیدا اشنٹو مذہب کے تحت ہوتے، شادی گرجا گھر میں کرواتے اور بڑھاپے میں بدھ مت ہو جاتے ہیں۔ ان کے برعکس جتنے منافق مجھے پاکستانی مسلمانوں میں ملے وہ بھی بہت کم لوگوں میں دیکھے۔

یہاں اس بات کا اعتراف کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ میں اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے بشریٰ کا بے حد ممنون ہوں۔ انھوں نے اس ڈگری کے حصول میں بہت قربانی دی ہے۔ میری پہلی کتاب ''انجمنِ آرزو'' کی رونمائی کی تقریب کی صدارت ڈاکٹر مبشر حسن نے کی تھی (اللہ سبحان و تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے)۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ انیس کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی اصل حقدار بشریٰ ہیں۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سبق آموز کہانی

کیا وہ بے وقوف تھا؟

ایک ایسے دردمند ہنس مکھ کی کہانی جو کبھی بھلائی کا صلہ نہیں مانگتا تھا

جاوید بسام

بہت دور پہاڑوں کے دامن میں ایک ہنس مکھ چرواہا رہتا تھا۔ وہ ابھی نوعمر لڑکا ہی تھا، مگر اپنی بھیڑوں کی زبان بخوبی سمجھ لیتا تھا۔ بھیڑیں بھی اس کے اشاروں اور سیٹی کو پہچانتی تھیں۔ وہ سارا دن انھیں گھاس کے میدانوں اور پہاڑوں پر ٹہلاتا رہتا تھا۔

ایک دن جب بہت سردی تھی۔ وہ اپنی بھیڑوں کے ساتھ گاؤں کے بازار کی طرف آ نکلا۔ جہاں ایک چائے خانے کی چمنی سے نکلتے دھویں کو دیکھ کر اُس کا چائے پینے کا دل چاہا۔

چرواہے نے بھیڑیں سڑک کے کنارے ایک جگہ جمع کیں، ایک دوست سے ان کا خیال کرنے کا کہہ کر چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ وہ سیاحوں کی آمد کا موسم تھا۔ تمام میزیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ چرواہا، کاؤنٹر کے قریب رکھے اسٹولوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے ایک میز پر اکیلا آدمی بیٹھا نظر آیا۔ وہاں باقی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ اس طرف بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ آدمی نے چونک کر اسے ناگواری سے دیکھا۔ وہ شہر سے آیا تھا اور ایک امیر بیوپاری تھا۔

”کیا آپ کو میرا یہاں بیٹھنا برا لگا ہے؟“ چرواہے نے مسکراتے ہوئے پوچھا ”ہاں، تمھیں وہاں بیٹھنا چاہیے۔“ بیوپاری، کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رعب سے بولا۔

اسی وقت ویٹر چائے اور بسکٹ وغیرہ لے آیا اور بیوپاری کے آگے رکھنے لگا۔ چرواہے نے چٹکی بجائی اور بولا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کہیں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسٹول پر جا بیٹھا۔

وہاں ایک گھسیارا پہلے سے بیٹھا تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ چرواہا بلند آواز میں بول رہا تھا۔ جیسے بیوپاری کو اپنی بات سنانا چاہتا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں ایک چرواہا ہوں۔ چرواہے عام طور پر سادہ لوح اور کچھ بے وقوف سے ہوتے ہیں، عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ ہم بھی اپنی بھیڑوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سے ہی کچھ سیکھتے سمجھتے رہتے ہیں۔“

اُس نے کچھ توقف کیا، پھر بولا۔ ”میں سارا دن بھیڑوں کو لے کر گھومتا رہتا ہوں مگر شام ہوتے ہی انھیں باڑے میں بند کر دیتا ہوں۔ بھیڑیں بھی بے وقوف ہوتی ہیں۔ ایک جس راستے پر چل دے باقی بھی اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں۔ لوگ اُن سے کسی عقلمندی کی امید نہیں رکھتے، لیکن میں نے اکثر یہ بات محسوس کی ہے کہ کبھی رات کو اگر بارش ہو جائے تو وہ ایک دوسرے سے بہت تعاون کرتی ہیں۔“

بیوپاری بظاہر چائے پینے میں مگن تھا، مگر اس کے کان چرواہے کی باتوں پر لگے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا باڑا تو بڑا ہے، مگر چھپر زیادہ بڑا نہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو ٹھنڈ بڑھ

جاتی ہے۔ ایسے میں تمام بھیڑیں چھپر کے نیچے پناہ لیتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے جگہ بناتی ہیں اور جڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو ٹکریں نہیں مارتیں، نہ ایک دوسرے سے بھڑتیں۔" بیوپاری نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو اُس نے فوراً نظریں چرا لی۔ چرواہے نے چائے ختم کی اور سیٹی بجاتا باہر نکل گیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں کو سنبھالا اور انھیں ہانکتا ہوا پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ بیوپاری کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ پھر اس نے منہ بنایا اور چائے ختم کر کے اخبار اٹھا لیا کچھ دیر وہ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر باہر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پہاڑ کی دوسری طرف روانہ ہو گیا۔

تیز ہوا درختوں میں سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ بیوپاری، کچی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ راستا پتلا اور خراب تھا۔ وہ احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ اُس نے راستے پر پانی کھڑا دیکھا، شاید کوئی چشمہ پھوٹ آیا تھا۔ اُس نے گاڑی اور ہلکی کر لی۔ دھیرے دھیرے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی کہ اس نے محسوس کیا وہاں کی زمین ریتلی ہے۔ گاڑی کے پہیے زمین میں دھنس رہے تھے۔ وہ تھوڑا آگے گیا تھا کہ پہیے ریتلی کیچڑ میں پھنس گئے۔ اُس نے رفتار بڑھائی، پہیے گھومتے رہے مگر آگے نہ بڑھے۔ بیوپاری نے گہری سانس لی اور گاڑی بند کر دی پھر گردن باہر نکال کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر گاڑی میں یونہی بیٹھا رہا پھر پائینچے اوپر کیے اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس درختوں کے پتے ہوا سے ہل رہے تھے۔ بیوپاری دھیرے دھیرے چلتا گاڑی کے پیچھے آیا اور اسے دھکیلنے کی کوشش کی، لیکن یہ اُس اکیلے کے بس میں نہ تھا۔ وہ پریشانی سے سر کھجاتے ہوئے انتظار کرنے لگا کہ کوئی وہاں آ جائے تو اس سے مدد لے۔ وقت گزرتا رہا مگر کوئی نہ آیا۔ وہ سوچ رہا تھا گاؤں جا کر مدد لانی پڑے گی کہ اچانک پہاڑ پر سے بھیڑوں کی بھیں بھیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

بیوپاری نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کچھ بھیڑیں ڈھلوان پر سے اتر رہی تھیں۔ پھر سیٹی کی آواز سنائی دی اور چرواہا نظر آیا۔ وہ، وہی تھا جو چائے خانے میں اُس کی میز پر آ بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا اُدھر ہی آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ قریب آ گیا۔ پھر آواز سنائی دی۔ "کیا ہوا سر، گاڑی پھنس گئی؟"

بیوپاری نے بے بسی سے گردن ہلائی۔

چرواہا، بظاہر بے نیازی سے قریب چلا آیا اور بولا۔ "آپ غلط راستے پر آ گئے ہیں، اب یہ استعمال نہیں ہوتا، خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ پہلے پہیوں کے نیچے پتھر رکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آستینیں چڑھاتا ہوا سڑک کے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ بیوپاری نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھائے۔ جتنی دیر میں چرواہے نے تین پتھر لا کر رکھے وہ ایک ہی لا سکا۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کیا۔ چرواہے نے گہری سانسیں لیں، سینہ پھلایا اور دھکا لگانے لگا۔ اسے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گاڑی باہر آنے لگی۔ پھر چلتی ہوئی خشک زمین پر چلی گئی۔ کچھ دور جا کر بیوپاری نے گاڑی روک لی۔ وہ اترا اور چرواہے کو آواز دی جو اپنی بھیڑوں کی طرف پلٹ گیا تھا۔ وہ قریب چلا آیا۔

بیوپاری نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "بہت شکریہ، اگر تم مدد نہ کرتے تو مجھے پریشانی اٹھانی پڑتی۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ چرواہے کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری کی جھلک نظر آئی پھر وہ پہلے کی طرح لاپروا اور کھلنڈرا نظر آنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "میں نے اپنی بھیڑوں سے یہ سیکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون تو کرتی ہیں، مگر کبھی اُس کا صلہ نہیں لیتیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور آوازیں نکالتا تیزی سے بھیڑوں کی طرف چل دیا۔ اس کی آوازیں سن کر وہ بھی اس کے گرد جمع ہونے لگیں تھیں۔ بیوپاری حیرت سے کھڑا انھیں جاتا دیکھ رہا تھا۔ ●●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ادیبہ شہزاد

خواب

اس روز طبیعت ایسی بے قرار ہوئی جیسے کسی پتنگے کو اندھیر
کری میں چھوڑ دیا جائے اور وہ روشنی کی تلاش میں کبھی اِدھر کبھی
ھر منڈلاتا پھرے مگر کہیں کوئی چراغ میسر نہ ہو۔ میں بھی اس
طراب کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کئی جتن کرنے لگا۔
ل کتاب لے کر بیٹھا مگر الفاظ دل و دماغ کی راہ سے چپ
پ گزرتے چلے گئے۔ سوچا، کچھ دیر ٹی وی دیکھ لیا جائے مگر

کر ایک ہی نظم کی تشریح میں ربط اللسان ہونے سے قاصر رہا تو ممکن ہے کہ ذہن اپنی اصل پر واپس آ جائے۔ میں کسی نئے تخیلاتی سفر پر جانے کے قابل ہوسکوں اور اپنی ادھوری کتاب کی تکمیل کی منصوبہ بندی کرسکوں مگر ذہن کسی زنگ لگی دھات کی طرح جامد تھا۔

میری پریشانی میں مزید اضافہ ہوا۔ آدرش اور حقیقت کا ایسا

تضاد ہمیشہ بدنما اثرات مرتب کرتا ہے۔ میں نے خود کو مزید سیماب پا ہونے سے بچانے کے لیے کہیں باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر نگاہ ڈالی۔

اس بیس مرلہ کرائے کے مکان کا

ع و اقسام کی صورتیں عجب عجب آوازوں کے ساتھ یوں
ئی دینے لگیں گویا کوئی لشکر حملہ آور ہونے کی اطلاع دے رہا
صبح سے دوپہر ہوگئی اور میں یہی نہ سوچ سکا کہ چھٹی کا دن کس
ح بسر ہو؟

شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوئے دوسرا برس تھا۔ اس کُل
انیہ میں یہ میری پہلی چھٹی تھی جو میں نے آرام کرنے کی غرض
کی تھی۔ خیال تھا کہ ایک روز کے لیے اگر ہر جماعت میں جا

ایک ایسی لڑکی کا فسانۂ حیات جو دل کی خواہشیں ناتمام رہ جانے پر ماتم کناں تھی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

صحن رنگا رنگ پھولوں، شہتوت اور کیکر کے بڑے بڑے درختوں کی آماجگاہ تھا۔ چمکتے فرش اور درختوں کی لمبی شاخوں سے ہوتی ہوئی میری نظر آسمان پر پڑی جو سرمئی اور سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا مغرور موسم دیکھ طبیعت کچھ مچلی، جی للچایا۔ میں نے الماری سے سفید چمکتا کرتا پاجامہ نکال کر زیب تن کیا، بالوں کو ایک طرف جمایا اور چند داں بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ سوچنے لگا کہ اماں نے کیا سوچ کر مجھے شفیق چچا کی بیٹی سے شادی کرنے کی پیشکش کی۔ انھیں خوب علم تھا کہ مجھے نئے زمانے کی نئی سوچ، بڑے خواب دیکھنے والی، کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھنے والی شریک حیات کی تلاش ہے جو گھر کی چاردیواری میں قید ہو کر میاں کی جی حضوری اور بچوں کی خدمت میں ہی خود کی تکمیل خیال نہ کرے بلکہ یہ ادراک رکھتی ہو کہ عورت بھی اس دنیا کی ایک فرد ہے اور ذاتیات کے بعد اس پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ دنیا میں اپنے حصے کا انقلاب لا کر اپنے کام کے نشانات چھوڑ کر خود کو امر کرے۔

پچھلے ماہ جب گھر گیا تو پری سے مل کر بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ روایتی خیالات کی حامل عام سی لڑکی تھی جس نے خیالوں کی دنیا بسا رکھی تھی۔ اس نے ترازو کے ایک پلڑے میں مجھے اور دوسرے میں کسی تصوراتی شخصیت کو رکھا ہوا تھا۔ ایسی شخصیت جس میں ایک بھی نقص نہ تھا۔ اس کے نزدیک دونوں پلڑے برابر تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں بادلوں بھرے آسمان تلے جب اس کے گھر کے چھت پر کھڑے میں نے اس سے سوال کیا:

"آپ کا سب سے بڑا خواب کیا ہے؟" گلابی لباس میں ملبوس معصوم سی صورت کی حامل پری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"خواب......؟ میں نے تو کبھی بڑے خواب دیکھے ہی نہیں جی۔ میں تو بس کسی عام سی لڑکی کی طرح اپنے مجازی خدا کے خوابوں کی تکمیل میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں بڑے خواب نہیں دیکھتی مگر بڑے خواب دیکھنے والا ساتھی ضرور چاہتی ہوں۔ جب اس کے خواب پورے ہو جائیں گے تو سمجھوں گ کہ میرے خواب بھی پورے ہو گئے۔"

اس دوران اس نے ایک بار بھی مجھ سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس دور میں ایسی سادہ لوح لڑکی کا ایسا رویہ میرے باعثِ تعجب تھا۔ وہ تو شاید مجھے اپنا صنم مان کر خود کو برہمن سمجھنے غلطی کر بیٹھی تھی مگر مجھے ایسی اللہ میاں کی گائے کے ساتھ گزا کرنے کا خیال قدرے ناگوار گزرا۔ ذہن میں ایک کے بعد د خوفناک خیال آنے لگا۔ کبھی وہ شرماتی ہوئی میری ڈانٹ ڈپ سن رہی تو کبھی مجھ سے اپنے آنسو چھپانے لگتی۔ کبھی میرے کھانا بناتے ہوئے گنگناتی دکھائی دیتی۔ ایسی شریکِ حیات میرے خیالات میں دور دور تک گزر تھا نہ خواہش۔

میں نے فوراً اُسے ذہن سے جھٹکا اور گھر پہنچتے ہی انکار نوید سنا ڈالی۔ اماں نے پریشان ہو کر مجھے سمجھانا شروع کر دیا اچھی طرح سوچ بچار کرنے کو کہا۔ انھوں نے سمجھایا کہ ج اگلے ماہ اسلام آباد سے آؤ تو اُس وقت اپنا آخری فیصلہ سنا اب مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ میں اپنا فیصلہ بدلنے کی سعی کرتا رہا دل راضی نہ ہوا۔ جوتا پہنتے پہنتے آخری خیال یہی آیا کہ اس اماں کو صاف انکار کر دوں گا۔

بھئی دنیا میں لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے کوئی نہ کوئی تو ضرور گی جو میرے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو گی۔ ان خیالات بعد میں پھر سے پتنگا بن گیا۔ پھڑ پھڑاتا پتنگا، جو اُجالے کی تل میں اندھیرے پر دھاوا بول چکا تھا۔ برآئے نام تیاری کے اپنی سترسی سی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بادلوں بھرے آس تلے کھلی سڑکوں پر بلاوجہ گھومنے لگا۔

ستمبر کے مہینے میں ایسی ٹھنڈی ہوائیں قدرے فرح بخش ثابت ہو رہی تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت کے میں ایک بڑے سے شاندار شاپنگ سنٹر پر رکا۔ خریداری کا ذ تو ہرگز نہ تھا مگر آتے جاتے لوگوں کو دیکھنا اور ان کے چہر پڑھنا ہمیشہ سے ہی بھایا کرتا۔ ایسے میں محض میرا ذہن میر

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہمراہ ہوتا، وہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی کرتے، خود کو منوانے کی جدوجہد کرتے، کسی کو نیچا دکھانے کی، کسی کو سر پہ اُٹھانے کی کوشش جاری تھی۔ ایک بے نام سا سفر جاری تھا۔

یوں لگتا کہ سب ایک ہی منزل کے مسافر تھے مگر یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کی منزل کسی اور کی بھی منزل ہے۔ ہر ایک کو لگ رہا تھا کہ وہ منفرد ہے۔ اس سینکڑوں کے مجمع میں کوئی اس جیسا نہیں کوئی اس کا ہم سفر نہیں بلکہ سب کا راستہ جدا جدا ۔ یہ ادراک بیک وقت صحیح بھی تھا اور غلط بھی۔ کیوں؟ یہی سوچتے سوچتے میں دوسرے فلور پر گھومنے لگا۔ اسی دوران میری نظر چند قدم دور دائیں رُخ کھڑی لڑکی پر پڑی۔ وہ سرخ ساڑی میں ملبوس نازک سی حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک بجھنے کے قریب پھڑ پھڑاتی لو والا چراغ جو اپنے خاتمے سے محض ایک پھونک کی دُوری پر تھا۔ یہاں ہلکی سی ہوا چلی اور وہاں وہ اپنا وجود کھو بیٹھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا جو پہلی ملاقات میں ہی میرے ذہن پر ثبت ہو چکی تھی۔ آج دوسری بار دیکھنے پر کیونکر بھولی ہو گی؟

میں مضمحل قدم اُٹھاتا اس کے قریب پہنچا۔ اُلجھتے تاثرات لیے آخر بول ہی پڑا۔

”آپ وہی ہیں نا؟“

”جی؟ مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“ وہ مڑی۔ سیاہ بالوں کو بڑی سختی سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ ایک بھی بال اپنی مرضی سے جھولنے کے قابل نہ تھا۔ غور کرنے پر ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا بالوں کو جبراً خاموش کر کے قید کیا گیا ہو۔ ایسی قید کہ انھیں کراہنے تک کی بھی اجازت نہ تھی۔

”آپ قیصرہ جبیں ہیں شاعرہ؟“ میں نے تجسس آمیز لہجہ اپنایا:

”جی میں قیصرہ جبیں ہی ہوں مگر شاعرہ نہیں ہوں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بالوں کے بعد میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی۔ یہ جملہ کہتے ہی ان میں نمی بھر آئی تھی۔ جسے وہ خود سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”میں نے دو سال قبل آپ کو ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ وہاں آپ نے ایک قدرے باغیانہ سی نظم پڑھی تھی۔ جس کا عنوان تو مجھے یاد نہیں مگر خواتین کی خوب نمائندگی کی آپ نے۔ اس کے بعد آپ کو کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ کیا اب آپ شاعری نہیں کرتیں؟“

میں نے ربط سے ایک کے بعد ایک لفظ کہا۔ اس دوران اس کے چہرے پر کئی تاثرات آئے اور گئے مگر ہر تاثر کہیں نہ کہیں پشیمانی سے جا ملتا تھا۔

”میں نے کہا نا آپ سے، میں شاعرہ نہیں۔ کسی مشاعرے میں گئی اور نہ ہی آپ سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی۔“ اس نے بظاہر اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ مجھے دو سال پہلے کا وہ دن یاد آ گیا جب مشاعرے کے بعد میں نے بمشکل اس خوبرو 'انقلابی' شاعرہ سے ملاقات کرنے کی راہ ہموار کی تھی۔ دو منٹ کی ملاقات میں اس نے میرے تعریفی کلمات کے جواب میں بس اتنا کہا تھا، ”کبھی کسی کے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ مت بنیئے گا۔ ممکن ہو تو راستے کے پتھر ہٹا دیجیے گا اور اگر نہ کر سکیں تو کم از کم مزید پتھر نہ پھینکیے گا۔ بہت شکریہ۔“

”مختصر سا کلام مگر بلا کی تاثیر لیے ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد میری نظروں میں عورت کا مقام مزید معتبر ہو گیا تھا۔ میں اسے نہیں بھول سکتا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟ مجھے غلط فہمی کیونکر ہو سکتی تھی؟

”مجھے یاد ہے میں نے آپ سے ہی ملاقات کی تھی۔ میں نے آپ کی شاعری تلاش کرنے کی بھی کافی کوشش کی مگر اس ایک مشاعرے کے علاوہ کبھی آپ کی شاعری کہیں سُنی نہ پڑھی۔ بہت خوب کلام تھا آپ کا۔“

”آپ بس بھی کیجیے۔“ اس نے ہاتھ اُٹھا کر غصے کا اظہار

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کیا۔ یوں لگا جیسے میرا ایک ایک لفظ آگ میں ایندھن کا کام دے رہا ہو۔ آواز میں ایسی دہشت تھی کہ میں پل بھر کے لیے گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ غور کرنے پر اس کی آنکھ سے ٹپکتا آنسو بھی واضح ہوا جسے اس نے فوراً ہی صاف کر لیا۔ میں حیران ہوا کہ ایسا بھی کیا ہو گیا کہ اس کی آنکھ سے آنسو ہی نکل پڑے؟ کیا میری باتیں اتنی ناگوار گزریں؟ مگر میں نے تو کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، عقب سے ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس تھا۔ بال بڑھے ہوئے اور ہلکی ڈاڑھی نمایاں تھی۔

"کیا ہوا؟ یہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے تم سے؟" وہ ناسمجھی اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات لیے درشتی سے بولا۔

"راہ چلتا آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ وہی شاعرہ ہیں جسے میں نے دو سال پہلے کسی مشاعرے میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا کہ میں شاعرہ نہیں اور نہ ہی آپ کو جانتی ہوں مگر یہ مانتا ہی نہیں۔" اس نے بے بسی سے ساری کہانی اپنے شوہر کو سنا ڈالی۔ وہ مجھ پر برس پڑا۔

"بھائی یہ شاعری وغیرہ آپ ہی جیسے لوگوں کا کام ہے۔ ہم سیاست دان ہیں۔ ہماری خواتین یہ کام نہیں کرتیں۔ تمھیں اندازہ بھی نہیں کہ میری بیوی سے ایسی بدتمیزی کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعتاً ایک سیاست دان تھا۔ ایم این اے جسے میں پہچان نہ سکا اور جسے پہچان گیا تھا، وہ ایک پل میں دستبردار ہو گئی۔

"چھوڑ دیجیے اسے۔ خوامخواہ اپنا موڈ خراب نہ کریں۔" اس نے پیار بھرے فکرمند لہجے میں گویا التجا کی۔

"اب آپ شرافت سے یہاں سے چلتے بنیں۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ میں فوراً ہی چند قدم پیچھے ہٹا اور وہ دونوں میرے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔

"کہیں تم شادی سے پہلے کبھی شاعری تو نہیں کرتی رہیں؟ کیا کسی مشاعرے پر گئی ہو کبھی؟" وہ چلتے چلتے اس پوچھنے لگا۔

"نہیں تو! بالکل نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہ کام نا پسند۔ مجھے بھی نہیں......"

آواز گھٹتے گھٹتے غائب ہو گئی اور ساتھ ہی وہ دونوں نظر بھی منظر سے پردہ نشین ہو چکے تھے۔

اس کے جاتے ہی میں دل برداشتہ ہوا۔ اس کی آنکھو میں آنے والے آنسو کا کیا مطلب تھا؟ گویا کوئی آدھی ادھو حسرت جس کے پورا ہونے کا انتظار کرتے کرتے انسان ہمت جواب دے جائے۔ اس کی آنکھوں میں کبھی نہ ختم ہو والے انتظار کی کہانی رقم تھی۔ میں ایک بار پھر بلا مقصد گھو مگر اب وہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کسی شخص پر نظر نہ ٹھہری۔ پھر ایک بھٹکا ہوا پتنگا بن گیا۔

باہر آیا تو ایک بار پھر سے اس پر نظر پڑی۔ وہ ایک شا گاڑی کے بغل میں کھڑی تھی۔ اکیلی تھی اور غالباً اپنے سیا دان شوہر کا انتظار کر رہی تھی جو کہیں گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ا نے نظریں پھیر لیں۔ ہمارے درمیان چند قدموں کا ہی فا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ مجھ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسی پل اس نے گاڑی سے ایک کاغذ ا نکالا، کچھ سوچ کر لکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے وہ کاغذ ز پر پھینک دیا۔ اسی دوران اس کا شوہر آ گیا اور کچھ دریافت ک جواب میں اس نے محض سر ہلایا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور ا ہی پل وہ گاڑی کئی گاڑیوں کے درمیان کھو گئی۔ وہ تہ شدہ اب تک زمین پر گرا تھا۔ میں آگے بڑھا اور اسے کھولا۔

"وہ شاعرہ جو اپنے خوابوں کے لیے لڑ نہ سکی، کیا شاع سکتی ہے؟" لکھائی واضح تھی۔ یہ پڑھتے ہی میں نے کاغذ وہیں پھینک دیا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف جاتے ہو سوچنے لگا کہ اب کی بار اماں کو پری کے لیے ہاں کہہ دوں گا۔ میں کسی کے خواب قتل کرنے کا روادار نہیں ہو سکتا۔ ◆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

منانے کے دن

یوسف ناظم

جن قوموں نے دن منانے میں غفلت برتی وہ زیادہ دیر پنپ نہیں سکیں... قہقہہ بار تحریر

اگر آدمی اپنی مرضی سے بے کار رہنا چاہے تو اور بات ہے ورنہ دُنیا میں کئی شریفانہ کام ایسے ہیں جن میں آدمی اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے۔ بے کار رہنے میں آدمی کو جو لطف آتا ہے وہی بلکہ اس سے زیادہ لطف اُسے دن منانے میں حاصل ہو سکتا ہے اور دن منانا بے کار رہنے سے یقیناً بہتر ہے۔ یہ کام بھی ہے اور تفریح بھی۔ آپ کے بے کار رہنے کی اطلاع کسی کو ملتی ہے اور کسی کو نہیں۔ مثلاً چھٹی کے دن آپ گھر میں بیوی سے بحث و مباحثہ کر رہے ہیں۔ بچوں پر اپنے اقتدار کا سکہ جما رہے ہیں یا بستر میں پڑے پڑے جاسوسی ناول پڑھ رہے ہیں۔ آپ کی ان مصروفیات کا علم کسی کو نہیں ہوتا لیکن اگر آپ دن منانے پر تُل جائیں تو کوئی شخص بھی مطلع ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا بلکہ یوں کہیے کہ اس خوشخبری سے کسی شخص کا بچنا محال ہے۔

دن کئی طرح کے منائے جا سکتے ہیں۔ ان میں بعض دن انفرادی اور نجی نوعیت کے ہوتے ہیں، مثلاً جنم دن۔ اگر آپ اپنا جنم دن منانے میں کسی خاص وجہ سے شرم محسوس کرتے ہیں تو کوئی شخص آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ یہ دن منائیں۔ لیکن آپ اپنے بچے کا جنم دن بلاتکلف منا سکتے ہیں کیونکہ بچے کا جنم دن منانا ابھی والدین کے لیے شرم کی بات نہیں ہوئی اور بے چارے بچے کو کیا معلوم کہ آگے چل کر اسے اپنی ولادت کے بارے میں کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔

گھریلو مسائل پر گہری نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ بچے کا جنم دن منانا مہنگا نہیں پڑتا۔ اس لیے اکثر زندہ دل لوگ اپنے ایک ہی بچے کا جنم دن سال میں دو دو، تین تین مرتبہ منانے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بچے کی سالگرہ کے دن خود والدین کا ہاتھ منہ دھونا اور نئے کپڑے پہننا، اچھے کلچر کی نشانی ہے۔ اس دن اگر بچے کے والدین خود گانا نہ گا سکیں تو انھیں مندرجہ ذیل ریکارڈ بجانا، سُننا اور مہمانوں کو سنانا چاہیے:

ہم بھی اگر بچے ہوتے نام ہمارا ہوتا ببلو شبلو
کھانے کو ملتے لڈو
اور دُنیا کہتی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......!

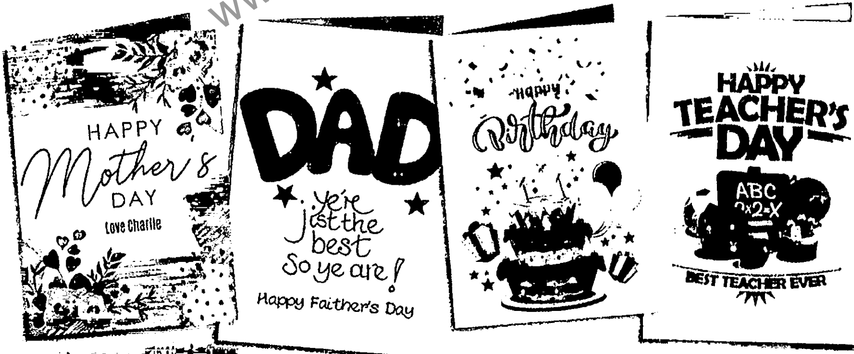

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بچے کے جنم دن کے علاوہ آپ نہایت مہذب طریقے سے اپنی شادی کی سالگرہ بھی منا سکتے ہیں۔ اس دن میاں بیوی صبح سویرے ایک دوسرے سے مسکرا کر بات کر سکتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ آپس میں مُسکرا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس دن یہ لوگ ہوٹل میں کھانا بھی کھا سکتے ہیں۔ دونوں کو خوشی ہوگی۔ بیوی کو اس لیے کہ چلو کسی بہانے ایک دن تو چولہا پھونکنے سے نجات ملی، اور میاں کو اس لیے کہ قیمتاً ہی سہی، ایک دن تو بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانے سے چھٹکارا ملا۔ کھانا کھانے اور برا منہ بنا کر بل ادا کرنے کے بعد یہ دونوں اس دن سینما بھی دیکھ سکتے ہیں۔ شوہر کو ہیروئن کی خوبصورتی اور بیوی کو ہیرو کی دلیری اور خوش مزاجی ضرور پسند آئے گی۔ شادی کی سالگرہ ایسے ہی منانی چاہیے۔ دوست احباب کو دعوت دے کر گھر پر بلانا اور اعلان کرنا کہ یہ ہماری شادی کی سالگرہ کا دن ہے، دوسروں کو خواہ مخواہ عبرت دلانا ہے۔ عبرت دلانے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن صرف عبرت دلانے کی خاطر زیرِ بار ہونا منصفی نہیں۔ یوں جی چاہے تو میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ دے سکتے ہیں۔ تحفہ البتہ ایسا ہونا چاہیے جو جلد ٹوٹ پھوٹ جائے یا خرچ ہو جائے۔ مثلاً پانی پینے کا ٹمبلر یا سگریٹ کا ڈبہ (شوہر کے لیے) عمدہ سینٹ یا چھوٹا سا آئینہ (بیوی کے لیے)۔ تحفے میں دی ہوئی چیز اگر زیادہ عرصہ تک کام دیتی رہے تو میاں بیوی دیر تک اس بات پر کڑھتے رہیں گے کہ کیا لغو تحفہ ملا ہے۔ غیر پائیدار تحفے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتے۔

شخصی اور خانگی خوشیاں کسی اصول یا قانون کی پابند نہیں ہوتیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے آپ کو خوش اور زندہ رکھے۔ بعض لوگ خاموش رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ گنتی کے ہوا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جب شرافت کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو ''یوم خاموشی'' مناتے ہیں۔ یوں ان کی خاموشی ایک دن کی ہوتی ہے لیکن حساب سے دیکھا جائے تو وہ ایک دن کے علاوہ دو راتیں بھی خاموش رہتے ہیں۔ (بظاہر ایسا ہی ہونا چاہیے) خاموشی کے دن وہ صرف سنتے ہیں بولتے نہیں۔ ان پڑھ لوگوں سے وہ اشاروں میں باتیں کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دونوں ہاتھ دُور دُور تک پھیلائیں تو مطلب ہوتا ہے کہ انھیں اخبار چاہیے۔ اپنے منہ تک ایک ہاتھ لے جا کر منہ ذرا اوپر اٹھائیں تو انھیں پانی پلانا چاہیے۔ پڑھے لکھے لوگوں سے وہ لکھ کر بات کرتے ہیں، مثلاً اگر ان سے کہا جائے کہ شاہ نواز کی فیملی آج عراق جا رہی ہے تو وہ فوراً کاغذ پر لکھ دیں گے کہ تم میری طرف سے جا کر خدا حافظ کہہ دینا اور بچوں کے لیے کیڈ بریز کے چاکلیٹ پہنچا دینا...... کسی اور کو لکھ کر ہدایات دیں گے تو روئی کے سٹے کے لیے موتی لال سیٹھ سے کہہ دینا کہ میں نے جو بھاؤ کل کہا تھا اس پر تین ہزار گانٹھیں لے لیں۔ شکر کے لیے ہدایت لکھی جائے گی کہ پانچ سیر شکر بلیک سے منگوا لو اور پندرہ روپے دکان کے حساب میں لکھ دو۔ یوم خاموشی منانے والوں کو گفتگو کا سلسلہ دوسرے دن صبح سویرے ہی شروع ہو جاتا ہے اور پھر وہ مسلسل چھے دن بولتے رہتے ہیں کہ یوم خاموشی منانے والے اصل میں چھے دن تک مسلسل بولنے کی وجہ سے تھک کر یوم خاموشی منانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاش یہ بات صحیح ہوتی اور عورتیں بھی یوم خاموشی منا سکتیں لیکن ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ ان ہونی باتیں سوچنے سے فائدہ۔ اگر بیویاں یوم خاموشی منائیں تو شوہر ایک دن کا بادشاہ بن جائے۔

یہ تو ہوئے وہ دن جن کی قومی اور بین الاقوامی کوئی اہمیت نہیں، لیکن جب اجتماعی شعور بہت زور دکھاتا ہے اور زندگی کا ثبوت دینا فرض ہو جاتا ہے تو ملک کے سارے باشندے مل جل کر دن منانے کا نیک کام انجام دیتے ہیں۔ دن منانا ایک اضطراری فعل ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے یا کھڑے کھڑے کسی بڑے آدمی کے ذہن میں یہ بات آ جاتی ہے کہ فلاں دن منانا چاہیے۔ بس ایک مرتبہ کوئی دن منا لیا جائے تو پھر وہ کینسر بن جاتا ہے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دن منانا ہر قوم اور ہر ملک کے لیے بے حد ضروری ہے۔

جن قوموں نے دن منانے میں غفلت کی وہ زیادہ دنوں تک پنپ نہیں سکیں۔ جب قوم کسی اہم اور دشوار مرحلے سے دوچار ہوتی ہے تو صرف دن منانے سے کام نہیں چلتا۔ ایسے نازک موقعوں پر پورا ہفتہ منانا پڑتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت، ہفتۂ خوش اخلاقی، ہفتہ قومی بچت، ہفتہ حفظانِ صحت کا مطلب ہوتا ہے کہ کم از کم اس ہفتہ کے دوران میں شہر کے گلی کوچے صاف رہیں، تعفن ہو لیکن کم۔

اس ہفتے میں مختلف پروگرام ہوتے ہیں۔ جن میں لوگوں کو ان امراض کے نام بتائے جاتے ہیں جن میں وہ آسانی سے گرفتار ہو سکتے ہیں۔ ایسی تقریریں سُن کر عوام کافی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور کم سے کم چار گھنٹوں تک بازار کی چیزیں نہیں کھاتے۔

ہفتۂ خوش اخلاقی کبھی کبھار منایا جا سکتا ہے۔ اس ہفتہ میں ہر شخص کے چہرے پر ’بُناکا‘ (BINACA) مُسکراہٹ نظر آتی ہے۔ خواہ مخواہ کی مسکراہٹ بڑی دلچسپ چیز ہوتی ہے اور بعض اوقات تو آپ شرمندہ ہو جاتے ہیں کہ آپ کے سامنے کھڑا ہوا شخص مُسکرا کیوں رہا ہے اور آپ سوچتے ہیں کہ یا تو آپ کا شیو ٹھیک نہیں ہوا یا آپ نے کپڑے غلط پہن رکھے ہیں۔ آپ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ مُسکراہٹ، ہفتۂ خوش اخلاقی کی مرہونِ منت ہے۔ ورنہ لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں مُسکراہٹ سے کیا واسطہ۔ اور وہ بھی مسلسل ایک ہفتہ کی مُسکراہٹ۔

ہفتہ قومی بچت میں سوائے بچت کے ہر چیز ہوا کرتی ہے۔ نمائش تفریح، اہل و عیال کے ساتھ بھیل پوری، بٹاٹا وڑا اور آئسکریم کھانا، قومی بچت کے ہفتے کے ضروری مشاغل ہیں۔ اس ہفتے میں اگر کوئی شخص معمول سے زیادہ خرچ کرے تو اسے خودسر اور کاہل سمجھا جاتا ہے۔ ہفتۂ دُودھ بھی اسی قماش کا ہفتہ ہُوا کرتا ہے۔ اس ہفتے میں پانی کا خرچ زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس ہفتے میں جن لوگوں کو خالص دودھ مل جاتا ہے وہ بڑے خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں۔ شاید یہ لوگ دودھ فروشوں کے سسرالی عزیز ہوتے ہیں۔

دن تو ہر قسم کے منائے جا سکتے ہیں۔ سب سے اچھا دن وہ ہو سکتا ہے جس دن کسی خوشی میں مدرسوں میں مٹھائی اور محلوں میں کپڑا تقسیم کیے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ اس دن صبح سے لے کر رات تک جہاں بھی ذرا سی جگہ ہو جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو کبھی اپنے گھر میں بات کرنے کا موقع نہیں ملتا انھیں اس دن مجمع عام میں تقریر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ شاعروں کو تو لوگ اس دن اغوا کر کے اپنے اپنے مشاعرے میں لے جاتے ہیں۔

یوم والدین بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا اونچا دن مانا گیا ہے۔ یہ ایسے موقعوں پر منایا جاتا ہے جب مدرسوں کے شاندار نتائج شائع ہو چکتے ہیں، اس روز عصرانہ بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔ جس کے اخراجات کی پابجائی، پُور فنڈ سے کی جاتی ہو گی۔ جلسہ میں فیل ہونے والے لڑکوں کے بلند حوصلہ والدین شریک ہوتے ہیں۔ اس روز انھیں بتایا جاتا ہے کہ مدرسے کا نتیجہ پچھلے سال 12 فیصد تھا لیکن اس سال 16 فیصد رہا۔ یہ سنتے ہی حاضرینِ جلسہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا دیتے ہیں، کیونکہ تالی ایک ہاتھ سے بجتی ہی نہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی تقریر اور ڈرل ماسٹر کے شکریہ پر یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں ہماری ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ہر دن کوئی نہ کوئی یادگار دن ہوتا ہے۔ بلکہ بعض موقعوں پر تو قوم ایسے نازک موقف میں آجاتی ہے کہ ایک ہی دن میں کئی کئی دن منانے پڑتے ہیں۔ مثلاً صبح سات بجے سے دس بجے تک یوم والدین منایا گیا تو گیارہ بجے سے دو بجے تک یوم بے روزگار اور پھر تین بجے سے یوم سیاسی بحران اور رات میں کہیں جا کر یہ دن یوم علمی فقدار پر ختم ہوتا ہے لیکن ایسے موقعے کبھی کبھار ہی آتے ہیں، ورنہ عام طور پر ہر مسئلے کے لیے ایک علیحدہ دن مقرر ہے اور آپ ہنستے کھیلتے بولتے وہ دن منا سکتے ہیں۔ ◆◆◆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

عبدالرحمٰن چغتائی

مقبول جہانگیر

چغتائی صاحب بڑے عجیب وغریب آدمی ہیں۔

میں کبھی کبھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو طے نہیں کر پاتا کہ چغتائی مصور نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟ شاعر؟ موسیقار؟ فلسفی؟ عالمِ دین؟ صوفی؟ یا اپنے عظیم آباؤ اجداد کی طرح سنگ وخشت سے ایک جہانِ پیدا کردینے والے معمار؟ ایسے معمار جو لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ اور تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ یوں چغتائی کی حیثیت ایک بڑے معمار کی سی بھی ہے جو تصویریں نہیں بناتا، رنگوں اور خطوں کے عظیم الشان قلعے اور تاج محل بناتا ہے۔

وہ چغتائی ہیں۔ چنگیز خان کے پوتے اور ہلاکو خان کے پڑپوتے چغتائی خان کی نسل میں سے۔ گویا کھرے منگول ہیں۔ اُن کے یہ آباؤ اجداد بھی بہت بڑے فن کار تھے۔ جدھر نکل جاتے انسانی کھوپڑیوں کے سر بفلک مینار پر مینار کھڑے کرتے چلے جاتے۔

جہاں جہاں تک جگہ پایئے گا
عمارت بناتے چلے جایئے گا

شوکت تھانوی مرحوم نے ان کے بارے میں بڑے مزے کی بات کہی تھی کہ خدا کا شکر ہے چغتائی صاحب ''مصاعر'' بن کر رہ گئے، خدانخواستہ خدا ہوتے تو ہم سب اسی شکل وصورت کے ہوتے جیسی ان کی تصویریں ہیں۔ یعنی یہ دنیا تو بہت رنگین ہوتی مگر ہم سب ایسے ہوتے کہ گدّی تک ہماری ٹانگیں ہوتیں، ٹخنوں تک ہاتھ ہوتے اور ہاتھ سے کچھ ہی چھوٹی انگلیاں اور انگلیوں سے کچھ ہی چھوٹے ناخن...... آنکھوں کی جگہ ایک شگاف نظر آتا، البتہ ناک ایسی ضرور ہوتی جس سے ہم ایک دوسرے کو سونگھ سکتے۔ اور ''مصاعر'' کی تعریف شوکت

ایک ایسا عظیم فنکار جو تصویریں نہیں بلکہ رنگوں اور خطوں کے عظیم الشان قلعے اور تاج محل بناتا ہے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

صاحب نے یوں فرمائی:

''مصاعر'' اس مصور کو کہتے ہیں جو اپنی تصویروں کے ذریعے شاعری کرے۔ ان کا شعر الفاظ میں نہیں خطوط میں ادا ہوتا ہے اور وہ بھی عام فہم شعر نہیں، غالب کا شعر...... ان چغتائی صاحب نے مرقع چغتائی کے نام سے غالب کا کلام چھاپا ہے اور جب سے غالب کا کلام ان تصویروں میں چھپا ہے اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ غالب کے کلام کی تو لوگوں نے شرح لکھ دی تھی مگر ان تصویروں کی شرح کون لکھے؟

شوکت مرحوم نے تو یہ باتیں بطور تفریح طبع فرمائی تھیں ورنہ اُن کے دل میں چغتائی صاحب کا بڑا احترام تھا اور وہ ان کے کمالِ فن کے بڑے معترف تھے۔ تاہم ابتداء میں چغتائی صاحب کی تصویریں عام ہونا شروع ہوئیں تو فقرہ کسنے، پھبتی اُڑانے اور طنز کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ عوام سے تو خیر کیا گلہ کہ چغتائی کا فن اُس وقت بھی ان کے فہم و فکر سے بالا تھا اور آج بھی ہے۔ تعجب تو خواص پر تھا کہ وہ بھی اس رو میں بہ گئے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید حوصلہ ہار دیتا۔ اپنے برش، رنگ اور کاغذ دریا برد کر کے جنگل کی راہ لیتا مگر چغتائی نے سب وار ہنس ہنس کر جھیلے، اُف تک نہ کی اور 'خلقے بطعن گفتگو، عاشق بکارِ خویشتن' کی مجسم تصویر بن گیا۔ ایک عرصہ اسی حالت میں بیتا۔ پھر کچھ دل درد آشنا، خوش صورت اور خوش سیرت لوگ آگے بڑھے۔ انھوں نے چغتائی کے باطن میں جھانکا۔ آگے بڑھنے والوں میں دانشور تھے، ادیب اور معلم تھے، شاعر تھے، نقادانِ فن تھے۔ ان سب نے مل کر چغتائی کو سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، احمد شاہ بخاری، فیض احمد فیض، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، حکیم یوسف حسن، مولانا صلاح الدین احمد اور ابوالاثر حفیظ جالندھری...... گویا وہی حلقہ تھا جو آگے چل کر نیاز مندانِ لاہور کے قالب میں ڈھل گیا۔ تاثیر مرحوم نے چغتائی کے فن پر معرکتہ آلارا مضامین لکھے۔ پطرس اور تاج کی جچی تلی تنقیدوں نے بہت سی گرہیں کھولیں۔ حکیم یوسف حسن، صلاح الدین احمد اور سالک نے اپنے زیرادارت شائع ہونے والے جریدوں میں چغتائی کے فن سے قارئین کو متعارف کروایا۔

شاعرِ مشرق نے بڑھ کر مستقبل کے مصورِ مشرق سے معانقہ فرمایا کہ یہ بھی اپنے ہی قبیلے کے ان افراد میں سے ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

چہ ساحراند کہ آتش ز آب می سازند

چغتائی صاحب اُن دنوں کو یاد کر کے اکثر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے گھر پر یا انھی دوستوں میں سے کسی ایک کے گھر پر علم و ادب کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ بحث، مباحثے، تنقید، تبصرے کا ہنگامہ برپا رہتا۔ تاثیر کی شوخیاں، پطرس کی شرارتیں، حفیظ کی ترنم ریزیاں، سالک کی فقرے بازی، تبسم کی پھلجڑیاں اور تاج کی کم گویائی اس محفل کی جان تھی۔ ان سب کا کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، دھول دھپا، لڑائی جھگڑا، روٹھنا اور من جانا کچھ ایسی دلفریب اور ناقابلِ فراموش یادیں ہیں جنھیں بیان کرنے والے اب صرف چغتائی، تبسم اور حفیظ رہ گئے ہیں۔ تاثیر کو چغتائی سے اور چغتائی کو تاثیر سے کچھ ایسا قلبی تعلق ہو گیا تھا جسے محاورے کی زبان میں ایک جان دو قالب کہہ سکتے ہیں۔ چغتائی کے اس دور کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے کئی بچھڑ گئے۔

ڈرائنگ ماسٹر عبدالرحمن چغتائی مصورِ مشرق ایک ہی دن میں نہیں بن گئے۔ اس کے لیے انھیں محنت و مشقت سے اٹا ہوا طویل سفر طے کرنا پڑا۔ نصف صدی تک شب و روز کے بائیس بائیس گھنٹے ریاض کرنا اور دل و جگر کا خون جلانا پڑا۔ سینکڑوں راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنی پڑیں، غیروں کے قہقہے اور اپنوں کے طعنے سننے پڑے۔ ایسے حالات سے بھی گزرے کہ کئی کئی روز ایک دھیلا تک اُڑ کر منہ میں نہ گئی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اور گھر میں چولہا نہیں سُلگا مگر انھوں نے اپنے چہرے بشرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا جانا ہی نہیں۔ بے جا خواہشوں اور آرزوؤں کا تانا بانا کبھی بُنا ہی نہیں۔

انھیں اپنے کلام اور فن سے جنون کی حد تک لگاؤ رہا اور بلاشبہ یہ جنون عشق ہی ہے جو پستیوں کو بلندیوں اور بلندیوں کو پستیوں میں بدل دیتا ہے۔ چغتائی صاحب کی شخصیت میں جو رکھ رکھاؤ اور وقار ہے، وہ اکتسابی نہیں وہبی ہے۔ انھوں نے اپنے اُوپر بناوٹ اور تصنع کا خول چڑھانے کی کبھی کوشش کی نہ انھیں اس کی ضرورت پڑی۔ ایک ایسا شخص بھی جو انھیں جانتا پہچانتا نہیں، محض ان کا قیافہ اور سراپا دیکھ کر ہی بے اختیار بول اُٹھے گا کہ یہ ایک بڑے آدمی کا قیافہ ہے۔ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا سراپا ہے۔

ان کا لباس ہمیشہ سادگی کا مظہر رہا۔ سستے سے سستے کپڑے کی بوشرٹ، پتلون یا قمیص پاجامہ، سر کے بال تیل سے ہمیشہ بے نیاز۔ چغتائی اور ان کے متعلقین کے بارے میں محلے کا ایک شخص بھی شاکی نہ تھا کہ ان کی زبان یا ہاتھ سے اسے کبھی کوئی نقصان پہنچا یا انھوں نے کبھی کسی کو اذیت دی ہے۔ چغتائی صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ بہت بڑے مصور ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے آدمی ان سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ یہ باتیں محلے کے بچے بچے کے علم میں تھیں۔

چغتائی صاحب بلاضرورت لوگوں میں گھلنے ملنے اور میل ملاقات سے پرہیز رکھنے میں سکون محسوس کرتے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ لوگ ان کے مکان پر نہ آئیں اور خط وکتابت ہی سے ملاقات کرلیں یا اپنا جو کام ہو بتا دیں۔ وہ مردم بیزار ہرگز نہیں۔ موقع ہوتو بڑے مزے کی باتیں کرتے اور سب سے ملتے جلتے بھی لیکن بہرحال وہ اس حقیقت کے شدت سے قائل ہیں کہ 'ہیچ آفت نرسد گوشہ تنہائی را'۔ اس حقیقت کی معقولیت پر ایمان رکھتے ہوئے وہ اکثر وبیشتر اپنے کلبہ احزاں میں بند رہتے اور ہفتوں باہر نہیں نکلتے۔ اس لیے شہر میں انھیں جاننے اور پہچاننے والے شاذونادر ہی ہیں۔

خدانخواستہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ چغتائی صاحب متکبرین میں سے ہیں۔ اہلِ کمال میں تکبر نہیں ہوتا، انکسار اور استغنا ہوتا ہے۔ جہاں تکبر پایا جائے، سمجھ لیجیے کمال ناقص رہ گیا۔ اہلِ کمال کا استغنا بھی ہر ایک سے خاص نہیں ہوتا۔ صرف اُن سے ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دولت یا اقتدارِ حکومت کے سہارے بڑا سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

چغتائی صاحب اس نوع کے متکبرین سے اوّل تو ملتے ہی نہیں، اگر مارے باندھے ملنا پڑ جائے تو ان کا اسغنا اوج کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ شاید انھیں معلوم ہے کہ 'التکبر مع المتکبرین عبادۃ'۔ اس قسم کی عبادت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جانے نہیں دیتے اور اس میں بڑی روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے واقعات و حالات میں نے ان کے اس استغنا کے دیکھے اور سنے ہیں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں جو اکتوبر ۱۹۵۸ میں مارشل لاء کے زور پر برسرِ اقتدار آئے تھے۔ ان دنوں اُن کی ہیبت اور شوکت کا کیا عالم تھا، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مرحوم ایوب خاں چغتائی صاحب کے فن اور ذات دونوں کے ہمیشہ سے قدردان تھے۔ انھی دنوں ان کا جی چاہا کہ مصور مشرق سے ملاقات کریں اور چند تصویر بتاں بھی خریدیں تاکہ بعد مرنے کے گھر سے کچھ سامان نکلنے کا سامان ہو جائے۔ انھوں نے چغتائی صاحب کے نام فرمان جاری کیا کہ ایوان صدر میں حاضر ہو جائیے۔ ہم سے ملاقات کا شرف حاصل کیجیے۔ چند تصویریں بھی ساتھ لائیے تاکہ ہم پسند فرما کر خریدیں۔ مصور مشرق نے جواب دیا:

''ملاقات کا شوق آپ کو ہے، مجھے نہیں۔ مجھ سے ملنا ہے تو میرے غریب خانے پر آ جائیے۔ تصویریں یہیں آن کر دیکھیے۔''

اب اسے ایوب خان مرحوم کی شرافت کہیے یا چغتائی صاحب کے بخت کی ارجمندی کہ ہیبت و جبروت کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ قصہ مختصر، ایوب خاں بڑے کروفر اور شان و شوکت سے چغتائی صاحب کے گھر آئے اور ہم نے چغتائی صاحب کے استغنا کی یہ حالت دیکھی کہ ان کے استقبال کے لیے سڑک پر آنا تو درکنار، اپنے مکان کی پوری سیڑھیاں بھی نہ اُترے اور سیڑھیوں کے عین درمیان میں آ کر مصافحہ کیا۔

غلام نرگس مستِ تو تاجدارانند

پاکستان کے دورے پر ملکہ برطانیہ لاہور تشریف لائی تھیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ وہ مصور بھی اسی شہر نجد لاہور میں رہتا ہے جس کی بنائی ہوئی کئی تصویریں ان کے قصر بکنگھم میں لگی ہیں۔ ملکہ نے چغتائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گورنر ہاؤس سے طلبی کا حکم آیا کہ فوراً آیئے ملکہ برطانیہ آپ سے ملاقات کی خواہش مند ہیں اور شاید چند تصویریں بھی خریدیں۔ پیشکش بہت پُرتکلف اور بیش قیمت نفع سے خالی نہ تھی۔ ممکن ہے چغتائی صاحب معزز مہمان کی پزیرائی کے لیے ملاقات کو چلے جاتے لیکن تصویروں کی خرید کا جو لالچ دیا گیا اس نے فن کار کو آتش زیر پا کر دیا۔ بے پروائی سے فرمایا:

''میں مصروف ہوں۔ ملکہ سے ملاقات کا وقت میرے پاس نہیں۔''

گورنر ہاؤس سے آنے والوں نے خوشامد کی انتہا کر دی مگر چغتائی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نہ جانے انھوں نے ملکہ برطانیہ سے کیا عذر کیا ہو گا تاہم اس نے چغتائی صاحب کی پانچ تصویریں خریدیں اور انھی کو غنیمت جان کر ساتھ لے گئی۔

عالمی بینک کے صدر یا نائب صدر، اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اُن کا نام یوجین بلیک تھا، لاہور تشریف لائے۔ بے حد مصروف تھے مگر چغتائی صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ چغتائی صاحب نے کہلوا دیا کہ پہلے ملاقات کا وقت طے کر لیجیے پھر تشریف لائیے۔ اس وقت مصروف ہوں، ملاقات سے معذور ہوں۔ انھوں نے چغتائی صاحب سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ پھر اگلے روز آئے اور فن کار سے ملاقات ہو سکی۔

آیئے اب ان کی جمالی شان کا انداز بھی دیکھیے۔ اپنے سے چھوٹوں کے لیے وہ سراپا محبت، شفقت اور خلوص کا نشان رہے۔ محلے کا کوئی چھوٹا بڑا اپنی کوئی حاجت یا ضرورت لے کر اُن کے پاس پہنچ جائے فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور جہاں تک ممکن ہو گا اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ غریبوں کی خدمت کرنے اور ان سے بولنے، باتیں کرنے میں وہ بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے غربت و افلاس کا ایک کٹھن دور دیکھا اس لیے اس

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

طبقے کی پسماندگی اور اس کی مصیبت سے خوب آگاہ ہیں۔

چغتائی صاحب کے گھر کے پیچھے ہی ایک چھوٹی سی صاف ستھری مسجد ہے۔ گویا ان کا گھر مسجد کے زیرسایہ ہے اور غالب کے الفاظ میں اُنھیں خدا کا ہمسایہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اس مسجد میں بہت برس پہلے ایک پٹھان مولوی صاحب امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ کبھی کبھی چغتائی صاحب کے گھر سے اُن مولوی صاحب کو کھانا، کپڑا اور اس قبیل کی دوسری چیزیں ہدیہ کی جاتیں۔ امام صاحب کو کوئی تکلیف ہوتی تو بلا تکلف اپنی سادگی کے باعث وقت بے وقت چغتائی صاحب کے دروازے پر دستک دے دیتے اور موصوف پورے تحمل سے ان کی شکایت سنتے۔ ایک دفعہ شاید گھر میں کوئی نہ تھا جو مولوی صاحب کو کھانا پہنچا آتا چنانچہ ہم نے دیکھا کہ مصورِ مشرق بنفس نفیس ایک ہاتھ میں روٹیوں کی چنگیر اور دوسرے ہاتھ میں سالن کا کٹورا تھامے مسجد میں آئے اور کھانا پیش کیا۔

مسجد کے ساتھ ہی وہ مشہور اکھاڑا ہے جہاں رستم زمان بھولو پہلوان اور ان کے بھائی شام کے وقت باقاعدگی سے زور کیا کرتے۔ جب یہ اکھاڑہ ویران ہو گیا تو اس کے آس پاس چنڈو بازوں اور جواریوں نے اڈا بنالیا جہاں دن رات خوب دھما چوکڑی مچتی اور چغتائی صاحب کے کام اور آرام میں خلل آتا، مگر وہ صبر سے سب کچھ سہتے اور اُف نہ کرتے۔

منشی اسد اللہ مرحوم لاہور کے ایک عظیم خطاط تھے۔ عبدالمجید پرویں رقم اور تاج الدین زریں رقم کی صف کے خطاط۔ دیوان غالب کو جب چغتائی صاحب نے مصور کر کے ''مرقع چغتائی'' کے نام سے شائع کیا تو خطاط کا کمال انھی منشی اسد مرحوم نے دکھایا تھا۔ خط نستعلیق میں حروف نہیں، قلم سے موتی جڑتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ میر عماد الحسینی آقا عبدالرشید یا حافظ نور اللہ کے قلم مستعار لیے ہیں۔ بازار سریاں والا اندرون موچی دروازے میں منشی جی کا مکان تھا۔ چغتائی صاحب کا آبائی مکان بھی اسی محلے میں تھا۔ مدتوں کی دعا سلام تھی۔ دونوں اپنے اپنے فن کے لاثانی فنکار تھے اور ایک دوسرے کے ناز اُٹھانے میں پیش پیش۔ منشی جی مر گئے۔ ان کا لڑکا رفیع اللہ عرف عابد حسین نوعمر تھا، اپنی بیوہ ماں کا سہارا۔ خوش نویسی کے فن میں بھی مبتدی تھا اور ادھر اُدھر روزی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ کبھی کبھی چغتائی صاحب کے مکان واقع راوی روڈ کی طرف بھی آ نکلتا۔ چغتائی برادران اسے دیکھتے ہی سینے سے لگا لیتے۔ وہ ان کے مرحوم فن کار دوست کی نشانی تھا۔ اگرچہ پھٹے حالوں تھا مگر اس سے اتنی محبت اور پیار کا سلوک کیا جاتا کہ مجھے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ انھی کے گھرانے کا فرد ہے۔ چغتائی صاحب اس کی خودداری اور عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر کچھ نہ کچھ کام اسے دیتے رہتے اور اُجرت معمول سے زائد ادا کرتے۔

صدر ایوب کے ہمراہ

www.pakistanipoint.com

عبدالرحیم چغتائی ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ چہرے مہرے، چال ڈھال میں بڑے بھائی کی تصویر۔ چھوٹا بھائی ہونے کی نسبت غیر اختیاری ہے۔ اختیاری نسبتیں یہ ہیں کہ وہ چغتائی صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری ہیں، ان کی کتابوں کی اشاعت کے مہتمم ہیں، ان کے مشیر کار ہیں، سفر وحضر کے ساتھی اور دوست ہیں، گھر کے منتظم اعلیٰ ہیں۔ گوشت سبزی سے لے کر چغتائی صاحب کی تصویروں کی فروخت، ان کی نمائش اور ان کی حفاظت کا اہم فریضہ وہی انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے فن کار کو بہت سی ایسی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد کیے رکھا ہے جن میں الجھ کر وہ فن کی خدمت کرنے کا زیادہ وقت نہ نکال سکتا۔ پھر ان بھائیوں کی محبت بھی مثالی ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بڑے چغتائی کہیں جائیں اور چھوٹے چغتائی ان کے ساتھ نہ ہوں۔ ان کی عبادتیں بھی مشترک ان کی تفریحیں بھی مشترک۔

جمعہ کی نماز دونوں بھائی برسوں سے شاہی مسجد میں ادا کرنے کے عادی ہیں۔ مسجد ان کے مکان سے بمشکل چار فرلانگ کے فاصلے پر ہوگی، چاہیں تو پیدل بھی جا سکتے ہیں مگر وضعداری یہ ہے کہ مکان سے نکلیں گے، سیدھا سادا قمیص پاجامہ پہنے ہوئے، ٹوپی کی جگہ نماز پڑھتے وقت سر پر رومال باندھ لیں گے۔ پھر سڑک پر کھڑے ہو کر اُس تانگے کی راہ دیکھیں گے جو دو آنے کے حساب سے سواریوں کو اتارتا چڑھاتا چلا جاتا ہے۔ سالم تانگہ انھوں نے کبھی نہ کیا۔ اسی طرح شہر میں کوئی اچھی انگریزی فلم آئی، دونوں بھائی پہنچ گئے پہلے شو میں اور شرافت سے دوسرے درجے کی قطار میں کھڑے ہو گئے ٹکٹ کے لیے۔ رش زیادہ ہوا اور ٹکٹ نہ ملا تو ٹھنڈے ٹھنڈے مال کی سیر کرتے ہوئے گھر واپس پہنچ گئے۔ اگر فرصت ہے تو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پرانی کتابیں اور رسالے بیچنے والے کے پاس پہنچ گئے اور نہایت انہماک سے پھٹی پرانی کتابیں اور دیمک لگے رسالے دیکھنے لگے اور کوئی نہ کوئی کام کی چیز لے کر ہی وہاں سے اُٹھے۔

بسنت کے تہوار سے ایک ہفتہ قبل چغتائی صاحب اپنی تمام مصروفیات سے آزاد ہو جاتے اور اب ایک نئے مشغلے کا آغاز ہوتا۔ یعنی ایک سے ایک خوبصورت پتنگ اور تکل اپنے ہاتھ سے بنانا، ڈور سوتنا، مانجھا تیار کرنا اور عین بسنت کے روز منہ اندھیرے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر پتنگ بڑھا دینا۔ سارا دن ہاؤ ہو اور پتنگ بازی میں کاٹ دینا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کو لہولہان کر کے سورج غروب ہونے کے بعد کوٹھے سے اُترنا۔ انھیں اس مشغلے میں بے پناہ ذوق وشوق سے مصروف دیکھیں تو کبھی یقین نہ کریں کہ یہی وہ شخص ہے جس کے فن کی مشرق و مغرب میں دھوم ہے اور جو اس وقت معصوم بچوں کی طرح پتنگ اڑانے اور پیچ لڑانے میں کھویا ہوا ہے، وہی عبدالرحمٰن چغتائی ہے جو بڑے بڑے آدمی کو اپنے دروازے سے یہ کہہ کر لوٹا دیتا ہے کہ ملاقات سے معذور ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں۔ برسوں تک چغتائی صاحب کا یہی مشغلہ رہا، غالباً اب بھی ہے اور لوگ یہ طے نہیں کر پاتے کہ چغتائی صاحب پتنگ اچھی بناتے ہیں یا تصویر۔ معماری، نجاری، آہنگ گری کے فن سے بھی وہ خوب آگاہ ہیں۔ ایک دفعہ اُس بوڑھے بڑھئی سے باتیں کرنے بیٹھ گئے جو ان کی تصویروں کے فریم تیار کر رہا تھا۔ چغتائی صاحب نے اس فن کی پوری تاریخ بیان کر دی اور ایسے ایسے نکتے اسے ذہن نشین کرانے لگے کہ وہ بیچارہ اپنا کام بھول کر حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ چغتائی صاحب نے جب اُسے بالکل مبہوت کر دیا تو دونوں ہاتھوں سے اس بوڑھے بڑھئی کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولے:

”بابا جی، آپ اپنا کام کیجیے، یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

میں نے چغتائی صاحب میں جس خوبی کا سب سے بڑا عنصر دیکھا وہ اپنے سے ہر طرح سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہے۔ کوئی چیز انھیں بھا جائے، بلا تکلف آپ کو داد دے کر وہ آپ کو بھول نہیں جائیں گے، برسوں بعد بھی آپ کو یاد رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کا کوئی کام کر دیں خواہ آپ کے کسی رسالہ یا کتاب کا سرورق ہی کیوں نہ ہو۔ آپ انھیں اپنی کتابیں بھیجیں گے تو خوش ہو کر نہ صرف رسید سے نوازیں گے بلکہ ان کتابوں کو ردی والے کے ہاتھ بیچ دینے کے بجائے شوق و ذوق سے مطالعہ بھی کریں گے۔ خواہ وہ کتاب آپ نے بچوں کے لیے لکھی ہو اور اس کی ضخامت مختصر ہو۔ ایسی چیزوں کو وہ حقارت سے کبھی نہیں دیکھتے یا پھر ایسے موضوعات جن سے بظاہر انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی پھر بھی وہ ایسے بڑے موضوعات پر چھپنے والی کتابوں کو پڑھتے ہیں اور اپنی صحیح رائے سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ بڑے اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے۔

یہ بات میں سنی سنائی نہیں کہہ رہا، بلکہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں مجھے جبر سے یا اختیار سے جن موضوعات پر کتابیں یا مضامین لکھنے کا موقع ملا، ان میں ایک کے سوا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس سے چغتائی صاحب تو ایک طرف، کسی بھی سنجیدہ، متین اور ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے مگر چغتائی صاحب برابر یہ مضامین اور کتابیں دیکھتے اور میرا دل بڑھاتے رہے۔ اب میں اپنی انھی کتابوں اور مضامین کو دیکھتا ہوں تو بڑی ندامت ہوتی ہے کہ بھلا یہ کیا کام ہے جس کی تعریف و توصیف کی جائے۔

اُردو ڈائجسٹ کی ادارت میں شامل ہونے کے بعد جب میں نے چغتائی صاحب کو اس حادثے سے باخبر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پرچہ انھیں اعزازی طور پر بھجوایا جاتا تھا اور وہ اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے تھے۔ میرے پاس ان کے جو مکاتیب محفوظ رہ گئے، اب انھیں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط میں کیسے اچھے اچھے مشورے دیے اور جب بھی ان سے کسی مضمون کی فرمائش کی گئی، وہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

مکرمی معظمی! سلام مسنون۔ اُردو ڈائجسٹ کا جب پہلا پرچہ شائع ہوا تو میں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے پسند کیا تھا اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ ایک ایسا پرچہ شائع ہوا ہے جس کی اشاعت کم و بیش دس ہزار تک پہنچ جانی چاہیے تاکہ اس معزز اور باوقار مجلسِ ادارت کو زیادہ سے زیادہ خدمت بجالانے کا موقع حاصل ہو۔ موجودہ دور میں آپ کی یہ کوشش اُردو ادب میں ایک غیر معمولی کوشش ہے۔ وہ ایک نیا مشن اور نئی آواز ہے۔ جو مواد آپ بہم پہنچا رہے ہیں اور جس مقصد کا آپ پیچھا کر رہے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے کوئی مفید مضمون لکھوں جس کا مقصد آپ کے مقصد سے ملتا جلتا ہو۔ موجودہ دور کے آرٹسٹوں نے مطالعہ نگار کے ذہن پر ایک ایسی بداعتمادی مسلط کر دی ہے کہ غریب مطالعہ نگار کھل کر اپنی رائے چھوڑ، اپنے ذوق کا بھی اظہار نہیں کر سکتا۔ تجریدی اور مجرد کوشش یہ نہیں کہتی کہ ہم اپنے معاشرے سے بیگانہ رہیں اور ایسا مواد مہیا کریں جس سے ذوقِ نظری جاتا رہے اور بداعتمادی اُبھرے۔ یورپ کی ہر تحریک اس کے اندر سے اس طرح پھوٹ نکلتی ہے جیسے مٹی کے اندر سے بیج......اور ہماری نقالی ایک ایسا پیوند بھی نہیں جو مطالعہ کا حصہ دار ہے۔

یاد آوری کا شکریہ۔

آپ کا مخلص......عبدالرحمن چغتائی۔

☆☆☆

میں اُن دنوں چغتائی صاحب کی شخصیت اور فن پر ایک مضمون اُردو ڈائجسٹ کے سالنامے میں لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا اور میں نے ایک سوالنامہ ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تاکہ جو باتیں میرے علم میں نہیں، وہ معلوم ہو جائیں۔ کردار کی تشکیل کا اشارہ غالباً اسی سلسلے میں ہے۔ بہر حال اگلے خط سے اس معاملے پر کچھ اور روشنی پڑتی ہے:

''مکرمی معظمی، سلام مسنون۔ میں کراچی سے لاہور پہنچ گیا ہوں۔ اب آپ اپنی ضرورت کے مطابق جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ ملاقات سے پہلے میرے لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنی ضرورت کے مدّنظر چند سوال لکھ دیں میں ان کا جواب لکھ کر آپ کو اطلاع دوں گا تاکہ آپ آئیں اور مزید جو چاہیں پوچھ سکیں...... باقی رہا سرورق کا معاملہ، میں ضرور بنا دوں گا۔ اگر کسی تصویر کی ضرورت ہو تو اس کا فوٹو بھی دے سکتا ہوں۔ آپ کی ثقافتی جدوجہد سے مجھے ہمدردی ہے اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ تعاون کیا جائے۔

والسلام، آپ کا مخلص۔ چغتائی۔''

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''حسب وعدہ مضمون ارسال خدمت ہے۔ کوشش کردی ہے، خدا کرے آپ کے کام آ سکے۔ مطمئن رہیں، ڈسٹ کور بنا کر جلدی بھیج دوں گا۔ جناب الطاف کی بلند ہمتی دیکھتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر یاد آ جاتے ہیں، وہ ہمیشہ ہی اُردو ادب میں اس معیار کے پرچے کا تصور بناتے رہے مگر حالات سازگار نہ تھے جو آج نظر آ رہے ہیں۔ ہمیشہ ہی میری تمنا رہی ہے یہ سلجھاؤ زبان کو زبان کی حیثیت دینے میں قابل مدیروں کو توجہ دینی چاہیے۔ یہی حسن اور یہی معیار پڑھنے والوں کو مطالعہ کرنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ شاہد صاحب کا ایک مختصر سا خط ارسال خدمت ہے، کام آ سکے تو استعمال میں لائیں بعد استعمال واپس کر دیں۔ علامہ اقبال کے مصور ایڈیشن کا انتظار اب ختم ہونے کو ہے۔ والسلام مخلص چغتائی۔''

لگے ہاتھوں شاہد احمد دہلوی مرحوم کا وہ آخری خط بھی چغتائی صاحب کے نام پڑھ لیجیے جو 13 مئی 1967ء کو لکھا گیا تھا:

''حضرت محترم، سلام مسنون۔ 10 مئی کا نوازش نامہ ملا، شکریہ۔ آپ تو خدا کے فضل سے اس صدی کی زندہ تاریخ ہیں۔ پھر خدا کا آپ پر یہ بھی کرم ہے کہ آپ کے ہاتھ میں ایک شگفتہ رقم قلم ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ کو اپنے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ تفصیل سے تمام واقعات لکھ دیں البتہ خاص خاص باتیں فرصت کے اوقات میں لکھ سکتے ہیں۔ انھیں آپ 'فرسودہ باتیں' کا دلچسپ عنوان دے سکتے ہیں۔ آپ کے پاس جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کی نقل تو آپ ضرور عنایت فرما دیں۔ پطرس کے زمانے کی نشر شدہ تحریریں بھی نقل کرا دیجیے۔ جلدی نہیں ہے، ایک مہینے میں...... میں آپ کے اچھے خیالات کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ سلامت رکھے۔ خاکسار۔ شاہد احمد۔''

شاہد احمد نے چغتائی صاحب سے کہا کہ جلدی نہیں ہے اور خود مرحوم جلدی میں تھے۔ اس خط کے لکھنے کے صرف دو ہفتے بعد ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ رہے نام اللہ کا......

1968ء میں شاہد احمد دہلوی مرحوم کی شخصیت اور فن پر راقم کی تالیف ''یادِ شاہد'' زیر ترتیب تھی۔ بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس کتاب کا سرورق چغتائی صاحب بنائیں تو کیسا رہے۔ اس لیے بھی کہ مرحوم شاہد احمد سے چغتائی صاحب کے تعلقات نہایت قدیم اور بے حد مخلصانہ تھے۔ خود شاہد صاحب انھیں اس صدی کی زندہ تاریخ سمجھتے تھے۔ میں نے چغتائی صاحب سے سرورق کی فرمائش کی۔ موصوف اُن دنوں علامہ اقبال کا کام مصور کرنے میں بے پناہ مصروف تھے۔ دم لینے کی فرصت نہ تھی، تاہم نہ صرف بہت عمدہ اور معنی خیز سرورق عطا فرمایا بلکہ شاہد مرحوم پر ایک اچھا مضمون بھی لکھ کر مجھے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بھیجا جو کتاب میں شامل ہے۔

راقم الحروف اس زمانے میں ''اردو ڈائجسٹ'' کے شعبہ ادارت سے منسلک تھا اور سالنامہ نکالنے کا پروگرام طے پا رہا تھا۔ خیال آیا کہ سرورق چغتائی صاحب سے لیا جائے، چنانچہ ان سے عرض کیا گیا۔ انھوں نے فوراً ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ بہت سی تصویریں آپ کے سامنے رکھ دوں گا جو پسند آئے گی وہ سالنامے کے لیے لے جایئے گا۔

میں اور الطاف حسن قریشی صاحب ان کے دولت کدے پر پہنچے۔ وہی فن کار جو ملک کے سب سے بڑے حاکم کے استقبال کے لیے اپنے مکان سے سے نیچے نہ اُترا تھا، ہمارے لیے چشم دید تھا۔ وہ ہمیں اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ چاروں طرف بڑی بڑی تصویریں خوبصورت فریموں میں سجی ہوئیں، ہمارے سامنے تھیں۔

ہم نے تصویریں دیکھیں اور نقشِ حیرت بن گئے۔

نگارخانہ چین بھی ان تصویروں کے سامنے ہیچ و عاجز نظر آتا۔ تصویریں کیا تھیں گلہائے رنگا رنگ کا خزاں نادیدہ چمن تھا جو یکایک ہمارے سامنے کھل گیا تھا۔ بلاشبہ چغتائی صاحب رنگ و خطوط کے شاعر ہیں اور یہ شاعری الفاظ کی شاعری سے زیادہ نازک اور سجیلی ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ حافظ و خیامؔ اور رومیؔ و اقبالؔ کی روحیں یک جان ہو کر چغتائی کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔ مانیؔ و بہزاد زندہ ہوتے تو اس قالب کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ہر تصویر جیسے ایک مرقع غزل، ہر رنگ سرمستانِ محبت کے لیے خم خانہ، ہر خط بادۂ ذوق و شوق کا پیمانہ، کہیں عشق کی جاں گدازی، کہیں حسن کی فتنہ پردازی، کہیں عالمِ ملکوت کی جھلکیاں، کہیں عالمِ لاہوت کی بوالعجبیاں، رنگ کہیں نیرنگ، کہیں جوش کہیں خروش۔ غرض ارض و سما کی بے کراں وسعتیں ان تصویروں میں سمٹی ہوئی۔ حد یہ کہ تصوف کا پورا فن اور اس کے تمام باریک نکتے چغتائی نے اپنی تصویروں میں سمو دیے تھے۔ کوئی صاحب حال صوفی ان تصویروں کو دیکھتا تو وجد میں آ کر رقص کرنے لگتا۔ معرفت و حقیقت کے کیسے کیسے، دقیق مضامین چغتائی کے موقلم سے ٹپکتے ہیں کہ عقل تحیر میں ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں کرنے والے ان تصویروں کو دیکھتے تو پتہ چلتا کہ وجود کیا ہے، شہود کیا۔

گیسوئے یار ہیں خطِ رُخسار سے الگ
خطِ شکست ہے خطِ گلزار سے الگ

معلوم ہوا کہ ہم خطوط و رنگ کے ایک طلسمِ ہوش رُبا میں گھر گئے ہیں۔ ایک تصویر کا عنوان تھا اقبالؔ اور رومیؔ۔ چغتائی نے یہ تصویر صرف سبز رنگ سے بنائی تھی۔ ایک پرشکوہ سر بفلک کوہ کی چوٹی پر دو سائے سے نظر آتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا دوسرا بڑا۔ معلوم ہوا یک مرشد رومیؔ دوسرا اقبالؔ ہے۔ چغتائی نے محض ایک رنگ سے نہ جانے کتنے رنگ پیدا کر دیے تھے۔ اور لمحہ بہ لمحہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ تصویر زندہ ہو رہی ہے اور ہم خود اس ماحول کا جزو بن گئے ہیں۔ چغتائی صاحب کا خلوص دیکھیے کہ جو تصویر ہم نے مانگی انھوں نے عنایت کی، مگر بعض ناگفتنی وجوہ کے باعث وہ تصویر سالنامے کی زینت نہ بن سکی۔ اس میں سراسر کوتاہی ہماری تھی لیکن چغتائی صاحب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا اور انھوں نے آج تک نہ پوچھا کہ وہ تصویر نہ چھاپنے اور واپس کر دینے کی وجہ کیا تھی۔

چغتائی صاحب بظاہر بڑے روکھے پھیکے اور خشک نظر آتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ باغ و بہار قسم کے انسان ہیں۔ موج میں ہوں گے تو لطائف و ظرائف کا ایک دفتر کھول دیں گے۔ خود بھی ہنسیں گے دوسروں کو بھی ہنسائیں گے۔ انھوں نے تہذیب و تمدن کا ایک پورا دور دیکھا ہے۔ وہ اس کی تفصیلات اور جزئیات تک سے واقف ہیں۔ وہ مغلوں کے عہد میں پیدا ہوئے ہوتے تو بار بار زر و جواہر میں تلتے اور یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو جابجا ان کے مجسمے بازاروں میں لگائے جاتے اور ان کی شخصیت اور فن پر ڈھیروں کتابیں لکھی جاتیں۔ ●●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

محمد جمیل اختر

طوفان کے بعد...

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ صبح جب لوگوں نے گھروں کے دروازے کھولے تو گلیوں میں پانی ابھی بھی بہہ رہا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں جو کل تک پتوں میں چھپی ہوئی تھیں، آج یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے اِن پر کبھی کوئی پتا اُگا ہی نہ ہو۔ درختوں کی جھکی اُداس ٹہنیاں کسی ہجر کا استعارہ معلوم ہوتی تھیں۔ بچے کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی سے کھیل رہے تھے۔ اُن بچوں کے قہقہے طوفان کے بعد پھر زندگی کے ہونے کا ثبوت تھے، لیکن وہ نوجوان جس کی عمر بیس اکیس سال ہوگی، اپنے کمرے میں کمبل کے اندر حالتِ خوف میں کانپ رہا تھا۔ اُس نے ایسا منظر دیکھ لیا تھا جو باوجود کوشش کے اُس کی آنکھوں سے ہٹ نہیں رہا تھا۔

کل رات جب بارش ہو رہی تھی، بیت الخلاء جانے کے لیے اُٹھا۔ پہلے اُس نے بکریوں کے کچے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ گاؤں میں اُن دنوں بکریوں پر عجیب وغریب ''پاگل پن کی وبا'' نے حملہ کر رکھا تھا۔ روز کسی نہ کسی کی بکری رات کو تڑپنے لگتی اور صبح تک زمین پر سر مار مار کر خود کو اتنا زخمی کر لیتی کہ اُسے بچانا ناممکن ہو جاتا۔

زندگی اور محبت بعض اوقات انسان کے ساتھ عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ ایک نوجوان کی قلبی کشمکش کا فسانہ

AR AZEEM
pakistanipoint.com

اس نوجوان کے پاس بھی تین بکریاں تھیں اور اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائیں۔ اُس وقت طوفان تو تھم چکا تھا لیکن ہلکی ہلکی بوندا باندی ابھی بھی ہو رہی تھی۔ اِسی دوران اُسے چند آوازیں سنائی دیں۔ شاید کوئی لڑ رہا تھا۔ آوازیں یقیناً سامنے والے مکان سے آ رہی تھیں جو ابھی چند ہی روز پہلے آباد ہوا تھا۔ اُس نے آوازوں کو نظر انداز کیا اور جلدی سے بیت الخلاء میں گھس گیا۔ وہیں اُس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ باہر نکلا تو اُسے محسوس ہوا، دیوار کے اُس پار گلی میں کوئی دوڑ کر گزر رہا ہے۔ وہ فوراً دیوار پر چڑھ کر گلی میں جھانکنے لگا۔ دُور ایک سایہ دوڑتا ہوا غائب ہو گیا تھا۔

سامنے کے مکان میں ہلکی روشنی والا بلب جل رہا تھا اور ایک آدمی خون میں لت پت پڑا تھا۔ نوجوان کو سمجھ نہ آئی کہ ایسی صورتِ حال میں اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ واپس آیا اور کمبل میں گھس گیا لیکن اُس منظر نے اُسے بے حد خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو یہ آدمی اُن کے محلے میں رہنے آیا تھا اور آج اُسے کسی نے قتل کر دیا۔

گزشتہ اتوار گلی میں سامان سے بھرا ٹرک آ کر رُکا۔ چند مزدور سامان اُتارنے لگے۔ وہی آدمی جو اَب قتل ہو چکا تھا، مزدوروں کو سامان اندر لے جانے کے لیے مختلف احکامات دے رہا تھا۔ اُس کی عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ سر کے بال اور مونچھیں مکمل سیاہ تھیں۔ وہ یقیناً اِنھیں رنگتا ہو گا۔ آدمی کے اِس مکان میں منتقل ہونے کے تین روز بعد ایک عورت اُس کے دروازے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''لوگو میرے ساتھ ظلم ہو گیا۔ میرا شوہر مجھے اور بیٹی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا ہے۔ اب وہ ضرور دوسری شادی کر لے گا۔ ہائے میرا کیا ہو گا؟''

محلے کے لوگوں کے لیے یہ عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ وہ اُس آدمی سے ابھی پوری طرح واقف بھی نہیں تھے تو اِس عورت کو بھلا کیا جانتے، لیکن انھوں نے اُس گھنی مونچھوں والے صاحب سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں اپنی بیوی کے ساتھ یہ ظلم کر رہا ہے؟ اُس نے محلے والوں کو بتایا کہ وہ تو خود اِس عورت سے تنگ ہے بس بیٹی کی وجہ سے اِسے طلاق نہیں دے سکتا۔

''یہ میری بیوی نہیں بلکہ جادوگرنی ہے۔ اِس نے مجھ پر جادو کروا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہر وقت میرے سر میں درد رہتا اور خوابوں میں اژدھے منہ کھولے مجھے کھانے کے لیے دوڑے چلے آتے ہیں۔ ساری رات مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میری چارپائی ہلا رہا ہو۔ اُٹھ کر دیکھتا ہوں تو کوئی نہیں ہوتا۔ یہ خود دوسری شادی کرنا چاہتی ہے۔ جوان بیٹی کی وجہ سے اِسے طلاق بھی نہیں دے سکتا۔ ہائے میرے بیٹی جو مجھے بہت یاد آتی ہے لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔''

محلے کے لوگوں نے اِس حمید نامی اس آدمی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور وہ عورت روتی پیٹتی واپس چلی گئی۔

وہ نوجوان کمبل میں لیٹا اب خوف سے کانپ رہا تھا۔ باہر صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔

''قتل ہو گیا، نیا رہائشی قتل ہو گیا۔'' اُس نے بستر ہی میں یہ آوازیں سُنیں۔ وہ بھاگ کر گلی میں گیا، جہاں ایک ہجوم جمع تھا۔ بارش کا پانی ابھی بھی گلی سے گزر رہا تھا، ساری رات بادل برسیں تو گلیاں اتنی جلدی پانی سے خالی نہیں ہوتیں۔

کچھ ہی دیر میں پولیس آ گئی اور محلے میں لوگوں سے تفتیش کرنے لگی۔

''سچ پوچھیں تو ہم حمید صاحب کو ابھی مکمل طور پر جان ہی نہ پائے تھے سوائے یہ کہ وہ ایک ہفتہ قبل یہاں آئے اور رات کوئی اُنھیں قتل کر کے چلا گیا۔'' ایک محلے دار نے ہمت کر کے پولیس کو بیان دیا۔

''جناب! اُن کا اپنی بیوی کے ساتھ بھی جھگڑا چل رہا تھا۔ تین روز پہلے وہ عورت یہاں آئی اور لڑ جھگڑ کر چلی گئی۔ وہ جاتے ہوئے اسے بہت بددعائیں دے رہی تھی......اور

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

وہ......انسپکٹر صاحب! وہ عورت جادو بھی کراتی ہے، ہو سکتا ہے اسی نے یہ سب......'' ایک اور محلے دار نے ڈرتے ڈرتے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''کسی نے رات کو گولی چلنے کی آواز سنی تھی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

کسی نے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ وہ نوجوان عجیب تذبذب کا شکار تھا...... ہاتھ اُٹھائے کہ نہیں لیکن پھر وہ بول اُٹھا۔

''جی میں نے رات کو آواز سنی تھی۔ اُس وقت میں غسل خانے میں تھا۔''

انسپکٹر اُس کے قریب آ گیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوالات کرنے لگا۔'' رات کس وقت کی بات ہے؟''

''دو...... ہاں یہ دو بجے کی بات ہے۔ بارش کی رفتار میں کمی آ گئی تھی۔ میں باہر آیا تو کسی کی اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں اُس وقت بکریوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بکریوں پر پاگل پن کی بیماری حملہ کر رہی ہے اور وہ زمین پر سر پٹخ پٹخ کر مر جاتی ہیں تو مجھے اِن کی فکر ستائے رکھتی ہے۔ میں نے غسل خانے ہی میں گولی چلنے کی آواز سُن لی تھی۔ باہر نکل کر میں جلدی سے بیرونی دیوار پر چڑھ گیا، لیکن کوئی بہت دُور بھاگے جا رہا تھا۔ میں اُسے پہچان نہیں پایا۔''

''نوجوان! تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہو گا۔'' انسپکٹر نے کہا اور اسے پولیس وین میں بٹھا دیا گیا۔

''لیکن جناب، میں نے تو کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ مجھے پولیس اسٹیشن کیوں لے جایا جا رہا ہے؟''

''ڈرو مت۔ تمہیں بس یہی بیان وہاں ریکارڈ کروانا ہے۔''

اُس کا باپ پاس کھڑا سوچ رہا تھا آخر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُس نے گولی چلنے کی آواز سُنی۔ آواز کا کیا ہے وہ تو اُس نے بھی سُنی تھی لیکن اِس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ وہ قاتل کو جانتا ہے۔

اُس رات نوجوان بیان ریکارڈ کروانے گیا اور اب اُسے گئے گیارہواں مہینہ تھا۔ پولیس والے اُس سے قاتل کے متعلق بے تکے سوالات کیا کرتے۔

''اُس کی شکل کیسی تھی؟''......''وہ دونوں کس بات پر جھگڑ رہے تھے؟''......''کیا اِس جھگڑے میں روپے پیسے یا زمین کی کوئی بات بھی تھی؟ کسی عورت کا نام جو تم نے سنا ہو؟''......''گولی لگتے ہی وہ قاتل بھاگ گیا تھا یا اُس نے کچھ سامان بھی اُٹھایا تھا؟''......''کیا وہ اکیلا تھا؟''

ایسے بہت سے سوالات جن کے جوابات اُسے معلوم نہیں تھے۔ وہ اِسے سزا کے طور پر اُلٹا لٹکا دیتے۔ اُس کا جی چاہتا کہ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے لیکن وہ بکری نہیں انسان تھا۔ اُسے اپنے ماں باپ یاد آ جاتے جو اُس کے انتظار میں روتے رہتے تھے۔ اُس کا باپ ہر ملاقات پر اُسے بتاتا کہ بہت جلد حمید کی بیوی کا پتا چل جائے گا۔ وہ اُسے تلاش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ یقیناً اِس قتل کا دوسرا سرا اُسے تلاش کرنے پر ہی ملے گا۔ وہ دیکھتا کہ چند ماہ ہی میں اُس کا باپ بے حد بوڑھا ہو چکا اور کمر میں خم آ گیا ہے۔ دُکھ انسان کو کتنی جلدی بوڑھا کر دیتا ہے۔ گویا خوشی جوانی اور دکھ بڑھاپا ہے۔

وہ ساری رات جیل کی کوٹھڑی میں لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ جب کبھی نیند آتی تو وہ بس ایک ہی خواب دیکھتا۔ ایک ہی منظر اُس کے خوابوں سے چپک کر رہ گیا تھا۔ خواب میں سنہرے بالوں والی ایک لڑکی اُسے مسکرا کر دیکھتی اور پھر دُور ہوتی جاتی حتیٰ کہ ایک نکتے میں بدل جاتی۔ نوجوان خود کو صحرا میں دوڑتے دیکھتا جہاں ریت نے اُسے ہر جانب سے گھیر لیا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ سوچتا کہ یہ لڑکی کون ہے جسے وہ روز خواب میں دیکھتا ہے؟

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ایک رات پولیس اہلکاروں کی غفلت کی وجہ سے وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ بھاگتا رہا...... بغیر اِدھر اُدھر دیکھے۔ اُسے کسی راستے کا علم نہیں تھا۔ جب آدمی کو کسی بھی راستے کا علم نہ ہو تو ہر راستہ اُس کا اپنا ہوتا ہے اور وہ کسی بھی طرف جا سکتا ہے۔ ابھی دن کی روشنی نہیں پھیلی تھی۔ وہ ایک بستی میں جا نکلا جو مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اب وہ تھک چکا تھا۔ اُس کا جوڑ جوڑ درد کی شدت سے ٹوٹ رہا تھا۔

وہ شاید اپنی زندگی میں پہلی بار سب سے زیادہ اُسی رات بھاگا تھا۔ آخر پیاس کی شدت سے چکرا کر گر پڑا۔ کافی دیر اُوپر آسمان کی جانب ستاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا کہ اُسے زندگی سے محبت تھی۔ یہ محبت ہی تھی کہ وہ پھر ہمت کر کے اُٹھا اور قریبی گھر کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

☆☆☆

شفیق اور اُس کی بیوی گہری نیند میں تھے جب انھوں نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک کی آواز سُنی۔

"اِس وقت بھلا کون ہو سکتا ہے؟ کوئی چور، ڈاکو یا پھر...... دروازہ مت کھولنا۔" شفیق کی بیوی نے بہت آہستگی سے کہا۔ شفیق عجب تذبذب کا شکار تھا کہ دستک دوبارہ ہوئی۔

"پانی۔" ایک نحیف سی آواز تھی۔

"یہ تو کوئی پانی پینا چاہ رہا ہے۔" شفیق نے بیوی سے کہا۔

"پانی مانگنے کا یہ کون سا وقت ہے؟ مت کھولنا دروازہ۔ گھر میں جوان بیٹی ہے۔"

"پانی...... کوئی پانی دے دے۔ میں مر جاؤں گا۔" ایک درد بھری آواز آئی۔

دوسرے کمرے سے ان کی بیٹی گل رخ اُٹھ کر آ گئی۔

"اماں۔ باہر کوئی ہے۔"

ہری مرچیں

☆ بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں، سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے۔

☆ آدمی ایک بار پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔

☆ مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انھیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

☆ حجام کی ضرورت ساری دنیا کو رہے گی تاوقتیکہ ساری دنیا سکھ مذہب اختیار نہ کر لے اور یہ سکھ کبھی ہونے نہیں دیں گے۔

☆ امریکا کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہیں۔

☆ مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی، اُلجھن دور ہو جاتی ہے۔

☆ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔

☆ فقیر کے لیے آنکھیں نہ ہونا بڑی نعمت ہے۔

☆ سود اور سرطان کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

☆ اختصار ظرافت اور زنانہ لباس کی جان ہے۔

☆ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے، جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔

(مشتاق احمد یوسفی)

☆ ☆ ☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

''ہاں معلوم ہے، لیکن یوں آدھی رات کو کون کسی کے دروازے پر دستک دیتا ہے؟'' ماں کی آواز میں شش وپنج کی کیفیت تھی۔

''پانی......مسافر ہوں۔ مر رہا ہوں۔'' آواز پھر آئی۔

''یہ تو کوئی بیمار ہے۔ دروازہ کھول دیں اتاں۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' گل رخ نے کہا۔

''اچھا تم دونوں دوسرے کمرے میں جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں۔'' شفیق نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس کی بیوی فوراً اُٹھی اور باورچی خانے سے چھری لا کر اُسے پکڑا دی۔ ''یہ پاس رکھو۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔''

شفیق نے چھری پکڑی اور باہر دروازے کی جانب بڑھا۔ ''کون ہے؟''

''مسافر ہوں......بیمار ہوں۔ پانی چاہیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

شفیق نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا۔ باہر ایک آدمی گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے سر دروازے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ شفیق کے دروازہ کھولتے ہی وہ اُس کے قدموں میں آن گرا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹا لیکن اُس آدمی نے گرنے کے بعد بھی کوئی حرکت نہ کی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ شفیق اُسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔

بعد میں اُسے شفیق نے بتایا کہ وہ دس گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسے وہ پھر بھی زندہ تھا؟ ہوش میں آنے کے بعد شدید نقاہت کے مارے وہ نظر تک نہیں گھما پا رہا تھا۔

''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ رات کو تمہاری ایسی حالت کیسے ہو گئی؟'' نوجوان کی حالت کچھ سنبھلی تو شفیق نے پوچھا۔

''میں مسافر ہوں۔ پہاڑوں کے اُس پار سے آیا ہوں۔ دراصل......کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔'' اُس نے ذرا ٹھہر کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

''اوہ اچھا۔'' شفیق نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے نوجوان بے ضرر لگا۔

اُس نے اگلے دو روز وہاں قیام کیا اور اب وہ کافی بہتر تھا۔ اِس دوران شفیق مستقل اُس کے ساتھ رہا۔ اُس کی بیوی بار بار پوچھتی کہ یہ انجان مسافر کب جائے گا؟ بلکہ ایک بار تو نوجوان نے اپنے کانوں سے بھی سُن لیا جب وہ کہہ رہی تھی......''مسافر ہے تو ہم کیا کریں؟ اب بس اُسے جانا چاہیے۔''

شفیق کمرے میں آیا تو نوجوان کھڑا ہو گیا۔

''شفیق صاحب، آپ کا بہت شکریہ، اب میں چلتا ہوں۔''

''اوہ معذرت! اگر آپ نے میری بیوی کی کوئی بات سُن لی ہے تو۔ وہ غصے کی بہت تیز ہے۔ مجھے بھی ابھی اِسے سمجھنے میں کافی وقت لگے گا۔'' آخری جملہ شاید خود کلامی تھی۔

''ارے نہیں، کوئی بات نہیں شفیق صاحب! عورت کو سمجھنا کون سا آسان کام ہے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

زرینہ اور اُس کی بیٹی گل رُخ اُسے خدا حافظ کہہ کر رخصت کرنے پہلی بار اُس کے سامنے آئی تھیں۔

زندگی اور محبت بعض اوقات انسان کے ساتھ عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نوجوان زرینہ اور اُس کی بیٹی گل رخ دونوں کو جانتا تھا۔ ایک کو اُس نے اپنی گلی میں دیکھا تھا اور دوسری کو اپنے خوابوں میں۔ وہ یہ بات کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی مسکراتے ہوئے ایک نکتے میں بدل رہی تھی اور اُس نے محسوس کیا......ریت کے طوفان نے اُسے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سفرنامہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ 1983ء کی بات ہے، حکومتِ پاکستان نے انقرہ یونیورسٹی، ترکی کے شعبۂ اُردو میں میری تعیناتی کر دی۔ میں پھر ڈھائی سال ترکی میں مقیم رہا۔ اس دوران میں ترکی کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتا رہا۔ میرا زیادہ تر قیام انقرہ ہی میں رہا۔ اِس عرصے میں مجھے شہر دیکھنے، اس کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومنے، ایک ایک محلے میں جانے اور وہاں رہنے والوں سے ملنے اور ان کی معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی زندگی سے آشنا ہونے کے مواقع ملے۔ یہاں مجھے بڑی محبت ملی، بڑی عزت نصیب ہوئی جس نے مجھے اِس شہرِ بے مثال کا مزاج دان اور اِس میں بسنے والے لوگوں کا دالہ و شیدا بنا دیا۔

ایک پاکستانی استاد ترکی میں...

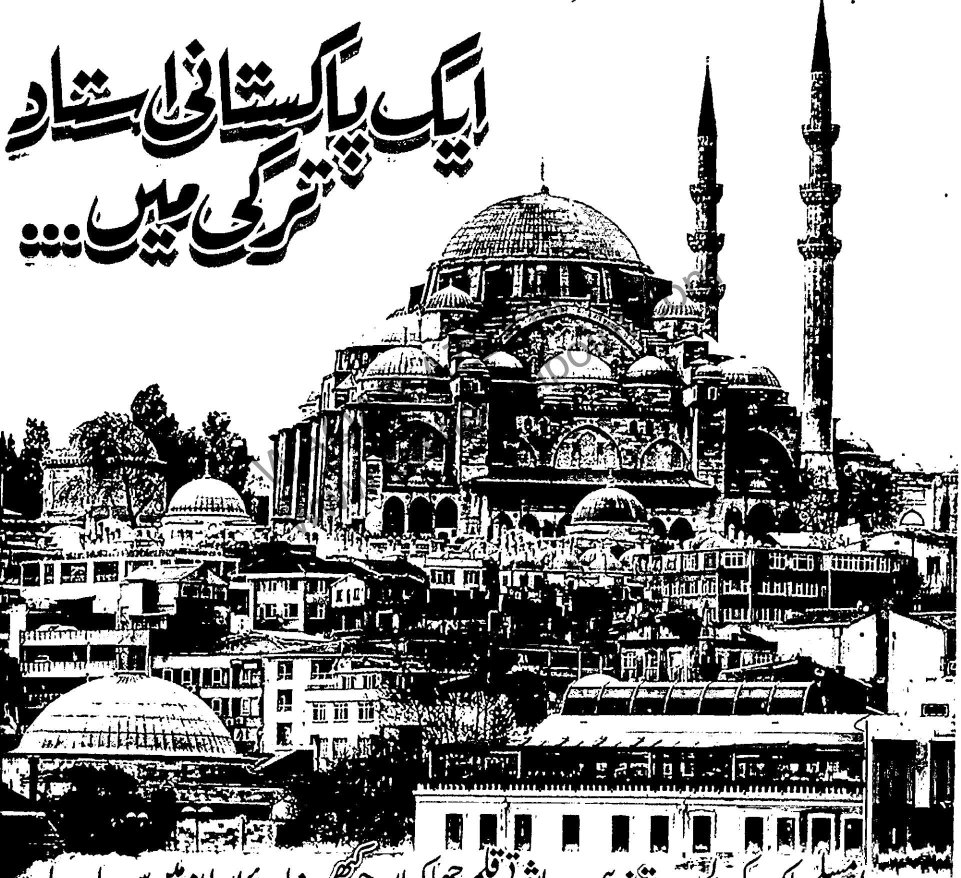

برادر مسلم ملک کی دلچسپ تہذیبی و معاشرتی قلمی جھلکیاں جو کبھی دنیائے اسلام میں سپر پاور رہا ہے

انقرہ پھولوں کا شہر ہے۔ موسمِ بہار میں یہاں پھول کھلتے ہیں اور دکانوں پر بکتے بھی ہیں۔ ہر بازار میں پانچ دس دکانیں پھولوں کی ضرور ہوتی ہیں جہاں پھول بڑی شان سے بکتے ہیں۔ ترک ان پھولوں کو بڑے شوق سے خریدتے اور گھروں میں سجاتے ہیں۔ جس زمانے میں انقرہ کا موسم خراب ہوتا ہے اور پھول باغوں میں نہیں ہوتے، تو باہر سے منگوائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اِمپورٹ ہوتے ہیں۔ انقرہ کے پھول والوں کی دکانیں کبھی بھی رنگارنگ قسم کے پھولوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ پھولوں کے دکان داروں اور خریدنے والوں، دونوں کو پھول سجانے کا بڑا سلیقہ ہے۔

انقرہ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت بڑا شہر ہو گیا ہے۔ دُور دُور تک آبادیاں ہی آبادیاں نظر آتی ہیں۔ اِس شہر کی آبادی اب تیس لاکھ سے کم نہیں، لیکن اِتنی بڑی آبادی کے اس شہر میں ٹرانسپورٹ کا نظام ایسا ہے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ شہر میں چلنے والی بسیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ بہت خوبصورت، بڑی اور کشادہ ہیں، بہت سستی ہیں اور جلدی جلدی چلتی ہیں۔ اِس لیے دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

بسوں کا نظام بھی خوب بنایا گیا ہے۔ بس میں صرف ایک ڈرائیور ہوتا ہے، کنڈیکٹر نہیں۔ چھوٹے سائز کے ٹکٹ بسوں کے اڈوں پر مل جاتے ہیں۔ دس بیس خرید لیجیے۔ بس میں داخل ہوں تو ڈرائیور کے پاس رکھے بکس میں ڈال دیجیے اور اس ٹکٹ سے جہاں بس جا رہی ہے، وہاں تک چلے جائیے۔ ہر شخص بکسوں میں ٹکٹ ڈالنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی نے ٹکٹ نہ ڈالا ہو۔ اگر کسی کے پاس ٹکٹ نہ ہو، تو وہ بس میں اشارہ کر کے کہے گا۔ ''بیتانے''، یعنی ایک ٹکٹ۔ اُسے سُن کر جس کے پاس ٹکٹ ہو گا، وہ اِس کو ٹکٹ دے دے گا۔ ٹکٹ لینے والا اُس کو پیسے ضرور دے گا۔

انقرہ کے مرکزی بس اسٹیشن سے جو بسیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں، وہ تو بہت ہی آرام دہ ہیں، اُن میں ہوائی جہاز کا مزہ آتا ہے۔ وقت کی پابندی سے یہ بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہیں ہوتی۔ جب بس اپنے سفر پر روانہ ہوتی ہے، تو کنڈیکٹر ہر مسافر کے ہاتھوں میں لیموں چھڑکتا ہے تاکہ وہ تازہ دم ہو جائے۔ پھر ٹافیوں سے اس کی تواضع کرتا ہے۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں ہر وقت مل سکتی ہیں۔ بس جہاں جہاں دورانِ سفر رکتی ہے، وہاں مسافروں کو ترکی چائے مفت پیش کی جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں انقرہ سے استنبول جا رہا تھا۔ راستے میں بس 'بولو' کے پہاڑی مقام پر ٹھہری۔ میں ریستوران میں چائے پینے کے لیے گیا۔ چائے پی کر کاؤنٹر پر بل دینے لگا، تو وہاں موجود آدمی نے 'یوک' کہہ کر بل لینے سے انکار کیا۔ کچھ مسافر وہاں کھڑے تھے، اُنھوں نے بتایا کہ بس کے مسافروں سے دورانِ سفر چائے کی قیمت نہیں لی جاتی۔ ترکی اِس اعتبار سے دنیا کے تمام ملکوں میں منفرد ہے۔

انقرہ میں ٹیکسی کا نظام بھی بہت اچھا ہے۔ میں نے کار نہیں رکھی تھی، اِس لیے اکثر و بیشتر ٹیکسیوں میں اِدھر اُدھر جاتا تھا۔ انقرہ کی ٹیکسیاں بہت آرام دہ ہیں۔ اور ہر سڑک پر، ہر آبادی میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ میٹر ایسے لگے ہیں جن میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ٹیکسی والے خوش مزاج، دیانت دار اور خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ خصوصیت صرف انقرہ کو حاصل ہے۔ ورنہ بیشتر ملکوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر ٹیکسی والے اچھے لوگ نہیں ہوتے اور مسافروں کو کسی نہ کسی طرح پریشان ضرور کرتے ہیں۔

انقرہ میں ہر طرح کی آزادی ہے، لیکن اِس کے ساتھ ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ کوئی قانون کو توڑتا نہیں۔ کوئی غیر ذمہ داری کی بات نہیں کرتا۔ کوئی اِس آزادی سے غلط فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ انقرہ کی زندگی کے ہر شعبے میں باقاعدگی نظر آتی ہے اور ہر فرد اصولوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اہمت حامدی مسجد

انقرہ میں حکومت نے شادیوں کا نظام بنا رکھا ہے۔

اسلامی طریقے سے نکاح تو گھر پر ہو جاتا ہے، لیکن دولہا دلہن کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ شادی کے ہال میں جانا پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص آتا ہے جس کو ہوجا کہتے ہیں۔ وہ ترکی زبان میں کچھ کہتا ہے اور دونوں سے عہد لیتا ہے۔ اِس کے بعد وہ رجسٹر میں اپنے دستخط کرتے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ ان کے عزیز حاضرین کو معمولی سی شیرینی تقسیم کرتے ہیں۔ سب انہیں مبارک باد دیتے ہیں، اور اس طرح یہ تقریب اختتام کو پہنچتی ہے۔

گنجلک پارک میں شادی کا جو دفتر ہے، اُس کے ہال میں مَیں نے کئی بار شادی کے یہ مناظر دیکھے، اور اِس معاملے میں ترک قوم کی باقاعدگی اور سادگی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ غرض انقرہ ایک ترقی یافتہ پاک صاف بلکہ پاکیزہ اور خوبصورت شہر ہے۔ یہ پاکیزگی اور خوبصورتی ہر اس شخص کا دل لبھاتی ہے جو یہاں تھوڑا سا وقت بھی گزارتا اور یہاں کے نظامِ حیات کی فضا کو قریب سے دیکھتا ہے۔

اِس شہرِ بے مثال نے دو ڈھائی سال تک میرا بھی دل لبھایا ہے اور اس کے حسن و جمال کی چاندنی آج بھی میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے۔

قونیا کی سیاحت

پہلی بار قونیا پہنچ کر ہم نے مولانا رومؒ کے مزار کے لیے ٹیکسی لی جس نے مختلف آبادیوں اور بازاروں میں سے گزر کر ہمیں چند منٹ میں مولانا کے مزار پر پہنچا دیا۔

راستے میں نئی تعمیر کی ہوئی اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ بعض قدیم عمارتوں کے آثار بھی نظر آئے۔ قونیا ایک زمانے تک سلاطینِ سلجوقیہ کا پایۂ تخت رہا ہے، اِس لیے یہاں ان کی بنائی ہوئی مسجدیں اور محل ابھی تک موجود ہیں۔ ان سلاطین سے قبل یہ علاقہ یونانیوں اور رومنوں کے زمانے میں بھی اہم رہا ہے۔ ان کے زمانے کے آثار بھی یہاں تھوڑے بہت موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں تو شہر کے چپّے چپّے پر لکھی ہوئی ہیں۔ مولانا رومؒ کے مزار کی عمارت اور سلطان علاء الدین کی مسجد، مسجد سلطان سلیم آج بھی اسلامی عہد کے زریں دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

ہم لوگ اِن قدیم عمارتوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے مولانا رومؒ کے مزار پر پہنچے۔ درگاہ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب سلطان سلیم کی تعمیر کی ہوئی مسجد نظر آئی۔ آگے چلے تو سامنے مولانا کی درگاہ کا دروازہ دکھائی دیا جس پر خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا نظر آیا ''یا حضرتِ مولانا''۔

درگاہ میں داخل ہونے سے قبل میں نے سوچا وضو کر لیں۔ چنانچہ ہم لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں وضو کرنے کا معقول انتظام تھا۔ مردوں کا الگ، خواتین کا الگ۔ ہم لوگوں نے یہاں وضو کیا جس سے عجب طرح کی فرحت نصیب ہوئی اور تازگی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد ہم لوگ فاتحہ پڑھنے مزار پر حاضر ہوئے۔

صدر دروازے سے گزر کر جب ہم اندر داخل ہوئے تو آس پاس بہت سے مزار نظر آئے۔ اِن میں مولانا کے والد،

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سلطان ولد اور خاندان کے دوسرے لوگوں اور بعض رفیقوں اور مریدوں کے مزار تھے۔ درمیان میں مولانا کا مزار تھا۔ خاصی تعداد میں لوگ وہاں فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ دُعائیں مانگ رہے تھے۔ ہم سب نے بھی یہاں فاتحہ پڑھی، کلام پاک کی تلاوت بھی کی اور دیر تک عالمِ اسلام کے استحکام، ترکی اور پاکستان کی فلاح و بہبود، اپنے عزیزوں اور دوستوں کی صحت اور خوش حالی کے لیے دعائیں مانگیں۔ یہاں اِس ماحول میں تمام حاضرین پر رقت طاری تھی اور بیشتر ترک خواتین کی آنکھوں سے تو آنسو جاری تھے۔ بانسری کی دھن کی ہلکی ہلکی موسیقی اِس فضا میں گونجی ہوئی تھی اور اِس کے ساتھ مولانا کی مثنوی کا یہ پہلا شعر حواس پر چھایا ہوا تھا۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وز جدا یہا شکایت می کند

میں اِس فضا میں دیر تک ایک کونے میں کھڑا ہوا دل ہی دل میں اِس مثنوی کے اشعار پڑھتا رہا جس کے بارے میں کہا گیا ہے 'ہست قرآں در زبانِ پہلوی'۔ اِس عرصے میں برابر رِقت طاری رہی۔ میں اپنی اِس کیفیت کا تجزیہ نہ کرسکا۔ سوائے اِس کے کہ میں ایک بہت بڑے بزرگ، بہت بڑے عالم، بہت بڑے فلسفی اور عظیم شاعر کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ جس کا دیدار کرنے کے لیے میں نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔ آج ان خوابوں کو باری تعالیٰ نے حقیقت بنا دیا۔ علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار بھی اس عالم میں بہت یاد آئے۔

مُرشدِ رومیؒ حکیم پاک باز
شرح مرگ و زندگی برما کشاد
پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
پیر رومیؒ مُرشد روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

سُرور کی یہ کیفیت تھی کہ مزار کے پاس سے ہٹنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مولانا بہ نفسِ نفیس سامنے بیٹھے اور زِندہ ہیں، اور حاضری دینے والے تمام لوگوں سے محوِ کلام ہیں۔ ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر، اولیاء اللہ اور بزرگان ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اُن کا فیض بھی ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، اِس لیے مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ صحیح تھی۔ اِس احساس نے مجھے مولاناؒ کے بہت قریب کر دیا۔ میں نے اُن سے باتیں کیں۔ اپنے قلم کی توانائی اور شادابی کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ اس انسان کے پیدا کرنے میں معاون ہو جس کی مولانا کو زندگی بھر تلاش رہی اور جس کی جتنی ضرورت آج ہے، شاید اِس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

استنبول میں قیام

ترکی میں دورانِ قیام استنبول بھی گیا۔ غازی ہوٹل میں تھوڑی دیر آرام کر کے ہم لوگ سب سے پہلے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر گئے۔ حاضری دی، فاتحہ پڑھی اور دیر تک وہاں کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے رہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بہت بڑے بزرگ تھے، ولی تھے اور کانسٹی ٹائن (قسطنطنیہ) کے اِس شہر پر، جب مسلمانوں نے حملہ کیا تھا تو حضورﷺ کی فوج کے دوش بدوش یہ بھی جہاد میں شریک ہوئے۔ یہ بھی لڑے تھے اور شہید ہو گئے۔

اُن کی قبر کا ایک زمانے تک کسی کو پتا نہ چلا۔ جب کئی سو سال بعد سلطان محمد فاتح نے اِس شہر کو فتح کیا، اور وہ اپنے اُستاد اور بزرگ آقا شمس الدین کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوا۔ ایک رات شمس الدین نے خواب میں دیکھا کہ شہر کے فلاں حصے میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر ہے۔ جب اس جگہ کو کھودا گیا، تو یہ قبر صحیح حالت میں برآمد ہوئی۔ چنانچہ سلطان نے اس پر ایک عمارت تعمیر کروائی جو آج تک اسی حالت میں موجود ہے۔ ساتھ ہی وہ مسجد ہے جو صدیوں پہلے تعمیر ہوئی اور جس میں سلاطینِ عثمانیہ کی تاج پوشی کی رسم ادا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استنبول یونیورسٹی

ہوئی تھی۔ یہ مسجد فاتح محمد نے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کروائی تھی۔ سلطان سلیم نے اس کو کوئی سو سال بعد از سرِ نو تعمیر کروایا اور اس کے نقشے میں کچھ تبدیلیاں کیں۔

مزار پر فاتحہ پڑھ کر ہم لوگ اس مسجد میں گئے اور وہاں نماز پڑھی۔ پھر مزار کے آس پاس شہیدوں کی جو بے شمار قبریں ہیں، اُن پر فاتحہ پڑھی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار کے احاطے کے آس پاس دُور دُور تک شہیدوں کے مزار ہیں، جن میں سے کچھ مزاروں پر تو نام لکھے ہیں، لیکن کچھ پر نام نہیں۔

ان مزاروں پر فاتحہ پڑھ کر ہم پر جو کیفیت طاری ہوئی، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخِ اسلام کی اَن گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ یہاں خدا جانے کتنے فوجی، سیاست دان، فن کار، شاعر اس آبادی میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے قبرستانوں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار دیکھ کر ہم توپ کاپی محل دیکھنے گئے۔ مختلف مقامات دیکھ کر ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ سے متعلق مختلف اشیا زیارت کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں سامنے ایک تختی لگ ہوئی نظر آئی جس پر ترکی اور انگریزی زبانوں میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:

”اب آپ ایک ایسے مقام پر داخل ہو رہے ہیں جو حد درجہ مقدس اور محترم ہے۔ کیونکہ اس میں اسلام سے متعلق مقدس اشیاء رکھی گئی ہیں۔ یہاں شور نہ کیجیے۔ ہنسیے نہیں۔ مذاق نہ کیجیے، سنجیدہ رہیے اور اِس جگہ کے تقدس کا خاص خیال رکھیے“۔

اِس عبارت کو پڑھ کر ہم لوگ اس کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلے آنحضرت ﷺ کی قبائے مبارک، دندا مبارک اور موئے مبارک، قدم مبارک کے ایک نقش اور ایک مکتوبِ مبارک کی زیارت کی۔ یہ مقدس اشیاء سلاطینِ عثمان کے زمانے میں حاصل کر کے یہاں رکھی گئی تھیں۔ ہمیں بتا گیا 15 رمضان المبارک کو سلطانِ وقت اس مقام پر حاضر

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

دیتے تھے اور ان مقدس و محترم اشیاء کی زیارت کرتے۔

ہم نے بھی اِن مقدس اشیاء کا دیدار کر کے اپنے سینوں کو نور اور آنکھوں کو سُرور کی روشنی سے بھر لیا۔ پھر اِس کے بعد خلفائے راشدین کی تلواریں دیکھیں جن کو نہایت اہتمام سے الماریوں میں رکھا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ایک پیالے، حضرت موسیٰؑ کے عصا، حضرت یوسفؑ کی پگڑی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے قالین کی بھی زیارت کی۔

زبانِ یارِ من ترکی

ایک بار دُکان کے کاؤنٹر پر بیٹھی ایک خوبرو خاتون سے میں نے پوچھا ''انگلیزجے بلیورسنوز؟'' (یعنی آپ انگریزی سمجھ لیتی ہیں؟'')۔

جواب ملا ''نو انگلش، نو انگلش!''

اور وہ یہ کہہ کر خوب ہنسیں اور اشاروں میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہا۔

مجھے اُن کے اِس انداز نے بہت لطف دیا۔ دل میں کہا کاش میں تم سے زیادہ باتیں کر سکتا!

یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے ترکی بالکل نہیں آتی تھی۔ صرف دو چار فقرے کام چلانے کے لیے میں نے سیکھ لیے تھے۔ ان فقروں کو میں اکثر استعمال کرتا۔ ترک ان فقروں کو سُن کر بہت خوش ہوتے، یہ سمجھ کر یہ شخص ہے تو کہیں باہر کا لیکن ہماری زبان بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک دن میں ایک دکان پر گیا۔ کچھ چیزیں دیکھیں اور پوچھا ''بونے قدر؟'' (یعنی اِس کی کیا قیمت ہے؟)۔

دکان دار نے کہا ''بیش بن لیرا'' (یعنی پانچ ہزار لیرا)۔

میں نے کہا ''چوک فیات براز اندرم ممکن ماء'' (یعنی بہت قیمت ہے۔ کیا قیمت میں کچھ کمی ممکن ہے؟)

جواب ملا ''ممکن دیل (یعنی ممکن نہیں ہے) ''ضرر'' (یعنی نقصان ہے)۔

میں چپ رہا۔

پھر اُس نے پوچھا ''مملکت؟''

میں نے جواب دیا ''پاکستان''۔

اُس نے بے اختیار کہا ''جانم فدا پاکستان، ترکیہ پاکستان کاردیش۔ اندرم ممکن۔'' (یعنی میری جان فدا ہو پاکستان پر۔ ترکی اور پاکستان بھائی ہیں۔ قیمت میں کمی ممکن ہے۔)

قیمت میں کچھ کمی کر کے اُس نے وہ چیز مجھے دے دی۔

پھر چلتے وقت اُس نے مجھے گلے لگایا اور فارسی بولنے لگا۔

''برادرِ ما۔ مسلم پاکستانی۔ برکت اولس''۔

ترکی میں صرف ترک زبان بولی جاتی ہے۔ ترکوں کی اکثریت کوئی اور زبان نہ بولتے نہ سمجھتے ہیں۔ انگریزی کا تو اُس زمانے میں نام و نشاں تک نظر نہیں آتا تھا۔ سڑکوں پر، بازاروں میں، کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں، بینکوں میں، دفتروں میں صرف ترکی زبان سنائی دیتی اور سارا کاروبارِ حیات اِسی زبان میں چلتا۔ گویا ترکی زبان ترکوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

ترکوں کو اپنی زبان سے بڑی محبت ہے اور عوام و خواص میں اس محبت کو پیدا کرنا مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کا کارنامہ ہے۔ عثمانیوں کے زمانے میں ترکی بولنے کی زبان تھی۔ لکھنے اور تصنیف و تالیف کے لیے زیادہ تر فارسی استعمال کی جاتی تھی۔ اتاترک نے قوم کی تعمیر کے لیے ترکی زبان کی اہمیت کو محسوس کیا، اس کو ترکوں کے دلوں میں جگہ دی اور زندگی کے ہر شعبے میں یوں رائج کیا کہ وہ قومی زندگی کا بنیادی جز بن گئی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ترکی میں ایک سے دوسرے سرے تک ترکی بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔ کوئی اور زبان نہ تو بولی جاتی نہ لکھی جاتی ہے۔ یہاں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم کے لیے قومی زبان کتنی اہمیت رکھتی ہے اور اتاترک نے اِس زبان کو ترکوں کا اوڑھنا بچھونا بنا کر کیسی عظیم قومی و ملّی خدمت انجام دی۔

اتاترک کی منصوبہ بندی ہی کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے ترکی کے ہر تعلیمی ادارے میں اعلیٰ تعلیم تک ترکی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

زبان میں ہوتی ہے۔ انجینئرنگ اور میڈیسن تک ترکی زبان میں پڑھائی جاتی ہیں، اور ترکی اِن علوم کی تحقیق و تدریس میں کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ یہاں شہرۂ آفاق انجینئر اور ڈاکٹر ہیں جو انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانیں نہیں جانتے۔ یہ لوگ نئی سے نئی تحقیق کا ترجمہ ترکی میں کر لیتے ہیں۔ اِس طرح اپنے علمی سفر میں غیرملکی زبانوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

ترکی میں دورانِ قیام میں ایک دن مجھے دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ میں نے اس کے سامنے اپنا حال انگریزی میں بتانا شروع کیا، لیکن وہ کچھ نہ سمجھا، اور کہنے لگا ''انگلیز چہ بل می یورم'' (یعنی میں انگریزی نہیں جانتا)۔

میں نے کہا ''بن براز ترکچہ کنشیورم''۔ (یعنی میں تھوڑی سی ترکی بول سکتا ہوں)۔

اُس نے کہا ''چوک گزیل''۔ (یعنی بہت خوب)۔

چنانچہ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی، لولی لنگڑی ترکی میں اپنا حال اُسے بتایا تو وہ سمجھ گیا اور اُس نے بڑی محبت سے میرا علاج کیا۔

رخصت ہوتے وقت اُس نے معذرت کی اور کہا ''ترکی میں کسی اور زبان کے استعمال کا رواج نہیں اور انگریزی تو یہاں بالکل نہیں چلتی، کیونکہ انگریزوں سے ترکوں کی دشمنی رہی ہے۔ میں تھوڑی سی جرمن جانتا ہوں، لیکن وہ بھی مشق نہ ہونے کی وجہ سے بھول گیا ہوں''۔

میں نے کہا ''اپنی قومی زبان کا استعمال تو قوم کی شناخت ہے۔ یہ ضروری ہے۔ میں آپ لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ہمارے ہاں انگریزی رائج ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے''۔

اس نے کہا ''انگریزی تو اب بین الاقوامی زبان ہے۔ اس کے استعمال سے فائدے ہوتے ہیں۔ پاکستان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ترقی کی ہے، اُس میں انگریزی زبان کا خاصا ہاتھ ہے''۔

ڈاکٹر نجم الدین دیر تک بولتے رہے، اور میں دل ہی دل میں اُن کی تہذیب و شائستگی کی داد دیتا رہا۔ دراصل اُن کی اس تقریر کا مقصد یہ تھا کہ میں انگریزی کے بارے میں اُن کی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

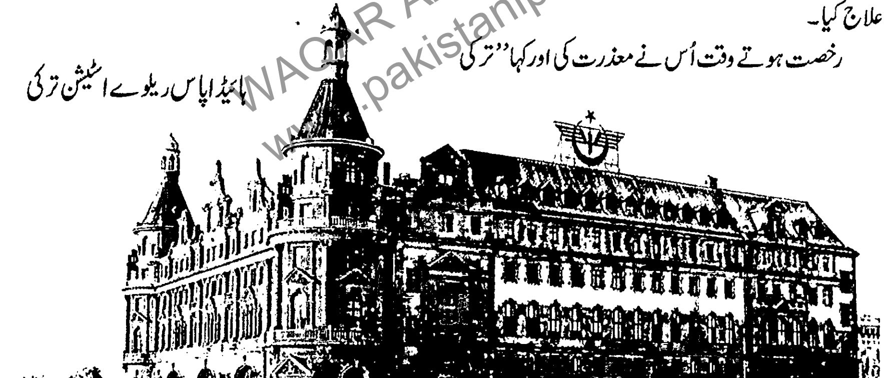

ہائیڈا پاس ریلوے اسٹیشن ترکی

باتوں کو محسوس نہ کروں۔

ترکی دنیا کے ایک ایسے حصے میں واقع ہے جہاں موسم تقریباً سارا سال خوشگوار رہتا ہے۔ بیشتر علاقوں میں چار پانچ مہینے شدید سردی ہوتی ہے اور برف بھی بہت گرتی ہے، لیکن اس موسم کا اپنا حُسن ہے۔ برف گرتی ہے، تو ہر چیز حدِ نظر تک سفید براق ہو جاتی ہے۔ سردیوں کے ختم ہونے کے بعد جب بہار آتی ہے تو درخت سرسبز و شاداب ہو کر والہانہ انداز میں جھومتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے اور رنگ رنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ موسمِ گرما میں دھوپ کی گرمی اور روشنی اپنا جلوہ دکھا کر دلوں میں گرمی اور روشنی پیدا کرتی ہے۔

ترک جری اور بہادر قوم ہے۔ سو پشت سے اُن کے آبا کا پیشہ سپہ گری رہا ہے۔ اُنھوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں، اور اِن جنگوں میں عزم و ارادے کی پختگی اور کردار کی بلند اخلاقی کا جو مظاہرہ کیا ہے، وہ تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انہیں عظیم اسلاف نے سکھایا۔ عثمانیوں کے زمانے میں ترکوں میں بہادری اور جرأت مندی تو تھی، لیکن اخلاق کی وہ بلندی شاید نسبتاً کم تھی جس کا عملی نمونہ اتاترک نے پیش کیا۔ اتاترک فوجی جرنیل ہی نہیں، بلند مرتبہ مدبر بھی تھے۔ اُن کی زندگی کا ایک واقعہ اِس خیال پر صداقت کی مہر لگاتا ہے۔

جب اتاترک نے کئی سال کی مسلسل جنگ کے بعد یونانیوں پر فتح حاصل کی، تو یونانیوں کے سپہ سالار ٹیکوپیز (TIKOPIZ) کو اتاترک کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتاترک نے مفتوح سپہ سالار کو نہایت عزت اور احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا اور اس سے باتیں کیں۔ دورانِ گفتگو یونانی کمانڈر نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کافی (قہوہ) پینا چاہتا ہے۔

اتاترک نے فوراً کافی منگوائی، اس کے ساتھ خود بھی پی، اور کہا: ”آپ تو میرے مہمان ہیں، آج تو آپ کھانا بھی میرے ساتھ کھائیں گے۔“ اس طرح کا رویہ شاید ہی کسی فاتح نے اپنے مفتوح کے ساتھ اختیار کیا ہو گا۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اجداد کی اس بلند اخلاقی نے ترکوں کو بھی اخلاقی اعتبار سے ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے عام دشمنوں تک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ مہمان نوازی اُن پر ختم ہے۔ دنیا میں صرف دو قومیں مہمان نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں: ایک ترک اور دُوسرے پاکستانی۔

◆●●

دوستی کے اُصول

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے دوست کے پاس گیا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دوست نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا کہ مجھ پر چار سو درہم قرض ہیں: دوست نے چار سو درہم اس کے حوالے کر دیے اور روتا ہوا (گھر کے اندر) واپس آیا!

بیوی نے کہا کہ اگر ان درہموں سے تجھے اتنی محبت تھی تو دیے کیوں؟

اس نے کہا کہ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ مجھے اپنے دوست کا حال اس کے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو سکا حتیٰ کہ وہ میرا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو گیا۔

(انظر: احیاء العلوم الدین، اردو، ج 3، ص 843)

امام غزالی مزید لکھتے ہیں کہ دوستی کو نکاح کے تعلق کی طرح تصور کرنا چاہیے کیوں کہ اس میں بھی حقوق ہیں۔ جو چیز ضرورت اور حاجت سے زائد ہو اسے بنا مانگے اپنے دوست کو دے دے؛ اگر اسے مانگنے اور کہنے کی نوبت آئے تو یہ دوستی کے درجے سے خارج ہے۔ (ملخصاً: کیمیائے سعادت، اردو، ص 291)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بادشاہ سلامت

مشکور حسین یاد

ہماری زندگی معمول کے مطابق اچھی خاصی گزر رہی تھی کہ پچھلے دنوں ہمارے بچوں کی منجھلی خالہ ہمارے گھر تشریف لائیں اور ہمارے غیر معمولی انکسار کو دیکھ کر بولیں: ”اے ہے بھائی جان! آپ اتنا بھی اپنے آپ کو نہ گرائیں۔ کسرِ نفسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ اِس گھر کے بادشاہ ہیں۔“

”اری بہن! چھوڑو۔ ہم بادشاہ کیسے ہوئے؟“

ہمارے اس سوال پر اُن محترمہ نے ایسے ایسے زبردست دلائل پیش کیے کہ ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ واقعی ہم اپنے گھر کے سب سے بڑے فرد ہیں۔ کما کر بھی لاتے ہیں۔ ماشاءاللہ نصف درجن بچوں کے باپ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک عدد بیوی کے خاوند ہیں۔ خاوند خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، آخر خاوند ہے، بیوی کا مجازی خدا۔

ہم نے سوچا ہم بھی کس قدر بے وقوف واقع ہوئے ہیں کہ حالات ہمارے حق میں اِس قدر سازگار ہوں اور ہم پھر بھی گھر میں بھیڑ بکری بنے پھر رہے ہیں۔ ہمیں تو گردن اکڑا کر، سینہ تان کر اور ایک خاص رعب و دبدبے کے ساتھ چلنا چاہیے۔ بادشاہ کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ وہ اپنی مرضی چلاتا ہے۔ جس طرح چاہتا ہے، کرتا ہے۔ سونے کی خواہش ہوئی تو سو گئے، کھانے کی خواہش ہوئی تو کھا لیا، جی بہلانے کی خواہش ہوئی، جی بہلا

ابھی دنیا میں ایسے بادشاہ موجود ہیں جو نہ صرف سبزی خرید لاتے بلکہ گھر میں جھاڑو بھی خود لگاتے ہیں

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

لیا۔ یہی کچھ گھر کا ایک اعلیٰ فرد بھی کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم..... کہ جو ایک عدد بادشاہ سلامت ہیں!

اِس خیال کے آتے ہی ہم نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی، تو واقعی تمام ماحول پر ہم ہی ہم چھائے ہوئے نظر آئے۔ ماشاءاللہ یہ چھے عدد بچے کس کے ہیں؟ ہمارے..... یہ ایک عدد بیوی کس کی ہے؟ ہماری..... مکان میں جو سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے، کس کا ہے؟ ہمارا..... تو پھر ہم بادشاہ نہیں، تو اور کیا ہیں..... یقیناً ہم بادشاہ ہیں۔ ہم نے فلمی بادشاہوں کی طرح تالی بجا کر کہا: ''ارے کوئی ہے؟''

جواب ندارد۔ ہم نے دوبارہ تالی بجائی: ''ارے کوئی ہے؟''

اِس دفعہ بھی ہماری اس تالی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تیسری دفعہ ہم نے ذرا زور کے ساتھ تالی بجاتے ہوئے کہا: ''ارے کوئی ہے؟''

بیوی نے صحن میں سے جواب دیا: ''یہ آج آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے جو تالیاں بجا بجا کر کوے سے اُڑا رہے ہیں؟''

ہم غصے میں آ کر چلائے: ''میں پوچھتا ہوں، کوئی ہے؟''

''میں کہتی ہوں سب ہیں۔ آپ کو نظر نہیں آ رہا کیا؟ بچے بھی سامنے کھیل رہے ہیں، میں بھی یہاں صحن میں بیٹھی ہوں۔''

بیوی کے اِس جواب پر ہمیں خیال آیا کہ ہم نے اپنی بادشاہی کا اظہار صحیح طریقے سے نہیں کیا۔ واقعی جس وقت سب لوگ سامنے ہوں، اُس وقت ''ارے کوئی ہے؟'' کی آواز نکالنا بالکل بے معنی بات ہے۔ فلموں میں بھی بادشاہ سلامت اُسی وقت تالی بجا کر ''ارے کوئی ہے؟'' کہتے ہیں جس وقت اُن کے سامنے کوئی نہ ہو۔ لہٰذا ہم بادشاہ ضرور ہیں، لیکن نامعقول بادشاہ سلامت ہرگز نہیں ہیں اور نہ ہی ہونا چاہتے ہیں۔

ہم خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اِتنے میں ہمیں پیاس لگی۔ پہلے تو ہم باقاعدہ کسی بچے کا نام لے کر کہا کرتے تھے کہ عزیزم فلاں! میاں ہمیں پانی پلاؤ اور اگر بچے نہ ہوئے تو بیگم سے کہہ دیا، لیکن اب سوچا کہ کسی کا نام لینا اصولِ بادشاہت کے خلاف ہو گا۔ ویسے بھی بادشاہ لوگ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ حکم دیتے وقت جس قدر لفظ کم ہوں، اُسی قوت کے ساتھ حکم کا صدور بہتر ہو گا۔ چنانچہ ہم نے صرف اتنا کہا: ''پانی''۔

ہمارے اِس حکم پر کوئی تعمیل نہ ہوئی۔ ہم نے دوسری بار کہا: ''پانی''۔

اب بھی بچے حسبِ معمول کھیلتے رہے۔ تیسری دفعہ ہم واقعی بادشاہوں کی طرح کڑک کر پانی کہنے لگے تھے کہ ہمیں خود خیال آیا: کیا بادشاہ خالص پانی پیتے ہیں؟ اور فرض کرو کہ پیتے ہیں تو کیا پانی کو وہ بھی عام آدمی کی طرح پانی ہی کہتے ہیں؟ ہم نے ویسے تو کسی بادشاہ کو آج تک قریب سے دیکھا ہی نہ تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہم نے کسی فلم میں بھی بادشاہ کو پانی مانگتے نہیں سنا تھا۔ لہٰذا ہم خاصے پریشان ہوئے اور آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم پانی ضرور طلب کریں گے لیکن کڑک کر نہیں بلکہ اس کے برعکس آہستگی اور رومانوی انداز کے ساتھ۔ چنانچہ ہم نے لفظ پانی کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا: ''پا..... نی''۔

بیوی صحن سے برآمدے میں ہماری طرف آ رہی تھی، کہنے لگیں: ''کچھ حیا کرو..... بچوں کے سامنے یہ جا..... نی ..... جانی..... کہہ کر مجھے کیا پکار رہے ہو؟''

ہمارا گلا واقعی خشک ہو گیا۔ ہم بیوی کو یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اُسے جانی نہیں کہا اور ظاہر ہے کہ فی الحال پانی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ قہرِ درویش کے بجائے قہرِ بادشاہ برجانِ بادشاہ کی نئی کہاوت کے تحت خود ہی اُٹھ کر پانی پی لیا۔

پانی پی کر واپس اپنے کمرے میں آئے، تو ہمیں کچھ نیند سی آنے لگی۔ سوچا کہ بادشاہ کی جملہ حرکات و سکنات کا علم اُس

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کے گھر والوں کو ہوتا ہے۔ یعنی سب کو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت اس وقت کیا کر رہے ہیں؟ سو رہے ہیں کہ جاگ رہے ہیں؟ اپنے کمرے میں ہیں یا دیوان خانے میں؟ آرام فرما رہے یا مطالعے میں مصروف ہیں؟ بیٹھے ہیں یا کھڑے ہیں۔ غرض گھر والے بادشاہ کی ایک ایک حرکت سے باخبر ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر والوں کو بتا دیں کہ ہم سونے لگے ہیں! چنانچہ ہم نے تمام بچوں کو باری باری بلا کر کہا:

''ارے بھئی! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں سونے لگا ہوں۔''

اپنے اِس اعلان پر ہم نے محسوس کیا کہ ہر بچہ کچھ حیران و پریشان ہو رہا ہے۔ سب سے چھوٹی بچی دُرِ نجف نے تو ہمیں فوراً تڑاخ سے جواب دیا: ''ابو! آپ سونے لگے ہیں، تو سو جایئے۔ ہمیں کس لیے بتا رہے ہیں؟''

بیوی کو بلا کر کہا، تو وہ نیک خصلت ایک دم بولی: ''اے ہے! سونے کے علاوہ آج تک آپ نے کچھ کیا بھی ہے۔ جو اَب ماشاء اللہ باقاعدہ سونے کا اعلان فرما رہے ہیں؟ میں کہتی ہوں ایک بار نہیں، ہزار بار سو جایئے۔ لو اور سنو مجھے کام کرتی کو باورچی خانے سے بلا کر بتایا جا رہا ہے کہ میں سونے لگا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ساٹھ سال کی عمر ہونے سے پہلے کہیں سٹھیا گئے ہیں، خدا خیر کرے۔''

ہم نے سوچا بادشاہ کی ایک ایک حرکت کا علم اُس کے گھر والوں کو ہو، یہ بادشاہت کا ایک دقیانوسی تصور ہے۔ ماڈرن بادشاہ کو اِس کی قطعی ضرورت نہیں۔ اُسے ہر صورت میں آپ اپنی پرائیویسی Privacy کہہ سکتے ہیں جو ہمارے افسر صاحبان اکثر و بیشتر قائم رکھتے ہیں۔ اُن کے گھر ملنے جایئے یا دفتر میں، آپ کو لمحہ لمحہ پتا چلتا رہے گا کہ اب صاحب بہادر کیا کر رہے ہیں!

لہٰذا ہم چونکہ نہ دقیانوسی بادشاہ رہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی فرعون بننے کا، یعنی بڑا افسر ہونے کا ہمارا کوئی پروگرام ہے، اِس لیے ہمارے واسطے یہی مناسب ہے کہ اپنی جگہ ہم بادشاہ بھی رہیں اور ایک عام آدمی کی آزادیاں بھی ہمیں پوری طرح حاصل ہوں۔ اِس خیال کے آتے ہی ہم آرام سے پڑ کر سو گئے۔ گویا اب ہم بادشاہت کے تصور میں ایک انقلاب برپا کر رہے تھے۔ ہمارے ہر خراٹے سے اِس انقلاب کی رُوح پرور صدا بلند ہو رہی تھی لیکن ابھی ہم نے اِس قسم کے دس پندرہ خراٹے ہی لگائے تھے کہ ہماری چھوٹی بیٹی نے ہمیں جھنجھوڑا:

''ابو، ابو! اُٹھیے۔ امی کہہ رہی ہیں آٹا ختم ہے۔ بازار سے جا کر آٹا لایئے۔ آٹا نہ لائے تو کھانا نہیں ملے گا''۔

ہم گھبرا کر اُٹھے۔ واقعی بیوی کل سے کہہ رہی تھیں کہ آٹا لانا ہے لیکن ہم ٹال مٹول کر رہے تھے۔ فوراً اُٹھ کر بازار کی طرف چل دیے۔ ابھی گھر سے نکلے ہی تھے کہ چھوٹی بیٹی دوڑی ہوئی آئی اور ہمارے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا پکڑا کر بولی: ''ابو! امی نے کہا ہے کہ یہ کانے بینگن واپس کر کے آیئے اور سنیے! امی نے کہا ہے کہ دکان دار سے آنکھیں کھول کر سبزی لیا کیجیے''۔

ہم نے سوچا کیا بادشاہ سلامت خود سبزی خرید کر لاتے ہیں؟ اور اگر لاتے ہیں تو کیا واپس کرنے بھی وہی جاتے ہیں؟ کیا کبھی بادشاہ نے دکان سے جا کر آٹا خود خریدا ہے؟ ہمیں اپنے اندر سے آواز آئی: ''بادشاہ ہو یا فقیر، اپنے گھر کا کام کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔''

اِس آواز کو سنتے ہی ہم ایک شانِ بے نیازی سے سبزی کا تھیلا ہاتھ میں لیے بازار کی طرف چل دیے۔ ہم اپنے آپ کو اس وقت بھی بادشاہ تصور کیے ہوئے تھے، حالانکہ ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر ایسا تصور کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

بہرحال ہم بزعمِ خود ایک بادشاہ کی طرح چلے جا رہے تھے کہ ہمیں سامنے سے فارسی کے پروفیسر ل۔م آتے دکھائی دیے۔ اُنھوں نے حسبِ معمول فارسی میں ہماری خیریت پوچھی لیکن ہم نے اُنھیں حسبِ معمول جواب نہ دیا بلکہ اُن کے سلام کے جواب میں نہایت آہستگی سے یعنی دوسرے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

لفظوں میں نہایت رعونت کے ساتھ سر کو معمولی سی جنبش دی۔

پروفیسر ل۔م نے ہمارا گریبان پکڑ کر اپنے خاص انداز میں ہم سے خطاب فرمایا:

''اوئے میاں! تجھے آج کیا ہو گیا ہے کہ اُونٹ کی طرح اکڑ اکڑ کر چل رہا ہے؟ یعنی شترِ غمزے فرما رہا ہے؟''

ہم اگرچہ اس وقت اپنے آپ کو پوری طرح بادشاہ تصور کیے ہوئے تھے لیکن پروفیسر کے اس بے ساختہ فقرے پر اپنی بادشاہت کو فراموش کر کے داد دِیے بغیر نہ رہ سکے اور اُن سے ہنس کر پوچھا:

''یار اُونٹ کا اکڑ کر چلنا تمھی سے سنا ہے۔ کیا اُونٹ بھی اکڑ کر چلتا ہے؟ اور کیا اُس کا اکڑ کا چلنا مضحکہ خیز نہ دکھائی دے گا؟''

پروفیسر ل۔م نے فوراً جواب دیا: ''یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تم بھی اس وقت چلتے ہوئے مضحکہ خیز حد تک اونٹ نظر آ رہے ہو''۔

''پیارے! میں تو اِس وقت ایک بادشاہ کی حیثیت سے چلا جا رہا تھا''۔

''وہ کیسے؟''

''کیا گھر کا سربراہ بادشاہ نہیں ہوتا؟''

''اِس حساب سے تو میں بھی بادشاہ ہوں، لیکن بھائی میاں! واضح رہے کہ بادشاہ سلامت ابھی ابھی گھر میں جھاڑو دے کر آ رہے ہیں۔ جمعدارنی ایک ہفتے سے نہیں آئی اور بیگم صاحبہ کو بخار ہے''۔

ہمیں پروفیسر ل۔م کی یہ صاف گوئی بے حد پسند آئی۔ کچھ اِس لیے بھی کہ ہمیں پتا چلا کہ ابھی دنیا میں ایسے بادشاہ موجود ہیں جو نہ صرف سبزی بازار سے خرید لاتے بلکہ گھر میں جھاڑو بھی خود لگاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے ہماری گردن اکڑ گئی۔ ہم نے اچھی خاصی بلند آواز سے اپنے آپ سے کہا:

''ہم جھاڑو ہرگز ہرگز نہ دیں گے۔ یہ بادشاہت کی کھلم کھلا توہین ہے۔ جھاڑو دینا جمعدارنی یا پھر بیوی کا کام ہے۔ اگرچہ اُس وقت سڑک پر بیوی کے نمودار ہونے کے دُور دُور تک مکان نظر نہ آتے تھے، لیکن ہمیں یوں لگا جیسے بیوی نے گھور کر دیکھتے ہوئے ہم سے پوچھا ہے:

''کیا بیوی اور جمعدارنی کو آپ برابر سمجھتے ہیں؟''

ہماری ٹانگیں کانپنے لگیں اور نہایت گرم موسم ہونے کے باوجود ہمارے دانت بجنے لگے۔ ہم نے گڑگڑا کر کہا: ''نہیں، نہیں، ہم ایسے بدتمیز اور ناہنجار خاوند نہیں ہیں، ہم تو بیوی کو سر کا تاج سمجھتے ہیں''۔

سبزی خرید کر واپس گھر پہنچے تو بیوی نے اعلان کیا: ''گٹر بند ہو گیا ہے، اسے کھلوانے کا جلد از جلد انتظام کیا جائے''۔

ہم نے غصے میں آ کر جواب دیا: ''ابھی ابھی اپنی ایسی تیسی کرا کے سبزی وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ آتے ہی آپ نے یہ حکم صادر فرما دیا۔ میں گٹر کھلوانے کا اس وقت کوئی انتظام نہیں کر سکتا''۔

بیوی نے نہایت ملائمت سے فرمایا: ''میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ گٹر کھلوانے کا انتظام کریں، اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو خود گٹر کھول دیجیے۔ ایک دفعہ آپ نے کھولا تھا''۔

اِس مکالمے کے چند لمحے بعد ہی ہم یعنی بادشاہ سلامت کپڑے اُتارے، لنگوٹ کسے، گٹر کھولنے میں مصروف تھے۔ گٹر سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ بیوی کی پھر آواز آئی۔ لیکن اس آواز میں محبت اور لجاجت اپنے کمال پر تھی۔ بیوی کہہ رہی تھیں: ''میں نے کہا پیارے! آپ اس وقت کہاں ہیں؟ اجی! آپ سن رہے ہیں؟ میں کہہ رہی ہوں سرتاجِ من.....''۔

شاید زندگی میں دوسری یا تیسری مرتبہ بیوی نے ہمیں اس انداز میں پکارا تھا۔ اس وقت ہم واقعی اپنے آپ کو بادشاہ سمجھ رہے تھے۔ ہمارا سر غرور کی وجہ سے عرش کو چھو رہا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اِس وقت جو حکم بھی صادر فرمائیں گے، اُس کی تعمیل معاذ اللہ کُن فیکون کے انداز میں سرزد

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ہوسکتی ہے۔ چونکہ ہم اس وقت پلنگ پر دراز تھے، اِس لیے بیوی نے بائیں ہاتھ کی پانچوں اُنگلیوں سے ہمارے سر کے بالوں میں گدگدی کرتے ہوئے فرمایا: ''میری جان! کیا آپ تھک گئے ہیں؟''

ہم نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا: ''ارے واہ! تھکنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟''

''سچی مچی''۔

''ہاں.....ہاں، اور کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟''

اِس کے بعد بیگم نے اپنی اُنگلی ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کہا: ''آپ میری اُنگلی دیکھ رہے ہیں؟''

''اُف! اِسے کیا ہوا؟''

''سبزی تراش سے کاٹتے ہوئے زخمی ہوگئی۔ اب چونکہ دائیں ہاتھ کی اُنگلی ہے، اِس لیے.....''

''بولو.....بولو.....رُک کیوں گئیں؟''

''آپ میرا ایک کام کریں گے؟''

''کیوں نہیں''۔

''تو پھر ذرا مسالا پیس دیجیے۔ آپ کی لاڈلی سالی صاحبہ آئی ہوئی ہیں نا۔ وہ ہاتھ کا پسا ہوا مسالا ہی پسند کرتی ہے''۔

بیوی کی اِس اِلتجا اور وجہ معقول کے بعد آپ خود ہی فرمائیے۔ ہم مسالے پیسنے سے کس طرح انکار کرسکتے تھے! اگرچہ ہم نے کسی بادشاہ کو مسالا پیستے نہ سنا تھا لیکن بڑے بڑے ادیب اور شاعر مسالا پیستے رہے ہیں۔ خود ہمارے ڈپٹی نذیر احمد سے اُن کی ہونے والی بیوی نے مسالا پسوایا تھا، یعنی ہماری بیوی ہماری بیوی بن چکی تھی۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی تو ابھی بیوی نہ بنی تھی۔

بہر حال ہم مسالہ پیسنے میں دل و جان سے مصروف تھے کہ شاپنگ کرنے کے بعد بازار سے ہمارے بچوں کی منجھلی خالہ تشریف لے آئیں۔ ہمیں مسالا پیستے دیکھ کر فرمانے لگیں: ''بھائی جان! میں نہ کہتی تھی کہ خاوند اپنے گھر کا بادشاہ ہوتا ہے! جو کام وہ کرنا چاہتا ہے، کرسکتا ہے، خواہ مسالا پیسنا ہی کیوں نہ ہو۔ آج تک آپ خواہ مخواہ انکسار سے کام لیتے رہے ہیں۔ اتنی عاجزی اچھی نہیں۔ بس اِس طرح آپ اپنی مرضی چلایا کریں۔ آپ کا موڈ مسالا پیسنے کا تھا، آپ نے پیسنا شروع کردیا۔ میرا خیال ہے آپا نے آپ کو بہت منع کیا ہوگا لیکن آپ گھر کے بادشاہ تھے، حکم آپ کا چلا..... مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے میری بات مان لی''۔

سالی صاحبہ کی اِس دل جوئی کے بعد ہمارا دل چاہا کہ مسالا پیس کر ہم اپنے ہی منہ پر مل لیں، تو زیادہ اچھا رہے گا۔ ہم جل کر کباب بنے جا رہے تھے، مسالا لگ جائے گا، تو چٹ پٹا کباب بن جائیں گے۔

◆◆◆

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ تاریخ میں القدس شہر پر 24 مرتبہ قبضہ کیا گیا۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا پارک کنیڈا میں ہے۔

☆ ہٹلر برلن کا نام بدل کر جرمینیا رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ پہاڑ سوئٹزر لینڈ میں پائے جاتے ہیں۔

☆ تمام پھلوں اور سبزیوں کی نسبت تیز مرچ میں وٹامن سی کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

☆ فرعونوں کے زمانے کے مصر میں ہفتہ 10 دن کا ہوتا تھا۔

☆ تتلی کی چکھنے کی حس اس کے پچھلے پاؤں میں ہوتی ہے۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اُردو کہاوتیں

اُردو میں مستعمل کہاوتیں اور ضرب الامثال کا بے بہا خزانہ

دلچسپ حکایات اور کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا تاریخی پس منظر

﴿یہ مرغی کس کی ہے؟﴾

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

جب کوئی عیّار اور فریبی دوسرے کی کسی چیز کو ایماندار بن کر ہڑپنے کی کوشش کرے تو یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر کی حکایت بڑی دلچسپ ہے۔

حکایت:

ایک مرتبہ کسی مُلّا کو مرغی کھانے کی خواہش ہوئی مگر اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ مرغی کا گوشت خریدتا۔ اس نے سوچا کسی طرح گوشت تو کھانا ہی ہے۔ کام بھی بن جائے اور گناہ بھی نہ ہو۔ اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ جھٹ باہر گیا اور کسی کی مرغی پکڑ کر کہنے لگا: ''یہ مرغی کس کی ہے؟''

وہ مرغی کا لفظ دھیمی آواز میں نکالتا اور 'کس کی ہے' اونچی آواز میں بولتا۔

وہ مسجد کی چھت پر چڑھ گیا او کافی دیر یہی فعل کرتا رہا۔ جب کسی شخص نے مرغی کا مالک ہونے کا دعویٰ نہ کیا تو وہ مرغی کو اپنے گھر لے گیا او یہ کہہ کر کہ اس کا کوئی مالک نہیں اس لیے یہ مجھ پر جائز ہے، ذبح کرکے ہنڈیا میں رکھ چولہے پر چڑھا دی۔

☆☆☆

﴿ساٹھ گاؤں بکری چرگئی﴾

یہ مزیدار کہاوت تب کہی جاتی ہے جب کوئی حیرت انگیز واقعہ رُونما ہو جائے یا کوئی شخص ناقابل یقین بات منوانے کی کوشش کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے پس منظر کی کہانی بہت مزیدار ہے۔

حکایت:

کسی جنگل میں ایک غریب چرواہا رہتا تھا۔ اس ملک کا بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکلا۔ گھومتے گھومتے رات ہوگئی تو وہ اسی چرواہے کی کٹیا میں ٹھہر گیا۔ چرواہے نے بادشاہ اور اس کے وزیر کی بہت خدمت کی۔ حسبِ حیثیت خاطر داری اور تواضع کی۔ چلتے وقت بادشاہ نے خوش ہوکر ایک پتے پر فرمان لکھ کر اسے ساٹھ گاؤں کی سرداری عطا کردی اور اس سے کہا کہ اس فرمان کو لے کر کل دربار میں آجانا۔

بادشاہ کے جانے کے بعد اس غریب چرواہے نے اُس پتے کو کہیں رکھ دیا جسے بکری کھا گئی۔ بے چارہ بہت فکرمند اور رنجیدہ ہوا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ بادشاہ سے کیا کہے گا۔

وہ پھر بھی بادشاہ کے حکم کے مطابق اگلی صبح دربار میں پہنچا اور اپنے دُکھ بھرے قصے کو رو رو کر سُنایا۔

بادشاہ نے پوچھا کہ فرمان ساتھ لائے ہو؟

چرواہا روتے ہوئے بولا:

''بادشاہ سلامت! میرے ساٹھ گاؤں بکری چر گئی۔''

یہ سُن کر سب ہنس پڑے اور بادشاہ نے اُسے نیا فرمان جاری کردیا۔

☆☆☆

﴿گانگو کا ہینگا ہوگیا﴾

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص نہایت سستی سے بہت دیر میں کام کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں نہایت دلچسپ لوک کہانی ہے۔

کہانی: ایک کسان کے یہاں گانگو نامی ایک ملازم تھا جو کام میں نہایت سست تھا۔ کاتک کے مہینے میں ربیع کی فصل کی بوائی ہو رہی تھی۔ کسان نے گانگو سے کہا:

''گھر جا کر ہینگا یعنی پٹا لے آؤ''

کسان نے اس سے یہ بھی کہا کہ دیکھو جلدی آنا بوائی کرنا ہے۔

گانگو ہینگا لینے چلا گیا مگر واپس اس وقت آیا جب فصل پک کر تیار ہوچکی تھی۔ اس نے آتے ہی بُرا منہ بناتے ہوئے کسان سے کہا:

''مالک جب اتنی جلدی کا کام ہو تو میرے بجائے کسی اور سے کروالیا کریں۔''

اتنی دیر سے آنے کے بعد بھی گانگو سمجھ رہا تھا کہ وہ بہت جلدی واپس آچکا۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دنیا کا پہلا قرنطینہ

پروفیسر شوکت اللہ

جب سے کورونا وائرس کی وباء پھوٹی ہے تب سے لفظ قرنطینہ بولا اور سنا جارہا ہے۔ کمپیوٹر سے آشنائی رکھنے والوں کے لیے یہ کوئی نیا نام نہیں، کیونکہ اس کا استعمال کمپیوٹر میں اینٹی وائرس کے ساتھ 1988ء سے ہو رہا ہے جس سے مراد وائرس سے متاثرہ فائلوں کو الگ تھلگ ہارڈ ڈسک میں رکھنا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ باقی ماندہ فائلیں کمپیوٹر وائرس سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔

ڈکشنری میں اس کے معنی چالیس دن لکھے گئے ہیں۔ اس دورانیہ میں بحری جہازوں، افراد اور مویشیوں وغیرہ کو سمندر کے کنارے الگ تھلگ رکھا جاتا تاکہ کسی بیماری یا وباء سے متاثرہ افراد شہر میں داخل نہ ہوسکیں یا شہر میں پھیلی بیماری یا وباء اُن میں منتقل نہ ہو سکے۔ بعض لوگوں کے نزدیک لفظ قوارنٹائین (قرنطینہ) فرانس سے شروع ہوا، فرانسیسی زبان میں قروئین چالیس کو اور ٹائین دن کو کہتے ہیں۔ چناں چہ اسی مناسبت سے چالیس دن بحری جہازوں، افراد اور مویشیوں وغیرہ کے قیام کو قوارنٹائین (قرنطینہ) کہا جاتا تھا۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ اطالوی زبان کے لفظ قورنٹا سے نکلا ہے جس کے معنی چالیس

کے ہیں۔ 1377ء میں اٹلی کے کئی شہروں میں طاعون کی وباء پھیلی تو انھوں نے بحری جہازوں کو چالیس دن تک شہروں سے دُور رکھنے کی پالیسی اپنائی جس کو قوارنٹائین (قرنطینہ) کہا جانے لگا۔ اَب اکثر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چالیس دن میں کیا منطق ہے۔ برٹش میڈیکل جرنل نے اپنی 1997ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ انسان پینتیس سے چالیس دنوں کے لیے بغیر کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہے بشرطیکہ انسانی جسم مناسب ہائیڈریٹ ہو۔ اگر ہم قران پاک کا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہم بھی ایک نئی تاریخ کا حصہ بن رہے ہیں جو آنے والی نسلوں کا موضوعِ گفتگو ہوگا

مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر پہلا قرنطینہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنایا تھا، یعنی اللہ کے حکم سے کشتی بنائی تھی جو چالیس دن اور چالیس رات عذاب الٰہی سے محفوظ سفر کرتی رہی۔ اس کشتی میں کھڑکیوں، بالکونیوں اور ٹیرس کی سہولیات نہیں تھیں۔ اس میں انٹرنیٹ، یوٹیوب، فیس بک، موبائل فون، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن وغیرہ کی بھی سہولیات نہ تھیں۔ کشتی کے سوار جو اللہ تعالیٰ کے نیکوکار تھے صرف موسلا دھار بارش کی آواز سنتے۔ اُن کا زیادہ تر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ایک دوسرے کی دیکھ بھال میں گزرتا اور جب حضرت نوحؑ کی نافرمان قوم عبرت ناک انجام کو پہنچ گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے عذاب تھم گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔ جہاں سے انسانیت کا دوبارہ ارتقاء ہوا۔

حضرت نوحؑ کو اس وقت قوم کے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا جب اُن میں شرک اور بت پرستی عروج پر پہنچ گئی تھی اور پانچ بتوں (ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر) کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔ آپ علیہ السلام نے دعوت توحید شروع کی تو محض چند لوگ ایمان لائے اور جن کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی وہ نہ لائے۔

قوم کے سرداروں نے کہا۔ ”ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں اور تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے (تمہاری پیروی کر رہے ہیں)، ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اُوپر نہیں دیکھ رہے، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔“

حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”میری قوم والو! مجھے بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی دلیل پر ہوا اور مجھے اس نے اپنے پاس کی کوئی رحمت عطا کی ہو، پھر وہ تمہاری نگاہوں میں نہ آئی تو کیا زبردستی میں اسے تمہارے گلے منڈھ دوں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔

میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا ثواب تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ نہ میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں۔ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کر رہے ہو۔ میری قوم کے لوگو! اگر میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے نکال دوں تو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کون کرسکتا ہے؟ کیا تم کوئی نصیحت نہیں پکڑتے؟ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ (سنو!) میں غیب کا علم نہیں رکھتا۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، نہ میرا یہ قول ہے کہ جن پر تمہاری نگاہیں ذلت سے پڑ رہی ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے گا ہی نہیں۔ ان کے دل میں جو ہے اسے اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسی بات کہوں تو یقیناً میرا شمار ظالموں میں ہو جائے گا“۔

قوم کے لوگوں نے کہا۔ ”اے نوح! تو نے ہم سے بحث کر لی اور خوب بحث کر لی۔ اب تو جس چیز سے ہمیں دھمکا رہا ہے، وہی ہمارے پاس لے آ، اگر تو سچوں میں ہے۔“

حضرت نوحؑ نے اللہ کے حکم سے دعوتِ توحید جاری رکھی۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس دلاتے رہے اور عذاب الٰہی سے ڈراتے رہے۔ بتوں کے خلاف باتیں سن کر لوگ بپھر گئے اور انھوں نے آپؑ کی تکذیب و تکفیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑی اور یہ تحریک چلائی کہ جب آپ علیہ السلام بات کرتے تو وہ اپنی پوری قوت سے چلانے لگتے اور اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تاکہ آپؑ کی آواز سنائی نہ دے۔ آپؑ کی کافرہ بیوی نے یہ مشہور کر دیا کہ حضرت نوحؑ دیوانے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ لوگ جہاں کہیں بھی آپؑ کو دیکھتے تو آوازیں کسنا شروع کر دیتے اور پتھر مارنے لگتے۔ جبکہ آپؑ قوم کو مسلسل حق اور خیر خواہی کی طرف بلاتے رہے۔ یوں صدیاں بیت گئیں۔ صرف چالیس مردوں اور چالیس عورتوں کے سوا کسی نے بھی حضرت نوحؑ کا مذہب قبول نہ کیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ”اور بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کے پاس، پس رہے وہ اپنی قوم کے پاس ساڑھے نوسو برس اور اس

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خوف زدہ انسان پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ڈرتا ہے۔ وہ آنے والوں سے ڈرتا ہے۔ وہ ہر ایک سے ڈرتا ہے۔ اپنے ماضی سے ڈرتا ہے، اپنے حال سے ڈرتا ہے۔ اپنے مستقبل سے ڈرتا ہے، بلکہ اپنے پرائے یہاں تک کہ اپنے ہی سائے سے ڈرتا ہے۔

خوف اگر ایک بار دل میں بیٹھ جائے تو پھر وجہ کے بغیر ہی خوف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ڈرے ہوئے انسان کے لیے ہر امکان ایک ٹریجڈی ہے۔ اس کے لیے ہر واقعہ ایک حادثہ ہے۔

خوف زدہ انسان خود کو اس بھری دنیا میں تنہا محسوس کرتا ہے۔ خوف احساسِ تنہائی ضرور پیدا کرتا ہے۔ خوف زدہ انسان کی مثال ایسے ہے، جیسے کسی وسیع صحرا میں تنہا مسافر کو رات آجائے اور جب انسان اپنے وجود سے بے خبر ہو، اسے اپنے وجود کا احساس بھی مشکل سے ہوتا ہے۔

خوف سے بچنے کا واحد، مناسب اور سہل طریقہ یہی ہے کہ انسان میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے۔ یہ خوف، ہر خوف سے نجات دلاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے تو ہر خوف ختم ہوجاتا ہے۔ اگر منشائے الٰہی کو مان لیا جائے تو نہ زندگی کا خوف رہتا ہے نہ موت کا۔ نہ امیری کا، نہ غریبی کا۔ نہ عزت کی تمنا، نہ ذلت کا ڈر۔ یہ سب اس کے انداز ہیں۔ وہ جو چاہے عطا کرے۔ ہمیں راضی رہنا ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ کی ''دل دریا سمندر'' سے انتخاب

مدت میں چالیس مرد اور چالیس عورتوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔'' بالآخر مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں آپؑ نے اپنے رب کو پکارا۔

''اے میرے پروردگار! تو رُوئے زمین پر کسی کافر کو رہنے سہنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو (یقیناً) یہ تیرے اور بندوں کو بھی گمراہ کردیں گے۔'' اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی دعا قبول کی اور آپؑ کو ایک کشتی بنانے کا حکم دیا اور طوفان کی ابتدائی علامت بھی بتلائی۔ جیسے سورۃ المؤمنون میں ارشاد ہے۔

''تو ہم نے اسے وحی بھیجی کہ ہماری نگاہ کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا، پھر جب ہمارا حکم آئے اور تنور اُبلے۔ تو اس میں بٹھالے ہر قسم کا ایک ایک جوڑا اور اپنے گھر والے بھی سوائے ان کے جن پر (غرق ہونے کا) پہلے ہی صادر ہوچکا ہے اور ظالموں کے معاملہ میں مجھ سے بات نہ کرنا وہ ضرور غرق کیے جائیں گے۔'' آپؑ اس حکم کی تعمیل میں مصروف ہوگئے۔

جب طوفان کی ابتدائی علامت کے طور پر زمین سے پانی اُبلا تو آپؑ نے سب ایمان والوں اور ہر ذی روح کے جوڑوں کو کشتی میں سوار کرلیا، یعنی قرنطینہ میں منتقل ہوگئے۔ آسمان کے دروازے کھل گئے، موسلا دھار بارش ہونے لگی، زمین کے چشمے پھوٹ پڑے اور ایک خوف ناک سیلاب اُمڈ آیا۔ پانی آہستہ آہستہ اُونچا ہوتا گیا اور گھروں کی چھتوں اور ٹیلوں سے بلند ہوکر پہاڑوں کی چوٹیوں کو ڈبونے لگا۔ یوں پوری زمین ڈوب گئی، یہاں تک کہ وہ پہاڑ جس پر آپؑ کا نافرمان بیٹا کنعان چڑھا تھا وہ بھی ڈوب گیا اور قوم عبرت ناک انجام کو پہنچ گئی۔ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے عذاب تھم گیا تو کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔ آپؑ کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث سے دوبارہ انسانیت کا ارتقاء ہوا۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بکرے کی ماں

ہادیہ امین

’’ماں، میں نے سنا ہے کہ جب ہم بڑے اور مضبوط ہو جائیں گے، تو انسانوں کے ہاتھ فروخت ہو جائیں گے، پھر ہمارے ٹکڑے کر کے تکہ بوٹی کھائیں گے۔ ماں! کیا ایسا ہی ہوگا؟‘‘ بکرے نے اپنی ماں سے سوال کیا۔

’’بیٹا! تمہارے دوستوں نے آدھی بات بتائی ہے۔ یہ سچ ہے کہ رب نے ہمیں اور پوری کائنات کو انسانوں کے لیے مسخر کیا۔ یہ ہمیں اپنی خوراک بناتے ہیں مگر تم یہ سوچو کہ ٹکڑوں میں کٹنے کے بعد، گرم آگ میں مزے دار مسالوں سے ملنے کے بعد تمہاری اہمیت کتنی بڑھ جائے گی۔ تم معزز ہو جاؤ گے، تمہاری قیمت بڑھے گی اور تم رزق بن جاؤ گے۔ باادب لوگ تمہارا احترام کریں گے۔ تمہیں نیچے گرنے سے بچایا جائے گا۔ تمہارے نت نئے نام ہوں گے۔ تم مہنگے ہو جاؤ گے۔ بیٹا! یہ عزت، نام یونہی نہیں ملتا۔ اس کے لیے ٹکڑوں میں کٹ کر گرم آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ تمہیں تمہارے دوستوں نے تصویر کا محض ایک ہی رخ دکھایا ہے۔‘‘

اتنی عزت اور اہمیت سن کر بکرے کا دل خوش ہو گیا۔ زیادہ ہی جذباتی ہو کر کہنے لگا۔

’’ماں! اگر میری اہمیت اتنی زیادہ بڑھ جائے گی تو تم ہی مجھے ٹکڑوں میں کاٹ دو نا۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تمہارے بچے کو عزت ملے؟‘‘ بکرے کی ماں مسکرا کر بولی۔

’’بیٹا، ماں اپنی اولاد کو کبھی ایسے حالات میں نہیں ڈال سکتی۔ محبت کرنے والے کبھی کٹھن وقت میں نہیں ڈالتے۔ قدر کرنی چاہیے ان کی جو ہماری اہمیت بڑھاتے ہیں۔ تم بے زبان مخلوق ہو بیٹا۔ ان کے بارے میں برا نہ سوچو۔ ان کو اپنے حق میں بہتر ہی جانو۔ رہے انسان! وہ محبت کرنے والے ہیں۔ احسان کرتے، مشکل میں سہارا بنتے ہیں، حالات کو ہمارے سامنے مثبت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جیسے ابھی میں نے تمہارے سامنے کیا۔‘‘

بکرا ماں کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ’’کتنی اچھی باتیں کرتی ہو ماں۔ یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟‘‘

بکرے کی ماں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ مارنا چاہا پھر جواب دیا۔

’’میرے بچے! تجربات ہی زندگی میں سب کچھ سکھاتے ہیں۔ جب منڈی لگتی ہے، ہر طرح کے انسان جانور خریدنے آتے ہیں۔ پڑھے لکھے بھی، امیر بھی، خوبصورت بھی، ذہین بھی مگر عزت اور خیال صرف وہی رکھتے ہیں جنہیں رب کا خوف ہوتا ہے۔ وہی وقت پہ کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں۔ بیمار پڑنے پر ڈاکٹر کو بھی دکھاتے اور ذبح کرنے کا وقت آئے تو چھری نظروں کے سامنے تیز نہیں کرتے۔ خواہ مخواہ راہ چلتے نہیں مارتے۔ ہمارے معاملے میں اللہ سے ڈرتے اور ہمیں اللہ ہی کے نام پہ ذبح کرتے ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں نرم اور نیک دل لوگ۔ اللہ سب بکروں کو ایسے ہی لوگوں سے ملوائے۔ بس ایک بات یاد رکھنا۔ توحید اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جب کوئی حلال جانور بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوتا ہے تو وہ جائز اور حلال نہیں ہوتا۔ ہم سب ایک اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ اللہ کرے کوئی ہمیں غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کرے آمین۔‘‘

بکرے کی سمجھ میں بات آگئی اور وہ خوشی سے بقرعید کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

فکاہیہ

سید ضمیر جعفری

(جولائی 1945ء، ملیان کیمپ) بڑا ابھا گوان اور دلچسپیوں سے بھرواں دن..... دوپہر کا کھانا رسالدار میجر فتح خاں صاحب کے ڈیرے پر تھا۔ کھانے میں بھی لوڈرانہ کے کوارٹر ماسٹر حوالدار یعقوب خان کے بندوبست نے بڑے "دبھمن" ٹانک رکھے تھے، لیکن کھانے کے بعد گھڑے اور چمٹے کی سنگت پر پنجابی ابیات کی جو محفل جمی، اس کا ذائقہ مدتوں فراموش نہ ہو سکے گا۔ "ماہیا" اور "چھی" سنانے والے چند جوان تو کیمپ ہی سے نکل آئے مگر یہ محفل حوالدار نواز اور حوالدار باز خان کے ہاتھ میں (بلکہ گلے) میں رہی۔ نواز اور باز اٹلی سے واپس آنے والے آٹھویں ڈویژن کی نفری سے ہاتھ لگے۔ نواز، بھرتی ہونے سے پہلے، میرپور ریاست کشمیر اور آس پاس کے علاقوں میں میاں محمد بخش کی سیف الملوک اور سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ کے عارفانہ ابیات پڑھنے کے لیے دُور دُور تک مشہور تھا۔ کھڑی شریف اور کھنیارہ شریف کے میلوں میں نواز اور عالم لوہار کی جوڑی ایسا سماں باندھا کرتی کہ ان نوجوانوں پر روپوں کی بارش برسنے لگتی۔

باز خاں دوتارے کے ساتھ رحمٰن بابا کی کافیاں گانے میں کمال رکھتا تھا۔ سو اِن دونوں نے مل کر خوب رنگ باندھا۔ بنگال اور تامل ناڈو کے علاقے ویسے بھی "سرسنار" سمجھے جاتے

جاپانی جنگ کی لنگوٹی

دوسری عالمی جنگ میں مشرقِ بعید کے جاپانی محاذِ جنگ کی دلپذیر زعفرانی یادداشتوں کی چند جھلکیاں

ہیں۔ دو حوالدار کلرکوں نے ہارمونیم پر بنگلہ اور تامل زبانوں کے بھی لوک گیت سنائے۔ اُردو کی غزلیں بھی چلیں۔ حاضرین میں بھی تو ہر علاقے کے لوگ موجود تھے۔ کیپٹن بھگت سنگھ کیمپ کے ناتے سے مہمانِ خصوصی تھے اور دومیلی کے کیپٹن جمشید (بعد میں میجر جنرل ہوئے، کچھ عرصہ صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخواہ) کے قائم مقام گورنر بھی رہے) ''چیف گیسٹ'' تھے۔ وہ آٹھویں انڈین ڈویژن کے ساتھ وطن واپس آئے۔ نواز اور باز جنگ کی آگ سے اپنا فن کچھ اور صیقل کر آئے۔ خود بتا رہے تھے کہ جہاں لڑائی ذرا ٹھنڈی ہوتی، ہم بندوق رکھ کر ساز اُٹھا لیتے۔ ساز کی آواز کو کون دبا سکتا ہے؟

اتفاق کی بات کہ ابھی اگلے ہی دن ہمیں گاؤں سے منشی سوار یا خان کا خط ملا جو ہمارے علاقے میں ''سیف الملوک'' کے صاحبِ طرز گائیک مانے جاتے۔ منشی صاحب کی عمر اب ساٹھ برس سے اُوپر ہوگی بلکہ شاید ستر برس کے قریب ہوگی۔ (ان کا انتقال 1988ء میں ہوا)۔

آپ کو حضرت میاں محمد بخشؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت بھی حاصل رہی تھی۔ میاں صاحب کی زندگی میں سیف الملوک پڑھنے کے سلسلے میں ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ میاں صاحب ان سے اپنے ابیات سنا کرتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد کشن چند کی تحریک پر دلوں کی راکھ اُتارنے کے لیے کیمپ کے حاشیہ پر لگے ایک کارنیوال میں جا بیٹھے اور پھر رات گئے تک وہاں سے اُٹھ نہ سکے۔

کارنیوال کیا ہے؟ بمبئی (اب ممبئی) کے ایک ٹھیکے دار نے گجراتی اور تامل لڑکیوں کا ایک ''عوامی اوپیرا'' قائم کر رکھا ہے۔ چند ایک جوئے کے اسٹال بھی ہیں۔ لڑکیوں کے نہ فن میں کوئی بات تھی نہ تن میں کشش، مگر اِس ویرانے کی بھوک میں یہ جگنو بھی ایک آتش کدہ کی طرح بھڑک رہا تھا۔ بالخصوص جبکہ شراب پانی کی طرح پی جا رہی ہو۔ ہمارے اپنے جوان تو شاذ شاذ ہی یہاں تھے۔ بڑی تعداد ''گورا ونگ'' کے انگریز ٹامیوں کی تھی۔ حد یہ ہے کہ اٹلی کے جنگی قیدی بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ سنا ہے کہ وہ کارنیوال کی ایک شام کے لیے کئی کئی مہینے اپنا قیدی بھتہ بچا بچا کر پیسے جوڑتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ انگریز اور اطالوی سپاہی زبان نہیں سمجھتے مگر وہ اعصاب کی حرکتوں سے تو لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

''کارنیوال'' کا مالک شراب بھی انھی سے خریدتا ہے۔ ویسے زیادہ مقامی کشید چلتی ہے جس کے ایک ساغر سے آدمی ہوا میں اُڑنے لگتا ہے اور واقعی اس راس میں کم لوگ تھے جن کے قدم زمین پر ہوں۔ دو مرتبہ گورے سپاہی آپس میں گتھم گتھا بھی ہو گئے کہ صورت ایک انار و صد بیمار والی تھی۔ یہ تو معلوم تھا کہ اطالوی قیدیوں کو گھومنے پھرنے کی خاصی آزادی تھی کہ آخر وہ یہاں سے بھاگ کر کہاں جائیں گے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ان کو کارنیوال میں جشنِ عشرت منانے کی بھی آزادی حاصل ہے۔

کیمپ میں واپس آئے، تو آگے بارک میں میرے اور انوپ سنگھ کے لیے حکم نامہ پڑا تھا کہ کل صبح بمبئی میں ''امبارکیشن'' میں رپورٹ کرنا ہے۔ کہیں سے بلاوا آ گیا آخر ہمیں بھی۔ دل خوش بھی ہوا اور بوجھل بھی..... چلو تعطل تو ٹوٹا ...... کیمپ چھوٹا خدا خدا کر کے!

اٹلی اور برما

میجر جمشید (بعد میں میجر جنرل اور صوبہ سرحد کے قائم مقام گورنر) ٹہلتے ٹہلتے ہمارے ڈیرے پر آ نکلے۔ ان کے اور ہمارے ''ڈیروں'' کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی تو ہے۔ جو شخص دومیلی (ضلع جہلم) کی سنگلاخ پہاڑیوں کا جم پل ہو، یہ چھوٹی سی ہری بھری پہاڑی تو گویا اونٹ کے منہ میں زیرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم نے اس پہاڑی کا نام ''بکڑالہ ٹِل'' رکھ لیا ہے۔

میجر جمشید کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ لڑتے تو اٹلی میں رہے، مگر نگاہ اُن کی برما کی لڑائی پر لگی رہی۔ شرقِ اوسط میں بھی وہ کسی انگریز جرنیل کے آس پاس رہ چکے ہیں، چنانچہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

حیرت انگیز طور پر اعتماد کے ساتھ العالمین سے لے کر دریائے سانگرو تک ..... رومیل اور منٹگمری کے پیچھے چلتے چلتے صحرائی معرکوں کی ریت چھانتے چلے جاتے ہیں۔

برما کی لڑائی ختم ہوگئی، بلکہ جنگ ہی ختم ہوگئی۔ جمشید کو اِس بات کا بڑا قلق ہے کہ افریقہ اور یورپ کی لڑائیوں کو تو عسکری مبصروں نے بانس پر چڑھا رکھا ہے، مگر برما کے محاذ کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ اِس ''سوتیلے سلوک'' کی وجہ (ان کے نزدیک) یہ ہے کہ برما..... ''ہندوستانیوں کا محاذ'' تھا، ورنہ یہ محاذ بھی اس جنگ کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص ''چودھویں کور'' کی پیش قدمی تو ایک ایسا کارنامہ تھی کہ جنگی معرکوں میں اِس کی مثال کم ہی ملے گی۔ پیش قدمی اور ایسے علاقے میں قدم قدم پر سامنے کوئی پہاڑ کھڑا ہو..... کوئی دریا راستہ روک لے..... گھنا جنگل گزرنے نہ دے۔ ''ایراوتی'' اور ''چندون'' کے دریا تو بار بار چکر کاٹ کر سامنے آجاتے تھے۔

میجر جمشید..... اٹلی سے نمٹنے کے بعد برما میں لڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے کہ جاپانیوں نے ہتھیار ہی ڈال دیے۔ ان کے اختیار میں ہو تو یہ برما کی جنگ میں کامیابی کا سہرا آدھا آدھا کاٹ کر جنرل جیفرڈ اور جنرل آکنلک کے سروں پر باندھ دیں، کیونکہ جنرل جیفرڈ نے (آرمی گروپ کمانڈر کی حیثیت سے) یہ جنگ لڑی تھی اور آکنلک نے (کمانڈر ان چیف انڈیا کی حیثیت سے) یہ جنگ لڑوائی تھی۔ کہ وہ اگر پیچھے سے راشن اور بندے ہی نہ بھیجتا، تو جیفرڈ کیا کر لیتا۔ جنرل (بعد میں فیلڈ مارشل) سلم اس کے نزدیک چنداں موثر نہ رہا۔ جمشید کے مزید جنگی تجزیے کے مطابق جاپانیوں کی شکست کا باعث..... ''ایٹم بم'' تو خیر ہوا ہی..... مگر ان کے منصوبے بھی لچک دار نہ تھے۔ ورنہ آخر دم تک جاپانی فوج کی تعداد..... اتحادی فوج کے مقابلے میں کم نہ تھی۔ جاپانی فضائیہ بھی جو ایک مرتبہ تو کلکتے تک پر موت برسا گئی تھی، رفتہ رفتہ آسمان سے غائب ہوگئی۔ (11 ستمبر 1945ء)

منی پور کا آشیانہ بلبل

ہمارا شاعر دوست صوبے دار غلام علی بلبل کاشمیری عرصہ سے برما کے محاذ پر لاپتہ تھا۔ بارے کہ اس کا خط جہلم سے ہوتا ہوا ہمیں یہاں مل گیا۔ دلچسپ رُوداد لکھی ہے۔ لکھا ہے:

''بلبل کا آشیانہ اِن دنوں منی پور میں ہے۔ ہم جنرل ہٹن کے ساتھ برما کے اندر گئے تھے۔ جنرل الیگزنڈر کے ساتھ باہر آ گئے۔ اب منی پور میں اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ بہرحال خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ گھر بھی کیا، ایک پاؤں برما میں ہے، دوسرا ہندوستان میں۔ باشندے بھی دوغلے ہیں۔ آنکھیں ہندوستانی، جبڑے برمی۔ برما میں ہم نے انگریز سپاہی کم ہی دیکھے۔ میدان میں یا ہم تھے یا چینی تھے۔ جن کی کمان ایک امریکی جرنیل سٹل ویل (STIL WELL) کر رہا تھا۔ شکست کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے خلاف جاپان نے چھے ڈویژن فوج آراستہ کر رکھی تھی۔ شایانِ شان استقبال ہوا۔ یہاں ہم اپنے ہی جاننے والوں کو ڈھونڈتے ہیں، تو ہر تیسرا شناسا دکھائی نہیں دے رہا۔ جاپانیوں کو ہم پر واضح فضائی برتری حاصل تھی۔ واپسی میں جو صعوبت گزری، وہ بیان نہیں ہوسکتی۔ ہمارا تو شروع سے آخر تک وہی کرنل ''براڈ بورڈ'' ہمارے سروں پر سلامت رہا، البتہ اوپر کے کمانداروں میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ جنرل گفورڈ (GIFFORD) جنرل سٹاپ فورڈ (STOP FORD) جنرل لیسز (LESSE) اور جنرل سلم (SLIM) آتے جاتے رہے۔ ہم کبھی ''چودھویں آرمی'' چلے جاتے اور کبھی ''پندرھویں'' میں۔ گویا بڑی مانگ رہی ہماری بھی۔ آج کل ہم ایڈمرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کمان میں ہیں۔ یہ کوئی شہزادہ ہے۔ ہمیں شہزادہ صاحب کی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور شہزادہ صاحب کو ہماری خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں؟ خیر ہم تو خود یہاں ہیں جہاں سے ہمیں..... اپنی خبر نہیں آتی۔ پچھلے چند مہینے یہاں..... اِس انتظار میں گزرے کہ جاپانی آگے آئیں، تو ہم ان کو ناکوں چنے چبائیں۔ وہ آئے تو

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تھے، مگر ہماری ایک پنجاب رجمنٹ کو منہ دکھا کر واپس چلے گئے۔ جو کچھ ہوا اس کا احوال ہمیں معلوم نہ ہوا۔ ہم مزے سے اپنے خیموں میں چاول اُبال اُبال کر کھاتے رہے۔ یوں سننے میں آیا کہ ایک لاکھ جاپانیوں کا ٹڈی دل آیا تھا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ مہم کا حاصل اکیاب اور مانڈے کی خوبصورت وادیوں کی سیاحت۔" (16 ستمبر 1945ء)

سپاہی نہیں، بہروپیے

کل حکم نامہ آیا کہ آج صبح چھے بجے سے ساڑھے سات بجے تک "پریڈ" اور چھوٹے ہتھیاروں کے "کاڈر" (CADRE) چلیں گے۔ کیپٹن بھگت سنگھ پر کیپٹن الطاف حسین کے سفارشی خط کا یہ اثر ہوا کہ اُنہوں نے ہمیں "کاڈر اے" کا سربراہ نامزد کر دیا۔ حکم نامہ دیکھ کر ہماری تو سِٹی گم ہو گئی۔ دوڑے دوڑے کیپٹن بھگت سنگھ کے ڈیرے پر پہنچے۔ بھگت سنگھ اس وقت بھگتی کی حالت یعنی "گھٹنے" میں تھے، مگر ہم اُن کے اردلی کیہر سنگھ کی منت سماجت کر کے ان تک پہنچ ہی گئے۔ عرض کیا کہ ہمارے آبا کا پیشہ بے شک سپاہ گری رہا ہے، مگر ہم نے ابھی اس پیشے کی انگلی ہی پکڑی ہے۔ اپنی شاعری کا پس منظر اجالتے ہوئے بتایا کہ ہم کاغذی جنگ لڑنے والے ہیں۔ کہیں اپنی گولی اپنے ہی "گٹے" پر نہ مار بیٹھیں۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ پنجابی میں بولے: "سمجھ گیا۔ تسیں سپاہی نئیں، بہروپئے ہو۔" (آپ سپاہی نہیں، بہروپیے ہیں)۔

"بجا فرمایا۔" ہم نے عرض کیا۔ "آج کل کی جنگ دماغ سے بھی لڑی جاتی ہے اور فارسی کے ایک استاد نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ..... ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ (ہر کسی کو خاص کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے)۔

کپتان بھگت سنگھ کو غالباً "دماغ" کی طرف ہمارا اشارہ ناگوار گزرا، مگر بظاہر وہ ہماری فارسی پر کبیدہ خاطر ہو کر بولے: "جوان! توں ہن سانوں فارسی دی مار تے ناں دے۔" (جوان تو اب ہمیں فارسی کی مار تو نہ دے)۔ مگر اس سے پیشتر کہ ان کی برہمی مزید گہری ہو جاتی، ہم نے اپنا پنجابی کا ایک شعر عرض کر دیا۔

چپ بھلی ہوندی اے نکمّی باں باں کولوں
لسی گھوڑی چنگی ہوندی پلی ہوئی گاں کولوں

یعنی بے کار کی بک بک سے چپ بھلی، کمزور گھوڑی چربی والی گائے سے بہتر ہوتی ہے۔ پنجابی شعر کام کر گیا۔ آپ نے حکم نامے میں ترمیم کر کے ہمارے نام کی جگہ سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کے صوبے دار نادر خان کا نام لکھ دیا۔ ارشاد فرمایا: "ناں بدل دتا۔ رجمنٹ نئیں بدلی۔"

رِند کے رِند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی.... اُنہوں نے ہماری کمانداری تبدیل کر دی، مگر ہماری جگہ دوسرا کماندار بھی ہماری رجمنٹ ہی سے نامزد رکھا کہ ہم بھی سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کے نمک خوار تھے۔ ہمارے شانے پر اِسی رجمنٹ کا نام نشان ثبت تھا۔

پریڈ کی آزمائش

آج پریڈ کا پہلا دن تھا۔ صوبے دار نادر خان نے ہمیں خوب "پدایا"۔ انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک ہی دن میں سپاہیانہ زندگی کی ساری دھوپ رگوں میں اُتر گئی ہے۔ ہم سے لطیفے بھی بہت سرزد ہوئے۔ تمام کاڈر میں ہم اور جیسور کے صوبے دار متراجن کا تعلق ڈاک خانے سے تھا، بس ہم دو ہی آدمی تھے جن کے ہاتھ پاؤں کے درمیان خانہ جنگی کی حالت پائی جاتی تھی، جگ ہنسائی بھی ہوئی کہ..... بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہی صف میں چل رہے تھے۔ مگر یہ کوفت فائدے سے بھی خالی نہیں۔ ثابت قدم رہے تو کچھ عجب نہیں کہ فنِ سپاہ گری میں بھی کچھ پیش رفت ہو جائے۔ کچھ بھی نہ ہوا، تو کم از کم دوپہر کا قیلولہ تو گھنیرا ملے گا۔ رات کو مچھروں پر بھی شاید کچھ بالادستی رہے.....

اپنے آپ کو شاباش دینے کو جی چاہا کہ پہلے ہی دن رفل کے پانچ "فیروں" میں سے تین گولیاں "ٹارگٹ" پر جا لگیں۔ "گل زری" تو خیر، کیا ملتی، مگر "بے زری" کی ندامت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔

"سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کی "رشتہ داری" کے باعث صوبے دار نادر خان صاحب کی ساری توجہ ہمیں پر مبذول رہی۔ "مارچ پاسٹ"

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کے دوران میں وہ زیادہ تر ہمیں پر چنگھاڑتے رہے جیسے سیکنڈ پنجاب کی عظمت وشہرت کا سارا بوجھ ہمیں پر آن پڑا تھا۔

پنجاب رجمنٹ سے رشتہ

پریڈ کے بعد وہ ہمیں اپنے ساتھ ہی اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ صوبے دار صاحب کیمپ کے پکے "سٹاف" پر ہیں۔ رہائش کے لیے الگ کوٹھڑی ملی ہوئی ہے۔ اردلی میر عالم نے حقہ تیار کر رکھا تھا۔ اور دہی کی لسی "رڑکی" پڑی تھی کہ صوبے دار صاحب پریڈ کے بعد ناشتے میں دہی کی لسی کے ساتھ گیہوں کا "تین برا" پراٹھا کھاتے تھے۔ ہم بھی اِس "جشن" میں شامل ہوئے۔ ناشتے میں اور حقے کے ساتھ (جس کا ساتھ ہم نہ دے سکے) صوبے دار صاحب سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کی باتیں کرتے رہے۔ بن غازی میں "تھرڈ سیکنڈ" کے لہولہان ہونے کے واقعے کو کئی مرتبہ دہرایا۔ کئی سینئر افسروں کی نجی عادتوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ سینئر افسروں میں انگریز ہی تھے۔ مثلاً جنرل برگس گھر میں پوٹھواری جوتی پہنتے تھے۔ جنرل رسل کی جیب میں ہر وقت موچنا رہتا تھا۔ جس افسر کی ناک سے بال نکلے دیکھتے، تو اس کو وہیں "اٹین شین" کر کے موچنے سے اس کی ناک صاف کر دیتے۔ کوئی دیسی سینئر افسر تھا نہیں یا ان کو صرف میجر گوربخش سنگھ ہی یاد رہ گئے تھے۔ بہرحال ان کے گولا پھینکنے کے پینترے چل کر بتاتے رہے۔

(غالباً یہی لیفٹیننٹ گوربخش سنگھ 1965ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر ہمارے میجر جنرل ٹکا خاں کے سامنے بھارتی "کور" کی کمان کر رہا تھا۔)

رجمنٹل سنٹر میں گزری ہوئی زندگی کی فلم بھی گویا ان کی آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ واقعات، لطیفوں اور بدحواسیوں پر بچوں کی طرح ہنستے اور ہر لطیفے پر ہم سے ہاتھ بھی ملاتے۔ ہاتھ ملاتے کہاں تھے، ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے اور جب بھی ہاتھ مارتے، پوچھتے:

"ہور سناؤ"..... (اور سناؤ)۔

ادھر ہمارا "سیکنڈ پنجاب رجمنٹ" سے تعلق محض اتنا سا کاغذی تعلق تھا۔ اگر ہم خدانخواستہ میدانِ جنگ میں کھیت رہے، تو ہماری بیوی کے نام تعزیت کا تار سیکنڈ پنجاب رجمنٹل سنٹر کے کمانڈنٹ کی طرف سے جاری ہوگا۔ بیوہ کو پنشن بھی وہیں سے ملے گی۔ گویا ہم اس "کامن ویلتھ" کے اعزازی رکن تھے۔ مگر صوبے دار نادر خان اِس نام کو ہماری شناخت سمجھتے تھے۔ بہرحال کوئی اندرونی سنسنی محسوس کیے بغیر ہم صوبے دار صاحب کے قہقہوں کا ساتھ دیتے رہے اور جب تک ان کی خدمت میں حاضر رہے، اپنا ایک ہاتھ انہیں کے ہاتھ کے لیے وقف کیے رکھا، لیکن اِس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اپنی رجمنٹ سے محبت اور وابستگی کے اِس جذبے نے ہماری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ صوبے دار نادر خان کہوٹہ میں قصبہ دوبیرن کلاں کی ایک داخلی ڈھوک کے رہنے والے تھے، مگر رجمنٹل سنٹر میرٹھ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ یگانگت، ہم دمی اور ہم قدمی کا یہ رشتہ بھی کس قدر محکم رشتہ ہے۔

رائفل داغنے میں بھی ایک مزہ ہے۔ ہاتھ اس کی لبلبی پر ہو، تو حفیظ جالندھری کے بقول یوں لگتا ہے کہ ع

سارا جہاں اب ہے مرے اختیار میں

یہ مشق کارآمد رہے گی۔ بوقتِ ضرورت ہم کسی جرمن یا جاپانی سپاہی کے ہاتھوں مرنے سے پہلے اس کمبخت سے "دو دو فیر" تو کر لیں گے۔ جنگ کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ تم دشمن کو نہیں مارتے، تو دشمن تمھیں مار ڈالے گا۔ ہاں صوبے دار نادر خان اٹلی میں کچھ عرصہ قید بھی رہے تھے۔ اس قید کی دلچسپ باتیں سناتے رہے۔ بتایا کہ اٹلی بڑا خوبصورت ملک ہے۔ کسانوں کا ملک ہے۔ لوگ خوش اخلاق تھے۔ انگور بہت بھی تھے اور بڑے رسیلے اور بہت میٹھے بھی۔ ہم اطالوی کسانوں کے گھروں میں بھی چلے جاتے تھے۔ وہ لوگ بڑی خاطر خدمت کرتے۔ ایک کسان نے ان کو فرار ہونے میں مدد بھی دی۔ یہاں وہ اتوار کے اتوار ایک قیدی کو اپنی کوٹھڑی میں چائے پر مدعو کرتے ہیں۔ (28 ستمبر 1945ء)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دو بخیلوں کی شادی

ہوسکتا ہے کبھی وہ دونوں اپنی عادتوں سے نفرت کرنے لگ جائیں، مسکراہٹیں بکھیرتی زندہ تحریر

عاصی کرنالی

میرا خیال ہے جب قدرت نے اِس خاندان کے افراد کو بنایا ہوگا، تو چاروں عناصر کا استعمال نہایت بخل سے کیا ہوگا۔ اگر ان کے سینوں کو چیرا جائے، تو چڑیوں کے مختصر ترین دل ان سے برآمد ہوں گے۔ یا شاید اِس قدر چھوٹے، جو خوردبین کے بغیر قیامت تک نظر نہیں آسکتے۔ سب کا یہی حال ہے۔ سب بخل کے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً والدہ چائے بنائیں گی، تو پیالی میں دودھ کا ایک چمچہ ڈالیں گی۔ ان کی چھوٹی بہن چمچے کو چمچی میں بدل دیں گی۔ بڑی صاحبزادی دودھ ملانے کی بجائے چائے کو دور سے دودھ دکھائیں گی۔ اور چھوٹی صاحبزادی کچھ ایسی فضا پیدا

کریں گی کہ نتیجے کے طور پر آپ کو چائے نہیں مل سکے گی۔ چائے ہے دودھ نہیں، دودھ بھی ہے چینی نہیں۔ چینی ہے لیکن سقا پانی نہیں لایا۔ پانی ہے لیکن ماچس نہیں۔ نتیجہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ آپ نے ایک کہانی سنی ہوگی۔ میں تو اسے واقعہ ہی سمجھتا ہوں۔ ایک بخیل آقا نے ایک بخیل ملازم رکھا جو بخل میں آقا سے دس جوتے آگے تھا۔ ایک دن آقا نے کہا: ”کھانا لے آ اور دروازہ بند کردے۔“ نوکر نے کہا: ”محترم آقا! یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دروازہ بند کردے اور کھانا لے آ۔“

میں اِس کہانی یا واقعے میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اِس کہانی یا واقعے کے کردار یقیناً اسی خاندان کے مرحوم افراد ہوں گے۔ خیر چھوڑیے یہ بات۔ میں خود آپ سے ایک نازک بات کہتا ہوں۔ آپ کے یہاں کوئی ملاقاتی آتا ہے۔ آپ اسے سچ مچ کچھ کھلانا پلانا چاہتے ہیں، تو اس سے کہے یا پوچھے بغیر کچھ نہ کچھ زنان خانے سے لے آئیں گے۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جب آپ ملاقاتی سے پوچھتے ہیں: ''آپ چائے پئیں گے۔ آپ کھانا کھائیں گے۔'' تو دراصل آپ کچھ کھلانے پلانے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہیں۔ محض رسماً ایسی حرکت کر رہے ہیں اور جب ملاقاتی خلافِ توقع کہہ دیتا ہے کہ ''ضرور پیوں گا۔'' تو کیا آپ کے دل پر بجلی نہیں گر پڑتی؟ اور جب آپ چائے کی پیالی بنا کر اسے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔'' تو کیا دراصل آپ کا دل یوں نہیں کہہ رہا ہوتا کہ ''مردود کہاں سے آمرا۔'' ممکن ہے آپ بہت فیاض ہوں اور ایسا نہ سوچتے ہوں، لیکن میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ جب آپ کھلانے پلانے کے موڈ میں نہیں ہوتے یا کم ہوتے ہیں، تو آپ پوچھتے ہیں: ''چائے پئیں گے آپ؟''۔ لیکن پوچھنے کا ایک نازک گُر اور بھی ہے جو مجھے اِس خاندان سے استفادے کے طور پر حاصل ہوا ہے۔ میں ایک دن بھری دوپہر میں وہاں پہنچا۔

بزرگوار بولے: ''چائے تو نہیں پئیں گے آپ.....؟''

بزرگوارنی بولیں: ''اوئی اللہ اتنی گرمی۔ اِس موسم میں یہ چائے کیسے پئیں گے۔''

برخودار نمبر ایک نے ڈائریکٹ مجھ سے خطاب کیا۔

''شربت تو پسند نہ ہوگا آپ کو؟''

میں نے کہا: ''کیوں پسند نہ ہوگا!''

ایک کونے سے آواز آئی: ''لیکن بوتل تو خالی پڑی ہے کل شام سے۔'' یہ منجھلے صاحبزادے ہیں۔

باپ پھر بولے: ''کیا برف نہ منگوا دی جائے؟''

ان کی بیگم نے پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا: اے ہے! ایسا نہ کرنا۔ برف کے استعمال سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔''

آخر ایک صاحب زادے نے سادہ اور خالص پانی کا ایک گلاس پیش کر کے سارا تذکرہ ختم کر دیا۔

ایک روز ہماری بیگم نے کہا: ''آج پکچر دیکھی جائے۔ میں اپنی سہیلی اور ان کی امّی کو لے لوں ..... '' بیگم کا اشارہ اسی خاندان کی طرف تھا۔

''بسم اللہ ضرور لے لیجیے .....'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔''

تو پھر کیا ہوا؟ بیگم بولیں۔ ''سب اپنا اپنا ٹکٹ لے لیں گے۔''

یہ شرط طے کرنے کے بعد ہم ان کے گھر پہنچے۔ میں نے کہا۔

''جلد تیار ہو جائیں آپ، سینما جا رہے ہیں۔''

''ٹکٹ اپنے اپنے پیسوں سے ہوں گے .....'' بیگم بولیں۔

''بھئی یہ غلط ہے۔ پیش کش آپ کی ہے، ٹکٹ آپ لیں گے .....'' ماں کی اِس تجویز پر ایک لڑکی نے بھی مہرِ تائید ثبت کر دی!..... میں نے بڑی خفّت سے کہا: ''میں یہ کہنے کی جسارت نہ کرتا، لیکن آج جیب بہت خالی ہے۔''

''اپنا بھی آج یہی حال ہے۔'' بزرگ خاتون بولیں۔

''کل تو بہت پیسے جیب میں تھے، لیکن اتفاقاً سب خرچ ہو گئے۔ پھوٹی کوڑی بھی پلّے نہیں.....'' یہ کہتے کہتے وہ کسی کام کو اُٹھیں، تو ایک لپٹا ہوا اخباری کاغذ اُن کی قمیص کے اندر سے پھسل کر گر پڑا اور کھل گیا۔ کئی نوٹ تھے اس میں ..... اُنہوں نے تیزی سے سمیٹتے ہوئے گھبرا کر مجھ سے کہا:

''یہ کسی کے امانت رکھے ہیں۔''

''کیا آپ پانی نہیں پئیں گے؟'' ایک لڑکے نے مجھے گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی امّی کو پلائیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا۔

میں نے ان کے گھر میں گھی کے کنستر، دودھ کے دیگچے، شربتوں کی بوتلیں، چائے کے پیکٹ، پیسوں کی ریل پیل، سب کچھ دیکھا، لیکن ان کے استعمال میں کسی غیر کو شریک نہیں دیکھا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ بخیل لوگ اپنی ذات کے لیے بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ لیکن آخر میں مَیں اِس نتیجے پر پہنچا کہ ایسے لوگ اپنی ذات سے بھی بخل برتتے ہیں۔ یہ مجھے اس وقت

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

معلوم ہوا جب ایک بار نوٹوں کی ایک گڈّی کو چوہے کتر گئے۔ دوسری بار گھی کے ایک کنستر میں چوہوں کی ایک پوری فیملی ڈوب گئی۔ تیسری بار سردی آ گئی اور شربت کی بوتلیں بھری کی بھری رہ گئیں۔ اور چوتھی بار ایک صندوق سے قیمتی کپڑے اور زیور چوری ہو گئے اور ان کی چوری کے بعد یہ راز کھلا کہ واقعی وہ موجود تھے، کیونکہ موجود نہ ہوتے، تو چوری کیسے ہوتی؟

ایک دفعہ بیگم نے ترنگ میں آ کر اس خاندان کے چند افراد کو مدعو کر لیا۔ وہ لوگ ابھی آئے نہیں تھے اور ہماری بیگم ہم سے کہہ رہی تھیں۔

”تم لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے انہوں نے مدعو کیا۔ میں وہاں بہت سے پھل، مٹھائیاں اور کھلونے لے گئی۔“

”لیکن اِس وقت اِس تذکرے کا فائدہ؟“

”تم سامنے کی پوری الماری خالی کر دو۔“

”یعنی کیوں آخر؟“..... میں نے استعجاب سے پوچھا۔

”بھئی! وہ لوگ لدے پھندے جو آئیں گے۔ دیکھنا کیا کیا سوغات لاتے ہیں..... اور وہ لوگ آ گئے..... خالی ہاتھ.....

اور ان میں باہم یہ مکالمہ ہوا:

”ہم نے سوچا پھل لے چلیں، لیکن خوبانیوں میں کیڑے، آلو بخارے باسی، تربوز بے مزہ، خربوزے بے ذائقہ .....“ ماں کی اِس بات کو ایک لڑکی نے آگے بڑھایا۔

”پھر مٹھائی کا خیال آیا۔ لیکن ابّا نے روک دیا کہ مٹھائی میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ مضرِ صحت ہے۔“

ایک لڑکے نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا۔ ”سوچا کھلونے تو ضرور ہی لے چلیں گے، ننھے مُنّوں کے لیے ..... لیکن امّی نے منع کر دیا۔ کہ سیالکوٹ سے منگا کر دیں گے۔ اپنے شہر کے کھلونے تھرڈ کلاس ہوتے ہیں۔“

بزرگوار بولے: ”اَماں کیا ذکر لے بیٹھے ہو تم لوگ۔ جو دینا ہے نقد دے ڈالو۔“

بیوی بولیں: ”اے ہے! دیں گے کیوں نہیں ..... پر ذرا سانس تو لینے دو۔ کہیں جا تو نہیں رہے ہیں.....“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”چھوڑیے یہ باتیں..... شربت تو نہیں پئیں گے آپ .....؟“

..... لیکن میرا یہ فقرہ محض مزاحاً تھا، کیونکہ اِتنی دیر میں نوکر شربت کے بھرے ہوئے دو جگ میز پر رکھ چکا تھا۔

شام تک خوب دادِ شکم دی جاتی رہی۔ پھر یہ لوگ چلے گئے۔ آپ مجھے ذلیل خیال کریں گے، اگر میں کہوں کہ وہ بچوں کو کچھ دے کر نہیں گئے۔ میں یہ بات ہرگز نہ کہتا، لیکن اِس لیے کہنی پڑ رہی ہے کہ دو دن بعد جب میں اُدھر گیا، تو نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بزرگوار نے کہا:

”بھئی ہم اُس دن بچوں کو کچھ دینا بھول گئے .....“ اور لطف یہ ہے کہ اِس بھول کی تلافی پھر بھی نہ کی گئی۔

میرے ایک دوست ہیں مہتاب۔ انہیں بھی اللہ نے کسی خاص ہی مٹی سے بنایا ہے۔ ان میں بھی کچھ اسی قسم کے جراثیم ہیں جو مذکورہ خاندان میں پائے جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، کاش مہتاب بھی اسی خاندان کے ایک فرد ہوتے۔ تاہم میں دل کو اس خیال سے مطمئن کر لیتا ہوں کہ خون کا رشتہ نہ سہی، بخل کا رشتہ تو قائم ہے۔ ان مہتاب صاحب کی ایک عادت یہ ہے کہ جب ملتے ہیں، پہلی بات یہ کہتے ہیں کہ مرغا کھلاؤ۔ ہم تین دوستوں کی تگڈم بڑی دیر سے ہے۔ مہتاب، منظور اور مَیں۔ ہماری دوستی مثالی ہے۔ ہم تینوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے، لیکن ہم مہتاب کی بخیلانہ حرکتوں سے بہت تنگ ہیں۔ جب بھی ہم ملتے ہیں، مہتاب کہتا ہے ”بہت دیر سے جی چاہتا ہے آپ میری دعوت کریں، ہوٹل میں، پُرتکلف، مرغا ضرور کھاؤں گا۔“

یا پھر یوں کہتا ہے ..... آج پکچر چلتے ہیں۔ منظور ٹکٹ خریدیں گے۔ نجیب پُرتکلف انٹرول دیں گے اور میں پکچر دیکھوں گا۔ انٹرول کھاؤں گا اور جب پکچر ختم ہو جائے گی، تو ہوٹل میں مرغا بھی کھاؤں گا۔“

میں اور منظور کئی بار سر جوڑ کر بیٹھے کہ مہتاب سے یہ خوئے بد

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کیسے چھڑائی جائے۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ سوسائٹی میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ یہ عادت کہیں اسے شرمندہ نہ کرادے۔ ایک بار ہم نے یہ تدارک سوچا کہ آئندہ ہر پروگرام کنٹری بیوشن ہوا کرے گا۔ جو خرچ ہوگا تین حصوں میں بٹ جائے گا۔ مہتاب بھی مان گیا۔ اِس شرط کو پہلی بار آزمانے کے لیے ہم تینوں کیفے ڈی لکس میں گئے۔ مرغ کے تین پیس۔ قورمہ، پلاؤ، شامی کباب، جیلی کریم دو کپ فی کس، چائے اور کیپسٹن کے دو پیکٹ۔ خوب آرڈر چل رہے تھے۔ پھر بل آیا۔ بیس روپے کچھ آنے۔ ہمیں کنٹری بیوشن کرنا تھا۔ بیرے کو کسی بہانے کاؤنٹر پر بھیج دیا۔ منظور اور میں نے سات سات روپے میز پر رکھ دیے۔ مہتاب سے طلب کیے، کہنے لگا۔ اُٹھنّی جیب میں پڑی ہے اور امّی کے لیے جوشاندہ لے جانا ہے، لیکن کوئی بات نہیں کل آپ دونوں میرے غریب خانے پر دعوت کھائیں گے۔ ہم نے بھی سوچا کنٹری بیوشن نہ سہی، دعوت سہی۔ ریچھ کا ایک ہی بال کافی ہے۔ اگلے دن پہنچتے پہنچتے دیر ہوگئی۔ شاید دو بج گئے۔ مہتاب ہمارا استقبال کرتے ہوئے بولا۔ یار انتظار کرتے کرتے ناامید ہوگیا۔ خیال آیا شاید اب آپ نہ آئیں اور کھانا سڑ جائے۔ اِس لیے سب استعمال میں آگیا۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو ایک افسانہ سناتا ہوں، کل رات لکھا ہے۔ اِتنی دیر میں نوکر کچھ پھل لے آئے گا۔ میں اسے بھیجتا ہوں۔ مہتاب افسانہ سناتا رہا۔ ہم دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے رہے۔ نوکر آگیا، آدھ سیر امرود لے کر۔ اس نے معذرت کی کہ اور کوئی پھل نہیں مل سکا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس نوکر نے چند دنوں بعد وہاں سے نوکری چھوڑ دی۔ ایک روز راستے میں ملا۔ کہنے لگا ''بابو جی! مہتاب بابو نے کہا تھا چونّی سے زیادہ خرچ نہ کرنا۔ اِس لیے میں امرود لے آیا تھا، معاف کر دینا۔'' ہمیں بہت غصہ آیا۔ مہتاب ملا، تو میں نے ڈانٹا کہ مجھے معلوم نہ تھا تم اِتنے ذلیل ہو۔ گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگا ''چھوڑو بھی یار، چلو مرغا کھلاؤ۔'' ہم دونوں کو ہنسی آ گئی۔ اور ہم تھوڑی دیر بعد کیفے میں بیٹھے اسے مرغا کھلا رہے تھے۔ اس نے بیرے سے کہا۔ تین سگرٹیں لے آؤ اور جیب سے پیسے نکالنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ روک لیا اور کہا: ''پیسے میں نذر کرتا ہوں۔ آپ کی جیب میں اُٹھنی ہوگی اور اس کا بھی جوشاندہ لے جانا ہوگا امّی کے لیے.....'' وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا۔ اور منظور نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا: ''پیراسائٹ ہے سالا!''

میں نے سوچا، اِس پیراسائٹ کو اِس مذکورہ خاندان کے ساتھ چمٹا دیا جائے۔ مہتاب سے پوچھا۔ وہ فوراً رضامند ہوگیا۔ صرف اِتنا پوچھا، لڑکی کیا کچھ لائے گی۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکی کی ماں سے میں نے کہا:

''مہتاب پڑھا لکھا، خوش حال نوجوان ہے، اسے فرزندی میں لے لیجیے۔'' وہ بھی رضامند ہوگئیں۔ اُنہوں نے بھی یہ بات پوچھی۔ لڑکا کیا کچھ لائے گا۔ میں نے کہا۔ آپ لڑکے کو کیا کچھ دیں گی۔ جواب دیا جس نے لڑکی دے دی، سب کچھ دے دیا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا کہ دنیا کے سب بخیل ''لینے'' ہی کے متعلق سوچتے ہیں ''دینے'' کے تصور سے ان کی جان نکلتی ہے۔ مجھے ایک بخیل کی کہانی یاد آگئی جو کنوئیں میں گر پڑا تھا۔ لوگ مینڈھ پر کھڑے پکار رہے تھے کہ ''میاں ہاتھ دینا'' وہ بے حرکت کھڑا تھا۔ آخر کار ایک نفسیات شناس نے چیخ کر کہا ''میاں ہاتھ لینا'' اور بخیل چشمِ زدن میں باہر تھا!

میں نے واقعی بے انتہا کوشش کی کہ مہتاب کی شادی ذکیہ کے ساتھ ہو جائے۔ دونوں حد درجے کے بخیل تھے۔ میرا خیال تھا کہ اِن دونوں منفیوں کو بظاہر جمع کر دیا جائے۔ ہوسکتا ہے ایک دوسرے کے آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر شرم آجائے۔ بیوی اور شوہر جذباتی رشتے ہیں تیز چمک رکھنے والے آئینے، جنہیں دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ شاید ذکیہ اور مہتاب ایک دوسرے کے بخل کو دیکھ کر اپنی اِس عادت سے نفرت کرنے لگیں۔ ذکیہ چائے کو دودھ دکھانے کی عادت ترک کر دے۔ اور پیراسائٹ اُٹھنی کا جوشاندہ خریدنا بند کر دے۔ آخر ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مجھے ایک دن کاروبار کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ خلافِ توقع مجھے وہاں ایک ہفتے کی بجائے ایک مہینہ لگ گیا۔ بہرحال واپس آیا۔ بہت سے تحفے خرید لیے تھے۔ کچھ منظور کے لیے، کچھ نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے۔ منظور کے یہاں گیا۔ اس کے حصے کے تحفے اس کی بچی پروین کو تھمائے۔ پھر میں نے منظور سے کہا، چلو مہتاب کے گھر چلیں۔ ذکیہ کے لیے ایک ساڑھی لایا ہوں۔ اسے دوں گا، تو خوش ہوگی۔

منظور نے افسردہ ہو کر کہا ''ذکیہ تمہیں وہاں نہ ملے گی۔''

''تو کہاں ہے وہ؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ اپنے میکے آبیٹھی ہے۔''

''میکے آبیٹھی ہے! کیوں؟'' میں نے بڑے اضطراب سے پوچھا۔

''بات نہایت معمولی تھی۔'' منظور نے ایک آہ بھر کر کہا، لیکن اسی سے جھگڑا بڑھتا گیا۔

''کچھ بتاؤ تو آخر!''

''کیا بتاؤں، ایسی عجیب بات تھی کہ رونا بھی آتا ہے، ہنسی بھی۔''

منظور کے اِس اینچ پینچ سے میری طبیعت اُلجھ گئی۔ میں نے جھلّا کر کہا۔

''بکواس چھوڑو، اصل بات بتاؤ۔''

منظور نے شربت کا گلاس مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''شادی کے کوئی ایک ہفتے بعد ذکیہ کے ماموں ذکیہ سے ملنے آئے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی ہے۔ اس نے مہتاب سے کہا۔ دکان سے مینگو سکوائش کی ایک بوتل اور کچھ برف لے آؤ۔ مہتاب گیا اور آ کر نہایت افسوس سے کہا کہ دکان دار دکان بند کر گیا ہے۔ اس کا کوئی رشتہ دار مر گیا، وہ نمازِ جنازہ پڑھنے گیا ہے۔ ماموں نے سادہ پانی پر اکتفا کیا۔ اگلے دن پڑوسن سے معلوم ہوا کہ دکان کھلی تھی۔ مہتاب نے غلط بیانی کی۔ اِس پر ہلکی سی چخ ہوگئی۔ دو تین دن بعد ایک معزز گھرانے میں ان کی دعوت ہوئی۔ مرغے کی قاب سامنے آئی، تو مہتاب نے تمام مرغا اپنی پلیٹ میں انڈیل لیا اور کھانے میں نہایت بدتمیزی دکھائی۔ جب دونوں گھر آئے، تو ذکیہ نے مہتاب سے کہا:

''تمہیں شرم نہیں آئی۔''

''جی! کس بات کی شرم؟''

''تم نے دعوت میں آنکھ بچا کر سگریٹ کے دو پیکٹ پتلون کی جیب میں ڈال لیے..... کنجیل کہیں کے۔''

وہ خاموشی سے اُٹھا۔ اس نے کارنس سے ذکیہ کا بڑا پرس اُٹھایا اور اسے کھولتے ہوئے کہا: ''اور یہ دو لڈو اِس میں کہاں سے آئے۔ میں تاڑ رہا تھا جب تم نے مٹھائی کی پلیٹ سے انہیں سرکایا۔ چور کہیں کی۔ بخل کی بھی انتہا ہے۔'' یہ چخ اتنی بڑھی کہ وہ میکے آگئی۔ اور اب تک وہیں ہے۔

''اور مہتاب؟''..... میں نے پوچھا۔

منظور نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا..... ''وہ کل مجھے کیفے لے گیا۔ یہ کہہ کر کہ آج وہ کھانا کھلائے گا اپنی جیب سے، جب بیرا آیا، تو اس نے آرڈر دیا۔ ''بیرا دو ہاف پلیٹ دال، دو ہاف پلیٹ سبزی، دو فل پلیٹ خالی اور آخر میں دو کپ چائے کچن سے بنوا کر فسٹ کلاس۔'' جب کھانا کھا چکے، تو اس نے بیرے سے کہا ''دیکھو چائے مت لانا۔ سخت گرمی ہے۔ بس ایک جگ برف کے پانی کا بھر لاؤ فسٹ کلاس!'' اِس بات پر منظور اور میں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

''چلو اس کے پاس چلیں۔'' میں نے کہا۔ ''اسے مجبور کریں گے وہ ذکیہ سے صلح کر لے۔'' منظور نے جلدی جلدی لباس بدلا۔ ہم دونوں اس کے گھر پہنچے۔ وہ بڑے خلوص سے ہم سے بغل گیر ہوا۔ میں نے کہا ''یہ تو نے کیا کیا، ذکیہ کو ناراض کر دیا؟''

وہ کہنے لگا، چھوڑ یار! اِن باتوں کو..... چل کیفے ڈی لکس۔ تو نے مجھے بہت دیر سے مرغا نہیں کھلایا!''

Rs. In Million

Sr. No.	Name of Scheme	Estimated Cost & Earnest Money (2% Estimated Amount)	TS No. & Date	Completion Time	Tender Fee
1.	Rehabilitation / Construction of road, Mal-Fatyana Link road from Masjid to BHU via Veterinary Hospital to link Post Office in Tehsil Kamalia District Tobe Tek Singh (CDR Phase II)	10,000 0.210	E.E. No. 676 dated 16.03.2020	04 months	Rs.10000/-

Note: If the tenders could not be issued / opened on above mentioned dates due to any unavoidable circumstances, the alternate date of issuance of tender will be 24.07.2020 and will be received on 27.07.2020 however the time and all other term and condition will remain the same.

IPL - 5274

Executive Engineer

Highway Division T.T. Singh

Superintending Engineer

Highway Circle, No.2, Faisalabad.

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

رزق حرام

’’حرام کماتا ہے تبھی تو دیکھو بیوی مسلسل بیمار رہے۔‘‘

نسیم سیٹھ دکان پہ آئے ہوئے ایک جاننے والے کو اپنے رشتے دار کے متعلق بتا رہے تھے۔

’’ہاں نسیم بھائی صحیح کہہ رہے ہو۔ اتنی جلدی کون بھلا گھر بنا تا ہے آج کل......اور تو اور ساری بیٹیاں بھی نمٹا دیں ہیں۔‘‘

’’ہاں بھئی! اب جیسا کماؤ گے ویسا ہی خرچے میں نکل بھی جائے گا۔‘‘

’’بالکل ٹھیک کہا۔‘‘

’’اچھا پھر میں چلتا ہوں۔ دفتر جانا ہے۔‘‘

’’آفس کون سے۔ آپ ابھی تک ریٹائر نہیں ہوئے۔‘‘

’’ارے صرف تنخواہ لینے جاتا ہوں مہینے میں ایک بار۔ وہاں سیٹنگ کی ہوئی ہے اکاؤنٹنٹ اور مینیجر سے۔ ان کو ان کا حصہ پہنچا دیتے ہیں اور ہماری حاضری لگ جاتی ہے۔ باقی دکان سے تو ’رزق حلال‘ اپنا چل ہی رہا ہے......

اچھا میاں اب اجازت دیر ہو رہی ہے۔‘‘

☆☆☆

(مراسلہ: فیضان متین)

NOTICE INVITING TENDER

Sealed tenders based on item rates (as per TS Estimate) are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C&W Department for the financial year 2020-21 in the field of Highway/Bridges.

Tender Bid documents from the date of publication can be obtained, from the office of the Executive Engineer, Highway Division Toba Tek Sigh on payment of prescribed tender/bid fee in the form of CDR/Bank Draft Cashier's of any scheduled bank date of publication from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/ upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of contractor / managing partner/ Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR/ Bank Draft/Cashier's Cheques of any scheduled bank:-

i) Chief Engineer (Central) Punjab Highway Department Lahore.
ii) Commissioner Faisalabad Division, Faisalabad.
iii) Superintending Engineer Highway Circle No.2, Faisalabad.
iv) Deputy Commissioner, Tobe Tek Singh.
v) Executive Engineer, Highway Division Toba Tek Singh
vi) Assistant Commissioner, Toba Tek Singh

Tenders rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be issued from the date of publication upto 21.07.2020 and will be received on 23.07.2020 upto 02:00 P.M. and the same will be opened after 30 minutes of the closing time i.e. at 02:30 P.M. simultaneously in the offices of the Chief Engineer, (Central) Punjab Highway Department Lahore and the Commissioner Faisalabad Division, Faisalabad on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives.

Conditional tenders and tender not accompanied with earnest money @ 2% of the estimated amount in shape of CDR/Bank Draft/Cashier's cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

PPRA Rule 35 will be followed in true letter & sprit for rejection of tenders.

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مزاح

شجاع الدین غوری

چائے کی چاہ

ایک خوشامدی شاعر کی دلچسپ کہانی جو سب کو شیشے میں اتارنا خوب جانتا تھا

شیخ چاند ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے پیدائشی دوست ہیں۔ شیخ چاند کی وجہ تسمیہ کافی دلچسپ ہے۔ شیخ چاند کے والد کا نام شیخ بدرالدین، والدہ کا مہتاب بیگم، بڑی بہن کا قمر جہاں اس سے چھوٹی کا ماہِ منیر۔ یعنی ایں خانہ ہمہ مہتاب است۔ دو لڑکیوں کے بعد جب شیخ بدرالدین صاحب کے ہاں اولاد نرینہ کی ولادت باسعادت ہوئی تو لوگوں نے یوں بات پھیلائی کہ اس گھر کو پہلے ہی چار چاند لگے تھے۔ اب پانچواں بھی چڑھ آیا۔ یہ بات نہ صرف قبول خاص و عام ہوئی، بلکہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھتے ہوئے اہل شیخ کے دل میں گھر کر گئی اور نومولد شیخ چاند کے نام سے موسوم ہوا۔

بڑے شیخ صاحب کے کچھ بے تکلف دوستوں نے باپ بیٹے کو حسب مراتب ''فل مون'' اور ''ہاف مون'' کے خطاب سے نواز رکھا ہے۔

یہ بات یقینی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں چھوٹا کون اور بڑا کون ہے۔ شیخ چاند کی عمر حسب ضرورت چاند کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ان کی والدہ کا خیال ہے کہ وہ مجھ

QAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سے چھوٹے ہیں۔ اور میری والدہ کا کہنا ہے کہ میں ان سے چھوٹا ہوں۔ انڈہ پہلے یا مرغی کے مخمصے کو یہیں رہنے دیجیے۔ کیونکہ ہماری پریشانی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ وقت بے وقت، موقع بے موقع، دن دھاڑے ہمارے گھر پر حملہ کرنا، رات کے کسی پہر شب خون مارنا ان کی عادت بن چکی ہے۔ بچے چاند چاچا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ بیگم ان کی آمد پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں اور ہاتھ پیر جھٹک کر اپنی ناراضی کا اظہار کرتی ہیں۔ ہم بے بس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بارہا سمجھایا کہ شریفوں کے آنے جانے کے کچھ اوقات و آداب ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے بے سود۔ چکنے اتنے کہ اچار کا گھڑا بھی مات کھا جائے۔ کسی بات کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ ایک کان سے سنا دوسرے سے اڑا دینا، آپ کے لیے محاورہ ہو گا لیکن یہ بات ان پر صادق آتی ہے۔

ان کا آنا جانا دھمکنا، سب کچھ گوارا، مگر اس کا ہم کیا علاج کریں کہ وہ خود کو سقراط و بقراط کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ ہر مسئلہ کا حل، ہر مرض کا علاج منٹوں، سیکنڈوں میں پیش کر دیں۔ ہر بات میں دخل دینا۔ بات بات پر بحث کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ دنیا کا ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر موصوف کامل دسترس نہ رکھتے ہوں۔ اردو زباں و ادب پر تو آپ کی خاص نظر عنایت ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف کا اپنے آپ کو استاد کامل سمجھتے ہیں۔ عام گفتگو عمومی انداز میں کرتے ہیں، لیکن اگر بات زبان و بیان پر ہو تو آپ کے منہ سے روزمرہ محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتوں کے موتی برسنے لگتے ہیں اور اگر ذکر شعر و شاعری کا ہو تو اشعار کے دریا بہا دیتے ہیں۔

کل ہی کی بات ہے، رات تقریباً دس بجے ہوں گے۔ بیگم بچوں کی دھما چوکڑی سے تنگ آئے بیٹھی تھی۔ دو ایک کی پیٹھ بھی سہلا چکی تھیں، تیور انتہائی خطرناک تھے باقی بچوں کے ساتھ ساتھ ہم بھی جل تو جلال تو صاحبِ کمال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے تھے کہ کہیں اس کے بعد ہماری کوتاہیوں اور بچوں کی طرف سے لاپروائیوں کے دفتر نہ کھل جائیں۔

ہماری بیگم کے جلال کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی بے تکلف سہیلی ان سے پوچھ بیٹھی کہ ''تمہاری چنگیز خانی پر تمہارے شوہر کچھ نہیں کہتے......؟'' تو وہ مسکرا کر مجازؔ کے انداز میں کہتی ہیں۔ ''لوگوں کی بیویاں سعادت مند ہوتی ہیں، خوش قسمتی سے میرے شوہر سعادت مند ہیں۔''

ایسے خطرناک لمحات میں جب کہ لحظہ بہ لحظہ حرب و ضرب کے اندیشے بڑھ رہے تھے، اچانک شیخ چاند آ موجود ہوئے۔ حسب عادت انھوں نے اپنی آمد کا اعلان دروازہ پیٹ کر اور چائے کا مطالبہ گلا پھاڑ کر کیا جو بیگم کا ہمیشہ سے ناپسندیدہ فعل رہا ہے۔ ان کی اس حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

''چاند بھائی! چائے ختم ہو گئی ہے۔ یہ تو بازار جاتے نہیں، رات کا وقت ہے بچوں کو کہاں بازار بھیجوں۔ صبح ہو گی تو چائے آئے گی۔ اب آپ صبح تک تو انتظار کرنے سے رہے۔'' لہجہ نیم چڑھے کریلے سے بھی کڑوا اور انداز کاٹ کھانے والا تھا۔

ہم ابھی تک اپنے دفاعی مورچہ میں دبکے ہوئے تھے احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جب تک حالات امن و صلح کا رخ اختیار نہ کر لیں، ہمیں اپنا مورچہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نہ جانے کس وقت حالات پلٹا کھائیں۔ شیخ چاند کی آمد سے جنگ بندی کی امید کم ہو کر بیگم کی بم باری اور شیخ چاند کی چاند ماری کے اندیشے بڑھ گئے تھے۔

ہماری بیگم کی کسی بات کا نہ اس سے پہلے کبھی ان پر اثر ہوا تھا نہ اب ہوا۔ ان کی بات سن کر پہلے تو وہ مسکرائے اور پھر جیب سے چار عدد چائے کی تھیلیاں نکال کر بیگم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔

''لیجیے دو اب کام میں لائیں اور دو صبح کے لیے اٹھا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

رکھیے۔'' بیگم ہکا بکا کبھی شیخ چاند کو تو کبھی ان کے ہاتھ میں جھولتی چائے کی تھیلیوں کو دیکھنے لگیں۔

ہم اپنے دفاعی مورچہ میں دبکے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہے تھے تا کہ بے ساختہ نکلنے والے قہقہہ کو روک سکیں۔

''جب آپ کے پاس چائے موجود ہے، تو پھر گھر سے پی کر کیوں نہیں آتے......؟'' شرمندگی اور جھنجھلاہٹ کے باعث جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو ایک عام سی بات کہہ ڈالی۔

''ہمیں کھانا اپنے گھر کا اور چائے آپ کے گھر اور ہاتھ کی پسند ہے۔'' وہ یہ بات ایک جھونک میں کہہ تو گئے۔ پھر فوراً ہی سنبھلا لیتے ہوئے کہنے لگے۔ بات دراصل یہ ہے بھابھی! کہ آپ کے ہاتھ کی بنی چائے اتنی عمدہ اور لذیذ ہوتی ہے کہ بار بار پینے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ بخشے نانا مرحوم کہا کرتے تھے، میاں چائے پینے کا لطف تب ہی آتا ہے، جب چائے لب ریز ہو، لب دوز ہو اور لب سوز ہو اور یہ تینوں خوبیاں آپ کی چائے میں پائی جاتی ہیں۔

اس چکنے چپڑے مکھن میں لتھڑے جواب کو سن کر ہم تصور ہی تصور میں بیگم کو آسمانِ غضب کی بلندیوں سے اتر کر بحرِ ستائش کی اتھاہ گہرائیوں میں تیرتا دیکھ رہے تھے۔

وہ اپنی بات کو یوں جاری رکھے ہوئے تھے۔ بخدا اگر آپ کے ہاتھ کی بنی چائے کا مزہ اردو ادب کے شعرائے متقدمین و متاخرین نے چکھا ہوتا تو یقین کیجیے، ان کی شاعری سے چائے کا رنگ جھلکنے لگتا۔

دلی دکنی چائے کے مضمون پر شعر کہتے تو یوں کہتے:

اے ولی دردِ سر کبھو نہ رہے
گر ملے چائے ان کے ہاتھوں سے

میر تقی میر کہتے تو یوں کہتے۔

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک چائے پی کر سو گیا ہے

غالب کہتے تو یوں کہتے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگِ علاج
چائے ہر رنگ میں چلتی ہے سحر ہونے تک

مجاز کہتے تو یوں کہتے۔

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ مجھ کو چھوڑ دے
چائے کا یہ وقت، کچھ چائے پینے دے مجھے

اور علامہ اقبال نے تو ساقی نامہ کے بجائے چائے نامہ لکھا ہوتا۔

وہ چا جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ چا جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ چا جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ چا جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اُٹھا ساقیا پردہ اِس چائے سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس سے پہلے کہ شعرائے کرام کی فہرست طویل ہو کر ایک عظیم الشان مشاعرے کی شکل اختیار کر لے، ہم اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے۔ شیخ کو بازو سے پکڑا اور ڈرائنگ روم کی جانب کھینچتے چلے گئے...... اور بیگم اپنی تعریف میں سرشار چائے کی تھیلیوں کو دائیں بائیں ہلاتی باورچی خانے کی جانب چلی گئیں۔

◆◆◆

بات تو سچ ہے مگر......

دنیا میں بانوے فیصد لوگ گوگل کا استعمال اپنے اسپیلنگ چیک کرنے اور معلومات عامہ کے لیے کرتے ہیں اور پاکستان میں 80 فیصد لوگ گوگل کا استعمال اس لیے کرتے ہیں کہ پتہ چل سکے انٹرنیٹ چل رہا ہے کہ نہیں۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

رضوان اللہ

ہر شخص کے معاملاتِ زندگی ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں ان لگے بندھے معمولات سے آدمی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنے کام کے دوران وقفہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کو جلد تھکن کا احساس نہیں ہو گا۔

ماحول انسان کے مزاج پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ گھر یا دفتر کا ماحول اگر خوشگوار نہیں تو آپ کے مزاج پر اس کا لازمی اثر پڑے گا۔ کوشش کر کے ماحول خوشگوار بنائے رکھیں یا آپ اس ماحول میں خود کو ڈھال لیں۔ جب آپ دیکھیں کہ واقعی کوئی چیز برداشت سے باہر ہے تو آپ ایسا ماحول یا جگہ تلاش کریں جہاں آپ خود کو آرام دہ اور پُرسکون محسوس کریں۔ آپ میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ متعلقہ لوگوں سے کس طرح نمٹنا یا برتاؤ کرنا ہے۔ ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھیں کہ آپ کا کام بھی متاثر نہ ہو اور دوسرا فرد بھی آپ کے متعلق منفی رائے قائم نہ کرے۔ اسی طرح گھر کا ماحول بھی خوشگوار رکھیں۔

غذائی جادو

www.pakistanipoint.com

سادہ غذا نہ صرف دسترس میں ہے، یہ زندگی کو بہتر اور صحت مند بنانے کا نادر کلیہ ہے

مثبت سوچ

صحت مند رہنے کے لیے اپنے رہن سہن کے طریقوں میں مثبت تبدیلی لائیے۔اس سے آپ کے اندر ایک طمانیت کا خوشگوار احساس جنم لے گا۔

ماہرین صحت کہتے ہیں کہ مثبت سوچ کے حامل لوگ کم تھکتے ہیں۔ وہ زیادہ فعال، سرگرم اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اردگرد لوگوں کی منفی باتوں پر دھیان نہیں دیتے بلکہ اچھے پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان سے بات چیت کرتے ہیں۔

یہ لوگ سمجھوتہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

غذا کا انتخاب

اچھی صحت برقرار رکھنے سے مدافعت اور امراض کے علاج کے لیے غذا نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہرین غذائیت سر رابرٹ میکرسن کے الفاظ ہیں:

''صحیح قسم کی خوراک، افزائش صحت کے لیے نہایت اہم، واحد عامل اور غلط خوراک افزائش مرض کے لیے نہایت اہم واحد عامل ہے۔''

متوازن اور صحیح خوراک غذائی مجموعہ (Combination Diet) سے بن سکتی ہے۔ جس میں غذائی عناصر (Essential Nutrients) موجود ہیں۔

سادگی اپنائیے، تازہ سبزیاں، سادہ خوراک

تازہ سبزیاں استعمال کیجیے۔ انھی کے رس میں سٹیم یا بوائل کریں۔ سبزیوں کو چھیلے بغیر استعمال کرنا چاہیے۔ خاص کر جڑ والی سبزیوں کو بھگونے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ اس سے ذائقہ اور غذائیت میں کمی آتی ہے۔ سبزیوں کے زرد رنگ کے بیجوں کے اندر وٹامن اے کی خاص مقدار ہوتی ہے۔

سادہ طرزِ حیات اپنانے سے آدمی فطرت کے قریب ہوتا ہے۔ ہر کام سادگی سے آسانی اور سہولت سے ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس پرتعیش زندگی میں تصنع، بناوٹ اور مصنوعی پن جھلکتا ہے۔ سادہ خوراک کھانے سے صحت و تندرستی برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ تازہ، سادہ اور متوازن خوراک مناسب وقفے سے کھانا صحت کی ضامن ہے۔ بازار سے تیار کھانے کھانا، جو ذائقے میں تو چٹ پٹے اور مزیدار لگتے ہیں لیکن صحت کے لیے چنداں فائدہ مند نہیں۔ آج کل فاسٹ فوڈ کولا مشروبات بھی صحت کے لیے نقصان دہ اور مضر ہیں ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ ہمیشہ اطمینان اور سکون کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے نوالے خوب چبا کر کھانے سے لعاب دھن شامل ہوتا ہے اور ہاضمہ بھی اچھا رہتا ہے۔ کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے پانی پینا بہتر ہے درمیان میں اور بعد میں پانی پینا مناسب نہیں۔

وقت کا صحیح استعمال کریں

ایک مقولہ ہے: ''کم کھانا صحت، کم بولنا حکمت اور کم سونا عبادت ہے۔''

اس لیے ہمیشہ اس وقت کھانا کھائیں جب خوب بھوک لگے اور جب تھوڑی بھوک رہتی ہو تو کھانا سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ رات کو دیر تک جاگنا مناسب نہیں۔ جلد سونے کی عادت اپنائیں۔ اس سے صبح جلد بیدار ہو سکیں گے اور اپنے معمولاتِ زندگی بہتر طور پر سرانجام دیں گے اور آپ کا سارا دن خوشگوار اور اچھا گزرے گا۔ فکر و پریشانی، اضمحلال و افسردگی (ڈپریشن اور ذہنی دباؤ اسٹریس) سے اپنے آپ کو بچائیں۔ بعض بیماریوں کا خوف بھی ہمیں پریشان کیے رکھتا ہے۔

کتب بینی کی عادت ڈالیں

کتب بینی ایک صحت بخش مشغلہ ہے۔ کتابوں سے محبت رکھنے والے کسی فلسفی نے اس کی تعریف یوں بیان کی تھی۔

''انسانی زندگی میں رنج و غم کے بادل جب راہوں کو تاریک کر دیتے ہیں تو یہ کتابیں ہی ہیں، جو مخلص دوست کی طرح میٹھے لفظوں سے ہماری ڈھارس بندھاتی اور ان تاریک راہوں کو روشن کر دیتی ہیں۔''

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کتابیں پڑھنے سے دماغ کے عضلات (مسلز) صحت مند، چاق چوبند اور فعال رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں دماغی تنزلی اور دماغی امراض کی شرح ان لوگوں کی نسبت جو کتابوں یا ایسی سرگرمیوں سے دُور بھاگتے ہیں 32 فیصد کم ہوتی ہے۔

اچھی تحریریں پڑھنے سے ذہنی دباؤ میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ ماہرین صحت کہتے ہیں کہ اچھی کتاب کے مطالعے سے ذہنی دباؤ کا باعث بننے والے ہارمون مثلاً کارٹی سول (CORTISOL) کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔

کتب بینی آپ کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ جتنی زیادہ معلومات آپ کے پاس ہوں گی، آپ زندگی کے مشکل ترین کاموں سے اتنے ہی بہتر انداز میں نمٹ پائیں گے۔

تحریری صلاحیتوں میں بہتری اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ کسی مضمون پر لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں، تو اس عنوان پر پہلے سے شائع شدہ کم از کم دس مضامین کا لازمی مطالعہ کریں۔ اس سے آپ کے لفظوں کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ دوسرے مصنف کی تحریروں میں الفاظ کا اُتار چڑھاؤ، چناؤ، لفظوں کی روانی اور تحریری انداز آپ کی اپنی تحریر پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بالغ عمر سے ہی کتب بینی کرنے والے افراد کی توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت اور یادداشت ان افراد سے بہتر ہوتی ہے جو مطالعہ نہیں کرتے۔

سائیکل چلانے سے کئی بیماریوں کا خاتمہ

اپنے آپ کو صحت مندانہ سرگرمیوں میں مصروف رکھیں۔ صبح و شام کی سیر، سائیکلنگ، تیراکی، گھڑ سواری سے آپ کئی طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ماہرین صحت کہتے ہیں جو لوگ روزانہ آدھا گھنٹہ سائیکل چلاتے ہیں۔ وہ حملۂ قلب، ذیابیطس، مٹاپے، ہائی بلڈ پریشر اور دوسری بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ سائیکل چلانا ایک مفید ترین ورزش ہے، جو آپ کو تندرست و توانا اور چاق و چوبند رکھتی ہے۔ سائیکل چلانے سے پورے جسم میں خون کا دورانیہ بہتر رہتا ہے۔ چربی گھل جاتی، خون میں شکر کی سطح بھی مناسب رہتی ہے۔ اس طرح کئی بیماریوں سے انسان بچا رہتا ہے۔ ماضی میں لوگ اتنے سہل پسند نہیں تھے۔ وہ گاڑی کے بجائے پیدل زیادہ چلتے یا سائیکل چلاتے تھے۔ اسی لیے جسمانی طور مضبوط اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ آپ بھی اگر تندرست و توانا چاق و چوبند رہنا چاہتے ہیں تو روزانہ آدھا گھنٹہ سائیکل چلائیے۔

پانی کی اہمیت کو سمجھیں

امریکا میں کی گئی تحقیق کے مطابق روزانہ مناسب مقدار میں صاف ستھرا پانی پینے سے نہ صرف صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے بلکہ یادداشت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ پانی جلد کو تروتازگی اور شادابی بخشتا ہے۔ ذہنی و جسمانی نشوونما میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ پانی کی مناسب مقدار جسم کو پہنچتی ہے تو نمکیات کی کمی نہیں ہوتی۔ پانی ذہن کو توانا اور تیز کرتا ہے۔ پانی بیٹھ کر تین سانسوں میں اطمینان سے اور ہمیشہ دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے۔ اس سے قلب پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں وہ گھٹنوں اور مثانے کی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پانی کے ہر گھونٹ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

مضرِ صحت عادت تبدیل کر لیجیے

بازار کی تیار شدہ روغنی غذائیں نہ کھائیے یہ دشمن صحت غذائیں ہیں۔ ریشے والی غذائیں کھانے کی عادت ڈال لیجیے۔ اس لیے کہ ان سے دل کی تکلیف اور سرطان کا خدشہ کم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نزلہ اور ذیابیطس سے بھی انسان محفوظ رہتا ہے۔

اعصاب مضبوط کیجیے

دماغ کو طاقت دینے کے واسطے پھل بالخصوص مفید

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ناقابل یقین

دنیا کی تاریخ ایسے ان گنت قدیم واقعات سے بھری پڑی ہے جسے سن کر ان کی حقیقت کو تسلیم کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔

☆ رومن شہنشاہ Commodus نے ایک بار روم کے معذور افراد کے درمیان ایک لڑائی کا مقابلہ منعقد کروایا جس میں ایک فریق کی جیت دوسرے کے مرنے کی صورت میں ہوتی تھی۔

☆ قرونِ وسطیٰ کے دور میں دندان ساز مردہ فوجیوں کے دانت نکال کر مصنوعی دانت تیار کیا کرتے تھے۔

☆ میکسیکن جنرل Santa Anna نے جب اپنی ایک ٹانگ کھوئی تو ریاست میں باقاعدہ ٹانگ کا سوگ منایا گیا۔

☆ انیسویں صدی میں اکثر کسی مقدمے کی سماعت کے دوران جانوروں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔

☆ پندرہویں صدی کے دوران یورپی باشندے لاشوں کو غذا کے طور پر کھایا کرتے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس طرح وہ بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

☆ مایا تہذیب کے باشندے قربانی دینے والے افراد کے دھڑکتے دل سینوں سے نکال لیا کرتے تھے۔

☆ گزشتہ 3500 سالوں میں مہذب دنیا نے صرف 200 سال امن کے دیکھے ہیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہیں۔ جن پھلوں میں فاسفورس کا مادہ زیادہ ہے مثلاً سیب وغیرہ دل و دماغ اور اعصاب کی پرورش کرتے ہیں۔ مغز اخروٹ جس کی شکل دماغ سے مشابہ ہے ضعفِ دماغ کا یقینی علاج ہے۔ اعصاب کی کمزوری کا کامیاب اور زوداثر طریقہ یہ ہے کہ پھلوں کا بکثرت استعمال کیا جائے۔ خصوصاً تازہ اور پکے ہوئے انگور، سیب، ناشپاتی، کیلا اور انجیر کا استعمال بہت مفید ہے۔

وٹامن اپنی مرضی سے نہ لیں

ایک تحقیق کے مطابق اخبارات، رسائل یا کتب بینی کی بنا پر از خود حیاتین (وٹامنز) کھانا مناسب نہیں۔ اگر کوئی فرد صحت مند ہے اور متوازن غذا کھا رہا ہے تو اسے حیاتین کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ کسی جسمانی کمزوری یا تکلیف دُور کرنے کے لیے کھاتا ہے تو بھی معالج سے مشورہ ضروری ہے۔ وجہ یہ کہ بعض حیاتین کی زیادہ مقدار نقصان پہنچاتی ہے۔ مثلاً حیاتین الف (وٹامن اے) جو مچھلی، بعض پھلوں اور سبزیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ حیاتین جلد کی صحت، آنکھ کی بینائی اور ہڈیوں کے لیے مفید ہے۔ اس کی روزانہ پانچ ہزار یونٹ کی مقدار کھانی چاہیے، لیکن اگر 25 ہزار یونٹ روزانہ کھائی جائے تو بھوک مرجائے گی، خون کی کمی ہوجائے گی، بینائی کمزور ہوجائے گی، ہڈیوں میں درد ہوگا اور منہ میں چھالے پڑجائیں گے۔

اسی طرح ہر وٹامن خصوصیت کے ساتھ مضر اثرات بھی رکھتا ہے۔ اگر انھیں جسمانی ضرورت کے حساب سے نہ کھایا جائے تو وہ فائدے کی جگہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

صحت مند رہنے کے چار اُصولوں کو اپنا لیجیے۔ یہ چار اُصول یہ ہیں۔

صفائی، ورزش، متوازن غذا اور مناسب آرام و نیند۔ اگر آپ کی زندگی ان چار ستونوں پر مضبوطی سے قائم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ اللہ کے قرب کے بھی متلاشی رہتے ہیں یعنی نماز روزہ قرآن زکوٰۃ کے پابند ہیں تو پھر یقیناً آپ کی زندگی مثالی اور صحتمند ہے۔

شاہد احمد دہلوی

گنجا نہاری والا

دیگ میں سب سے پہلے غریب کا حصہ نکالنے والے دِلّی کے بانکے نہاری فروش کا دلچسپ تذکرہ

شاہ جہاں بادشاہ نے آگرہ کی چلچلاتی گرمی سے بچنے کے لیے دلی کو حکومت کے صدر مقام کے لیے پسند کیا اور جمنا کے مغربی کنارے قلعہ معلیٰ کی نیو پڑی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمنا کے کنارے کنارے ہلالی شکل میں شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ ہزاروں مزدور قلعہ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے بال بچے، کنبے قبیلے والے سب مل کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہوں گے۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے سودا سلف بیچنے والے بھی آ گئے۔

گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کچے مکانات کی آبادی میں خاصی چہل پہل رہنے لگی۔

اہل قلعہ کے پہلو میں دریا گنج کے رُخ متوسلین شاہی اور امیر امراء کے محلات ڈیوڑھیاں اور مکانات بننے شروع ہو گئے۔ اِدھر قلعہ کے سامنے پہاڑی پر جامع مسجد اُبھرنی شروع ہوئی۔ شہر کے بازاروں کے نقشے بنے۔ جہاں اب پریڈ کا میدان ہے یہاں اُردو بازار، خانم کا بازار اور خاص بازار تھا۔ چاندنی چوک یہی تھا اور قلعے کے چوک پر ختم ہوتا تھا۔ جا بجا نہریں اور باغات سے شہر کو سجایا گیا تھا۔ جب قلعہ مکمل ہوا اور بادشاہ نے اس میں نزول اجلال فرمایا

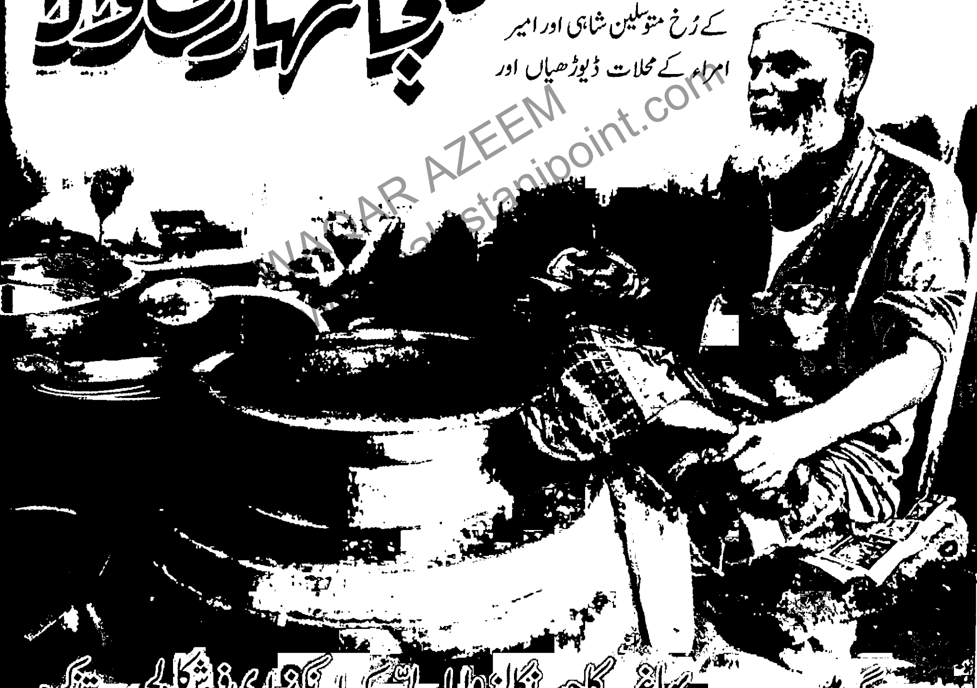

WAQAR AZEEM pakistanipoint.com

توشاہ جہاں آباد سج سجا کر دلہن بنا۔ یہاں دربار ہوا تو بادشاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ مغل شہنشاہوں کی بے انتہا دولت پانی کی طرح بہائی گئی اور رعایا فارغ البال اور مالا مال ہوگئی۔

بادشاہ کے حکم کے مطابق بازاروں میں دنیا زمانے کی چیز موجود۔ اس کے علاوہ فرمان ہوا کہ روزمرہ سودا گلی گلی اور کوچے کوچے پھیری والے آواز لگا کر بیچیں۔ چنانچہ دلی میں آج تک یہی دستور چلا آتا ہے کہ گھر بیٹھے ایک پیسے سے لے کر ہزار روپے کی چیز پھیری والوں سے بازار کے بھاؤ خرید لو۔ اصل میں پردہ نشین خواتین کی آسائش بادشاہ کو منظور نہ تھی کہ جس کا جی چاہے اپنی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیز لے لے۔ آج بھی دلی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید کر جمع کر لیتی ہیں۔ قصائی کنجڑے، کیسرے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منہیار فصل کا میوہ قدرت کا پھل بیچنے والے حد یہ ہے کہ پھول والے تک بڑی دلکش آواز لگاتے ہیں اور گلی گلی سودا بیچتے پھرتے ہیں۔ کسی نے آواز لگائی:

’’ریشم کے جال میں ہلایا ہے نکتیاں، بان قدرت کا جلیبا...... کھا لو۔ ایک تو بول دلکش، اس پر ترنم غضب۔ جی او بدا کے یہی چاہتا ہے کہ سودے والا خالی نہ جانے پائے۔ گنڈے دمڑی کی اوقات ہی کیا۔ جھٹ اسے آواز دی۔ دمڑی کے ڈھیر سارے شہتوت دے گیا۔ دلی کے دل والے سدا سے چٹورے ہیں۔ شاید اسی زبان کے چٹخارے کے ذمہ دار یہی چٹ پٹے پھیری والے اور ان کی سریلی آوازیں ہیں۔ شاید ہی کوئی سودے والا ہو جو کسی شوم کے گھر سے خالی جاتا ہو۔ دھیلی پاؤلا ہر گھر سے مل جاتا ہے۔ باہر والے یہ طور طریقے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں پھٹتی ہیں۔ شاہ 57ء کے ساتھ ختم ہوئی مگر دلی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور شاہ خرچیاں اب تک باقی ہیں۔

زبان کے چٹخارے کا ذکر آیا ہے، تو اس شہر والوں کے اسی پہلو کو لے لیجیے۔ دلی والوں کو اچھا کھانا اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق ہے۔ یہ شوق انھیں ورثے میں ملا ہے۔ اگلے دلی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ ہو۔ بادشاہ کی دولت میں سے حصہ رسد سب کو پہنچتا تھا۔ سستا سماں تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے فراغت۔ ایک کماتا اور دس کھاتے تھے۔ بے فکری سے کماتے اور بے فکری سے اُڑاتے اور باتوں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعے والوں کی تقلید کی جاتی۔ ہر قسم کے کھانے، رکاب داروں اور باورچیوں سے پکوائے جاتے اور ان میں بھی نت نئی اختراعات کی جاتیں۔ پخت و پز کرنے والوں کے علاوہ بادشاہ سے لے کر ان کے اوقات والوں تک ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے کا شوق تھا۔

آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کئی اختراعات ہیں جن میں مرچوں کا ولمہ بہت مشہور ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کے ہاں طاہری ایسی پکتی ہے کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے اور کہیں ماش کی دال ایسی مزیدار ہوتی ہے کہ کوئی اور لگاؤن اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ گھروں کے علاوہ بعض بازار کے دکانداروں نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً گھنٹے والا حلوائی، چڑیا والا کبابی، سرکی والوں کا کھیر والا، پائے والوں کا چچا کبابی، قابل عطار کے کوچے کا سوہن حلوے والا، شاہ گنج کا نواب قلفی والا، فراش خانے کا شابو بھٹیارو لال کنویں کا نان بائی اور چاندنی چوک کا گنجا نہاری والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دلی میں زبان زد عام ہیں۔ ورنہ شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جن میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں۔

مشہور دکانداروں کے ہاں سودا صاف ستھرا، نفیس اور ایک خاص ذائقے کا ہوتا ہے۔ پشت ہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔ ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں محفوظ ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہر تجارت کی طرح ان کے بھی چند بھید ہیں۔ عوام کے اس نظریے نے اتنی شدت اختیار کی کہ

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

طرح طرح روایتیں اور افواہیں شہر میں پھیل گئیں۔ چچا گولے کے کباب ایسے بناتا تھا کہ سارا شہر اس پر ٹوٹ پڑتا۔ پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر روزانہ شام کو اس کی تھڑی لگتی تھی۔ اس ٹھیئے پر ان کی سات پشتیں گزر گئیں۔ چچا کو اس پر بہت ناز تھا کہ ان کے باپ دادا کے کباب بادشاہ کے دسترخوان پر جایا کرتے تھے۔ شہر میں آج تک مشہور ہے کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن ہوتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جاتا تھا۔ پھر چپکے سے ایک بزرگ کہتے:

"سمجھے بھی۔ یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا ہے۔ میاں آدمی کا گوشت کھلاتا تھا آدمی کا۔ جب وہ پکڑا گیا اور اس کی تلاشی ہوئی ہے تو سیکڑوں کھوپڑیاں اس کے گھر سے نکلیں۔" ظاہر ہے یہ ایک لغو اور مہمل قیاس ہے۔ اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح و خاص تناسب کی وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر تاؤ بھاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر کون سی ایسی انوکھی چیز ہے۔ گھر گھر پکتی ہے مگر سرکی والوں کی دکان کے پیالے کھائیے تو جانیے۔ دہی، دودھ، چاول اور شکر کا آمیزہ مگر تناسب اور تاؤ ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی چاٹ کھا رہے ہیں۔ شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربا مشہور ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں بادشاہی وقت کا شوربا ہے۔

ارے بھئی یہ کیسے؟

اجی حضرات! یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے ایک پیالہ بچا لیتے اور اگلے دن کے شوربے میں ملا دیتے ہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آتا ہے۔ یوں ہمارا شوربا شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔

حاجی نان بائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لیے خمیری، کلچے اور شیرمال تیار کیے جاتے اور ایسے ملائم کہ ہونٹوں سے توڑ لو مگر ان کا ہنر دیکھنا ہو تو جو آپ کا جی چاہے فرمائش کر کے پکوائیے۔

حاجی نان بائی کا ذکر آیا تو یاد بخیر میاں گنجے نہاری والے یاد آ گئے۔ اصل میں نہاری والے نان بائی ہی ہوتے ہیں۔ بھٹیارے نہیں ہوتے۔ نہاری تو جاڑوں کھائی جاتی ہے۔ گرمیوں اور برسات میں کھائی جائے نہ پکائی جائے۔ ان دنوں نہاری والے اپنا تنور گرم کرتے ہیں اور روٹی پکانے پر ان کی گزر اوقات ہوتی ہے۔ دلی میں اب تو تقریباً ہر بڑے محلے میں ایک نہاری والا موجود ہے لیکن اب سے پچیس سال پہلے صرف چار نہاری والے تھے۔ انھوں نے شہر کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ گنجے کی دکان چاندنی چوک میں کڑے کے پاس تھی اور شہر میں ان کی نہاری سب میں مشہور ہوتی تھی۔ دلی سے باہر اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ نہاری کیا ہوتی ہے اور بعض مقامات پر یہ لفظ کچھ اور معنوں میں مستعمل ہے مثلاً چوپایوں کو خصوصاً گھوڑوں کی تقویت کے لیے ایک گھولوا پلایا جاتا ہے، جسے نہاری کہتے ہیں۔ بعض جگہ پایوں کو نہاری کہا جاتا ہے۔ دلی میں ایک خاص قسم کا سالن ہوتا ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے اور بازاروں میں فروخت ہوتا ہے۔ اس کے پکانے کا ایک خاص طریقہ ہے اور اس کے پکانے والے بھی خاص ہوتے ہیں۔

نہاری کو آج سے نہیں غدر کے پہلے سے دلی کے مسلمانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو گھر میں بھی اور باہر بھی سیکڑوں قسم کے قورمے پکتے ہیں مگر نہاری ایک مخصوص قسم کا قورمہ ہے۔ اسے پکانا سوائے نہاری والوں کے اور کسی کو نہیں آتا۔ اس کی پخت وپز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری رات پکائی جاتی ہے اور پکنے کی حالت میں ہمہ وقت اس کا تاؤ مساوی رکھا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے۔ تیسرے پہر سے اس کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دکان کی دہلیز کے پاس زمین میں گڑھا کھود کر ایک گہرا چولہا یا بھٹی بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک بڑی سی دیگ اس طرح اُتار کر جما دی جاتی ہے کہ صرف اس کا گلا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

باہر نکلا رہ جاتا ہے۔ چولہے کی کھڑکی باہر کے رخ کھلتی ہے اور اس میں ایندھن ڈالا جاتا ہے جو دیگ کے نیچے پہنچ جاتا ہے۔ آگ جلانے کے بعد قورمے کا مسالا بھونا جاتا ہے۔ جب مسالے میں جالی پڑ جاتی ہے تو گوشت کے پارچے خصوصاً ادلے ڈال کر انھیں بھونا جاتا ہے اور اندازے سے پانی ڈال کر دیگ کا منہ ڈھک دیا جاتا ہے۔ پکانے والے کو جب ادھ گلے گوشت کا اندازہ ہو جائے تو دیگ کا منہ کھول کر اس میں پچیس تیس بھیجے اور اتنی ہی نلیاں یعنی گودے دار ہڈیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ شوربے کو لبدھڑا بنانے کے لیے پانی میں آٹا گھول کر ڈالا جاتا ہے اور یہ آلن کہلاتا ہے۔ اب دیگ کا منہ آٹا لگا کر کونڈے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیگ ساری رات پکتی رہتی ہے اور اس کا تاؤ دھیما رکھا جاتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے پکنے کے بعد جب علی الصبح دیگ پر سے کونڈا ہٹایا جاتا ہے، تو دُور دُور تک اس کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر الگ برتن میں رکھ لی جاتی ہیں اور پھر گاہکوں کا بھگتان شروع ہوتا ہے۔ یہ کھانا چونکہ دن شروع ہوتے ہی کھایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا نام نہار کی رعایت سے نہاری پڑ گیا۔

☆☆☆

ہاں تو ذکر تھا گنجے نہاری والے کا۔ دلی والوں کے علاوہ قرب و جوار سے بھی لوگ ان کی نہاری کھانے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کالج کے لڑکے اتوار کے اتوار دھاوا بولتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں بھی چند بار گنجے کی نہاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان کی دکان صبح دم کھلتی تھی اور کھلنے سے پہلے گاہک موجود ہوتے۔ کسی کے ہاتھ میں پتیلی، کوئی بادیہ لیے، کوئی ناشتہ دان سنبھالے سردی میں سکڑتا سوں سوں کرتا ٹہل لگا رہا ہے۔ بنی تلی ایک دیگ پکتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی۔ ذرا دیر سے پہنچے تو میاں گنجے نے معذرت کے لہجے میں کہا:

''میاں! اب کل لیجیے گا اور ذرا سویرے آیئے گا۔''

نہاری کے مسالوں کا وزن اور پکانے کا طریقہ اوروں کو بھی معلوم ہے مگر وہ ہاتھ اور نگاہ جو اُستاد گنجے کو میسر تھی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اکثر لوگ ان سے دریافت بھی کرتے تھے کہ ''آخر استاد بات کیا ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی پکی نہاری میں یہ لذت نہیں ہوتی؟ تو وہ ہنس کر یہ کہہ دیا کرتے کہ ''میاں بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ اور حضرت سلطانؒ جی کا فیض ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا''۔

اُستاد گنجے کے کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ان کا سراپا بھی بیان کیا جائے۔ ''گنجے'' کے نام سے خوامخواہ ذہن میں ایک کراہیت سی پیدا ہوتی ہے۔ نازک خیال اور نفیس مزاج لوگ گنجے کے ہاتھ کا پانی بھی پینا گوارا نہیں کر سکتے لیکن استاد کو تو سرے سے گنج کی بیماری ہی نہیں تھی۔ اصل میں ان کی چندیا کے بال جھڑ گئے تھے اور نائٹ صاف ہو کر تامڑا نکل آیا تھا اور اس کے تین طرف چار انگل چوڑی بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔ دلی کے چلبلی طبیعت والے بھلا کب چوکنے والے تھے۔ گنجے کی پھبتی ان پر کسی اور یہ کچھ ایسی جمی کہ چپک کر رہ گئی۔ گندمی رنگ کا گول چہرہ، خشخاشی ڈاڑھی، بڑی بڑی چمکدار مگر حلیم آنکھیں۔ باوجود نہاری فروشی کے ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ لٹھے کا شرعی پاجامہ نیچا کرتا، کرتے پر بہت صوفیانہ چھینٹ کی نیم آستین، سر پر صافہ، کسرتی اور بھرا بھرا جسم۔ انھیں کوئی دیکھے تو سمجھے کہ بڑے خرانٹ ہیں۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہوں گے مگر ان کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بالعموم نامی دکاندار بڑے بدمزاج اور غصیل ہوتے ہیں جیسے کہ چچا کبابی کہ بڑے ہتھ چھٹ تھے اور مار پیٹ تک سے نہیں چوکتے تھے۔ استاد گنجے بڑے خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ انھیں تاؤ آیا ہو یا کبھی ان کے منہ سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکلا ہو۔ ہر گاہک سے چاہے وہ دو آنے کا ہو

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

روپے دو روپے کا بڑی نرمی سے بات کرتے اور مستقل گاہکوں کو تو اپنا مہمان سمجھتے۔

استاد گنجے کے کردار میں سب سے نمایاں چیز ان کا حلم اور انکسار تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے جنھیں دلی والے سلطان جی کہتے ہیں، استاد گنجے کو بڑی عقیدت تھی اور یہ انھی کا روحانی تصرف تھا کہ استاد گنجے کا دل گداز ہو گیا تھا اور وہ اپنی ساری کمائی غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کرنے میں صرف کرتے۔ سلطان جی کی سترھویں میں اپنی دکان بڑے اہتمام سے لے جاتے اور دوسرے سارے دنوں میں درگاہ کی حاضری ہر جمعرات کو باقاعدہ ہوتی۔ ہر مہینے گیارہویں کی نیاز ان کے ہاں بڑی دھوم سے ہوتی۔ دن بھر لنگر جاری رہتا۔ جمعرات کو ان کی دکان پر فقیروں کی لگاتار لگی رہتی اور سب کو پیسہ ٹکہ ملتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دکانداری شروع ہونے سے پہلے ادھر دیگ کھلی اور ادھر انھوں نے اللہ کے نام کا حصہ نکالا۔ اگر کوئی محتاج موجود ہوا تو پہلے اسے کھلایا ورنہ نکال کر الگ رکھ دیا۔ پھر دیگ میں سے بھیجے نلیاں نکال کر طباق میں رکھیں۔ تار اور رونق کو ایک بڑے بادیے میں الگ نکال لیا اور اس کے بعد دُکانداری شروع ہوئی۔ دکان میں بیسیوں پتیلیاں، دیگچے اور برتن رکھے ہیں۔ کسی میں دو روپے، کسی میں روپیہ کسی میں بارہ آنے، کسی میں آٹھ آنے پڑے ہیں۔ شوقین اور قدردان رات ہی کو اپنے اپنے برتن اور پیسے دے گئے ہیں کہ مایوس نہ ہونا پڑے۔ سب سے پہلے انھی برتنوں کی طرف استاد کی توجہ ہوتی ہے۔ بڑی تیزی اور پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہیں۔ ادھر گاہکوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ ان کی آسائش کا بھی خیال ہے۔ گاہک بھی جانتے ہیں کہ جس کے برتن پہلے آ گئے انھیں پہلے ملے گا۔ کسی باہر والے نے جو یہاں کے قاعدے اور قرینے نہیں جانتا جلدی مچائی تو استاد نے بڑی انکساری سے کہا:

''حضور ابھی دیتا ہوں۔ جو پہلے آیا ہے اگر اسے پہلے نہ دوں تو شکایت ہو گی۔ برتن پورے ہوئے، گاہکوں کا بھگتان شروع ہوا۔ دو روپے سے دو پیسے تک کے خریدار موجود اور سب کو حصہ رسد ملتا ہے۔ تین گھنٹے میں دو ڈھائی سو گاہکوں کو نہاری دی اور دیگ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گئی۔ اب جو کوئی آتا رہے تو بڑی سماجت سے کہتے ہیں۔ میاں معافی چاہتا ہوں، میاں اب کل دوں گا، انشاء اللہ خیر رکھے کل کھائیے گا۔ سبحان اللہ کیا اخلاق تھا اور کیسی وضعداری تھی۔ آگ اور مرچوں کا کام اور اتنے ٹھنڈے اور میٹھے۔ دوسروں کو دیکھ لیجیے۔ گالی گلوچ، دھکا مکی اور لپاڈگی کی نوبت رہتی ہے۔

اُستاد گنجے کے ہاں دو قسم کے گاہک آتے ہیں۔ ایک وہ جو خرید کر لے جاتے اور ایک وہ جو وہیں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر کھانے والوں کے لیے دکان کے اُوپر کمرے پر نشست کا انتظام تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرا تھا جس میں چٹائیاں بچھی رہتیں۔ اس میں ایک دو آدمی بھی کھاتے تھے اور دس دس کی ٹولیاں بھی۔ اُستاد سے جتنا اور جو سودا کہا جائے، وہ اتنا ہی دیتے تھے۔ اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا ترمیم نہیں کرتے تھے۔ مستقل گاہکوں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بڑے مزاج شناس اور غضب کی یادداشت تھی۔ صورت دیکھتے ہی کہتے: ''فرمایئے حکیم صاحب کیا حکم ہے؟ کیوں میاں کیا سودا پیش کروں؟ ڈپٹی صاحب ارشاد۔''

میاں گنجے کی نہاری دلی کے سب شرفاء کے ہاں جاتی تھی۔ ان کی سات پشتیں اسی دلی میں گزری تھیں۔ سارا شہر ان کو جانتا تھا اور یہ بھی دلی کی دائی بنے ہوئے تھے۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کے سارے خاندان اور ان کے رُودار افراد انھیں ازبر تھے۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو بڑوں کی خیر سلامی بھی پوچھ لیتے۔ ''کیوں میاں صاحب! بڑے ڈپٹی صاحب تو اچھی طرح ہیں؟ جی چاہتا ہے کہ انھیں بھی ایک دن تحفتہً نہاری کھلاؤں۔ اللہ نے چاہا تو اب کے وہ نہاری کھلاؤں کہ چلّے کے جاڑوں میں پسینہ آ جائے۔ اچھا میاں تو آپ کے لیے کیا بھیجوں؟

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اُستاد کمرے پر چھ آدمیوں کے لیے نہاری۔"

بس اس سے زیادہ آپ کو کہنے کی اور انھیں سننے کی ضرورت نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ آپ کی نہاری کا کیا لوازمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھ بھی آپ کے ہم مذاق ہوں گے۔ فی کس پاؤ بھر نہاری کے اندازے سے انھوں نے تار اور لبڈھڑ ایک بڑے سے بادیئے میں نکالا۔ گھی آدھ پاؤ فی کس کے حساب سے داغ کرنے انگیٹھی پر رکھ دیا۔ اتنے میں گھی تیار ہوا۔ انھوں نے چھے بھیجے توڑ، صاف وغیرہ کر نہاری میں ڈال دیے اور بارہ نلیاں بھی اس میں جھاڑ دیں۔ اوپر سے کڑکڑاتا گھی ڈال طباخ سے ڈھک دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر پہلے غوریاں اور چمچہ اُوپر بھیجا۔ اس نے کھونٹی پر سے کھجور کا بڑا سا گول دسترخوان بیچ میں بچھایا اور اس میں غوریاں چن دیں۔ پھر لپک کر نیچے آیا اور نہاری کا بادیہ احتیاط سے اُوپر پہنچا آیا۔ اتنے میں اس نے ہاتھ دھلا ئے۔ دوسرا لڑکا تھئی کی تھئی خمریاں اور ایک طباخ میں گرم مسالا، ادرک کی ہوائیاں، ہری مرچیں اور کھٹا رکھ گیا۔ سب دسترخوان پر ہو بیٹھے تو وہی لڑکا دہر دہر جلتی انگیٹھی ایک سینی میں قریب رکھ گیا۔ لڑکا روٹی سینک کر دیتا جاتا ہے۔ گرم اور تر نوالوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ دوستوں کے قہقہے اور چہچہے ہوتے جاتے ہیں۔ گھی نے نہاری کی لذت بڑھانے کے علاوہ مرچوں کا دف بھی مار دیا ہے۔ ذرا نہاری ٹھنڈی ہوئی اور غوری (بروزن، گوری) انگیٹھی پر رکھی گئی۔

یہ لیجیے میاں گنجے نے آپ کے دوستوں کے لیے ایک خاص تحفہ بھیجا ہے۔ تنور میں گرم گرم روٹیاں نکال کر گھی میں ڈال دیں اور گھی پی کر ایسی خستہ اور نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔ واہ واہ کیا مزاج دانی اور اداشناسی تھی۔ جب ہی تو آج تک گنجے نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔

یہ تو خیر امیروں کے چونچلے تھے۔ اصل میں نہاری غریب غرباء کا من بھاتا کھاجا ہے۔ کاریگر دست کار اور مزدور صبح صبح کام پر جانے سے پہلے چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو پیسے کی نہاری اور دو پیسے کی دو روٹیاں ان کے دن بھر کے سہارے کو کافی ہوتیں۔ گھر میں علی الصبح چار پیسے میں بھلا کیا تیار ہو سکتا ہے؟ سستے اور بابرکت وقت تھا۔ ایک پیسے میں چار سودے لے آتے۔ ایک کماتا اور دس کھاتے۔ اب دس کماتے ہیں اور ایک کو نہیں کھلا سکتے۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔ میاں گنجے نہاری والے بھی گزری ہوئی بہاروں کی ایک چٹ پٹی کہانی بن کر رہ گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

●●●

ہماری پیاری دنیا

یہ دنیا ہماری سوچ سے بھی کئی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے اور ان میں سے چند عجیب وغریب چیزیں سرفہرست ہیں۔ جن سے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت ناواقف ہے اور یہی مناظر دنیا کو انتہائی عجیب اور حیرت انگیز بناتے ہیں۔

کوکونٹ کریب: ایک میٹر لمبا انوکھا کیکڑا:

یہ دنیا کے سب سے بڑے کیکڑوں کی ایک قسم ہے۔ ان کیکڑوں کا وزن 4 کلوگرام تک ہوتا ہے جبکہ ان کا قد ایک میٹر تک بلند ہو سکتا ہے۔ یہ کیکڑے بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے مختلف جزائر میں پائے جاتے ہیں۔

پگ بی مرموسیٹ: دنیا کا سب سے چھوٹا بندر

یہ دنیا کا سب سے چھوٹا بندر ہے اور یہ جنوبی امریکہ کے مغربی ایمیزون کے برساتی جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ اس بندر کا وزن صرف 100 گرام ہوتا ہے۔ یہ ہریالی یا پھر دریا کے کنارے آباد جنگلات میں رہنا پسند کرتا ہے۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مستنصر حسین تارڑ

میرا قیمہ

میں ٹولنٹن مارکیٹ میں چھوٹے گوشت کی ایک دکان پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور کچھ اس قسم کے ''جذباتی'' سوال جواب سن رہا تھا۔

''نسیم بھائی پہلے میرا قیمہ بنا دیجیے'' ایک خاتون کہہ رہی تھیں۔

''بہن جی آپ فکر ہی نہ کریں، میں آپ کا ایسا قیمہ بناؤں گا کہ آپ یاد کریں گی......!''

''ذرا جلدی کریں نسیم بھائی۔''

''بس آپ کھڑی رہیں۔ آپ کے کھڑے کھڑے میں آپ کا قیمہ بنا دوں گا۔''

''قیمہ روکھا بناؤں یا موٹا......''

''روکھا ٹھیک رہے گا لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔''

''بہن جی شیخ صاحب کا قیمہ ہے، یہ والا جو میں کوٹ رہا ہوں، اس کے بعد ان شاء اللہ آپ کا قیمہ بنے گا۔''

''نسیم صاحب ...... مغز چاہیے، مل جائے گا؟'' ایک صاحب دریافت کرتے ہیں۔

''کیوں نہیں جناب ...... یہ ہمارے لیڈران کرام تھوڑی ہیں، بکرے ہیں۔ ان میں بہت مغز ہے، ابھی دیتا ہوں۔''

''اور میرے گردوں کا کیا ہوا؟'' ایک آواز آتی ہے۔

''یہ والے!'' نسیم کا بھائی جو شکل سے ہیرو لگتا ہے چند گردے فضا میں بلند کرتے ہوئے کہتا ہے، ''آپ کے

عید قرباں ہو یا عام دن، قصائی کی دکان پر ہونے والی شگفتہ گفتگو کی بازگشت دہراتا شاہک

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

گردے ہیں...... ابھی نکالے ہیں، بنا کر دیتا ہوں۔"

"اور میری ران......"

"یہ رہی آپ کی ران، بالکل نرم اور تازہ تازہ"۔

"اور میری سری......"

"ابھی توڑتا ہوں......"

"ایک صاحب جو آرڈر دے کر جا چکے تھے، واپس آ کر پوچھتے ہیں "یار ابھی تک میرا گوشت نہیں بنایا......"

"اوہو آپ یہ بتائیں کہ آپ کی بوٹیاں کیسے کاٹوں! چھوٹی یا بڑی...... میں پانچ منٹ میں آپ کا گوشت بناتا ہوں جناب ......ہم آپ کا گوشت نہیں کاٹیں گے تو اور کس کا کاٹیں گے......"

بالآخر میری باری آتی ہے اور میں ایک مختصر سا آرڈر دیتا ہوں۔

"تارڑ صاحب" نسیم مسکراتے ہوئے کہتا ہے "اتنا گوشت تو پورے محلے کے لیے کافی ہوگا، کیا کریں گے؟ اتنے گوشت کو دیگ میں پکائیں گے؟"

"بھائی آپ براہِ کرم جگتیں نہ کریں اور گوشت بنا دیں ......اور یہ والی بوٹی تو اچھی نہیں ہے! یہ نہ ڈالنا۔"

"یہ والی؟" ......وہ بوٹی اُٹھا کر اس کی نمائش کرتا ہے۔

"یہ والی بوٹی تو بڑی جذباتی بوٹی ہے تارڑ صاحب......"

نسیم اپنے گوشت کے بارے میں "جذباتی" کا لفظ بے دریغ استعمال کرتا ہے......مثلاً جناب یہ گردہ ملاحظہ کیجیے۔ بالکل جذباتی ہے...... یہ چانپ جو آپ دیکھ رہے ہیں، جذباتی ہو رہی ہے آہستہ آہستہ، یہ ران تو خیر ہے ہی جذباتی...... ویسے میرے پاس غیر جذباتی گوشت بھی ہے لیکن آپ کو مزا نہیں آئے گا...... وہ سامنے والا بکرا جو لٹک رہا ہے، وہ شہنشاہِ جذبات ہے اور بکری جو ہے، یہ ملکۂ جذبات ہے۔ اس کی ٹانگ پیش کروں؟"

گوشت کے بارے میں کالم لکھنا کچھ غیر ادبی سا فعل ہے لیکن کیا کیا جائے، یہ مہنگا ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی "مسلمانی" کم ہوتی جا رہی ہے۔ گوشت اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں...... ہمارے گاؤں میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ گوشت کھانے سے ایمان مضبوط ہو جاتا ہے، لوہے کی طرح...... ظاہر ہے اگر گوشت مہنگا ہوگا تو کم کھایا جائے گا اور اسی حساب سے "مسلمانی" کم ہوتی جائے گی۔ میں بھی اسی لیے فکرمند ہوں......

گوشت کی قیمتوں میں یک دم اضافہ ہو گیا ہے اور کہیں سے احتجاج کا ایک لفظ سنائی نہیں دیا...... سگریٹ مہنگے ہو جائیں تو چھوڑ دو، چائے مہنگی ہو جائے تو کم پیو۔ آٹا مہنگا ہو جائے تو کیک کھا لیں لیکن گوشت تو کم نہیں کھایا جا سکتا...... مجھے چونکہ گوشت کی قیمتوں میں اضافے کی خبر نہ تھی، اس لیے میں نے جیب میں پڑی رقم کے مطابق آرڈر دیا اور پھر بعد میں بل زیادہ بننے پر خوب خوب شرمندہ ہوا......

آج گوشت کا بیاں چلتا رہے چنانچہ چھوٹے گوشت کی مارکیٹ سے باہر آ جائیے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے سامنے بڑے گوشت کی مارکیٹ ہے...... یہاں بھی علم اور گوشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس مارکیٹ کے اندر بھی دکاندار تقریباً ایک ہی علاقے اور ایک ہی خاندان سے متعلق ہیں۔

ایک مرتبہ میرے والد صاحب جو انتہائی حساس طبیعت کے مالک تھے، گوشت خریدنے آئے۔ قصاب نے ایک بوٹی اٹھا کر کہا "چوہدری صاحب، بالکل بچے کی بوٹی ہے، بھون کے کھائیے، مزا آ جائے گا"۔ وہ دن اور آج کا دن والد صاحب کبھی بڑا گوشت خریدنے نہیں گئے۔ وہاں پر گوشت کے عجیب و غریب شوقین نظر آتے ہیں، ایسے شوقین جو پلاؤ کے لیے الگ گوشت منتخب کرتے ہیں اور کریلے پکانے کے لیے الگ۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل ہوتے ہیں جو صرف سری پایوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔

گوشت کھانا مسلمان کی اور خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو بھنا ہوا گوشت کھائیں گے یا شکرانے کے طور پر ایک دو بکرے حلال کر دیں گے۔ اگر فوتیدگی ہو جائے تو بھی مہمانوں کی تواضع آلو گوشت سے کی جائے گی۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

میرے ماموں اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ بالکل گلا ہوا نرم گوشت کس کام کا گوشت وہ جو نوچ نوچ کر کھایا جائے۔

ایک چھوٹا سا قصہ ہے، جس میں گوشت کے بارے میں ہی کچھ بیاں ہے...... میں اس وقت تقریباً ۱۵۔۱۶ برس کا تھا اور پہلی مرتبہ ولایت جا رہا تھا۔ جہاز میں میرے برابر کی نشست پر ایک مولانا براجمان تھے۔ وہ خاصے معصوم تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیوں چچا جان آپ کس سلسلے میں انگلستان جا رہے ہیں تو کہنے لگے! بیٹا کافروں کو مسلمان کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا، آپ کو انگریزی آتی ہے؟ کہنے لگے نہیں، جس نے مسلمان ہونا ہوگا اسے خود بخود میری زبان سمجھ آ جائے گی......

اُن دنوں ابھی جیٹ مسافر بردار طیارے اڑا نہیں کرتے تھے چنانچہ پنکھوں والا جہاز بڑے مزے سے ہواؤں اور بادلوں سے اٹھکیلیاں کرتا منزل کی جانب جاتا تھا۔ ہم کراچی سے چلے اور پھر طہران، قاہرہ، ایتھنز وغیرہ میں رکتے روم پہنچے۔ روم میں دو گھنٹے کا سٹاپ تھا اور ائیر لائن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافر حضرات ہوائی اڈے کے ریستوران میں جا کر اپنی پسند کا کھانا تناول فرمائیں، بل کمپنی کے ذمے ہوگا۔ اس اعلان پر مسافر حضرات بے حد خوش ہوئے۔ میں بھی خوش ہوا اور مولانا تو بے حد خوش ہوئے کیونکہ ہمیں شدید بھوک لگی تھی۔

ریستوران میں بیٹھے تو ایک خوبرو اطالوی خاتون ہاتھ میں مینو پکڑے ہمارے قریب آ گئی...... مولانا کھانسے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، میں چونکہ ابھی بچہ تھا اس لیے مجھے کھانسی بالکل نہ آئی۔ میں نے اپنے لیے ایک عدد روسٹ چکن منگوالیا اور اپنے ہم راہی سے دریافت کیا: ''مولانا آپ کیا کھائیں گے؟'' انھوں نے منہ بنا کر جواب دیا ''اس گوری گوری لڑکی سے کہو کہ میرے لیے صرف ابلی ہوئی سبزیاں لے آئے کیونکہ گوشت تو یہاں پر حلال نہیں ہوگا۔''

اب میں نے تو اس معاملے کے بارے میں غور نہیں کیا تھا کہ یہاں گوشت کس قسم کا ہوتا ہے اور مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے ان کا آرڈر بھی دے دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ویٹرس کھانا لے آئی...... ایک ٹرالی پر میرا روسٹ مرغ ابھی تک روسٹ ہو رہا تھا۔ اس کی خوشبو پورے ریستوران میں پھیلی تھی۔ مرغ کے گرد انڈے اور آلو کے کتلے اور سلاد وغیرہ بہار دکھا رہے تھے...... یہ سب کچھ میرے آگے رکھ دیا گیا۔ پھر ویٹرس واپس گئی اور ایک چھوٹی سی پلیٹ مولانا کے آگے لا کر رکھ دی۔ اس میں ایک ابلی ہوئی گاجر اور ایک دو آلو تھے۔ سفری چچا جان نے گاجر کھانے کی کوشش کی لیکن ان کی نظریں میرے روسٹ مرغ پر سے اٹھائے نہ اُٹھتی تھیں۔ میں مزے سے کھاتا جا رہا تھا اور وہ مجھے دیکھتے جا رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے گرج کر کہا ''برخوردار۔''

''جی جناب'' میں نے گھبرا کر جواب دیا۔

''یہ ہوٹل والی زنانی کو کہو کہ میرے لیے بھی یہی مرغ لے آئے، یہ شکل سے حلال لگتا ہے''۔

کہنے کا مطلب ہے کہ گوشت کھانے کے شوق میں ہم بعض اوقات اپنی مسلمانی کو بھی خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

لاہور کے ایک بہت ہی معروف ڈاکٹر صاحب اکثر بازار جا کر ایک بکرا خرید لاتے۔ گھر جا کر اسے خود ذبح کرتے، گوشت بناتے خود ہی بھونتے اور پھر اپنے بیٹوں کے ہمراہ ایک ہی نشست میں اسے چٹ کر جاتے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ گوشت ہونا چاہیے، چاہے گدھے کا ہی کیوں نہ ہو......

میں نے مکان بنایا تو ایک مزدور تقریباً روزانہ شام کو مزدوری کی رقم وصول کرتا، اس کا گوشت خریدتا اور بھون کر کھا جاتا۔ میں خود اگرچہ کھانے پینے کا زیادہ شوقین نہیں لیکن گوشت کھائے ہوئے اگر دو چار دن گزر جائیں تو جمائیاں آنے لگتی ہیں اور اپنے مسلمان ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے...... لیکن اب تو قیمت زیادہ ہونے سے ایسا لگ رہا ہے کہ قیمہ بکرے کا نہیں ہمارا اپنا بن رہا ہے...... ہمارے گردے نکالے جا رہے ہیں اور مغز کھایا جا رہا ہے...... اور وہ دن دُور نہیں جب ہم گوشت کی دکان پر جا کر قصائی کے آگے لیٹ کر کہیں گے ''براہِ کرم میرا قیمہ بنا دیجیے۔'' ●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بچوں کو ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے بچائیں

بچوں کے اذہان، نازک آنکھوں اور کمزور دل کی حفاظت اوّلین ذمہ داری ہے

ارم ناز

میں جب بھی اپنی بیٹی کی طرف دیکھتا ہوں تو احساسِ شرمندگی اور تکلیف دگنا ہو جاتا ہے۔ گو وقت گزر چکا۔ میری بیٹی اب ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اس کی ہر تکلیف کا ذمہ دار میں ہوں۔ کاش وقت واپس پلٹ آئے......لیکن گزرا ہوا وقت کب کسی کے لیے پلٹا ہے؟

چند سال پہلے میری بیٹی لیزا دو سال کی تھی۔ روزانہ کام کرتے ہوئے جب بھی وہ میرے پاس آتی تو مجھے بہت تنگ کرتی تھی، کبھی لیپ ٹاپ چھیڑتی تو کبھی میرے کندھوں پر جھولتی۔ ایسے میں کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ ایک دن بہت ضروری اسائنمنٹ کی تکمیل کے لیے مجھے دفتر سے صرف ایک دن کا وقت ملا تھا۔ میں نے لیزا کو اپنے اسمارٹ فون پر نظمیں لگا کر دے دیں۔ وہ دیکھنے لگی اور میں اطمینان سے اپنا کام کرنے لگا۔ پھر تو جیسے مجھے لیزا سے جان چھڑانے کا گر ہاتھ آ گیا۔ وہ جب بھی مجھے تنگ کرتی میں موبائل اسے تھماتا اور کام کرنے لگتا۔ اس روٹین کو جب چھے ماہ ہو گئے تو میری بیٹی کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ سوجن اور جلن حد سے بڑھنے پر جب ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ بچی کی آنکھوں کی سرجری کرنی پڑے گی۔ اتنی چھوٹی بچی کی آنکھ میں اس قدر تکلیف کیسے ہو سکتی؟ یہ سوال جب ڈاکٹر سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کی وجہ موبائل فون کا استعمال ہے کیونکہ اتنی چھوٹی بچی کی آنکھوں کے خلیے بہت نازک ہوتے ہیں، اس لیے وہ موبائل کی تیز اور مسلسل روشنی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میری بچی کی سرجری کی گئی۔ جن دنوں اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی وہ درد سے چلاتی اور روتی تھی۔ ہم میاں بیوی اس کو بہلانے پھسلانے کا مختلف سامان کرتے لیکن وہ نہ بہلتی۔ وہ دور انتہائی دکھ بھرا تھا۔ جب اس کی پٹی کھلی اور وہ دیکھنے کے قابل ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی لیکن ساتھ ہی ڈاکٹر نے یہ خبر بھی سنا دی کہ اب ساری زندگی اسے عینک لگانا پڑے گی۔

اب میری بیٹی سات سال کی ہے۔ یوں تو وہ ٹھیک ہے لیکن عینک اس کے چہرے کا لازمی جزو بن چکی۔ میں جب بھی کسی بچے کو اسمارٹ فون یا ٹیب وغیرہ استعمال کرتے دیکھوں تو فوراً اس کے والدین کو خود پر بیتے ان کرب بھرے لمحوں کے بارے میں بتاتا ہوں تاکہ ان کے بچوں کو کسی قسم پریشانی کا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سامنانہ کرناپڑے۔ والدین اپنی آسانی کے لیے بچوں کوایسی چیزیں تودے دیتے لیکن ان کے مضراثرات بھول جاتے ہیں۔

والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد صحت مند و توانا اور قابل ہوتا کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنی قابلیت کا لوہا منوا سکے۔ اس لیے وہ اولاد کی ہر خواہش اور ضرورت کو بلا تامل پورا کرتے ہیں، نیز چھوٹی عمر سے ہی جدید سے جدید اشیاء اور نت نئی ٹیکنالوجی سے انھیں متعارف کرواتے ہیں، لیکن جہاں سائنس کی ترقی اور ایجادات نے انسان کو زمین سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا وہیں اس کا بے جا اور غلط استعمال ننھے اذہان کو متعفن بھی کر رہا ہے۔

یوں تو ٹیکنالوجی نے بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت، تفریح، میل جول، دوستی اور زندگی کے ہر پہلو میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن بچے جو مستقبل کے معمار اور والدین کی امیدوں کا سہارا ہیں، وہ جدید ٹیکنالوجی کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر متاثر ہو رہے ہے۔ والدین کو چاہیے کہ اگر وہ اپنے بچوں کو حقیقی معنوں میں ٹیکنالوجی کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھوانا چاہتے تو درج ذیل باتوں پر عمل کریں۔

اسکرین کا وقت مقرر کریں:

موبائل فون، ٹیب اور لیپ ٹاپ سے دلچسپی کے باعث بچے ہر وقت ان چیزوں سے چپکے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی جب بھی ذرا سے فارغ ہوں فوراً موبائل یا ٹیب پر گیم کھیلیں یا ویڈیوز لگالیں۔ خصوصاً چھٹی کے دن۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچوں کے لیے وقت مقرر کریں۔ ماہرین کے مطابق اسمارٹ فون یا ریڈیو انٹینا سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جن سے کینسر، جینیاتی تبدیلی، بصارت، تناؤ اور یادداشت کی کمزوری جیسے امراض بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر جنم لے رہے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت نے بچوں کے تمام الیکٹرونک آلات دیکھنے کی حد مقرر کرتے ہوئے کہا کہ پانچ سال سے کم عمر بچے دن میں صرف ایک گھنٹہ جبکہ ایک سال سے کم اور دودھ پیتے بچوں کو اسکرین کو دیکھنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ یہ بھی ہدایت دی کہ والدین اپنا وقت بچانے اور بچوں کا دل بہلانے کے لیے بچوں کو برقی آلات مت فراہم کریں۔

گھر سے باہر کھیل کود: (لاک ڈاؤن کی صورت حال میں گریز کریں)

موجودہ دور کے والدین خود اتنے مصروف ہو چکے کہ ان کے پاس بچوں کے لیے وقت ہی نہیں۔ وہ انھیں اسمارٹ فون اور ٹیب جیسے آلات پکڑا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں نونہالوں کی صحت برباد کر رہیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو روزانہ کی بنیاد پر گھر سے باہر لے کر جائیں اور گھر سے باہر کھیلنے پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، اس کے فوائد سے آگاہ کریں نیز اسکول میں بھی انھیں کھیلوں میں حصہ لینے پر شاباش دیں، تبھی وہ صحتمند جسم کے ساتھ صحت مند ذہن کے بھی مالک بنیں گے۔ پہلے وقتوں میں بچوں کی صحت اس لیے قابل رشک ہوتی تھی کیونکہ وہ جسمانی مشقت والے کھیل بہت زیادہ کھیلتے تھے۔

بچوں کی نیند کا خیال رکھیں:

کم عمر بچوں کے تمام جسمانی اعضاء ہی افزائش کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کی بہترین صحت کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزانہ دس گھنٹے ضرور سوئیں۔ بچوں کے دماغ بہت زیادہ متحرک ہوتے ہیں۔ اگر وہ مقرر کردہ اپنی نیند پوری کریں گے تبھی ان کی ذہنی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئیں گی اور وہ دن بھر کی تھکاوٹ دُور کر کے اگلے دن کے لیے پھر سے تازہ دم ہو سکیں گے۔

روزانہ ورزش کریں:

والدین کو جس قدر اولاد کے مستقبل کی پروا ہوتی ہے، اسی قدر ان کی صحت کی بھی ہونی چاہیے۔ ہر وقت اسمارٹ فون، ٹیب یا ٹی وی دیکھنے کے سبب نہ صرف بچے موٹاپے کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ ان کی آنکھیں بھی متاثر ہو رہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین روزانہ انہیں ورزش ضرور کروائیں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خصوصاً آنکھوں کی، تاکہ انھیں دباؤ اور درد سے نجات ملے۔
اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ بچے توجہ مرتکز کر کے کوئی بھی کام کر رہے ہوں چاہے وہ برقی آلات کا استعمال ہو یا پڑھنا، ہر آدھے گھنٹے بعد بیس سیکنڈ کا وقفہ ضرور لیں۔ نیز پلکوں کو چند سیکنڈ جھپکانے کے بعد دوبارہ کام پر توجہ دیں۔ اس سے آنکھیں درد کا شکار نہیں ہوں گی۔

مخصوص فاصلہ برقرار رکھیں:

بچے جب بھی ٹی وی، اسمارٹ فون، ٹیب یا لیپ ٹاپ دیکھ رہے ہوں، والدین اس بات کا دھیان ضرور رکھیں کہ برقی آلات ان سے دُور مخصوص فاصلے پر ہوں۔ خصوصاً ٹی وی بیس انچ کی دُوری پر رکھا ہو۔ اسی طرح اسمارٹ فون اور ٹیب بھی دُور سے دیکھیں اور اگر آپ کا بچہ ہر چیز بہت نزدیک کر کے دیکھتا ہے تو فوراً آنکھوں کے معالج سے رجوع کریں۔

والدین بچوں کے ساتھ میل جول و بات چیت کریں:

عموماً والدین کام کی زیادتی یا مصروفیات کے باعث جدید ٹیکنالوجی تو بچوں کو فراہم کر دیتے لیکن خود ان سے دُور ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً بچے دن رات انھی آلات کا استعمال کرتے رہتے اگر ان پر نظر نہ رکھی جائے۔ ایسے بچے معاشرتی طور پر بہت زیادہ تنہا ہو جاتے ہیں کیونکہ جب تمام دن جب وہ اسمارٹ فون یا ٹیب استعمال کریں گے۔ گھر سے باہر جا کر کھیلنا اور نہ ہی والدین کے پاس بیٹھنا تو ایسی صورت میں بچے کا سماجی اور انفرادی طور پر تنہا ہونا ایک فطری عمل ہے۔

والدین کو چاہیے کہ روزانہ اپنے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزاریں، ان سے روزانہ کی مصروفیت کے متعلق پوچھیں کہ سارا دن انھوں نے کیا کھایا، کیا پڑھا اور کیا کھیلا؟ اس سے نہ صرف انھیں بچوں کی پسند و ناپسند کا پتا چلے گا بلکہ اُس کی روٹین کا بھی اندازہ ہو گا کہ کون سا کام یا چیز وہ غلط کر رہا ہے، جسے کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ باہمی میل جول سے والدین اور بچوں میں قربت بڑھتی نیز احساسِ تنہائی کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔

ظاہری جسمانی حالت میں تبدیلی

وہ بچے جو بہت زیادہ وقت کے لیے موبائل فون، ٹیب یا لیپ ٹاپ استعمال کرتے ہیں، انھیں کمر، گردن اور پٹھوں کے درد کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ لمبے عرصے تک ایک ہی طریقے سے بیٹھے رہیں تو ان مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک تو والدین زیادہ وقت کے لیے اسمارٹ فون یا ٹیب استعمال نہ کرنے دیں اور اگر ایسا کرنا ضروری ہے یعنی بچہ کوئی کام کر رہا تو ہر آدھے گھنٹے بعد اسے وقفہ کر کے اپنے بیٹھنے کا انداز بدلنے کا کہیں تاکہ آنے والی تکلیف سے جس حد تک ممکن ہو بچا جا سکے۔

بچوں کو جدید اسمارٹ فون اور دیگر گیجٹس کب دیں؟

ماہرین کے مطابق یوں تو بچوں کو جدید گیجٹس فراہم کرنے کی کوئی خاص عمر متعین نہیں لیکن بچوں اور بڑوں میں بڑھتے ہوئے عوارض کے باعث ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ان کے استعمال کی عمر مقرر کی ہے جس کا درج بالا سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ تاہم ماہرِ نفسیات کے مطابق بچوں کو اسمارٹ فون اور دیگر آلات دیتے وقت کچھ باتوں کا خیال ضرور رکھیں۔

☆ بچہ اسکرین دیکھنے اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کے قوانین کا پابند ہو۔

☆ بچہ بہت زیادہ فون یا میسج کرنے کا عادی تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو بعد میں سوشل میڈیا کے استعمال سے یہ شدت مزید بڑھ سکتی ہے۔ اس لیے پہلے ہی بچے کو آگاہی فراہم کر دیں۔

☆ بچہ فضول خرچ یا ضدی تو نہیں کیونکہ نیٹ پر نت نئی چیزوں کی پبلسٹی ہوتی رہتی۔ ایسا نہ ہو بچہ بعد میں ہر روز جدید اور نئی اشیاء کی آرزو کرے۔

☆ بچہ اپنی چیزوں کی حفاظت کرنے کا عادی ہے؟ اگر عادی ہو گا تبھی وہ اپنے موبائل فون یا ٹیب وغیرہ کی حفاظت کر سکے گا۔ بچے تو ناسمجھ اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان کو تو آپ جس چیز کا عادی بنائیں گے، وہ وہی کام کرنے لگ جائیں گے۔

اولاد والدین کا سرمایۂ حیات ہوتی، اس لیے اپنے آرام اور سکون کے لیے انھیں ٹیکنالوجی کے حوالے مت کریں۔ اپنی محبت، شفقت اور توجہ کو اسمارٹ فون سے مت تبدیل کریں۔ ایسا نہ ہو پھر آپ کو پچھتانا پڑے اور تب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

احمد سلیمی

سڑکوں پر......ہوش کے ساتھ ہی مانگنے کی عادت جڑ پکڑ چکی تھی......پھر اس کے مزید بھائی بہن پیدا ہوکر بڑے ہوئے۔

کورونا! تیرا شکریہ!

معصوم بچی کے دل سے نکلے الفاظ نے جب ایک ماں کو ہکا بکا کر دیا

اس کی آنکھوں کے سارے خواب مر گئے تھے۔ اب تو اسے یاد ہی نہیں تھا کہ کبھی، خوابوں کی تتلیاں بھی اس نے پکڑنا چاہا تھا۔ اب خواب نہیں تھے، مگر دن رات زندگی کے عذاب تھے۔ اس کی زندگی ہی کتنی تھی؟ بارہ سال! اس عمر میں لڑکیاں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ گھر میں کام کم کرتیں اور نخرے، فرمائشیں زیادہ۔

اسے یاد نہیں تھا کبھی باپ سے اس نے کوئی فرمائش کی ہو۔ اسے ناز نخرے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں ایک تھیلا اُٹھائے، اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ پھرتے رہنا اسے یاد تھا۔ اس کے آگے دنیا کا حسن یہی تھا کہ چند مڑے تڑے کرنسی نوٹ اسے ملیں، تھیلے میں کچھ کھانے کی اور جلانے کی چیزیں بھر جائیں۔ بارہ سال کی اس لڑکی کے کچھ خواب اگر تھے تو یہی تھے۔

اس کا نام بختاور تھا مگر زندگی نصیبوں جلی تھی۔ تین بہنوں میں منجھلی تھی۔ دو چھوٹے بھائی تھے۔ باپ کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایسا ہڈحرام تھا۔ افیون اور چرس کے نشے میں دھت اکثر اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ کبھی کبھار مزدوری کرتا تو وہ پیسے اپنے نشے میں اُڑا دیتا۔

بختاور کو یاد تھا، جب سے اس نے ہوش سنبھالا، ماں اور بڑی بہن کے ساتھ مانگنے جایا کرتی۔ کبھی گھروں میں کبھی

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اب ماں کے بغیر بھی وہ جانے لگے۔ اللہ پاک بے نیاز ہے۔

گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوتے مگر اولاد کی کثرت تھی نہ جانے اب یہ عطا تھی سزا تھی یا آزمائش۔

بختاور جوں جوں بڑی ہوئی، اس کے دماغ میں بہت سی باتیں شور مچاتیں۔ وہ اپنی ایسی زندگی سے تنگ آچکی تھی۔ کسی کا دروازہ کھٹکھٹا کے کچھ مانگتے ہوئے، گھر کی عورتوں کے ناگوار چہروں اور کڑوی باتوں سے دل پھٹ سا جاتا۔ دل میں دھواں سا بھر جاتا۔ کوئی کچھ دیتا بھی تھا تو جتلا کے، ہزار باتیں سنائی جاتیں۔ طعنے کسے جاتے، اُس کی اگلی پچھلی نسل کو کوسا جاتا۔

دس بارہ سال کی بچی کم سن ہوتی ہے مگر آج کے دور کا تیز رفتار میڈیا اسے سمجھدار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ بختاور کے گھر میں ٹی وی نہیں تھا مگر زندگی کی ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ لڑکوں کی چبھتی آنکھوں کو بھی خوب سمجھتی تھی۔ بازار اور سڑک پر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتی تو پیسے کم آنکھوں سے ہوس کے تیر زیادہ اُترتے تھے۔

کوئی دس روپے دے کر بے شمار سوال جواب کرنے بیٹھ جاتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ باپ کیا کرتا ہے؟

وہ اور اس کے بھائی بہن ان سوالات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ روزانہ نئی نئی کہانیاں سُنا کر اپنی بے چارگی اور بے کسی بیان کرتے اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کرتے۔

بختاور اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ہیلی چوک سے لے کر اسمبلی کی عمارت تک......اور پورے جٹیال کی گلیوں میں صبح سے شام کر دیتی۔ شام تک تھیلا بھی بھر جاتا اور کچھ پیسے بھی مل جایا کرتے۔

اپنے قد سے بھی بڑے بڑے تھیلے وہ بھائی بہن کندھوں پر اُٹھائے بہت دور جوٹیال نالے کے پاس اپنے دو کمروں کے کچے مکان میں پہنچ جاتے۔ بھرا ہوا تھیلا اور کرنسی نوٹ دیکھ کر باپ اور ماں کی باچھیں کھل جاتیں۔ پھر گھر میں آگ بھی جلتی، چولہے پر ہانڈی بھی چڑھ جاتی۔

بختاور اور اس کے بھائی بہن اتنا تھکے ہوتے کہ کھانا کھاتے ہی جہاں جگہ ملتی لیٹ کر طویل دن کی عذاب ساعتوں کے بعد، مہربان رات کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔

کبھی نیند نہ آتی تو بختاور سوچتی تھی ایسا کب تک کرتی رہے گی؟ وہ لڑکی ذات ہے۔ کب تک لوگوں کی گندی نظروں سے خود کو بچائے گی۔ اس کی ماں اور بڑی بہن کی زندگی بھی ایسے ہی گزری تھی۔ ماں نے اسے سمجھایا تھا۔

”بھیک مانگتے ہوئے ہم غیرت کی قربانی دیتے ہیں۔ بس یاد رہے اپنی عزت بچا کر رکھنا۔ مرد ذات بہت کم بخت ہے۔ خبردار! اُسے انگلی پکڑنے مت دینا ورنہ بازو پکڑنے کو لپکے گا۔“

ایک دن وہ بھائی بہنوں کے ساتھ کُوڑا چننے کے لیے گئی تو حیران رہ گئی۔ اکثر لوگوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ سارا سارا دن پھرا کرتی تھی۔ اس دن اسے سمجھ نہیں آیا کہ لوگ پریشان سے، ایک دوسرے سے سہمے سہمے سے کیوں ہیں؟ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی تو وہ ایک دم پیچھے ہو جاتا۔ دکاندار بھی دُور سے ہی جھڑک کر بھگا دیتے۔ اس دن شام تک ان کے تھیلے میں چیزیں اور جیب میں پیسے بھی ہمیشہ سے کم تھے۔ اس شام انھوں نے باپ اور ماں دونوں سے گالیاں سنیں اور اپنے بستروں میں سسکتے رہے۔ آج کھانا بھی نہ ملا۔

چند روز تک ایسا ہی ہوتا رہا پھر ایک گھر کی بھلی مانس عورت نے اپنے ہاتھ بچاتے ہوئے انھیں لفافے میں کوئی چیز دے کر سمجھایا کہ ایک ایسی بیماری پھیلی ہے جو ایک انسان کو دوسرے سے لگتی ہے۔ اس لیے آئندہ میرے گھر مت آنا۔

وہ بھائی بہنوں کے ساتھ باہر سڑک پر آئی تو پولیس والوں نے روک کر خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ آئندہ گھر سے باہر نکلے تو تھانے میں بند کر دیں گے۔

گھر آ کر اُس نے باپ کو بتایا تو وہ گالی دے کر بولا:

”سب بکواس ہے۔ میں کئی دن سے اس بارے میں سن

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

رہا ہوں۔ سب کہتے ہیں کہ یہ ڈراما ہے۔ چین کے لوگ کتے اور سانپ کھاتے ہیں۔ یہ بیماری انھیں لگی ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔"

بختاور بولی: "مگر ابا...... پولیس والوں نے بھی ہمیں منع کیا ہے۔"

باپ نے اس کی بات کاٹی اور گرج کر بولا: "میں کچھ نہیں جانتا۔ بہانے مت بنا۔ کچھ آئے گا تو گھر چلے گا۔"

ماں بولی: تم ذرا باہر جا کر پتا تو کرو۔ کیا پتا کوئی ایسی ویسی بات سچ مچ ہو۔ اِدھر کی عورتوں سے میں نے بھی ایسی بیماری کا سنا ہے۔"

اس کا باپ غصے سے پاؤں پٹختا، گالیاں بکتا باہر گیا اور بہت دیر بعد بجھی بجھی حالت میں واپس آ کر کہنے لگا:

"پورے علاقے میں خوف پھیلا ہوا ہے۔ ایک بیماری ہے، جسے کورونا کہتے ہیں۔ پوری دنیا میں پھیل چکی۔ گلگت میں بھی آ گئی ہے۔ سب لوگ گھروں میں بند ہیں۔"

بختاور کی ماں فکر مند لہجے میں بولی: "اب کیا ہوگا؟ چولہا کیسے جلے گا؟ تم تو چارپائی توڑتے رہتے ہو۔ کبھی ہاتھ پاؤں چلائے ہوتے تو آج گھر چلتا۔"

بختاور کا باپ ایسا نکما اور ناکارہ تھا کہ معصوم بچوں کی بھیک کی کمائی کھا کر پڑا رہتا۔ اب دھندہ رُک گیا تو ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ زندگی صرف نشے میں دھت رہنے کا نام نہیں۔

بختاور اور اس کے بھائی بہنوں کا کام بند ہو گیا۔ گھر میں کھانے کی قلت پڑ گئی مگر بختاور کی تو جیسے من کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر پھرتے رہنے، لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور برے کی طرح بدن میں اُترتی ننگی نظروں سے بچ گئی تھی۔ گھر میں فاقے ضرور تھے مگر بختاور کے مزے ہو گئے۔ پہلے تھکے ہارے چُور چُور بدن کے ساتھ صبح کر دیتی تھی۔ اب دن اور رات دونوں سکون سے کٹنے لگے۔

اگلے دن باپ باہر سے آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ہاتھوں میں وزنی تھیلا تھا۔ اس میں چینی، آٹا، چاول اور چائے کی پتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چند چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کے لیے چار پانچ دنوں کا خرچہ تھا۔ اس نے بتایا کہ باہر گلی میں ایک تنظیم والے آئے تھے۔ ضرورت مندوں میں کورونا کی وجہ سے یہ راشن تقسیم کر رہے تھے۔ وہ تصویریں بھی نکال رہے تھے۔ کہہ رہے تھے اخباروں اور ٹی وی میں بھی ہم دکھائے جائیں گے۔

بختاور اور اس کے بھائی بہن میڈیا اور کورونا کو نہیں جانتے تھے۔ بس یہی بات ان کے لیے اہم تھی کہ ان کے گھر میں اب چولہا جلے گا۔ وہ بھوک سے کم سہی، مگر کچھ تو کھا سکیں گے۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے جیسے خیرات کی برسات ہونے لگی۔ اس کا باپ پہلے گھر سے نکلتا ہی نہ تھا۔ اب خدا جانے اسے کیسے معلوم ہو جاتا کہ فلاں جگہ خیراتی سامان تقسیم ہونے والا ہے۔ وہ گھر سے نکل جاتا اور واپسی پر تھیلا بھر کے لاتا۔

بختاور اور اس کے بھائی بہنوں کے لیے یہ کورونا جیسے رحمت بن گیا تھا۔ ان کے معصوم کندھوں سے گھر چلانے کا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب ان کا باپ تھیلا اور جیب بھر کے لاتا تھا۔ بھیک پہلے بھی ملتی تھی اور اب بھی۔ بس کورونا کے خوف سے اسے صدقے کا نام دے دیا گیا۔

بختاور اپنی ماں سے کہا کرتی: "ماں! یہ کورونا کب تک رہے گا؟ یہ کتنا اچھا ہے۔ ہم بھائی بہنوں کو کتنا آرام مل رہا ہے۔ ہمارا باپ اب کھانے کو لاتا ہے۔ میں تو سوچتی ہوں کہ یہ کورونا اب کبھی نہ جائے۔ اس نے ہمارے باپ کو بھی گھر کے لیے کچھ لانا سکھا دیا ہے۔ اے کورونا! تیرا شکریہ۔"

معصوم بختاور کی بات سن کر ماں سمجھ ہی نہ پائی کہ وہ روئے یا ہنسے۔ ◆◆◆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

دو گام سفر

محمد فاروق

بزاخفش فارسی زبان کی ترکیب ہے۔ "بز" فارسی زبان میں بکرے کو کہتے ہیں۔ جبکہ اخفش ایک عربی زبان شناس عالم تھے۔ بزاخفش سے مراد ہے اخفش کا بکرا۔ بزاخفش کی ترکیب اُس احمق شخص کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو بغیر سمجھے بوجھے گردن ہلا دے۔ جو خالی الدماغ ہو۔ جس کو بات سمجھ نہ آئے مگر ہاں میں ہاں ملا دے۔

اخفش کا پورا نام اخفش اکبر ابوالخطاب عبدالحمید بن عبد المجید تھا۔ ولادت ہجَر بحرین میں ہوئی۔ سکونت بصرہ میں رہی اور یہ قیس بن ثعلبہ کے غلام تھے۔ کتب تفاسیر میں اشعار کے ماہر تھے۔ اِن سے ایک جماعت نے علم حاصل کیا جن میں مشہور نام عیسیٰ ابن عمر، ابوعبیدہ، اصمعی اور سیبویہ یہ ہیں۔ وفات ۱۷۷ھ میں ہوئی۔ اُن کی شہرت اخفش اکبر کے نام سے ہے۔

روایت ہے کہ اخفش اکبر اپنے طالب علمی کے دور میں انتہائی کند ذہن تھے۔ کوئی سبق اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عربی گرامر اُن کے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ خوداعتمادی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ ایک روز اُنھوں نے تنگ آکر اپنے اُستاد سے شکایت کی کہ مجھے سبق یاد نہیں ہوتا۔ عربی کی گردانیں میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ صرف ونحو کے قواعد کی پیچیدگیاں سلجھ نہیں رہیں، ایسی حالت میں کیسے پڑھوں؟

استاد نے اخفش کو مشورہ دیا کہ تم کسی کو عربی پڑھایا کرو۔ پڑھانے سے اسباق کی بار بار تکرار ہوتی ہے۔ اس طرح بہت سی الجھنیں سلجھ جاتی ہیں۔ مشکل طریق وتصور واضح ہو جاتے ہیں اور اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ اخفش گویا ہوئے، استاد محترم مجھ سے بھلا کون پڑھے گا۔ میرے تو اپنے دامن میں کچھ نہیں۔ اُن کے استاد نے اللہ جانے سنجیدگی سے کہا یا ازراہِ تفنن بات کی کہ تم ایک بکرا خرید لو۔ اُسے پڑھایا کرو۔ اخفش نے استاد کی نصیحت نہایت دیانت سے سمیٹ لی اور بکرا خرید لیا۔ اب اخفش کا معمول بن گیا کہ رات کو بیٹھ کر بکرے کو سبق سناتے۔ عربی صرف ونحو کے قائدے گوش گزار کرتے اور اس وقت تک بکرے کو سبق پڑھاتے رہتے، جب تک بکرا بول نہ اُٹھتا یا سر نہ ہلا دیتا۔ اخفش کے خیال میں جب بکرا بول پڑے یا سر ہلا دے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کو سبق یاد ہو گیا۔

بکرے کو سبق یاد ہوا یا نہیں، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، تاہم مسلسل محنت و ریاضت سے اخفش کو شرح صدر عطا ہو گیا۔ اُس کا دماغ کھل گیا اور زبان چل پڑی اور وہ ایسے فاضل و عالم بنے، کہ عربی زبان کے صف اول کے علما میں شمار ہوئے۔ تاہم بزِاُخفش کی ترکیب ایسے شخص کے لیے بولی جانے لگی جو بغیر سمجھے کسی بات پر سر ہلا دے۔

اخفش کی روایت سے عیاں ہے کامیابی وکامرانی کی منزل

اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنا، اُن کی اصلاح کی کوشش نہ کرنا ایک منفی عادت ہے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

دور نہیں، صرف چلنا شرط ہے۔ ایک جذبہ دل چاہیے جو ہر چیز کو مقابل لے آتا ہو۔ قدم اُٹھائیں اگر راستے میں مشکلات ہیں تو دوسری طرف راستے میں ہزارہا شجر سایہ دار آپ کے منتظر بھی ہیں۔ پیدائشی طور پر کوئی شخص بھی علوم وفنون کا ماہر نہیں ہوتا۔ مادرِ رحم سے کبھی کوئی انسان سیکھ کر نہیں آتا۔ انسان کورے ذہن کی حالت میں دنیا میں قدم رکھتا ہے اور یہ اس کی کوشش ومحنت ہوتی ہے جو اسے مختلف علوم وفنون میں ماہر بنا دیتی ہے۔

یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں رکاوٹوں سے زیادہ سیکھنے کے مواقع ہیں، بس سیکھنے کے لیے ایک مزاج اور پرعزم لگن ہونی چاہیے۔ غبی دماغ اور کند ذہن ہونا کوئی برائی اور کمزوری نہیں، البتہ اس غبی پن میں مبتلا رہنا، کند ذہنی کو روگ بنا کر پالنا ایک برائی اور کمزوری ہے۔

مندرجہ بالا روایت سے آشکارا ہوتا ہے کہ کامیاب اشخاص کی زندگی میں منزل کا تعین ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ساری توانائیاں ایک منزل کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے اس لیے آج اگر ہم کسی میدان میں کامیابی کا پرچم لہرانا چاہتے ہیں تو پہلے میدان کا تعین کریں۔ کس میدانِ عمل میں آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ سمت کے تعین کے بغیر سفر ایک سعی لاحاصل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اولاً کامیابی کے لیے کسی منزل کا تعین ہو، کارِ عمل کا کوئی شعبہ مقرر ہو، تب خوش نصیبی استقبال کرے گی۔

دوم یہ کہ کامیابی کے سفر میں سب سے بڑی سدِ راہ اپنی ذات ہوتی ہے۔ اپنے نقص وعیب تلاش کیے جائیں، اپنی خامیوں کوتاہیوں کو کھلے دل سے تسلیم کیا جائے، بالکل اُسی طرح جیسے اخفش نے اپنی کمزوری کا اقرار کیا کہ وہ کند ذہن اور غبی دماغ ہے۔ پھر اُس کمزوری کو دور کرنے کے لیے اس کا علاج کیا۔ یہ اُن کا مثبت طرزِ فکر تھا۔

اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنا، اُن کی اصلاح کی کوشش نہ کرنا ایک منفی عادت ہے۔ دوسروں پر اُنگشت نمائی کرنا اور اپنے عیب ونقص کی اصلاح کو فراموش کرنے کا رویہ ہمیشہ ناکام لوگوں کا طریق ہے۔ جو افراد ہر وقت دوسروں کے بارے میں شکایت کناں رہیں اور اپنی ذات میں موجود خامیاں بھول جائیں۔ کامیابی کے مواقع اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بیوقوف دوسروں کے نقص تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتے اور عقل منداپنے عیب سنوارنے پر متوجہ رہتے ہیں۔

پہلا رویہ تخریب کا ہے جبکہ دوسرا تعمیر کا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ اخفش کے طریق پر نکتہ چیں ہوں گے، مگر اخفش چونکہ اپنی ذات پر نکتہ چیں تھا اس لیے وہ اپنی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سوئم، راستے کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کسی ایسے استاد یا ماہر شخص سے مشورہ ضرور لیں جو اُن راستوں سے پہلے گزرا ہو، جو راہوں کے نشیب وفراز سے شناسا ہو کیونکہ صحیح اور بروقت مشورہ سفر کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

چہارم، جو مشورہ ملے اس کے مطابق محنت وریاضت سے کام کرنا شروع کر دیں کامیابی کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ آپ دل جمعی سے اپنے کام میں مشغول رہیں۔ مشیت الٰہی جلد آپ کی کاوشوں کو ثمر بار کرے گی۔ عجلت بازی سے گریزاں رہیں کیونکہ کامیابی اچانک برق آسمانی کی طرح چمکتی ہے نہ یکدم زلزلہ کی طرح آتی ہے، بلکہ یہ بتدریج خوشبو کی طرح پھیلتی جاتی ہے۔ یہ تو ایک پودے کی مانند نشوونما پاتی ہے۔ جیسے پودا فوراً وجود میں نہیں آتا، پہلے بیج سے تنا بنتا ہے، پھر شاخیں اور پتے نکلتے ہیں، پھر پھول کھلتے اور پھل پکتے ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد پودا شجرِ سایہ دار میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس سفر میں کوئی طریق مختصر نہیں ہے۔

عام طور پر لوگ دو گام چلتے اور ہمت ہار بیٹھتے ہیں جبکہ مسلسل محنت سے ہی خوابوں کو تعبیر ملتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کامیابی ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کا ثمر ہوتی ہے۔ جو بھی سستی وکاہلی کی بیڑیاں قدموں سے اُتار کر سرگرم عمل ہو گا۔ رحمت خداوندی اسی پر سایہ افگن ہو گی۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مختصر افسانہ

مکمل عشق

مریم چودھری

"تمہیں ہر چیز اتنی آسان کیوں لگتی ہے؟ تم ہر وقت مسکراتی رہتی ہو؟ تم بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ہمیں نہیں پکارتیں۔ درد ہو تو تم چلاتی بھی نہیں۔ تم لوگوں کی پروا کیوں نہیں کرتی؟ تم نے کبھی نہیں سوچا کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ایک ہم ہیں جو اپنی زندگی ہی لوگوں کے لیے جیتے ہیں۔ تم اتنی الگ سی کیوں ہو؟ آخر ایسا کیا ہے تم میں؟ جو تمہیں ہم سب سے ممتاز بناتا ہے۔ ایسا سکون اور اطمینان ہمیں نصیب کیوں نہیں؟ کچھ تو خاص ہے تمہارے پاس ہے جو ہم نہیں جانتے۔"

فجر عجوہ کے ساتھ چائے کی بیٹھک پر یہ گفتگو کر رہی تھی۔ عجوہ مسکراتی رہی۔ عجب نور تھا اس کے چہرے پر۔ فجر کو شک تھا کہ عجوہ کو یقیناً کسی سے محبت ہے تبھی اتنے رنگ اس کے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو سر سے پاؤں تک عشق میں ڈوبی ہوئی تھی

چہرے پر کھلتے ہیں مگر کس سے؟ کون ہے وہ جس کے عشق میں عجوہ اتنی سرشار رہتی ہے؟ فجر جاننا چاہتی تھی لیکن پوچھنے کی ہمت کبھی نہ کر سکی۔ اتنے میں عجوہ کی کلاس کا وقت ہو گیا۔ اُسے اُٹھ کر جانا پڑا۔

☆☆☆

''دیکھو عجوہ! میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی اور تم ہو کہ اتنی دیر سے آئی ہو۔ کاش ہماری کلاس بھی ایک ساتھ ہی ہوتی۔ یہ چند گھنٹوں کی دُوری بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ عجیب بے چینی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ مجھے سمجھ نہیں آتا۔ اس دوستی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' یونیورسٹی کے باہر کھڑی فجر عجوہ سے مخاطب تھی۔

''اچھا بابا! اب ایسا نہیں ہوگا۔ کوشش کروں گی جلد باہر آ جایا کروں۔'' عجوہ مسکراتے ہوئے فجر کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی۔ اسی ازلی اطمینان اور مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

☆☆☆

بھائی مجھے سمجھ نہیں آتا عجوہ کا اور میرا آٹھ سال کا سفر ہے۔ میں نے کبھی بھی اس لڑکی کو جھگڑا کرتے نہیں دیکھا۔ ہر چیز سے مطمئن رہتی ہے...... اور تو اور اپنے حق کے لیے بھی نہیں لڑتی۔ بہت ہی خوش رہنے والوں میں سے ہے۔ جب بھی کچھ مانگو، دے دیتی ہے۔ مدد کے لیے ایسے بھاگتی ہے جیسے اس کے سوا کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ مجھے آج تک میری اور اس کی دوستی سمجھ ہی نہیں آئی۔ ادھر مجھے تکلیف ہوئی اور دوسرے ہی پل وہ میرے پاس ہوتی ہے۔ ایسے جیسے میرا اور اس کا روحانی رشتہ ہو...... انتہائی گہرا۔

''بھائی اس میں ضرور کچھ ہے۔ ورنہ کوئی کیسے آپ کے سکون کی وجہ بن سکتا ہے مگر ایک بات ہے، آج تک میں اس کے گھر نہیں جا سکی۔ مجھے جانا چاہیے۔ اب تو اتنا وقت گزر گیا اور یونیورسٹی بھی مکمل ہونے کو ہے۔ مجھے معلوم ہے اس دفعہ پھر سے عجوہ ہی ٹاپ ٹین میں آئے گی۔'' یونیورسٹی جاتے ہوئے فجر اپنے بھائی سے محوِ گفتگو تھی۔ اتنے میں وہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ فجر نے گاڑی سے اُتر کر بھائی کو خدا حافظ کہا اور اندر کی جانب چل دی۔ اس کی نگاہیں عجوہ کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں

☆☆☆

اتنا وقت ہونے کو ہے، عجوہ کہاں رہ گئی؟ وہ تو چھٹی بھی نہیں کرتی...... اور...... اور اب تو آخری سمیسٹر کے امتحانات بھی سر پر ہیں۔ چھٹی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر وہ کہاں رہ گئی؟ فون کال بھی نہیں اُٹھا رہی۔

فجر کافی دیر سے عجوہ کا انتظار کر رہی تھی اور آتے جاتے ہر شخص سے پوچھ چکی تھی مگر سارا دن گزر جانے کے بعد تک کوئی خیر خبر نہ مل سکی۔ اس کی بے چینی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فجر نے گھر آتے ہی وہ پرانی کتاب نکالی جہاں عجوہ کے گھر کا پتا موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کی گلی میں موجود تھی۔

☆☆☆

عجوہ کے گھر کے قریب بہت ہجوم تھا۔ لوگ ہی لوگ۔ جوں ہی فجر اس کے گھر میں داخل ہوئی تو معلوم ہوا کہ عجوہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ لیکن یہ کیا؟ میں جیسے ہی یہاں آئی ہوں مجھے عجیب سا سکون ملا ہے جیسے میں عجوہ کے پاس ہوں۔ وہ نہیں جا سکتی۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اچانک یہ خبر سن کر فجر خود کو سنبھال نہ سکی اور عجیب صدمے میں چلی گئی۔

وہ عجوہ کے کمرے میں ایک ایک چیز حیرت اور آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لیے دیکھ رہی تھی۔ دیواروں پر محمدؐ کے پاک نام کی خطاطی والے فریم، درود شریف لکھے فریم، عجوہ کے ہاتھوں سے لکھا محمدؐ کا نام، جگہ جگہ۔ اس کی نوٹ بک فجر کے ہاتھ میں تھی۔ جس میں لکھی ہر تحریر کا ایک ایک لفظ عشق

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہے؟

ایک تڑپ محبوب جیسا بننے کی، ایک لگن نقش پا پر چلنے کی کوئی لمحہ چین نہیں لینے دیتی۔ ہر لحظہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوجائے جو ناگوار خاطر ہو۔ اسے محبت کا خوف کہتے ہیں۔ یہ محبت کا خوف عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام نے پالیا تھا۔ پھر ان کی آلائشیں صاف ہوتی گئیں۔ یہ عشق انہیں سفلی زندگی کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھا کر آسمانوں کی بلندیوں پر لے گیا۔ ستاروں کی مانند چمکنے کا خطاب دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پالیا۔ ان میں سے ہر ایک ہادی بن گیا۔ یہی ارشاد ہوا کہ جس کی بھی پیروی کرو گے منزل نزدیک تر ہوجائے گی۔

شیر خدا علی کرم اللہ وجہ حالت جنگ میں مدمقابل کو گرا کر سینہ پر چڑھ گئے۔ کفر ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ بھی تھا۔ جلد ہی ہمت ہار گیا۔ چہرہ مبارک پر تھوک دیا کہ اشتعال میں آکر جلدی کام تمام کردیں۔ پر شیر خدا نے چھوڑ دیا۔ یہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا تھا کہ جب میرے محبوب نے کبھی ذاتی مخاصمت نہیں رکھی تو مجھے بھی زیب نہیں دیتی۔ حالت جنگ، جذبات عروج پر لیکن محبوب کے عشق کی اور اپنی وفا کی لاج رکھنا فراموش نہیں ہوئی۔ یہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ایک روز عثمان غنی رسالت مآب کے پیچھے چلتے ہوئے قدموں کے نشان مبارک گنتے جارہے تھے۔ پلٹ کو پوچھ لیا۔ عثمان کیا کررہے ہو۔ عرض کیا قدموں کے نشان گن رہا ہوں کہ ان قدموں کی تعداد کے برابر غلام آزاد کرسکوں اور کر بھی دیے۔ یہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ہر نقش پا پر ہر ادا پر سو طریقوں سے قربان۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گواہ تھا۔ اوہ...... تو وہ یہ عشق تھا جس میں عجوہ گم تھی، سرتا پاؤں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی وہ نام اور مکمل ذات تھی، جس کی خوشبو فجر کو عجوہ سے جوڑے رکھتی تھی۔ یہی وہ سکون تھا، جو عجوہ کے اندر سے نکل کر فجر کو اپنے اندر اُترتا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ بے خودسی ہو کر عجوہ کے پاس بھاگی آتی تھی۔ تو وہ روحانی رشتہ یہ تھا۔ آج فجر گنگ تھی۔

☆☆☆

''میرا ہمیشہ یہ کہنا تھا کہ عشق محض اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں'' اور عجوہ ہمیشہ اس کے خلاف بولتی۔ وہ کہتی، ''بھلا عشق میں اذیت کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ تو تسکینِ دل کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' وہ کتنی سچی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی اور میں جاہل اسے دنیاوی اور عام عشق سمجھتی رہی۔

جس کا عشق اللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہو بھلا اس میں اذیت کیسی؟...... اور اس کی زندگی میں بے چینی کیسی؟ تکلیف کیسی؟ مجھے آج ہر اس سوال کا جواب مل رہا ہے جو میں اس سے آٹھ سال پوچھتی رہی اور اس کا وہ مطمئن انداز میں مسکرا دینا۔ مجھے آج احساس ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کر کے، ان سے عشق کر کے بہت سکون ملتا ہے......اور پھر ساتھ رہنا۔

عجوہ کا عشق بھی مدینہ تھا...... اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

میں ہمیشہ عجوہ سے پوچھتی رہتی مگر مجھے اب جواب مل گیا ہے کہ...... عشق میں کتنا سکون ہے۔ محبت اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراپا عشق...... عشق میں سکون کے سوا کچھ بھی نہیں اور اللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہی مکمل عشق ہے۔

فجر حرم پاک میں بیٹھی اپنے بھائی سے گفتگو کررہی تھی۔

آج اس کے اردگرد بھی سکون کے سوا کچھ نہیں تھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ڈاکٹر اختر احمد

کچھ بھی ناممکن نہیں

پیرو، براعظم جنوبی امریکہ کا تیسرا بڑا ملک ہے جس کی تاریخ اور ثقافت 15 ہزار سال سے زیادہ ہے۔ ایک طرف ایمزون کے جنگلات کا دوسرا بڑا حصہ یہاں موجود ہے تو دوسری طرف کوہ انڈیز کا وسطی سلسلہ بھی، جو رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا اور اُونچائی کے اعتبار سے ہمالیہ کے بعد دوسرا سب سے اُونچا پہاڑی سلسلہ ہے۔

پیرو سیاحوں کے لیے بہت کشش رکھتا ہے اور دنیا کے کئی حصوں سے لوگ اس کی سیاحت کرنے آتے ہیں۔ سیاحت کے لیے کولوراڈو کی ڈوڈسن فیملی بھی یہاں آئی تھی۔ اس گھرانے کی 11 سالہ اینا بھی اس سفر کے بارے میں بہت پُرجوش تھی۔ پیرو میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ مصر کی طرح آثار قدیمہ، یہاں موجود جنگلی حیاتیات جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے۔ اینا کو سب اچھا تو لگ رہا تھا مگر اسے بے چینی سے انتظار تھا کوسکو کی سیر کا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اینا نے رخ کیا اپنی آخری منزل یعنی پیرو کے شہر کوسکو کا جہاں اس کی خواہش ایک یتیم خانہ دیکھنے کی تھی۔ اس سفر کے لیے اینا

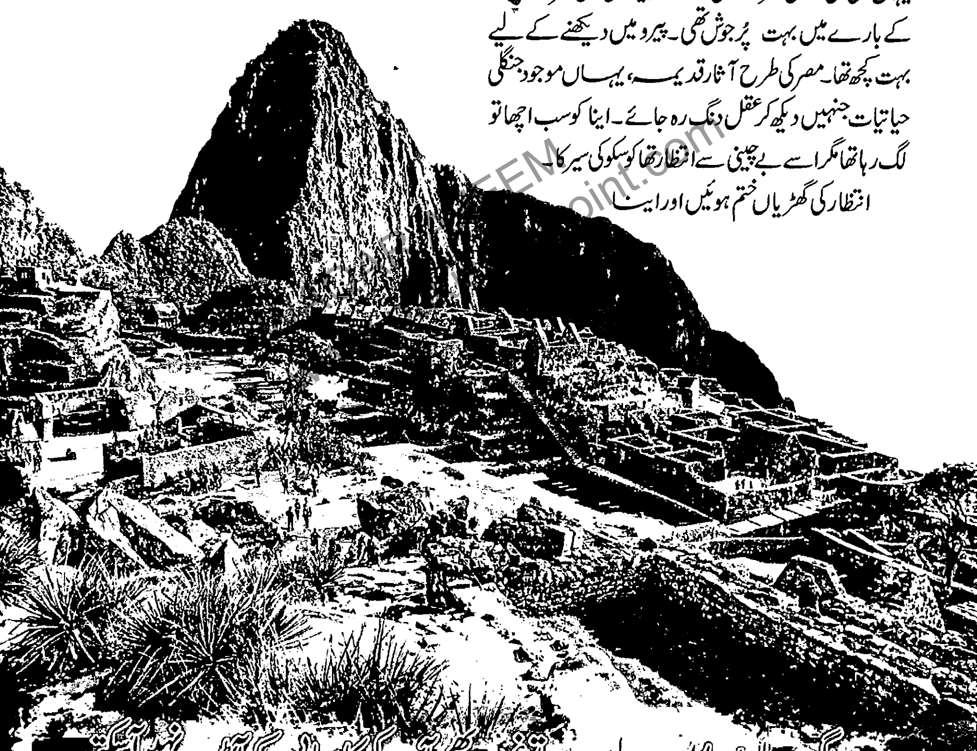

اگر حوصلہ اور ارادے بلند ہوں تو غربت بھی آپ کی کامیابی کے آڑے نہیں آسکتی

نے تیاری بھی کی تھی۔ وہ اپنے ساتھ یتیم خانے کی بچیوں کے لیے گڑیائیں، ٹیڈی بیئر اور چھوٹے تحائف بھی لے کر گئی تھی۔ ان لوگوں کا یتیم خانے میں بہت پُرجوش استقبال ہوا۔ بچیوں نے ایان کے اعزاز میں ایک مقامی رقص کا بھی مظاہرہ کیا۔ اینا نے ایک اُستاد سے پوچھا:

''کیا آپ کے ہاں آنے والے تمام مہمانوں کا استقبال اسی طرح کیا جاتا ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، جو مہمان بھی آئے گا، یہ بچیاں اسی محبت اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کریں گی۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ آپ ہمارے اس یتیم خانے کی پہلی مہمان ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اینا نے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ جب سے ہمارا یہ یتیم خانہ قائم ہوا ہے کسی نے آج تک اس کا دورہ نہیں کیا۔ آپ پہلی مہمان ہیں جس نے اس یتیم خانے کو دیکھنے کی خواہش کی۔''

''پھر چندہ یا فنڈ کیسے آتے ہیں؟'' اینا نے پوچھا۔

''ہمیں کوئی معقول چندہ نہیں ملتا۔'' باقی رہا ہمارا گزارا تو ان بچیوں کے نصیب سے کوئی نہ کوئی آسرا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ بچیاں کئی کئی وقت کھانا نہ ملنے یا ناقص غذا ملنے پر صبر شکر کر لیتی ہیں۔''

اینا خوراک کی کمی کی شکار بچیوں کو دیکھ کر دکھی ہو گئی۔ اینا نے وہ دن یتیم خانے کی بچیوں کے ساتھ بہت بھرپور انداز میں گزارا۔ ان کے ساتھ خوب کھیلی۔ شام کو اینا کی واپسی سے پہلے سب بچیاں بہت اُداس ہو گئیں۔ اس یتیم خانے کی بچیوں کے درمیان 11 سال کی اس چھوٹی سی بچی نے دل ہی دل میں کئی بڑے فیصلے کر لیے تھے جس کا اس وقت تذکرہ مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اینا اپنی آنکھوں کی نمی اپنی ہتھیلی کی پشت سے دور کرتے ہوئے ان بچیوں کو بائے بائے کر کے واپس اپنے شہر کولوراڈو چلی گئی۔

وہاں سے آنے کے بعد اینا اپنے ساتھ اتنا پیار لائی تھی کہ اس نے اس پیار کو اپنی سہیلیوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنی ان ہم جماعتوں، کی جو ہسپانوی زبان کی طالبات تھیں، کوسکو کے یتیم خانے کی بچیوں سے قلمی دوستی کرا کے محبت اور اپنائیت کے رشتوں کو مزید فروغ دیا۔ اینا اکثر اپنی ماں سے یتیم خانے کی ہی باتیں کیا کرتی۔

اینا نے اپنے گھر والوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کیوں نہ مستقل بنیادوں پر وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کوسکو کے یتیم خانے کی بچیوں کے حالات بہتر ہو سکیں۔ کم از کم مستقل بنیادوں پر بے چاریاں پیٹ بھر کر کھانا تو کھا سکیں۔ اینا کے والدین نے اسے اجازت دے دی۔ اینا نے بہت چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا۔ اس کی ہم جماعت اور پھر اسکول کی سہیلیوں نے اپنا فالتو سامان الگ کیا تو انھیں خود ہی اپنے وہ کپڑے، کھلونے، سینڈل اور دیگر چیزیں بھی نظر آ گئیں جو اگرچہ ان کے دل سے اُتر چکی تھیں مگر تھیں بالکل نئی اور کوسکو کی یتیم لڑکیوں کے لیے بہت قیمتی تحفہ۔

اینا کا حوصلہ بڑھا اور اس نے کمیونٹی سے بھی چندا اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور کمیونٹی نے بھی اینا کی لگن کو دیکھتے ہوئے اسے مایوس نہیں کیا۔ یوں باقاعدہ طریقے سے ''دل پیرو والوں کا'' کے نام سے ایک خالص خدمتی اور غیر نفع بخش ادارے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ لوگوں نے ''دل پیرو والوں کا'' کی دل کھول کر مدد کی۔

اس تنظیم نے اپنے لیے یہ راہنما اصول منتخب کیا کہ اگر یہ دنیا کو بدلنا ہے تو دلوں کو بدلنا ہو گا، وہ بھی ایک ایک کر کے چنانچہ کوسکو کے اس یتیم خانے اور اس میں مقیم لڑکیوں کے حالات بدلنے شروع ہو گئے۔ عمارت میں نیا رنگ و روغن ہوا، نیا باورچی خانہ تعمیر ہوا۔ ایک گرین ہاؤس کی بنیاد رکھی گئی جس میں نہ صرف یہ کہ تازہ سبزیوں کا حصول ممکن ہوا بلکہ یتیم خانے کی انڈوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پولٹری فارم بھی قائم کیا گیا اور پھر اینا کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لیے سولر گیزر بھی لگائے گئے تاکہ اینا کی سہیلیاں بھی گرم پانی کے غسل کا لطف لے سکیں۔

WAQAR AZEEM www.pakistanpoint.com

چیوشن فیئ

"دل پیرو والوں کا" نے ابتدائی چار برسوں میں ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ کی مدد فراہم کی، جس سے اس یتیم خانے کی طالبات کے لیے وظائف کا انتظام کیا گیا۔ ایک وظیفے کا نام ماریہ اسکالرشپ رکھا گیا جو کوسکو کی ایک مقامی خاتون کی یاد میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ خاتون غربت کے باعث تعلیم حاصل نہ کر سکی اور ایک بچی کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھی۔

اینا کو اس کارنامے پر کئی قومی ایوارڈ اور انعامات ملے مگر اینا کے لیے سب سے بڑا انعام کوسکو کی ان یتیم بچیوں کی محبت تھی جن کی وہ دوست بھی تھی، محسن اور آئیڈیل بھی۔

یتیموں کی پرورش کا حکم تمام مذاہب میں ہے۔ پیارے نبی ﷺ نے تو یتیم کی کفالت کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح پاس پاس ہوں گے، یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی۔

ہم یوں تو ہمیشہ دعا کرتے ہیں کہ روزِ قیامت ہمیں حضور پاک ﷺ کی شفاعت اور دیدار نصیب ہو مگر آخر کیوں اس کا وہ آسان راستہ نہیں اپناتے جس کا اشارہ خود حضور پاک ﷺ نے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم کسی یتیم کی اپنے بچوں کے ساتھ پرورش کرتے ہیں یا کسی یتیم خانہ کی مدد کرتے ہیں۔ تو ہمیں حضور ﷺ کا ساتھ نصیب ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

☆ اسکول سے نکالی جانے والی لڑکی...... اب امیر ترین

اگر حوصلہ اور ارادے بلند ہوں تو غربت بھی آپ کے آڑے نہیں آسکتی اور آپ دنیا کے کامیاب ترین انسان بن سکتے ہیں۔ اس بات کو ایک چینی خاتون نے سچ کر دکھایا۔

انتہائی غربت اور مفلسی میں پیدا ہونے والی چیوشن فیئ اس وقت 7 ارب ڈالر (7000 ارب روپے) کی مالکہ ہے۔

ایک وقت تھا جب اسے اسکول سے مفلسی کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اپنی ترقی کے راستے میں غربت کو نہ آنے دیا۔ چیو اس وقت Lens Technologies کی چیف ایگزیکٹو ہے۔ یہ وہ کمپنی ہے جو دنیا بھر کے موبائل فونز کے لیے ٹچ اسکرین بناتی ہے، ایپل اور سام سنگ بھی اس کے کسٹمرز میں شامل ہیں۔

چیو چین کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے والد فیکٹری میں کام کے دوران حادثہ میں نابینا ہو گئے۔ اسے اسکول سے سولہ سال کی عمر میں نکال دیا گیا اور اس نے ایک فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا جہاں وہ گھڑیوں کے لینز بنایا کرتے تھے۔ اس کی ایک دن کی آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم تھی۔

چیو نے اپنی بچت کے ساتھ تین ہزار ڈالر کے ساتھ کاروبار کا آغاز کیا اور ایک ایسا موقع آیا کہ اسے اپنا گھر بیچ کر ملازمین کی تنخواہیں دینی پڑیں لیکن اس نے بالکل ہمت نہ ہاری۔

2003ء میں جب اسمارٹ فونز کا سلسلہ ہوا تو اسے بہترین مواقع میسر آئے۔ اس نے فونز کے ٹچ اسکرین بنانے

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

شروع کر دیے اور یہاں اس کی ترقی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

☆☆☆

☆ دو بھائیوں کا خواب

یہ بات 1878ء کی ہے۔ ایک شخص سفر سے واپس آیا تو اس کے بیٹے دُور سے ہی اسے دیکھ کر اس کی طرف لپکے۔ بڑا بیٹا 11 سال کا تھا اور چھوٹا 7 سال کا۔ ابھی بچوں اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا کہ اس نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا اور کہا:

’بیٹو! میں تمہارے لیے ایک چیز لایا ہوں۔ لو اسے پکڑو۔‘‘ اور اس نے ایک چیز ان کی جانب اُچھال دی۔ دونوں بیٹے اسے پکڑنے کے لیے تیار تھے مگر اس ایک لمحے میں ایک ایسی بات ہوئی اس نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ وہ چیز ان بچوں کی ہاتھوں میں آنے کے بجائے چھت کی سمت اُڑنے لگی اور چند لمحوں میں پھڑ پھڑ کر فرش پر گر پڑی۔ لڑکے پھٹی آنکھوں سے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ تیزی سے اس کھلونے کی سمت بھاگے۔ وہ ایک اُڑنے والا مشینی کھلونا تھا جسے تار، بانس اور کاغذ سے بنایا گیا تھا۔

اس کھلونے نے بچوں میں پرواز کا جنون بھر دیا۔ وہ اس کھلونے سے اس وقت تک کھیلتے رہے جب تک وہ ٹوٹ نہیں گیا۔ چونکہ ان کے پاس کوئی دوسرا کھلونا نہیں تھا لہٰذا انھوں نے خود ہی اس قسم کا کھلونا بنا لیا۔ بعد میں انھوں نے پتنگیں بنانا شروع کر دیں۔ جو اس قدر عمدہ ہوتیں کہ محلے کے تمام لڑکے انھی سے خریدتے۔

اُن لڑکوں کے نام تھے ولبر رائٹ Wilbur Wright اور آرول رائٹ Orivlle Wright جنہیں ہم رائٹ برادرز کے نام سے جانتے ہیں۔

دونوں بھائی جو چیز بھی اُڑتی ہوئی دیکھتے تجسس سے تکنا شروع کر دیتے۔ گھنٹوں پشت پر لیٹ کر پتنگوں کو اُڑتا دیکھتے۔ چڑیوں اور کبوتروں کو اُڑتا دیکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ کس طرح عقاب بغیر بازو ہلائے اُڑتا رہتا ہے۔ وہ دونوں ہوا میں اُڑنا چاہتے تھے لیکن غربت کی وجہ سے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے۔

تعلیم یافتہ تھے نہیں، دیہات میں جا کر بدبودار مردہ گھوڑوں اور بھینسوں کی ہڈیاں چنتے اور انھیں کھاد کی فیکٹری میں فروخت کر دیتے۔ بعد میں وہ لوہے کے ٹکڑے چننے لگے جسے کباڑ خانے میں بیچ دیتے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) بنایا اور اخبارات شائع کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کاروبار ناکام ثابت ہوا۔ پھر انھوں نے سائیکلوں کی خرید و فروخت اور مرمت کی ایک چھوٹی سی دکان شروع کر دی۔

اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے، اخبار کی پرنٹنگ کرتے ہوئے اور سائیکلوں کے ٹائروں میں ہوا بھرتے ہوئے وہ ایک خواب کبھی نہیں بھولے...... ’’پرواز کا خواب‘‘...... یہ خواب کی طاقت ہی تھی جس نے 17 دسمبر 1903ء کے ایک ٹھٹھرتے دن انھیں مشینی پتنگ میں بٹھا دیا۔ ان کی محنت اور لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا

ہے کہ انھوں سے دوسو سے زائد تو صرف پروں پر تحقیق کی اور بالآخر انسانوں کے ہزاروں سال پرانے خواب ''ہوا میں اُڑنے'' کو یقینی بنا دیا۔

☆ آفس بوائے کا ای میل ایڈریس

ایک بے روزگار شخص نے ایک ادارے میں آفس بوائے (چپراسی) کے لیے درخواست دی۔

''تمہارا کام صفائی کرنا ہے، اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔'' انٹرویو کے بعد اسے منتخب کرتے ہوئے ایچ آر منیجر نے ایک کاغذ اس کے آگے بڑھایا:

''اس پر اپنا ای میل ایڈریس لکھ دو۔ میں تمہیں ایک فارم میل کروں گا، تم اسے بھر دینا۔''

''میرے پاس نہ تو کمپیوٹر ہے اور نہ ہی ای میل ایڈریس۔'' لڑکے نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

''کس دور میں جی رہے ہو بھائی۔'' منیجر نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

''جس شخص کا ای میل ایڈریس نہیں، اس کا وجود ہی نہیں اور جس کا وجود نہیں، اسے ہم نوکری پر کس طرح رکھ سکتے ہیں۔''

لڑکا نااُمیدی کی حالت میں دفتر سے نکل گیا۔ اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہزار روپے کے نوٹ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

وہ بازار گیا اور سب پیسوں کے ٹماٹر خرید لیے اور گھر گھر جا کر بیچنے شروع کر دیے۔ دو گھنٹوں کے اندر اندر اس کے پیسے دگنے ہو گئے۔ پیسے لے کر وہ دوبارہ بازار گیا اور تمام ٹماٹر ایک مرتبہ پھر فروخت کر دیے۔ رات میں جب وہ گھر پہنچا تو اس کے پاس چار ہزار روپے تھے۔

کام بہت مشکل تھا، لیکن اس کے حوصلوں سے بڑا نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہر روز صبح جلدی اُٹھے گا، منڈی جائے گا اور رات دیر تک کام کرے گا۔ اس کا کام چل پڑا اور بہت جلد وہ ٹھیلا خریدنے کے قابل ہو گیا۔

اس کی مسکراہٹ، محنت اور سادگی نے پانچ سال کے اندر اندر اسے امیر اور خوشحال آدمی بنا دیا۔ اب اس نے سوچا کہ اپنے گھر والوں کا بیمہ (Insurance) کروانا چاہیے۔

ایک انشورنس ایجنٹ کو فون کر کے بلایا، اس سے تفصیلی ملاقات کی۔ مختلف منصوبوں کے متعلق معلومات لینے کے بعد معاملات طے کر لیے۔ جب گفتگو مکمل ہو گئی تو ایجنٹ نے فارم بھرنا شروع کیا۔ ایک نقطے پر پہنچ کر ایجنٹ نے سوال کیا۔

''آپ کا ای میل ایڈریس کیا ہے۔''

''میرا ای میل ایڈریس نہیں۔'' اس شخص نے سکون سے جواب دیا۔ اس شخص کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''آپ کا ای میل ایڈریس نہیں ہے اور اتنی زیادہ ترقی کر لی۔ آپ کو اندازہ ہے اگر آپ کا ای میل ایڈریس ہوتا تو آپ کیا ہوتے؟''

اس شخص نے تھوڑی دیر سوچا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آفس بوائے۔''

کامیابی ہر شخص کی دسترس میں ہے لیکن تم اسے حاصل اسی وقت کر سکتے ہو جب تمہیں اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت کا ادراک ہوتا ہے۔'' (اسٹیفن رچرڈز)

دکھوں، غموں اور مایوسیوں میں کھو کر انسان مسکرانا بھول جاتا ہے۔ دکھ اور مصیبتیں تو آزمائشوں کی طرح زندگی کے ساتھ چلتی ہیں مگر ان اداسیوں کو مسکراہٹوں میں بدلنے کے لیے یہ لاجواب مزاحیہ کلام نہایت عرق ریزی سے آپ کے لیے یکجا کیا گیا ہے۔ کچھ دیر کے لیے نااُمیدی کے اندھیروں سے نکل کر خوشیاں تلاش کیجیے جو آپ کے آس پاس ہی موجود ہیں۔

☆☆☆☆

شوق سے لختِ جگر نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کے بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے دھڑ، راکٹ کے سر پیدا کرو
میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو
میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر پیدا کرو اور مختصر پیدا کرو
میری درویشی کے جشنِ تاجپوشی کے لیے
ایک ٹوپی اور کچھ مرغی کے پَر پیدا کرو
حضرت اقبال کا شاہین تو کب کا اُڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو
(سیّد ضمیر جعفری)

☆☆☆

تم بھول گئے شاید

وہ جو دودھ شہد کی کھیر تھی
وہ جو نرم مثل حریر تھی
وہ جو آملے کا اچار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو ہرن کے سیخ کباب تھے
وہ جواب اپنا جواب تھے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

وہ جو کوئٹہ کا انار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو سیب زینت باغ تھے
وہ جو شاخ شاخ چراغ تھے
وہ جو آلوؤں کو بخار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ رقیب کے جو بغیر تھی
وہ جو چاندرات کی سیر تھی
وہ جو عہد فصل بہار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(انور مسعود)

☆☆☆

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجیے
اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسا ضرور ہو کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگرچہ بیس تو دس خام بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجیے

(اکبرالہٰ آبادی)

☆☆☆

خبط مجھ کو شاعری کا جب ہوا
دس منٹ میں ساٹھ غزلیں کہہ گیا
سب سے رو رو کر کہا سن لو غزل
تاکہ میں ہو جاؤں پھر سے نارمل
رحم اپنوں کو نہ آیا جب ذرا
تو پریشاں ہو کے ہوٹل میں گیا
تاکہ مل جائے اک ایسا آدمی
چائے پی کر جو سنے غزلیں مری
جا کے بیٹھا سات گھنٹے جب وہاں
اک معزز شخص آئے ناگہاں
دیکھتے ہی ہو گیا دل باغ باغ
اب تو ہوگا پیٹ ہلکا اور دماغ
بعد از آداب اور تسلیم کے
میں نے ان سے یہ کہا تعظیم سے
آیئے تکلیف اتنی کیجیے
چائے میرے ساتھ ہی پی لیجیے
آ کے بیٹھے ساتھ جب کی التجا
آپ کا جو حکم ہو منگواؤں گا
مسکرا کر پھر تو بولے آنجناب
مرغ یخنی قورمہ نرگس کباب
شیر مال و شاہی ٹکڑا فیرنی
اور اگر مل جائے تو چورن کوئی
توس مکھن دودھ کافی رائتا
الغرض جو کچھ کہا منگوا لیا
ناک تک جب کھا چکے میں نے کہا
ہو تعارف اب ہمارا آپ کا
نام ہے اسرار میرا محترم
ساری دنیا جانتی ہے بیش و کم
شاعر اعظم ہوں میں عزت مآب
وہ یہ بولے میں تو بہرا ہوں جناب

(اسرار جامعی)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پروفیسر ہی جب آتے ہوں ہفتہ وار کالج میں
تو اونچا کیوں نہ ہو تعلیم کا معیار کالج میں
کچھ ایسے بھی پڑھاکو پنچھیوں کو ہم نے دیکھا ہے
کہ پر دفتر میں پنچے شہر میں منقار کالج میں
اگرچہ دوسرے مشروب بھی مہنگے نہیں ملتے
مگر چلتا ہے اکثر شربتِ دیدار کالج میں
وہ ڈگری کی بجائے میم لے کر لوٹ آیا ہے
ملا تھا داخلہ جس کو سمندر پار کالج میں
مجھے ڈر ہے کہ ہم دونوں کہیں سمدھی نہ بن جائیں
تری گلنار کالج میں مرا گلزار کالج میں

(ڈاکٹر انعام الحق)

☆☆☆

مسرت کے دن بھی رُلاؤ گی، ظالم؟
ابھی پھر سے بازار جاؤ گی، ظالم؟
سنوارو گی کنگھے سے زلفوں کو اپنی
یہ چاندی کو کیسے چھپاؤ گی، ظالم؟
لگاؤ گی آنکھوں میں کاجل کا ناوک
محلے کے بچے ڈراؤ گی، ظالم؟
نکھارو گی رخسار غازہ لگا کر
کھنڈر کو دوبارہ بساؤ گی ظالم؟
بجا، مسکرا کر گئی ہے پڑوسن
مگر اب کچہری لگاؤ گی، ظالم؟
سنبھالوں گا بچے یا شاپر تمہارے
یہ بازار کب تک گھماؤ گی ظالم؟
یہ مانا کہ ہے عید کا دن خوشی کا
خوشی میں مگر کتنا کھاؤ گی، ظالم؟
بناؤ گی مجمع میں شوہر کا بھرتہ
"جہاں میں تماشہ بناؤ گی ظالم؟"

(محمد تابش صدیقی)

☆☆☆

اس کے ابا سے معافی کی گزارش نہیں کی
بھاگ جانے کی بھی ہرگز کوئی کوشش نہیں کی
اِس پہ اُس نے بھی مری کوئی سفارش نہیں کی
الغرض باپ نے اس کے، مری بخشش نہیں کی
دو کزن، چار عدد بھائی اور ابا اس کے
سب نے پیٹا ہمیں اور ہم نے بھی جنبش نہیں کی
پیار سے سب کو ہی کہہ دیتا ہوں "بچے!" اکثر
شکر ہے آپ کو یوں کہنے کی لغزش نہیں کی
مل گیا ہم سے بریک اپ کا بہانہ اس کو
ہم نے جب بارہ بجے سالگرہ وِش نہیں کی
چغلیاں کھاتی ہے تیری یہ نکلتی ہوئی توند
تو نے اے دوست، کئی سال سے ورزش نہیں کی
پٹ کے بیوی سے بھی گھر سے نہیں نکلے عاطف
"ہم نے بازار میں زخموں کی نمائش نہیں کی"

(عاطف ملک)

☆☆☆

فیس بک پر جو تمہارے لیے گلنار تھی، میں تھا
وہ جو الہڑ سی بقول آپ کے مٹیار تھی، میں تھا
وہ جو آمادۂ امداد تھے ہر وقت، وہ تم تھے
جس کو پیسوں کی ضرورت تھی جو نادار تھی، میں تھا
تم کو یہ دیکھ کے ممکن ہے پریشانی سی ہو
وہ جو معقول سے رشتے کی طلبگار تھی، میں تھا
کورٹ میرج کے فضائل جو بتاتے تھے، وہ تم تھے
گھر سے جو بھاگ کے جانے پہ تیار تھی، میں تھا
اپنی بیگم کے مظالم پہ جو نالاں تھے، وہ تم تھے
جو تسلی تجھے دیتی تھی جو غمخوار تھی، میں تھا

(ڈاکٹر عزیز فیصل)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

قطعات

گدھے کے ساتھ اک لیڈر کا فوٹو
ذرا دیکھو تو کیا بڑھیا چھپا ہے
یہ فوٹو دیکھ کر اک شخص بولا
نہ جانے کون سا ان میں گدھا ہے

☆☆

وہ حال ہے ہر ایک بشر کانپ رہا ہے
بیٹا بھی جھکائے ہوئے سر کانپ رہا ہے
شوہر بھی ہے نوکر کی طرح کونے میں دبکا
بیگم نے قدم رکھا تو گھر کانپ رہا ہے

(آثم پیرزادہ)

☆☆☆

وبا بھی چارسو پھیلی ہے میں بھی گھر پہ بیٹھا ہوں
پریشاں رہتی ہے بیگم میری ہر وقت بے چاری
خدا جانے اشارہ کس کی جانب کر کے کہتی ہے
''نجانے جان کب چھوڑے گی یہ منحوس بیماری''

(امجد علی راجا)

☆☆☆

دال کی ڈش بھی تجھے پیش نہیں کر سکتا
چانپ بکرے کی میسر ہے نہ اب مرغ کی ٹانگ
سبزی خوروں کی حکومت رہے جب تک قائم
''مجھ سے پہلی سی ضیافت مری محبوب نہ مانگ''

(احمد علوی)

☆☆☆

میری بیگم ہے 'جیلس' خواتین سے
پوچھتی ہے یہ مس فاخرہ کون ہے
آئی ڈی کارڈ میرا بنا تو کہا
اب بتاؤ مجھے نادرہ کون ہے

☆☆

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی
سنگ باری کے لیے شیطان کی جانب گیا
ایک کنکر پھینکنے پر یہ ندا اُس نے سُنی
تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

☆☆

جب بھی چاہیں مرغ کھا لیتے ہیں یہ دولتمند لوگ
دن کی پابندی نہیں منگل ہو یا اتوار ہو
ہاں مگر مفلس کو کب ہوتا ہے یہ کھانا نصیب
مرغ ہو بیمار یا وہ خود کبھی بیمار ہو

☆☆

ہم کو تو بڑھاپے نے کہیں کا بھی نہ چھوڑا
محرومئ جذبات کو بیٹھے ہیں چھپائے
خوش ہوتے ہیں ہم لوگ اگر کوئی حسینہ
اس عمر میں ہم پر کوئی تہمت ہی لگائے

☆☆

میں تنہا ہوں مجھے ایسے ملازم کی ضرورت ہے
کہ جو تنخواہ لے مجھ سے فقط دو وقت کا کھانا
وہ صبح شام دے گا حاضری دربار داتا پر
وہاں سے لائے گا کھانا اپن دونوں کا روزانہ

(ضیاءالحق قاسمی)

☆☆☆

بے وجہ اختلاف میں اسباب سے گئے
بٹنے کو دال تو ہے، مگر جوتیاں کہاں
ویسے تو باس نے کبھی گالی بکی نہیں
لیکن وہ جیسے کہتا تھا.. ابن فلاں،، کہاں

(قیوم طاہر)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کتاب کا عنوان بلاشبہ نیا نہیں کہ بحیثیت مسلمان ہم اللہ کے پیغامات بخوبی جانتے، سمجھتے اور پڑھتے ہیں مگر یہ عنوان اپنے آپ میں ایک چونکانے والے معنی رکھتا ہے۔ کتاب کے سرورق پر لکھی ایک سطر بہت حیران کن اور انوکھی ہے۔

”غلبۂ اسلام کو مستقبل سے کھینچ کر حال میں لانے کا لائحہ عمل“

جب میں نے یہ سطر پڑھی تو سوچا کہ آخر ایسا کیا ہے اس کتاب میں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کے لیے کتاب کے صفحات کھنگالنا ضروری تھا۔ پہلے نظر پڑی اس کی فہرست پر اور دل خوش ہو گیا ہر طرح کے موضوع کو یہاں دیکھ کر۔ وہ ہر سوال، وہ ہر بات، جو قاری کے ذہن میں اُبھر سکتی ہے۔ شاید کسی بھی موضوع کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب بہت ہوشیار ہیں۔ پیشے سے ڈاکٹر ہیں لیکن یہ حقیقت بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی، اس ذات پاک کے کلام کی مدد اور اللہ سے محبت و قلبی تعلق پیدا کیے بغیر کسی مریض کو شفایابی تک پہنچانا ممکن نہیں کیونکہ یہ اسی ذات پاک کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسے شفا دے اور کس کے وسیلے سے دے۔ ڈاکٹر صاحب نے اللہ سے، اس کے کلام پاک قرآن سے اور اس کے محبوب رسول ﷺ سے ایسا مضبوط تعلق جوڑ لیا کہ سائنس اپنی جگہ، طب اپنی جگہ اور روحانیت سے فیض اپنی جگہ قائم رہا۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ۱۵۰۰ سال بعد بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور ان شاءاللہ تاقیامت رہے گا۔ ارشاد ربانی ہے کہ ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب کرے۔ اگرچہ مشرک برا منائیں۔“ (الصف: ۰۹)

کتاب کا ایک باب بہت خوبصورت ہے بعنوان ”اسلام کا عروج قرآن سے وابستہ ہے۔“

یہی سچ ہے کہ اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ اور سب سے افضل ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

”اگر ہم اسلام کے پھیلاؤ کا جائزہ لیں تو آج اللہ کے فضل سے سب سے تیزی سے پھیلنے والا دین اسلام ہی ہے اور یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی اور طاقت ہے۔

”آج سے کئی سال پہلے ایک مفکر نے پیش گوئی کی تھی کہ ”بغیر کسی تلوار بغیر کسی بندوق اور بغیر کسی جنگ کے میں دیکھ رہا ہوں کہ محض چند دہائیوں میں مسلمان یورپ کی اکثریتی آبادی ہوں گے۔“ اس پیش گوئی کی بازگشت ابھی مکمل طور پر تھمی نہ تھی کہ فورم آن ریلیجن اینڈ پبلک لائف کی رپورٹ (The Future Of The Global Muslim Population) نے تہلکہ مچا دیا۔ جس میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور آئندہ بیس برس تک اس میں ۳۵ فیصد اضافہ متوقع ہے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اب اگر یہ سوچا جائے کہ غلبۂ اسلام کب کیسے ہوگا؟ تو اس سوال کے جواب میں یہ حکم ربّانی قرآن میں پہلے ہی موجود ہے: ''ہماری باتیں سارے عالم میں پھیل جائیں گی اور لوگوں کے دل ان کو قبول کریں گے اور وہ پکار اُٹھیں گے کہ قرآن ہی سچا ہے۔'' (حم سجدہ۔ ۵۳)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں واضح طور پر وہ راز بتا دیا ہے جس کے ذریعے دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ ہے صرف اور صرف قرآن پاک کی عظیم، سچی اور انقلابی تعلیم کو دنیا میں پھیلانا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب مسلمان قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو دنیا پر غالب آ جائیں گے۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ مثال موجود ہے۔

ملکہ وکٹوریا دنیا کے پانچویں حصے پر حکمراں تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اتالیق اور وزیر اعظم لارڈ میلبورن سے دریافت کیا۔ ''آپ نے تاریخِ عالم کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس میں آپ کو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا نظر آئی؟''

وزیرِ اعظم لارڈ میلبورن نے بلاتامل جواب دیا: ''اسلام کا عروج۔'' ملکہ وکٹوریا نے سوال کیا، ''آپ نے اس کے اسباب پر غور کیا؟''

لارڈ میلبورن نے کہا، میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ان کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں ہدایت کے لیے ایک کتاب (قرآن مجید) دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے ترقی کی تمام راہیں ان پر کھلی رہیں، پھر جیسے جیسے انھوں نے اس کتاب سے بے اعتنائی برتنا شروع کی ان کا زوال شروع ہوگیا۔'' پھر لحہ بھر کے توقف کے بعد وہ بولا ''اگر کسی زمانے میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مسلمانوں نے من حیث القوم پھر قرآن کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی قرآن کے مطابق بنالی، تو پھر ہم کیا ساری دنیا ان کے زیرِ سایہ آ جائے گی۔''

اس کے علاوہ جارج برنارڈ شاہ نے تقریباً اسی سال قبل پیش گوئی کی تھی کہ دنیا کا مستقل مذہب اسلام ہے۔ وہ اس کی توانائی ہے جو زندگی کے بدلتے ادوار کے تمام تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ غیر مسلم تک اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جب مسلمان قرآن پر عمل کریں گے تو وہ دنیا پر غالب آ جائیں گے مگر مسلمانوں کو اس بات کا احساس تک نہیں۔

آج وقت کی سب سے بڑی اور اہم ترین ضرورت مسلمانوں کا خواب غفلت سے جاگنا ہے۔ غیر مسلموں کے پاس کچھ نہیں وہ تہی داماں ہیں لیکن مسلمان اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کے پاس کامل دین اسلام ہے، کامل پیغمبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کامل کتاب قرآن ہے۔ مسلمان ہر طرح سے افضل ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں قرآن کو صرف مرنے والے کے ایصالِ ثواب کے لیے، اپنی دنیاوی مشکلات کم یا ختم کرنے کے لیے اس کی آیتوں کو بطور تعویذ اور محض حساب کتاب کا کلام سمجھ لیا ہے، کہ بس ثواب ملے، پہنچایا جائے، گلے میں لٹکایا جائے، مگر...... اس میں اللہ نے کیا فرمایا ہے؟ کیوں فرمایا ہے؟ کس لیے فرمایا ہے؟ اور کس کے لیے فرمایا ہے؟ اس پر کسی کا دھیان نہیں۔ جس دن ہم نے اس کے پیغامات کو سمجھنا اور ان تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دی، اس دن مسلمان غیر مسلم کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔

یہ کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ یہی نہیں، ایسی ہر کتاب، جو ہمیں قرآن سے محبت کرنا سکھلائے اور جو ہمارے دین اسلام کو آسانی سے سمجھنے میں ہماری مدد کر سکے۔ یہ خوبصورت کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ اسے ڈاکٹر صاحب سے براہِ راست اس نمبر پر رابطہ کر کے منگوایا جا سکتا ہے۔ 03335242146

☆☆☆

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

چمنِ خیال

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اُردو ڈائجسٹ کا شمارۂ جون موصول ہوا۔ حسبِ سابق سرورق نے دل موہ لیا۔ سفاک سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ بے بس اور مظلوم شخص کی گردن پر گھٹنا رکھے اُسے زندگی سے محروم کر رہا ہے۔ سرورق نہایت حسبِ حال ہے۔

پی کے 713 کا سفر، عنوان سے پہلا تاثر یہ تھا کہ شاید کراچی طیارہ حادثہ پر کوئی تحریر ہے لیکن یہ تو ان دنوں کی داستان ہے جب پی آئی اے واقعی باکمال اور لاجواب تھی۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب نے پڑھنے والوں کو اپنا ہم سفر بنالیا۔ عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہوتی سپر پاور ایک عمدہ تجزیہ ہے۔ حقیقت میں ابھی تک اس موضوع پر اُردو کے جرائد میں ایسا تفصیلی مضمون شائع نہیں ہوا۔ امریکی فوج کے اندرونی ڈھانچے اور جدید اسلحے کی کہانی اس سپر پاور کے زوال کو جلد ممکن بنا دے گی۔

سید عاصم محمود صاحب اپنے تحقیقی مضامین سے ہمیشہ پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ بل گیٹس پر لکھا گیا مضمون اس کے کھرب پتی کے چہرے سے انسانیت دوستی کا غازہ اُتار کر اندر سے مکروہ چہرہ دکھاتا ہے اور یہ بات بل گیٹس کے ساتھ خاص نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندے اپنی دولت بچانے کی خاطر ہمیشہ سے ایسے کرتے آئے ہیں کہ اب انھوں نے قانونی طریقے اپنا لیے ہیں۔ بہرحال یہ ایک معلوماتی اور انکشافات سے بھرپور مضمون ہے جس کے کچھ مندرجات سے اختلافات کیا جاسکتا ہے لیکن عمومی تاثر وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔

ڈائجسٹ کے دیگر سلسلے، افسانے، کہانیاں، معلومات اپنی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ کوارنٹین وبا کے دنوں میں سرکاری اسپتالوں میں قائم کوارنٹین سینٹروں کی جو تصویر کشی کرتا ہے آج بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خالد اختر کی طرف سے طنزیہ خطوط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ اولڈ ہومز میں زندگی کے دن کاٹتے ہمارے بزرگ واقعی کس بات کی سزا کاٹ رہے؟ ضمیر جھنجھوڑ دینے والی تحریر ہے۔

(ڈاکٹر سید بلال مسعود، اسلام آباد)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ 10 سال سے زائد عرصہ سے پڑھ رہا

ہوں۔ سالانہ خریدار بھی ہوں۔ اس مرتبہ جون کے شمارے میں بل گیٹس کے خلاف سید عاصم محمود کا مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کہ ادارہ اب مقبول و معروف اور انسانیت کی فلاح کے لیے سرگرم شخص کے بارے میں اس طرح کے بے وزن اور سازشی نظریات پھیلا رہا ہے۔ خدا کا خوف کریں۔ خود اسلامی ممالک سے تو ریسرچ ہوتی نہیں اور چلے ہیں ترقی یافتہ لوگوں پر تنقید کرنے۔ بل گیٹس نے وہی کیا جو ایک سرمایہ دار کاروباری شخصیت کرتی ہے۔ کوئی بھی کاروباری اپنی دولت کو پانی کی طرح بہانے سے پہلے سوچتا ہے اور درست جگہ سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اشرافیہ سے تعلقات بناتا اور اپنی دولت کا ایک حصہ ہی فلاح و بہبود کے لیے مختص کرتا ہے۔ باقی سرمایہ کاروبار میں لگاتا ہے۔ کیا بُرا ہے اس طرح کرنے میں؟

حیرت ہے کہ بل گیٹس کے بچپن کے ایک واقعہ سے جس میں گیٹس اسکول میں ایک ویڈیو گیم کا ٹائم بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، فاضل مصنف نے یہ اخذ کیا کہ بل گیٹس دھوکے باز تھا۔ بچے تو گیم کھیلتے ایسا کرتے ہیں تبھی تو وہ بچے کہلاتے ہیں اور اگر کوئی بھی دن رات محنت کر کے اہم سافٹ ویئر بناتا ہے تو اسے پیٹنٹ کرواتا ہے۔ گیٹس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ شاید اگر میں آئی ٹی کی اہم سرمایہ دار شخصیت ہوتا اور کروڑوں روپے اسکولوں میں کمپیوٹر فنڈ دوں تو اگر ان میں میرا ہی تیار کردہ مستند سافٹ ویئر، جو مارکیٹ میں موجود سافٹ ویئر سے بہتر ہے، انسٹال ہو تو کیا خرابی ہے؟

اسی طرح اور بھی کئی جگہ مضمون میں خامیاں ہیں۔ عرض ہے کہ اس طرح کے مضامین سنجیدہ، سائنٹیفک اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں میں رد کر دیے جاتے ہیں۔ براہِ کرم اس طرح کے سازشی نظریات پر مبنی بے بنیاد مضامین مت شائع کریں۔ اُردو ڈائجسٹ کا ایک معیار ہے۔ کم نہ ہونے پائے۔ شکریہ۔

(شاہد قیاس)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ کی یہ روایت ہے کہ اس نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔ چاہے کوئی بڑی شخصیت ہو، مشہور و معروف ہو یا بااثر۔ جہاں اس نے دوسروں کے اچھے اقدامات اور کامیابیوں کو سراہا، وہیں اس نے ایسی شخصیات کے پول کھولنے میں بھی دیر نہ لگائی جن کے مثبت اقدامات کو کبھی اس نے سراہا بھی تھا۔ گویا اُردو ڈائجسٹ کا کردار اس ماں جیسا ہے جو اچھے کاموں پر اپنے بچوں کی پیٹھ تھپتھپاتی تو غلط کام پر سرزنش بھی کرتی ہے۔

اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جب بل گیٹس کی شخصیت کے مثبت اور اچھے پہلو دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس جریدے نے بل گیٹس اور اس کی بیوی ملینڈا گیٹس کی اچھائیوں اور کامیابیوں کو دل کھول کر سراہا۔

جولائی ۲۰۱۹ میں سرورق ان کی تصویر سے سجایا اور اُمید کی کہ یہ کامیاب جوڑا اسی طرح فلاحی خدمات انجام دیتا رہے گا مگر جب...... انکشاف ہوتا ہے کہ اسی شخصیت کے کچھ نئے مخفی روپ بھی اب دنیا کے سامنے آنے لگے، جن کے بارے میں دنیا نہیں جانتی، تو اس میگزین نے ایک بار پھر سچ لوگوں تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا اور بل گیٹس کے منفی پہلو سامنے آنے پر ان کا بھی انکشاف کیا۔ اس بات سے ہچکچائے بغیر، کہ یہی جریدہ ان میاں بیوی کی مدح سرائی بھی کر چکا۔ یہی تو خوبی ہے اس ڈائجسٹ کی، کہ چاہے پھر وہ گاندھی ہو یا گیٹس، مشہور شخصیات کے کامیاب چہروں نے جب جب اپنے روپ بدلے اور منفی اثرات سامنے آئے، تب تب اُردو ڈائجسٹ نے ڈنکے کی چوٹ پر سچ لکھا۔ (ندیم انجم، لاہور)

☆☆☆

شمارہ اپریل اور مئی ۲۰۲۰

(لاک ڈاؤن کی وجہ سے ڈاک کی ترسیل بند رہی، لہٰذا کچھ خطوط ہمیں شمارہ اپریل اور مئی سے متعلق دیر سے موصول ہوئے۔ ادارہ)

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

☆☆

شمارہ جون کے ساتھ اس بار اپریل اور مئی کا اُردو ڈائجسٹ بھی ملنے پر اتنی زیادہ مسرت ہوئی کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ جب ڈاک بابو کے انتظار میں آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اچانک میری پوتی ابیہہ پھولی سانسوں ہاتھوں میں یہ کہتے ہوئے، لو دادا جی آپ کی اُردو کی دو ڈائریاں (ڈائجسٹ) آئی ہیں۔ یعنی جیسے عید پر مفتی منیب الرحمان کے چاند نظر آنے کے ساتھ مفتی پوپلزئی صاحب کا چاند بھی آن نکلا ہو۔ ادھر ابھی دونوں چاند دیکھنے کے لیے نکالے ہی تھے کہ احمد مجتبیٰ اپنی ماں کی کپڑوں والی ٹوکری گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ پھرتی سے ایک شمارہ جس پر عمران خان کی تصویر تھی، اپنے ٹوکرے میں ڈال کر بھاگ نکلے۔

جو شمارہ ہمارے ہاتھ لگا اس کی ورق گردانی شروع کر دی اور شام تک پڑھ کر ہی دم لیا۔ شام کو احمد مجتبیٰ کو پیار کیا تو وہ اپنی ٹوکری سے 'لے لو' کہتے ہوئے میری طرف اپنے ننھے منے ہاتھوں میں ڈائجسٹ تھامے کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے ورق گردانی کر لی اور اب مجھے پڑھنے کی اجازت دے رہا ہو۔

رات دیر تک اس شمارے میں شائع ہونے والا ہر مظمون بھی ٹڈی دل کی طرح چٹ کر لیا۔ یوں لگا کہ اُردو کی کھٹی میٹھی چٹنی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کی سمارٹنس یعنی انتہائی بانکا سجیلا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ لگتا ہے مہنگائی کے ہاتھوں مجبوراً آپ نے اس کو کم خوراکی تک محدود کر دیا ہے۔ برنی سینڈرز کو پہلے تو اپنا ہی کوئی برنی سمجھا بعد ازاں پتا لگا پاکستان کا نہیں پولینڈ کا برنی ہے۔ اس کی ہمت، خلوصِ نیت اور سچی لگن نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سانچ کو آنچ نہیں، کے مصداق اور محنت میں عظمت عزم ولولہ ہو تو انسان کیا نہیں کر سکتا؟

میرا خیال ہے کہ ابھی برنی کو جو بائیڈن کو آگے لانا چاہیے۔ سیاسی اکھاڑے میں مسٹر ٹرمپ کا زور چلتا دکھائی نہیں دیتا اور ریاست متحدہ امریکا کی موجودہ صورت حال بھی خاصی پریشان کن ہے۔ ایسی صورت میں امریکا میں پاکستانیوں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ نہ جانے کب تک دنیا جھلستی سلگتی رہے گی؟ آخر کب تک؟ (شیخ نذیر احمد، اسلام آباد)

☆☆☆

میں نے جب کچھ کمانا شروع کیا تو تعلیمی قرضوں سے نجات کے بعد، تسکین ذوق کی خاطر اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بن گیا۔ اُردو ڈائجسٹ سے میری دل لگی اس وقت ہوئی جب میرے ہائی اسکول کے استاد نے مجھے اس کا ایک شمارہ پڑھنے کو دیا۔ میں بچپن سے ہی نونہال اور تعلیم و تربیت کا دلدادہ تھا۔ اُردو ڈائجسٹ مجھے بہت ہی پسند آیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی حیثیت اُردو قاری کے لیے وہی ہے جو ریڈرز کی انگریزی پڑھنے والوں کے لیے ہے۔ اس بار کرونا کی وبا اور لاک ڈاؤن کے باعث ماہِ اپریل کا شمارہ کچھ دیر سے ملا، مگر میرا یہ دوست جب ملا تو بہت ہی خوشی ہوئی۔ سرورق سبز رنگ کو نمایاں کرتا وزیراعظم کی تصویر لیے بھلا لگا۔

ہندو مسلم فسادات پر نظر اور دوقومی نظریہ کو تقویت دیتی تحریریں قاری کو ماضی سے روشناس کراتی ہیں۔ صالحہ محبوب کی معاشرتی کہانی 'حق حقدار کو ملا' بہت سبق آموز اور معاشرتی برائیوں پر ضرب کاری ہے۔ نعمت اللہ خان کی داستان حیات ہمیں اپنے سورماؤں سے ملاتی ہے۔ اور ایک پیغام ہے کہ اپنے حصے کی شمع جلاتے جائیں۔

خوبصورت پرندے ہدہد پر مضمون بہت اچھا تھا۔ صاحبزادہ شیر زمان نے شاعری پر جو اشعار کا بہترین گلدستہ حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا، کیا کہنے۔ ہیروں کا محافظ بھی بہترین کہانی تھی اور پھر تہذیب و تمدن کی اہمیت اُجاگر کرتی خرم سہیل کی تحریر 'ڈراما ریٹنگ کی دلدل میں' بہت ہی زبردست تھی۔ المختصر مزہ آ گیا۔ آپ کو ٹوئٹر پر فالو کیا۔ اللہ کرے یہ سلسلہ جاری رہے اور اللہ اس میں مزید برکت دے۔ (محمد نوید شاکر، راولپنڈی)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

عیدِ قرباں اور باورچی خانہ

جینا جہانگیر

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

عید الاضحیٰ کو اگر پکوانوں کا دن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس عید پر قربانی کرنے کی وجہ سے تقریباً ہر گھر کے افراد مختلف طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس بار لاک ڈاؤن اور کورونا کی صورتحال نے عید الفطر کو بھی پھیکا سا کر دیا۔ یہ اور بات کہ کچھ طبقات میں کورونا اور لاک ڈاؤن کا اثر نہ ہوا اور ان گھروں میں تمام جشن و روایات ہمیشہ کی طرح منائی گئیں جو بہرحال ساجیات کے موجودہ تقاضوں کے برخلاف اقدام تھا۔ یہ وبا ایسی ہے جس میں ہماری بیماری اور لاپروائی، دوسروں کی زندگی اور موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے احتیاط بے حد لازم ہے۔ اب رہی بات عید قرباں کی رونقوں کی، تو ہر تہوار اپنی بھرپور خوبصورتی کے ساتھ، مذہبی عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر منایا جا سکتا ہے۔ مختلف کھانے بھی پکائے جا سکتے ہیں مگر کیا آپ اس عید پر ایسا پکوان کھانا اور پکانا پسند کریں گے جو حضرت محمد ﷺ کا پسندیدہ ترین پکوان تھا؟

اپنے باورچی خانے میں سادگی سے گوشت کی ایک ڈش بنانے کے لیے بہترین اور لذیذ کھانے کا نام ثرید ہی ہو سکتا ہے۔ اس بار عید پر اسے گھر پر بنائیں اور نئی طرح کے جذبے سے گندھی عید منائیں۔ اس پکوان کو عام طور پر شوربے میں روٹی بھگو کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کئی احادیث بھی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا محبوب ترین کھانا روٹی کا ثرید تھا۔ (ابوداؤد شریف) اسی طر
صحیح بخاری میں ہے کہ عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت تمام عورتو
پر ایسے ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔

مختلف غذائی ماہرین کے مطابق یہ پکوان گوشت کی ڈش
ہونے کے باوجود جلد ہضم ہو جاتا ہے اس لیے یہ نظام ہاضم
کے لیے بھی بہترین ہے۔ جبکہ اس کے دیگر فوائد بھی ہیں۔

ثرید کے لیے درکار اجزاء:

600 گرام بغیر ہڈی بھیڑ یا گائے کا گوشت۔ چھو
بوٹیاں کر لیں۔

لوکی کا آدھا حصہ کاٹ لیں۔ زیتون کا تیل، 2 کھا
کے چمچ، پیاز ایک عدد
لہسن کی 4 پوتھیاں
ادرک حسب ذائقہ
کاٹ لیں یا پیس لیں

لاک ڈاؤن ہے تو سادگی سے بھی مثالی پکوان بنائے جا سکتے ہیں

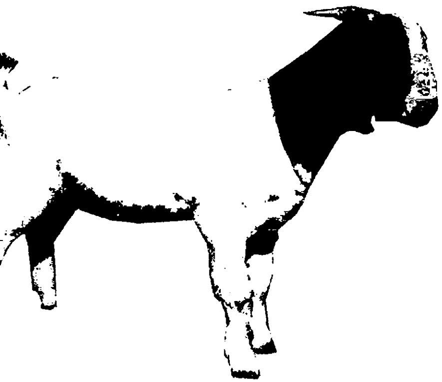

ٹماٹر کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ، ٹماٹر ایک عدد، نمک اور کالی مرچ حسب ذائقہ 1/4 چائے کا چمچ، ہلدی 1/4 چائے کا چمچ، سرخ مرچ پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، گرم مسالا پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، دھنیا پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، زیرہ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ دہی، ایک لیٹر ابلا ہوا پانی۔

پکانے کا طریقہ:

زیتون کا تیل برتن میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیں اور پھر اس میں پیاز، لہسن اور ادرک کا اضافہ کریں۔ انھیں اس وقت تک تلیں جب تک ہلکے سے سنہری رنگ کے نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد اس میں مسالے ڈال کر اس آمیزے کو ایک منٹ تک پکائیں۔

اس پر ٹماٹر کا پیسٹ اور کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال دیں جبکہ حسب ذائقہ نمک اور معمولی سا پانی بھی شامل کر لیں۔ اس آمیزے کو اس وقت تک پکائیں جب تک ٹماٹر پیسٹ کی شکل اختیار نہ کر لیں اور تیل آمیزے سے الگ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد گوشت کا اضافہ کریں اور چولہے کی آنچ بڑھا دیں، جبکہ آمیزہ چمچ سے ہلاتے رہیں۔

اس کے بعد ابلے ہوئے پانی کا اضافہ کر کے اسے ابلنے کے لیے رکھ دیں، جب یہ اُبل جائے تو آنچ ہلکی کر کے برتن ڈھانپ اور گوشت اس وقت تک پکائیں جب تک وہ گل نہ جائے۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں دہی اور لوکی ڈال کر مزید پندرہ منٹ تک پکائیں۔

جب سالن پک جائے تو چولہا بند کر کے دھنیا پودینا سے سجائیں۔ ثرید تیار ہے۔ ایک گرم روٹی کے ٹکڑے کریں اور پلیٹ میں رکھ دیں۔ اب اس کے اُوپر ثرید ڈالیں اور گرم گرم ہی پیش کریں۔

☆☆☆

عیدالاضحیٰ کے موقع پر گوشت کے دیگر پکوان دسترخوان کی شان بنتے ہیں۔ خواتین عیدالاضحیٰ پر پکوان بنانے مصروف رہتی ہیں اور گھر والوں کی تواضع کے ساتھ مہمانوں آمد کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ چاہے قربانی گائے کی بکرے کی، دنبے کی ہو یا اُونٹ کی، عیدالاضحیٰ پر کھانوں پہلا پکوان کلیجی ہی ہوتی ہے جسے سب شوق سے کھاتے ہیں کلیجی کے بعد دوسرا نام بریانی کا ہے کیونکہ دن میں ر کھانے کے بعد لوگ شام میں چاول جیسے یخنی پلاؤ یا مسا والی بریانی کھانا پسند کرتے ہیں۔ گھر میں قربانی ہو اور نئے پکوان نہ بنیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ عیدالاضحیٰ پر پکا جانے والے چند نہایت آسان اور لذیذ کھانے یہ ہیں۔

کلیجی:

کلیجی بنانے کے بہت سارے طریقے ہیں۔ ہر گھر کے پکانے کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ کلیجی مختلف تراکیب پکائی جاتی ہے مثلاً بُھنی ہوئی، شوربے والی، توا کلیجی، کھٹی کل شاہی کلیجی، مغلیائی اور دیگر لیکن سب سے زیادہ رجحان ہوئی کلیجی کا ہی ہے۔

بکرے کے گوشت کے پکوان:

مہنگائی کی وجہ سے بکرے کا گوشت عام طور پر کم جاتا ہے لیکن عیدالاضحیٰ کے موقع پر بکرے کے گوشت

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پکوان بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں جن میں بکرے کی چانپ، بریانی اور پلاؤ، قورمہ، ران روسٹ اور سجّی وغیرہ شامل ہیں۔

سب سے سادہ اور آسان روسٹ بنانے کے لیے دہی میں ادرک کا پیسٹ، نمک، لال مرچ حسب ذائقہ ڈالیں اور اُبلے ہوئے نیم گلے مٹن کی بوٹیاں اس آمیزے میں ڈبو دیں اور تقریباً آٹھ گھنٹے بعد گرم گھی میں ہلکی آنچ پر پکالیں۔ پانی نہ ڈالیں کیونکہ دہی اور گوشت کا اپنا کافی پانی نکلتا ہے۔ اسی میں گوشت گل جائے گا اور انتہائی آسان مگر بے تحاشا لذیذ مٹن روسٹ تیار ہو جائے گا۔ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

گائے کے گوشت کے پکوان:

گائے کی قربانی سب سے زیادہ عام ہے۔ کئی افراد گائے کی قربانی میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ گائے کے بے شمار پکوان عام طور پر گھروں میں پکائے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ عید کے موقع پر کچھ خاص پکوان جیسے اسٹو، پسندے، شامی کباب، تکّہ بوٹی، نہاری، کٹاکٹ، پائے، کوفتے، سیخ کباب وغیرہ۔

گائے کا گوشت اگر پہلے ہی ادھ نیم گلا کر فریج میں رکھ لیا جائے تو مہمانوں کے آنے پر، کھانا فوری طور پر مرغ کے تیار ہونے جتنے وقت میں پک جاتا ہے۔

دنبہ کے گوشت کے پکوان:

دنبے کی قربانی کراچی اور دیگر شہروں میں کم ہی دکھائی دیتی ہے حالانکہ دنبے کے گوشت میں وٹامن ڈی اور پروٹین وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ دنبے کا گوشت غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے گوشت کے پکوان جن میں روسٹڈ لامب، اسپائسی لامب لیگ، عربی لامب اسٹیو وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا گوشت چونکہ تھوڑا سا ہمک والا ہوتا ہے۔ ایک خاص مہک جسے کچھ لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اسے دُور کرنے کے لیے دنبے کا گوشت کیسا بھی پکائیں، تھوڑی سی سوکھی میتھی ڈال دیں۔ اس سے دنبے کے گوشت کی خاص ناگوار مہک ختم ہو جاتی ہے۔

اونٹ کے گوشت کے پکوان:

آج کل اُونٹ کی قربانی عام ہوتی جارہی ہے۔ پہلے کسی کسی محلے میں اُونٹ کی قربانی کا شور وغوغا اٹھتا تھا مگر اب تو ہر محلہ میں تقریباً ایک یا دو اُونٹ تو ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اُونٹ کا گوشت بازاروں میں بہت کم ہی ملتا ہے لیکن عید قرباں کے خاص موقع پر لوگوں کو اُونٹ کا گوشت میسر آہی جاتا ہے۔ اس کا گوشت چونکہ نمکین ہوتا ہے اس لیے ہائی بلڈ پریشر جیسے امراض میں مبتلا افراد کو اُونٹ کے گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے نیز اسے پکاتے وقت اس میں نمک نہیں ڈالنا چاہیے۔ اُونٹ کا گوشت پکانے کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے اور عام طور پر لوگوں کو اس سے واقفیت نہیں ہوتی کیونکہ عام دنوں میں اُونٹ کا گوشت بہت ہی کم پکایا جاتا ہے۔ ذائقے کے اعتبار سے یہ بہت لذیذ ہوتا ہے لیکن اسے پکانے کے لیے خاص مہارت چاہیے۔

بار بی کیو:

اس دفعہ شاید بار بی کیو کی وہ بہاریں اور رونقیں نہ ہوں، مگر چھوٹے محدود پیمانے پر گھروں کی چھتوں پر آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل کر اس کا مزہ لے سکتے ہیں۔ عید کے دنوں گھروں میں تکے بنانے کا رواج بہت پرانا ہے اور اس کی تیاری میں خواتین سے زیادہ گھر کے مرد حضرات اور بچے حصہ لیتے ہیں۔ رات کو گھر کی چھتوں پر یا صحن میں بیٹھ کر تکے بوٹی کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ بار بی کیو میں تکہ بوٹی، ملائی بوٹی، افغانی کباب، بہاری تکہ بوٹی اور کشمیری سیخ کباب شامل ہیں۔ عید منائیں، مزیدار کھانے بھی پکائیں لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نا جانے دیں اور غریبوں کو نہ بھولیں۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

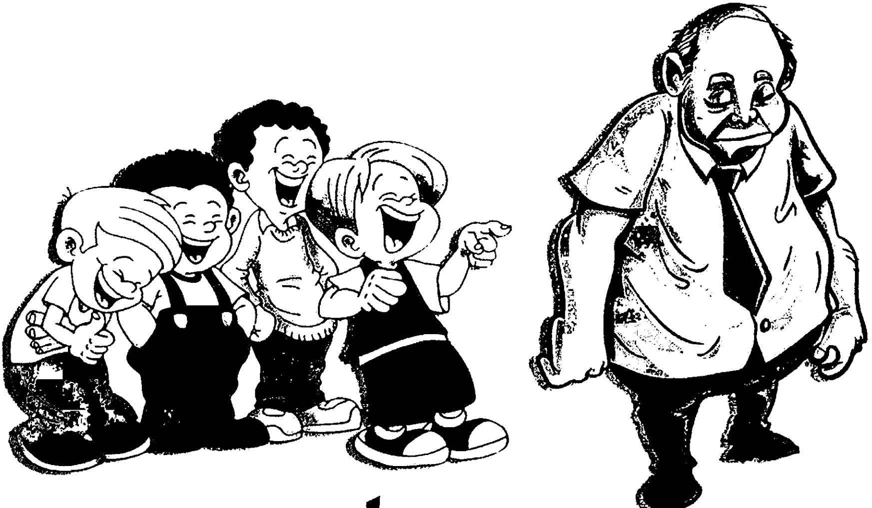

مایوسی کا علاج ہنسی!

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ایک دن سید انشاء اللہ خان انشاء نواب صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ گرمی کی وجہ سے دستار سر سے اُتار کر رکھ لی۔ انشاء کا منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب صاحب کو شرارت سوجھی اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ٹھونگ ماری۔ جس پر انشاء نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ! بچپن میں بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ جو لوگ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں شیطان ان کے ٹھونگیں مارتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بات سچ تھی۔

☆☆☆

ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔

ایک نے کہا، عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے، اگر آپ ان کے پانچ شعر سنا دیں تو میں آپ کو پانچ سو روپے دوں گا۔

دوسرے شخص نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیے۔ پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''اپنا تعارف تو کروایئے۔''

شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا، ''میں ہی عبدالعزیز خالد ہوں۔''

☆☆☆

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ''آئی سی ایس'' میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کے والد کمرے میں بے تکلفانہ چلے آئے۔ ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے

انھیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کروایا: ''یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں۔''

والد محترم کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں ان کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں۔''

☆☆☆

ایک ڈراما نگار کا ڈراما اسٹیج ہوا تو اس نے جارج برنارڈ شا کو بھی ڈراما دیکھنے کی دعوت دی۔ ڈرامے کے دوران سارا وقت برنارڈ شا سوئے رہے۔ جب ڈراما ختم ہوا تو ڈراما نگار نے خفگی سے کہا:

''میں ڈرامے کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی تھا مگر آپ سارا وقت سوئے رہے۔''

برنارڈ شا نے بڑے سکون سے جواب دیا، ''سونا بھی تو ایک طرح کی رائے ہی ہے۔''

☆☆☆

پطرس بخاری کے کسی عزیز کا نکاح تھا۔ اس کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک شخص ڈھونڈ کر لایا گیا جو بہت دبلا پتلا تھا۔ پطرس صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے، ''نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نکاح خواں اور چھوہارے کی۔ ماشاء اللہ ان میں دونوں صفات موجود ہیں۔''

☆☆☆

اسرار الحق مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب جوان کے روشناس نہیں تھے، ان کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر انھوں نے اپنی کن سری آواز میں گنگنانا شروع کیا۔

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔''

☆☆☆

جرأت نابینا تھے۔ ایک روز بیٹھے فکر سخن کر رہے تھے کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ آ گئے۔ انھیں محو پایا تو پوچھا، ''حضرت کس سوچ میں ہیں؟''

جرأت نے کہا، ''کچھ نہیں، بس ایک مصرعہ ہوا ہے۔ شعر مکمل کرنے کی فکر میں ہوں۔'' انشاؔ نے عرض کیا، ''کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔''

جرأت نے کہا، ''نہیں! تم گرہ لگا کر مصرعہ مجھ سے چھین لو گے۔'' آخر بڑے اصرار کے بعد جرأت نے بتایا۔ مصرعہ تھا۔

''اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی''

انشاؔ نے فوراً گرہ لگائی: ''اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔''

جرأت لاٹھی اُٹھا کر انشاؔ کی طرف لپکے۔ دیر تک انشا آگے اور جرأت پیچھے پیچھے انھیں ٹٹولتے ہوئے بھاگتے رہے۔

☆☆☆

اکبر الٰہ آبادی دلی میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں مہمان تھے۔ سب لوگ کھانا کھانے لگے تو آلو کی ترکاری اکبر کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی دختر حور بانو سے (ج کھانا کھلا رہی تھی) پوچھا کہ بڑے اچھے آلو ہیں۔ کہاں سے آئے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے خالو بازار سے لا ہیں۔ اس پر اکبرؔ نے فی البدیہہ شعر پڑھا۔

لائے ہیں ڈھونڈ کے بازار سے آلو اچھے
اس میں کچھ شک نہیں ہیں حور کے خالو اچھے

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

5. The bidders shall submit the bid in two parts. The first part shall be for specification, called the **"Technical Proposal"**, the second one for the cost, called the **"Financial Proposal"**. These bids should be sealed in envelop and **must** be submitted separately.
6. The technical bid will be opened first and evaluated. If the specification of bid meet the requirement of bid documents, then bid will be qualified for opening Financial Proposal, otherwise the same shall be returned unopened.
7. the bidders shall specify the name of product, name of manufacturer, country of origin, detailed specifications & compatibility, warranty details and in case of participating the bid as contracting firm, name of registered supplied/Distributor shall be specified.
8. The bidder shall include all taxes and duties in the bid price.
9. Procurements shall be governed under the Punjab Procurement Rules 2014.
10. If any further information required regarding the tender please visit the office of the undersigned during working hours.

IPL - 5309

Deputy Director (FFP)

WASA, Faisalabad

03409995455

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اُردو کے پروفیسر گھر آئے تو بیوی سے پوچھا:

"بیگم آج کیا پکایا ہے۔ مہنگائی کے ہاتھوں پریشان عورت نے جواب دیا۔

"خاک پکائی ہے۔"

پروفیسر صاحب بولے: "خاک کو الٹ کریں تو کاخ بنتا ہے۔ کاخ فارسی میں محل کو کہتے ہیں۔ محل کو الٹا کریں تو لحم بنتا ہے۔ لحم کو اردو میں گوشت کہتے ہیں۔ اچھا بیگم آج گوشت پکایا ہے۔"

☆☆☆

ناصر کاظمی اور حبیب جالب بے تکلف دوست تھے۔ جالب نے کاظمی سے کہا:

"آپ کی غزلیات سن کر میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش مجھ میں بھی ایسی غزل لکھنے کی استعداد ہوتی۔ جب میں آپ کا کوئی کلام دیکھتا ہوں میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس پر میرا نام لکھا ہو۔"

کاظمی نے جالب کی اس تعریف کا شکریہ ادا کیا۔ جالب نے کاظمی سے پوچھا:

"میری غزل دیکھ کر آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔"

ناصر نے جواب دیا: "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ کی غزل یا نظم آپ کے نام سے ہی چھپی۔ غلطی سے میرا نام نہیں چھپ گیا۔"

WATER & SANITATION AGENCY
OFFICE OF THE PROJECT DIRECTOR (FF)
P.O. BOX NO. 229, FAISALABAD
Phone: +92-41-24314194
Email: pmuwasafsd@yahoo.com

TENDER NOTICE

Sealed bids are invited from manufacturer/registered dealers and Distributors of manufacturer **(for specified products as requirement of bid)** or contractors who have deposited their enlistment/renewal fee for the financial year 2020-21 in WASA Faisalabad/HUD&PHED Lahore and having experience in this specific field.

Sr. No.	Name of Work	TS No. & Date	Estimate cost in Rupees (PKR)	Earnest Money (PKR)	Tender Fee. (PKR)	Time Limit
1.	Supply and Installation of Online Turbidity (NTU) & potential hydrogen (P_H) Analyzers Sensors for Water Treatment Plant (10MGD)	339/D(FP)/ WASA Dated 12/06/2020	2,526,940/-	2% of estimate cost	1500/-	04 Months

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

TERMS & CONDITIONS:

1. Tender Documents can be obtained from the office of Deputy Director French Funded Project, WASA near Novelty Bridge Sammundri Road, Faisalabad immediately after advertisement of tender notice through newspapers and uploading the notice on PPRA website with 2% (two percent) earnest money of the estimated cost in shape of (CDR) deposit-at-call from any scheduled Bank. The bids will be opened in Committee Room French Funded Project near Novelty Bridge Summundri road, Faisalabad. Bids receiving time 11:00 AM & opening time of bids 11:30 AM on 13.07.2020.
2. Earnest money must be accomplished with the tender which should be valid for at least Sixty (60) calendar days after the date specified for opening of the bids otherwise it will not be entertained.
3. Tenders shall be opened in the presence of interested bidders or their representatives who may care to be present.
4. Procedure of open competitive bidding = Single Stage two Envelop System.

ROSHAN
Packages Limited.

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہم اپنے کسان بھائیوں کا خیال رکھتے ہیں

پاکستانی آم اپنے منفرد ذائقے اور خوشبو کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے مگر بدقسمتی سے ناقص پیکیجنگ کی وجہ سے گاہک تک بہترین حالت میں نہیں پہنچ پاتا۔ جس کی وجہ سے 30 سے 40 فیصد پھل ضائع ہو جاتا ہے۔ اپنے پھلوں کی محفوظ ترسیل کے لیے روشن پیکیجز کے عمدہ اور مضبوط ڈبے کا انتخاب کریں اور ڈھیروں منافع کمائیں۔

www.roshanpackages.com.pk info@roshanpackages.com.pk

RoshanPackages.LTD Roshan Packages Limited +92 42 32300010

HEAD OFFICE: 325 G-III, M.A JOHAR TOWN, LAHORE - PAKISTAN

غذائی جادو

سادہ غذا نہ صرف دسترس میں ہے، یہ زندگی کو بہتر اور صحت مند بنانے کا نادر کلیہ ہے

رضوان اللہ

ہر شخص کے معاملاتِ زندگی ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں ان لگے بندھے معمولات سے آدمی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنے کام کے دوران وقفہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کو جلد تھکن کا احساس نہیں ہوگا۔

ماحول انسان کے مزاج پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ گھر یا دفتر کا ماحول اگر خوشگوار نہیں تو آپ کے مزاج پر اس کا لازمی اثر پڑے گا۔ کوشش کر کے ماحول خوشگوار بنائے رکھیں یا آپ اس ماحول میں خود کو ڈھال لیں۔ جب آپ دیکھیں کہ واقعی کوئی چیز برداشت سے باہر ہے تو آپ ایسا ماحول یا جگہ تلاش کریں جہاں آپ خود کو آرام دہ اور پُرسکون محسوس کریں۔ آپ میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ متعلقہ لوگوں سے کس طرح نمٹنا یا برتاؤ کرنا ہے۔ ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھیں کہ آپ کا کام بھی متاثر نہ ہو اور دوسرا فرد بھی آپ کے متعلق منفی رائے قائم نہ کرے۔ اسی طرح گھر کا ماحول بھی خوشگوار رکھیں۔

مثبت سوچ

صحت مند رہنے کے لیے اپنے رہن سہن کے طریقوں میں مثبت تبدیلی لائیے۔اس سے آپ کے اندر ایک طمانیت کا خوشگوار احساس جنم لے گا۔

ماہرین صحت کہتے ہیں کہ مثبت سوچ کے حامل لوگ کم تھکتے ہیں۔ وہ زیادہ فعال، سرگرم اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اردگرد لوگوں کی منفی باتوں پر دھیان نہیں دیتے بلکہ اچھے پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان سے بات چیت کرتے ہیں۔

یہ لوگ سمجھوتہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

غذا کا انتخاب

اچھی صحت برقرار رکھنے سے مدافعت اور امراض کے علاج کے لیے غذا نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہرین غذائیت سر رابرٹ میکریسن کے الفاظ ہیں:

''صحیح قسم کی خوراک، افزائش صحت کے لیے نہایت اہم، واحد عامل اور غلط خوراک افزائش مرض کے لیے نہایت اہم واحد عامل ہے۔''

متوازن اور صحیح خوراک غذائی مجموعہ (Combination Diet) سے بن سکتی ہے۔جس میں غذائی عناصر (Essential Nutrients) موجود ہیں۔

سادگی اپنائیے، تازہ سبزیاں، سادہ خوراک

تازہ سبزیاں استعمال کیجیے۔انھی کے رس میں سٹیم یا بوائل کریں۔سبزیوں کو چھیلے بغیر استعمال کرنا چاہیے۔خاص کر جڑ والی سبزیوں کو بھگونے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ اس سے ذائقہ اور غذائیت میں کمی آتی ہے۔سبزیوں کے زرد رنگ کے بیجوں کے اندر وٹامن اے کی خاص مقدار ہوتی ہے۔

سادہ طرزِ حیات اپنانے سے آدمی فطرت کے قریب ہوتا ہے۔ ہر کام سادگی سے آسانی اور سہولت سے ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس پرتعیش زندگی میں تصنع، بناوٹ اور مصنوعی پن جھلکتا ہے۔سادہ خوراک کھانے سے صحت و تندرستی برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ تازہ، سادہ اور متوازن خوراک مناسب وقفے سے کھانا صحت کی ضامن ہے۔ بازار سے تیار کھانے کھانا، جو ذائقے میں تو چٹ پٹے اور مزیدار لگتے ہیں لیکن صحت کے لیے چنداں فائدہ مند نہیں۔آج کل فاسٹ فوڈ کولا مشروبات بھی صحت کے لیے نقصان دہ اور مضر ہیں ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ ہمیشہ اطمینان اور سکون کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے۔چھوٹے چھوٹے نوالے خوب چبا کر کھانے سے لعاب دھن شامل ہوتا ہے اور ہاضمہ بھی اچھا رہتا ہے۔کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے پانی پینا بہتر ہے درمیان میں اور بعد میں پانی پینا مناسب نہیں۔

وقت کا صحیح استعمال کریں

ایک مقولہ ہے: ''کم کھانا صحت، کم بولنا حکمت اور کم سونا عبادت ہے۔''

اس لیے ہمیشہ اس وقت کھانا کھائیں جب خوب بھوک لگے اور جب تھوڑی بھوک رہتی ہو تو کھانا سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ رات کو دیر تک جاگنا مناسب نہیں۔ جلد سونے کی عادت اپنائیں۔ اس سے صبح جلد بیدار ہو سکیں گے اور اپنے معمولاتِ زندگی بہتر طور پر سرانجام دیں گے اور آپ کا سارا دن خوشگوار اور اچھا گزرے گا۔فکرو پریشانی، اضمحلال وافسردگی (ڈپریشن اور ذہنی دباؤ ایسٹریس) سے اپنے آپ کو بچائیں۔ بعض بیماریوں کا خوف بھی ہمیں پریشان کیے رکھتا ہے۔

کتب بینی کی عادت ڈالیں

کتب بینی ایک صحت بخش مشغلہ ہے۔ کتابوں سے محبت رکھنے والے کسی فلسفی نے اس کی تعریف یوں بیان کی تھی۔

''انسانی زندگی میں رنج و غم کے بادل جب راہوں کو تاریک کر دیتے ہیں تو یہ کتابیں ہی ہیں، جو مخلص دوست کی طرح میٹھے لفظوں سے ہماری ڈھارس بندھاتی اور ان تاریک راہوں کو روشن کر دیتی ہیں۔''

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

کتابیں پڑھنے سے دماغ کے عضلات (مسلز) صحت مند، چاق چوبند اور فعال رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں دماغی تنزلی اور دماغی امراض کی شرح ان لوگوں کی نسبت جو کتابوں یا ایسی سرگرمیوں سے دُور بھاگتے ہیں 32 فیصد کم ہوتی ہے۔

اچھی تحریریں پڑھنے سے ذہنی دباؤ میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ ماہرین صحت کہتے ہیں کہ اچھی کتاب کے مطالعے سے ذہنی دباؤ کا باعث بننے والے ہارمون مثلاً کارٹی سول (CORTISOL) کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔

کتب بینی آپ کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ جتنی زیادہ معلومات آپ کے پاس ہوں گی، آپ زندگی کے مشکل ترین کاموں سے اتنے ہی بہتر انداز میں نمٹ پائیں گے۔

تحریری صلاحیتوں میں بہتری اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ کسی مضمون پر لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں، تو اس عنوان پر پہلے سے شائع شدہ کم ازکم دس مضامین کا لازمی مطالعہ کریں۔ اس سے آپ کے لفظوں کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ دوسرے مصنف کی تحریروں میں الفاظ کا اُتار چڑھاؤ، چناؤ، لفظوں کی روانی اور تحریری انداز آپ کی اپنی تحریر پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بالغ عمر سے ہی کتب بینی کرنے والے افراد کی توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت اور یادداشت ان افراد سے بہتر ہوتی ہے جو مطالعہ نہیں کرتے۔

سائیکل چلانے سے کئی بیماریوں کا خاتمہ

اپنے آپ کو صحت مندانہ سرگرمیوں میں مصروف رکھیں۔ صبح و شام کی سیر، سائنٹیفک، تیراکی، گھڑسواری سے آپ کئی طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ماہرین صحت کہتے ہیں جو لوگ روزانہ آدھا گھنٹہ سائیکل چلاتے ہیں۔ وہ حملۂ قلب، ذیابیطس، مٹاپے، ہائی بلڈ پریشر اور دوسری بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ سائیکل چلانا ایک مفید ترین ورزش ہے، جو آپ کو تندرست و توانا اور چاق و چوبند رکھتی ہے۔ سائیکل چلانے سے پورے جسم میں خون کا دورانیہ بہتر رہتا ہے۔ چربی گھل جاتی، خون میں شکر کی سطح بھی مناسب رہتی ہے۔ اس طرح کئی بیماریوں سے انسان بچا رہتا ہے۔ ماضی میں لوگ اتنے سہل پسند نہیں تھے۔ وہ گاڑی کے بجائے پیدل زیادہ چلتے یا سائیکل چلاتے تھے۔ اسی لیے جسمانی طور مضبوط اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ آپ بھی اگر تندرست و توانا چاق و چوبند رہنا چاہتے ہیں تو روزانہ آدھا گھنٹہ سائیکل چلایئے۔

پانی کی اہمیت کو سمجھیں

امریکا میں کی گئی تحقیق کے مطابق روزانہ مناسب مقدار میں صاف ستھرا پانی پینے سے نہ صرف صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے بلکہ یادداشت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ پانی جلد کو تروتازگی اور شادابی بخشتا ہے۔ ذہنی و جسمانی نشوونما میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ پانی کی مناسب مقدار جسم کو پہنچتی ہے تو نمکیات کی کمی نہیں ہوتی۔ پانی ذہن کو توانا اور تیز کرتا ہے۔

پانی بیٹھ کر تین سانسوں میں اطمینان سے اور ہمیشہ دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے۔ اس سے قلب پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں وہ گھٹنوں اور مثانے کی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پانی کے ہر گھونٹ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

مضر صحت عادت تبدیل کر لیجیے

بازار کی تیار شدہ روغنی غذائیں نہ کھایئے یہ دشمن صحت غذائیں ہیں۔ ریشے والی غذائیں کھانے کی عادت ڈال لیجیے۔ اس لیے کہ ان سے دل کی تکلیف اور سرطان کا خدشہ کم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نزلہ اور ذیابیطس سے بھی انسان محفوظ رہتا ہے۔

اعصاب مضبوط کیجیے

دماغ کو طاقت دینے کے واسطے پھل بالخصوص مفید

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ناقابل یقین

دنیا کی تاریخ ایسے ان گنت قدیم واقعات سے بھری پڑی ہے جسے سن کر ان کی حقیقت کو تسلیم کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔

☆ رومن شہنشاہ Commodus نے ایک بار روم کے معذور افراد کے درمیان ایک لڑائی کا مقابلہ منعقد کروایا جس میں ایک فریق کی جیت دوسرے کے مرنے کی صورت میں ہوتی تھی۔

☆ قرونِ وسطیٰ کے دور میں دندان ساز مردہ فوجیوں کے دانت نکال کر مصنوعی دانت تیار کیا کرتے تھے۔

☆ میکسیکن جنرل Santa Anna نے جب اپنی ایک ٹانگ کھوئی تو ریاست میں باقاعدہ ٹانگ کا سوگ منایا گیا۔

☆ انیسویں صدی میں اکثر کسی مقدمے کی سماعت کے دوران جانوروں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔

☆ پندرھویں صدی کے دوران یورپی باشندے لاشوں کو غذا کے طور پر کھایا کرتے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس طرح وہ بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

☆ مایا تہذیب کے باشندے قربانی دینے والے افراد کے دھڑکتے دل سینوں سے نکال لیا کرتے تھے۔

☆ گزشتہ 3500 سالوں میں مہذب دنیا نے صرف 200 سال امن کے دیکھے ہیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہیں۔ جن پھلوں میں فاسفورس کا مادہ زیادہ ہے، مثلاً سیب وغیرہ دل و دماغ اور اعصاب کی پرورش کرتے ہیں۔ مغز اخروٹ جس کی شکل دماغ سے مشابہ ہے ضعفِ دماغ کا یقینی علاج ہے۔ اعصاب کی کمزوری کا کامیاب اور زود اثر طریقہ یہ ہے کہ پھلوں کا بکثرت استعمال کیا جائے۔ خصوصاً تازہ اور پکے ہوئے انگور، سیب، ناشپاتی، کیلا اور انجیر کا استعمال بہت مفید ہے۔

وٹامن اپنی مرضی سے نہ لیں

ایک تحقیق کے مطابق اخبارات، رسائل یا کتب بینی کی بنا پر از خود حیاتین (وٹامنز) کھانا مناسب نہیں۔ اگر کوئی فرد صحت مند ہے اور متوازن غذا کھا رہا ہے تو اسے حیاتین کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ کسی جسمانی کمزوری یا تکلیف دُور کرنے کے لیے کھاتا ہے تو بھی معالج سے مشورہ ضروری ہے۔ وجہ یہ کہ بعض حیاتین کی زیادہ مقدار نقصان پہنچاتی ہے۔ مثلاً حیاتین الف (وٹامن اے) جو مچھلی، بعض پھلوں اور سبزیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ حیاتین جلد کی صحت، آنکھ کی بینائی اور ہڈیوں کے لیے مفید ہے۔ اس کی روزانہ پانچ ہزار یونٹ کی مقدار کھانی چاہیے، لیکن اگر 25 ہزار یونٹ روزانہ کھائی جائے تو بھوک مر جائے گی، خون کی کمی ہو جائے گی، بینائی کمزور ہو جائے گی، ہڈیوں میں درد ہو گا اور منہ میں چھالے پڑ جائیں گے۔

اسی طرح ہر وٹامن خصوصیت کے ساتھ مضر اثرات بھی رکھتا ہے۔ اگر انھیں جسمانی ضرورت کے حساب سے نہ کھایا جائے تو وہ فائدے کی جگہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

صحت مند رہنے کے چار اُصولوں کو اپنا لیجیے۔ یہ چار اُصول یہ ہیں۔

صفائی، ورزش، متوازن غذا اور مناسب آرام و نیند۔ اگر آپ کی زندگی ان چار ستونوں پر مضبوطی سے قائم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ اللہ کے قرب کے بھی متلاشی رہتے ہیں یعنی نماز روزہ قرآن زکوٰۃ کے پابند ہیں تو پھر یقیناً آپ کی زندگی مثالی اور صحتمند ہے۔

گنجا نہاری والا

دیگ میں سب سے پہلے غریب کا حصہ نکالنے والے دِلّی کے بانکے نہاری فروش کا دلچسپ تذکرہ

شاہد احمد دہلوی

شاہ جہاں بادشاہ نے آگرہ کی چلچلاتی گرمی سے بچنے کے لیے دلی کو حکومت کے صدر مقام کے لیے پسند کیا اور جمنا کے مغربی کنارے قلعہ معلی کی نیو پڑی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمنا کے کنارے کنارے ہلالی شکل میں شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ ہزاروں مزدور قلعہ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے بال بچے، کنبے قبیلے والے سب مل کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہوں گے۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے سودا سلف بیچنے والے بھی آ گئے۔

گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کچے مکانات کی آبادی میں خاصی چہل پہل رہنے لگی۔

اہل قلعہ کے پہلو میں دریا گنج کے رُخ متوسلین شاہی اور امیر امراء کے محلات ڈیوڑھیاں اور مکانات بننے شروع ہو گئے۔ ادھر قلعہ کے سامنے پہاڑی پر جامع مسجد اُبھرنی شروع ہوئی۔ شہر کے بازاروں کے نقشے بنے۔ جہاں اب پریڈ کا میدان ہے یہاں اُردو بازار، خانم کا بازار اور خاص بازار تھا۔ چاندنی چوک یہی تھا اور قلعے کے چوک پر ختم ہوتا تھا۔ جا بجا نہریں اور باغات سے شہر کو سجایا گیا تھا۔ جب قلعہ مکمل ہوا اور بادشاہ نے اس میں نزول اجلال فرمایا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

توشاہ جہاں آباد سج سجا کر دلہن بنا۔ پہلا دربار ہوا تو بادشاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ مغل شہنشاہوں کی بے انتہا دولت پانی کی طرح بہائی گئی اور رعایا فارغ البال اور مالا مال ہوگئی۔

بادشاہ کے حکم کے مطابق بازاروں میں دنیا زمانے کی چیز موجود۔ اس کے علاوہ فرمان ہوا کہ روزمرہ سودا گلی گلی اور کوچے کوچے پھیری والے آواز لگا کر بیچیں۔ چنانچہ دلی میں آج تک یہی دستور چلا آتا ہے کہ گھر بیٹھے ایک پیسے سے لے کر ہزار روپے کی چیز پھیری والوں سے بازار کے بھاؤ خرید لو۔ اصل میں پردہ نشین خواتین کی آسائش بادشاہ کو منظور نہ تھی کہ جس کا جی چاہے اپنی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیز لے لے۔ آج بھی دلی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید کر جمع کر لیتی ہیں۔ قصائی کنجڑے، کیسرے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منہیار فصل کا میوہ قدرت کا پھل بیچنے والے حد یہ ہے کہ پھول والے تک بڑی دلکش آواز لگاتے ہیں اور گلی گلی سودا بیچتے پھرتے ہیں۔ کسی نے آواز لگائی:

”ریشم کے جال میں ہلایا ہے نکتیاں، بان قدرت کا جلیبا...... کھالو۔ ایک تو بول دلکش، اس پر ترنم غضب۔ جی اوبدا کے یہی چاہتا ہے کہ سودے والا خالی نہ جانے پائے۔ گنڈے دمڑی کی اوقات ہی کیا۔ جھٹ اسے آواز دی۔ دمڑی کے ڈھیر سارے شہتوت دے گیا۔ دلی کے دل والے سدا سے چٹورے ہیں۔ شاید اسی زبان کے چٹخارے کے ذمہ دار یہی چٹ پٹے پھیری والے اور ان کی سریلی آوازیں ہیں۔ شاید ہی کوئی سودے والا ہو جو کسی شوم کے گھر سے خالی جاتا ہو۔ دھیلی پاؤلا ہر گھر سے مل جاتا ہے۔ باہر والے یہ طور طریقے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں پھٹتی ہیں۔ شاہ 57ء کے ساتھ ختم ہوئی مگر دلی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور شاہ خرچیاں اب تک باقی ہیں۔

زبان کے چٹخارے کا ذکر آیا ہے، تو اس شہر والوں کے اسی پہلو کو لے لیجیے۔ دلی والوں کو اچھا کھانا اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق ہے۔ یہ شوق انھیں ورثے میں ملا ہے۔ اگلے دلی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ ہو۔ بادشاہ کی دولت میں سے حصہ رسد سب کو پہنچتا تھا۔ سستا سماں تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے فراغت۔ ایک کماتا اور دس کھاتے تھے۔ بے فکری سے کماتے اور بے فکری سے اُڑاتے اور باتوں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعے والوں کی تقلید کی جاتی۔ ہر قسم کے کھانے، رکاب داروں اور باورچیوں سے پکوائے جاتے اور ان میں بھی نت نئی اختراعات کی جاتیں۔ پخت وپز کرنے والوں کے علاوہ بادشاہ سے لے کر ان کے اوقات والوں تک ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے کا شوق تھا۔

آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کئی اختراعات ہیں جن میں مرچوں کا دُلمہ بہت مشہور ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کے ہاں طاہری ایسی پکتی ہے کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے اور کہیں ماش کی دال ایسی مزیدار ہوتی ہے کہ کوئی اور لگاون اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ گھروں کے علاوہ بعض بازار کے دکانداروں نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً گھنٹے والا حلوائی، چڑیا والا کبابی، سرکی والوں کا کھیر والا، پائے والوں کا چچا کبابی، قابل عطار کے کوچے کا سوہن حلوے والا، شاہ گنج کا نواب قلفی والا، فراش خانے کا شابو بھٹیارو لال کنویں کا نان بائی اور چاندنی چوک کا گنجا نہاری والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دلی میں زبان زد عام ہیں۔ ورنہ شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جن میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں۔

مشہور دکانداروں کے ہاں سودا صاف ستھرا، نفیس اور ایک خاص ذائقے کا ہوتا ہے۔ پشت ہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔ ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں محفوظ ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہر تجارت کی طرح ان کے بھی چند بھید ہیں۔ عوام کے اس نظریے نے اتنی شدت اختیار کی کہ

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

طرح طرح روایتیں اور افواہیں شہر میں پھیل گئیں۔ چچا گولے کے کباب ایسے بناتا تھا کہ سارا شہر اس پر ٹوٹ پڑتا۔ پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر روزانہ شام کو اس کی تھڑی لگتی تھی۔ اس ٹھیئے پر ان کی سات پشتیں گزر گئیں۔ چچا کو اس پر بہت ناز تھا کہ ان کے باپ دادا کے کباب بادشاہ کے دسترخوان پر جایا کرتے تھے۔ شہر میں آج تک مشہور ہے کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن ہوتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جاتا تھا۔ پھر چپکے سے ایک بزرگ کہتے:

''سمجھے بھی۔ یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا ہے۔ میاں آدمی کا گوشت کھلاتا تھا آدمی کا۔ جب وہ پکڑا گیا اور اس کی تلاشی ہوئی ہے تو سیکڑوں کھوپڑیاں اس کے گھر سے نکلیں۔'' ظاہر ہے یہ ایک لغو اور مہمل قیاس ہے۔ اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح و خاص تناسب کی وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر تاؤ بھاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر کون سی ایسی انوکھی چیز ہے۔ گھر گھر پکتی ہے مگر سرکی والوں کی دکان کے پیالے کھایئے تو جانیے۔ دہی، دودھ، چاول اور شکر کا آمیزہ مگر تناسب اور تاؤ ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی چاٹ کھا رہے ہیں۔ شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربا مشہور ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں بادشاہی وقت کا شوربا ہے۔

ارے بھئی یہ کیسے؟

اجی حضرات! یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے ایک پیالہ بچا لیتے اور اگلے دن کے شوربے میں ملا دیتے ہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آتا ہے۔ یوں ہمارا شوربا شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔

حاجی نان بائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لیے خمیری، کلچے اور شیر مال تیار کیے جاتے اور ایسے ملائم کہ ہونٹوں سے توڑ لو مگر ان کا ہنر دیکھنا ہو تو جو آپ کا جی چاہے فرمائش کر کے پکوایئے۔

حاجی نان بائی کا ذکر آیا تو یادش بخیر میاں گنجے نہاری والے یاد آ گئے۔ اصل میں نہاری والے نان بائی ہی ہوتے ہیں۔ بھٹیارے نہیں ہوتے۔ نہاری تو جاڑوں کھائی جاتی ہے۔ گرمیوں اور برسات میں کھائی جائے نہ پکائی جائے۔ ان دنوں نہاری والے اپنا تنور گرم کرتے ہیں اور روٹی پکانے پر ان کی گزر اوقات ہوتی ہے۔ دلی میں اب تو تقریباً ہر بڑے محلے میں ایک نہاری والا موجود ہے لیکن اب سے پچیس سال پہلے صرف چار نہاری والے تھے۔ انھوں نے شہر کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ گنجے کی دکان چاندنی چوک میں کڑے کے پاس تھی اور شہر میں ان کی نہاری سب میں مشہور ہوتی تھی۔ دلی سے باہر اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ نہاری کیا ہوتی ہے اور بعض مقامات پر یہ لفظ کچھ اور معنوں میں مستعمل ہے مثلاً چوپایوں کو خصوصاً گھوڑوں کی تقویت کے لیے ایک گھولوا پلایا جاتا ہے، جسے نہاری کہتے ہیں۔ بعض جگہ پایوں کو نہاری کہا جاتا ہے۔ دلی میں ایک خاص قسم کا سالن ہوتا ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے اور بازاروں میں فروخت ہوتا ہے۔ اس کے پکانے کا ایک خاص طریقہ ہے اور اس کے پکانے والے بھی خاص ہوتے ہیں۔

نہاری کو آج سے نہیں غدر کے پہلے سے دلی کے مسلمانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو گھر میں بھی اور باہر بھی سیکڑوں قسم کے قورمے پکتے ہیں مگر نہاری ایک مخصوص قسم کا قورمہ ہے۔ اسے پکانا سوائے نہاری والوں کے اور کسی کو نہیں آتا۔ اس کی پخت وپز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری رات پکائی جاتی ہے اور پکنے کی حالت میں ہمہ وقت اس کا تاؤ مساوی رکھا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے۔ تیسرے پہر سے اس کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دکان کی دہلیز کے پاس زمین میں گڑھا کھود کر ایک گہرا چولہا یا بھٹی بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک بڑی سی دیگ اس طرح اُتار کر جما دی جاتی ہے کہ صرف اس کا گلا

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

باہر نکلا رہ جاتا ہے۔ چولہے کی کھڑکی باہر کے رخ کھلتی ہے اور اس میں ایندھن ڈالا جاتا ہے جو دیگ کے نیچے پہنچ جاتا ہے۔ آگ جلانے کے بعد قورمے کا مسالا بھونا جاتا ہے۔ جب مسالے میں جالی پڑ جاتی ہے تو گوشت کے پارچے خصوصاً ادلے ڈال کر انھیں بھونا جاتا ہے اور اندازے سے پانی ڈال کر دیگ کا منہ ڈھک دیا جاتا ہے۔ پکانے والے کو جب ادھ گلے گوشت کا اندازہ ہو جائے تو دیگ کا منہ کھول کر اس میں پچیس تیس بھیجے اور اتنی ہی نلیاں یعنی گودے دار ہڈیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ شوربے کو لبدھڑا بنانے کے لیے پانی میں آٹا گھول کر ڈالا جاتا ہے اور یہ آلن کہلاتا ہے۔ اب دیگ کا منہ آٹا لگا کر کونڈے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیگ ساری رات پکتی رہتی ہے اور اس کا تاؤ دھیما رکھا جاتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے پکنے کے بعد جب علی الصبح دیگ پر سے کونڈا ہٹایا جاتا ہے، تو دُور دُور تک اس کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر الگ برتن میں رکھ لی جاتی ہیں اور پھر گاہکوں کا بھگتان شروع ہوتا ہے۔ یہ کھانا چونکہ دن شروع ہوتے ہی کھایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا نام نہار کی رعایت سے نہاری پڑ گیا۔

☆☆☆

ہاں تو ذکر تھا گنجے نہاری والے کا۔ دلی والوں کے علاوہ قرب و جوار سے بھی لوگ ان کی نہاری کھانے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کالج کے لڑکے اتوار کے اتوار دھاوا بولتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں بھی چند بار گنجے کی نہاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان کی دکان صبح دم کھلتی تھی اور کھلنے سے پہلے گاہک موجود ہوتے۔ کسی کے ہاتھ میں پتیلی، کوئی بادیہ لیے، کوئی ناشتہ دان سنبھالے سردی میں سکڑتا سوں سوں کرتا ٹہل لگا رہا ہے۔ پنی تلی ایک دیگ پکتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی۔ ذرا دیر سے پہنچے تو میاں گنجے نے معذرت کے لہجے میں کہا:

"میاں! اب کل لیجیے گا اور ذرا سویرے آئیے گا۔"

نہاری کے مسالوں کا وزن اور پکانے کا طریقہ اوروں کو بھی معلوم ہے مگر وہ ہاتھ اور نگاہ جو اُستاد گنجے کو میسر تھی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اکثر لوگ ان سے دریافت بھی کرتے تھے کہ "آخر استاد بات کیا ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی پکی نہاری میں یہ لذت نہیں ہوتی؟" تو وہ ہنس کر یہ کہہ دیا کرتے کہ "میاں بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ اور حضرت سلطانؒ جی کا فیض ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا"۔

اُستاد گنجے کے کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ان کا سراپا بھی بیان کیا جائے۔ "گنجے" کے نام سے خوامخواہ ذہن میں ایک کراہیت سی پیدا ہوتی ہے۔ نازک خیال اور نفیس مزاج لوگ گنجے کے ہاتھ کا پانی بھی پینا گوارا نہیں کر سکتے لیکن استاد کو تو سرے سے گنج کی بیماری ہی نہیں تھی۔ اصل میں ان کی چندیا کے بال جھڑ گئے تھے اور نائٹ صاف ہو کر تامڑا نکل آیا تھا اور اس کے تین طرف چار انگل چوڑی بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔ دلی کے چلبلی طبیعت والے بھلا کب چوکنے والے تھے۔ گنجے کی پھبتی ان پر کسی اور یہ کچھ ایسی جمی کہ چپک کر رہ گئی۔ گندمی رنگ کا گول چہرہ، خشخاش ڈاڑھی، بڑی بڑی چمکدار مگر حلیم آنکھیں۔ باوجود نہاری فروشی کے ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ لٹھے کا شرعی پاجامہ نیچا کرتا، کرتے پر بہت صوفیانہ چھینٹ کی نیم آستین، سر پر صافہ، کسرتی اور بھرا بھرا جسم۔ انھیں کوئی دیکھے تو سمجھے کہ بڑے خرانٹ ہیں۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہوں گے مگر ان کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بالعموم نامی دکاندار بڑے بدمزاج اور غصیل ہوتے ہیں جیسے کہ چچا کبابی کہ بڑے ہتھ چھٹ تھے اور مار پیٹ تک سے نہیں چوکتے تھے۔ استاد گنجے بڑے خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ انھیں تاؤ آیا ہو یا کبھی ان کے منہ سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکلا ہو۔ ہر گاہک سے چاہے وہ آنے دو آنے کا ہو

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

روپے دوروپے کا بڑی نرمی سے بات کرتے اور مستقل گاہکوں کو تو اپنا مہمان سمجھتے۔

استاد گنجے کے کردار میں سب سے نمایاں چیز ان کا حلم اور انکسار تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے جنھیں دلی والے سلطان جی کہتے ہیں، استاد گنجے کو بڑی عقیدت تھی اور یہ انھی کا روحانی تصرف تھا کہ استاد گنجے کا دل گداز ہو گیا تھا اور وہ اپنی ساری کمائی غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کرنے میں صرف کرتے۔ سلطان جی کی سترھویں میں اپنی دکان بڑے اہتمام سے لے جاتے اور دوسرے سارے دنوں میں درگاہ کی حاضری ہر جمعرات کو باقاعدہ ہوتی۔ ہر مہینے گیارہویں کی نیاز ان کے ہاں بڑی دھوم سے ہوتی۔ دن بھر لنگر جاری رہتا۔ جمعرات کو ان کی دکان پر فقیروں کی لنگتار لگی رہتی اور سب کو پیسہ ٹکہ ملتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دکانداری شروع ہونے سے پہلے ادھر دیگ کھلی اور ادھر انھوں نے اللہ کے نام کا حصہ نکالا۔ اگر کوئی محتاج موجود ہوا تو پہلے اسے کھلایا ورنہ نکال کر الگ رکھ دیا۔ پھر دیگ میں سے بھیجے نلیاں نکال کر طباق میں رکھیں۔ تار اور رونق کو ایک بڑے بادیے میں الگ نکال لیا اور اس کے بعد دُکانداری شروع ہوئی۔ دکان میں بیسیوں پتیلیاں، دیگچے اور برتن رکھے ہیں۔ کسی میں دوروپے، کسی میں روپیہ کسی میں بارہ آنے، کسی میں آٹھ آنے پڑے ہیں۔ شوقین اور قدردان رات ہی کو اپنے اپنے برتن اور پیسے دے گئے ہیں کہ مایوس نہ ہونا پڑے۔ سب سے پہلے انھی برتنوں کی طرف استاد کی توجہ ہوتی ہے۔ بڑی تیزی اور پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہیں۔ ادھر گاہکوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ ان کی آسائش کا بھی خیال ہے۔ گاہک بھی جانتے ہیں کہ جس کے برتن پہلے آگئے انھیں پہلے ملے گا۔ کسی باہر والے نے جو یہاں کے قاعدے اور قرینے نہیں جانتا جلدی مچائی تو استاد نے بڑی انکساری سے کہا:

”حضور ابھی دیتا ہوں۔ جو پہلے آیا ہے اگر اسے پہلے نہ دوں تو شکایت ہو گی۔ برتن پورے ہوئے، گاہکوں کا بھگتان شروع ہوا۔ دوروپے سے دو پیسے تک کے خریدار موجود اور سب کو حصہ رسد ملتا ہے۔ تین گھنٹے میں دو ڈھائی سو گاہکوں کو نہاری دی اور دیگ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گئی۔ اب جو کوئی آتا رہے تو بڑی سماجت سے کہتے ہیں۔ میاں معافی چاہتا ہوں، میاں اب کل دوں گا، انشاءاللہ خیر رکھے کل کھائیے گا۔ سبحان اللہ کیا اخلاق تھا اور کیسی وضعداری تھی۔ آگ اور مرچوں کا کام اور اتنے ٹھنڈے اور میٹھے۔ دوسروں کو دیکھ لیجیے۔ گالی گلوچ، دھکا مکی اور لپاڈگی کی نوبت رہتی ہے۔

اُستاد گنجے کے ہاں دو قسم کے گاہک آتے ہیں۔ ایک وہ جو خرید کر لے جاتے اور ایک وہ جو وہیں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر کھانے والوں کے لیے دکان کے اُوپر کمرے پر نشست کا انتظام تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرا تھا جس میں چٹائیاں بچھی رہتیں۔ اس میں ایک دو آدمی بھی کھاتے تھے اور دس دس کی ٹولیاں بھی۔ اُستاد سے جتنا اور جو سودا کہا جائے، وہ اتنا ہی دیتے تھے۔ اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا ترمیم نہیں کرتے تھے۔ مستقل گاہکوں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بڑے مزاج شناس اور غضب کی یادداشت تھی۔ صورت دیکھتے ہی کہتے: ”فرمایئے حکیم صاحب کیا حکم ہے؟ کیوں میاں کیا سودا پیش کروں؟ ڈپٹی صاحب ارشاد“

میاں گنجے کی نہاری دلی کے سب شرفاء کے ہاں جاتی تھی۔ ان کی سات پشتیں اسی دلی میں گزری تھیں۔ سارا شہر ان کو جانتا تھا اور یہ بھی دلی کی دائی بنے ہوئے تھے۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کے سارے خاندان اور ان کے رُودار افراد انھیں ازبر تھے۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو بڑوں کی خیر سلامی بھی پوچھ لیتے۔ ”کیوں میاں صاحب! بڑے ڈپٹی صاحب تو اچھی طرح ہیں؟ جی چاہتا ہے کہ انھیں بھی ایک دن تحفتہً نہاری کھلاؤں۔ اللہ نے چاہا تو اب کے وہ نہاری کھلاؤں کہ چلے کے جاڑوں میں پسینہ آ جائے۔ اچھا میاں تو آپ کے لیے کیا بھیجوں؟

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اُستاد کمرے پر چھ آدمیوں کے لیے نہاری۔“

بس اس سے زیادہ آپ کو کہنے کی اور انھیں سننے کی ضرورت نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ آپ کی نہاری کا کیا لوازمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھ بھی آپ کے ہم مذاق ہوں گے۔ فی کس پاؤ بھر نہاری کے اندازے سے انھوں نے تار اور لبڈھڑ ایک بڑے سے بادیئے میں نکالا۔ گھی آدھ پاؤ فی کس کے حساب سے داغ کرنے انگیٹھی پر رکھ دیا۔ اتنے میں گھی تیار ہوا۔ انھوں نے چھ بھیجے توڑ، صاف وغیرہ کر نہاری میں ڈال دیے اور بارہ نلیاں بھی اس میں جھاڑ دیں۔ اوپر سے کڑکڑاتا گھی ڈال طباخ سے ڈھک دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر پہلے غوریاں اور چمچہ اُوپر بھیجا۔ اس نے کھونٹی پر سے کھجور کا بڑا سا گول دسترخوان بیچ میں بچھایا اور اس میں غوریاں چن دیں۔ پھر لپک کر نیچے آیا اور نہاری کا بادیہ احتیاط سے اُوپر پہنچا آیا۔ اتنے میں اس نے ہاتھ دھلائے۔ دوسرا لڑکا تھئی کی تھئی خمریاں اور ایک طباخ میں گرم مسالا، ادرک کی ہوائیاں، ہری مرچیں اور کھٹا رکھ گیا۔ سب دسترخوان پر ہو بیٹھے تو وہی لڑکا دھڑ دھڑ جلتی انگیٹھی ایک سینی میں قریب رکھ گیا۔ لڑکا روٹی سینک کر دیتا جاتا ہے۔ گرم اور تر نوالوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ دوستوں کے قہقہے اور چہچہے ہوتے جاتے ہیں۔ گھی نے نہاری کی لذت بڑھانے کے علاوہ مرچوں کا دف بھی مار دیا ہے۔ ذرا نہاری ٹھنڈی ہوئی اور غوری (بروزن، گوری) انگیٹھی پر رکھی گئی۔

یہ لیجیے میاں گنجے نے آپ کے دوستوں کے لیے ایک خاص تحفہ بھیجا ہے۔ تنور میں گرم گرم روٹیاں نکال کر گھی میں ڈال دیں اور گھی پی کر ایسی خستہ اور نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔ واہ واہ کیا مزاج دانی اور اداشناسی تھی۔ جب ہی تو آج تک گنجے نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔

یہ تو خیر امیروں کے چونچلے تھے۔ اصل میں نہاری غریب غرباء کا من بھاتا کھاجا ہے۔ کاریگر دست کار اور مزدور صبح صبح کام پر جانے سے پہلے چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو پیسے کی نہاری اور دو پیسے کی دو روٹیاں ان کے دن بھر کے سہارے کو کافی ہوتیں۔ گھر میں علی الصبح چار پیسے میں بھلا کیا تیار ہو سکتا ہے؟ سستے اور بابرکت وقت تھا۔ ایک پیسے میں چار سودے لے آتے۔ ایک کماتا اور دس کھاتے۔ اب دس کماتے ہیں اور ایک کو نہیں کھلا سکتے۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔ میاں گنجے نہاری والے بھی گزری ہوئی بہاروں کی ایک چٹ پٹی کہانی بن کر رہ گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

●●●

ہماری پیاری دنیا

یہ دنیا ہماری سوچ سے بھی کئی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے اور ان میں سے چند عجیب وغریب چیزیں سرفہرست ہیں۔ جن سے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت ناواقف ہے اور یہی مناظر دنیا کو انتہائی عجیب اور حیرت انگیز بناتے ہیں۔

کوکونٹ کریب: ایک میٹر لمبا انوکھا کیکڑا:

یہ دنیا کے سب سے بڑے کیکڑوں کی ایک قسم ہے۔ ان کیکڑوں کا وزن 4 کلوگرام تک ہوتا ہے جبکہ ان کا قد ایک میٹر تک بلند ہو سکتا ہے۔ یہ کیکڑے بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے مختلف جزائر میں پائے جاتے ہیں۔

پگ بی مرموسیٹ: دنیا کا سب سے چھوٹا بندر

یہ دنیا کا سب سے چھوٹا بندر ہے اور یہ جنوبی امریکہ کے مغربی ایمیزون کے برساتی جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ اس بندر کا وزن صرف 100 گرام ہوتا ہے۔ یہ ہریالی یا پھر دریا کے کنارے آباد جنگلات میں رہنا پسند کرتا ہے۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

مستنصر حسین تارڑ

میرا قیمہ

میں ٹولنٹن مارکیٹ میں چھوٹے گوشت کی ایک دکان پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور کچھ اس قسم کے ''جذباتی'' سوال جواب سن رہا تھا۔

''نسیم بھائی پہلے میرا قیمہ بنا دیجیے'' ایک خاتون کہہ رہی تھیں۔

''بہن جی آپ فکر ہی نہ کریں، میں آپ کا ایسا قیمہ بناؤں گا کہ آپ یاد کریں گی......!''

''ذرا جلدی کریں نسیم بھائی۔''

''بس آپ کھڑی رہیں۔ آپ کے کھڑے میں آپ کا قیمہ بنا دوں گا۔''

''قیمہ روکھا بناؤں یا موٹا......''

''روکھا ٹھیک رہے گا لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔''

''بہن جی شیخ صاحب کا قیمہ ہے، یہ والا جو میں کوٹ رہا ہوں، اس کے بعد ان شاء اللہ آپ کا قیمہ بنے گا۔''

''نسیم صاحب ...... مغز چاہیے، مل جائے گا؟'' ایک صاحب دریافت کرتے ہیں۔

''کیوں نہیں جناب...... یہ ہمارے لیڈران کرام تھوڑی ہیں، بکرے ہیں۔ ان میں بہت مغز ہے، ابھی دیتا ہوں۔''

''اور میرے گردوں کا کیا ہوا؟'' ایک آواز آتی ہے۔

''یہ والے!'' نسیم کا بھائی جو شکل سے ہیرو لگتا ہے چند گردے فضا میں بلند کرتے ہوئے کہتا ہے، ''آپ کے

عید قرباں ہو یا عام دن، قصائی کی دکان پر ہونے والی شگفتہ گفتگو کی بازگشت دہراتا شاہکار

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

گردے ہیں...... ابھی نکالے ہیں، بنا کر دیتا ہوں۔"

"اور میری ران......"

"یہ رہی آپ کی ران، بالکل نرم اور تازہ تازہ"۔

"اور میری سری......"

"ابھی توڑتا ہوں......"

"ایک صاحب جو آرڈر دے کر جا چکے تھے، واپس آکر پوچھتے ہیں "یار ابھی تک میرا گوشت نہیں بنایا......"

"اوہو آپ یہ بتائیں کہ آپ کی بوٹیاں کیسے کاٹوں! چھوٹی یا بڑی...... میں پانچ منٹ میں آپ کا گوشت بناتا ہوں جناب ......ہم آپ کا گوشت نہیں کاٹیں گے تو اور کس کا کاٹیں گے......"

بالآخر میری باری آتی ہے اور میں ایک مختصر سا آرڈر دیتا ہوں۔

"تارڑ صاحب" نسیم مسکراتے ہوئے کہتا ہے "اتنا گوشت تو پورے محلے کے لیے کافی ہوگا، کیا کریں گے؟ اتنے گوشت کو دیگ میں پکائیں گے؟"

"بھائی آپ براہِ کرم جگتیں نہ کریں اور گوشت بنا دیں ......اور یہ والی بوٹی تو اچھی نہیں ہے! یہ نہ ڈالنا"

"یہ والی؟"...... وہ بوٹی اُٹھا کر اس کی نمائش کرتا ہے۔

"یہ والی بوٹی تو بڑی جذباتی بوٹی ہے تارڑ صاحب......"

نسیم اپنے گوشت کے بارے میں "جذباتی" کا لفظ بے دریغ استعمال کرتا ہے...... مثلاً جناب یہ گردہ ملاحظہ کیجیے۔ بالکل جذباتی ہے...... یہ چانپ جو آپ دیکھ رہے ہیں، جذباتی ہو رہی ہے آہستہ آہستہ، یہ ران تو خیر ہے ہی جذباتی...... ویسے میرے پاس غیر جذباتی گوشت بھی ہے لیکن آپ کو مزا نہیں آئے گا...... وہ سامنے والا بکرا جو لٹک رہا ہے، وہ شہنشاہِ جذبات ہے اور بکری جو ہے، یہ ملکۂ جذبات ہے۔ اس کی ٹانگ پیش کروں؟"

گوشت کے بارے میں کالم لکھنا کچھ غیر ادبی سا فعل ہے لیکن کیا کیا جائے، یہ مہنگا ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی "مسلمانی" کم ہوتی جا رہی ہے۔ گوشت اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں...... ہمارے گاؤں میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ گوشت کھانے سے ایمان مضبوط ہو جاتا ہے، لوہے کی طرح...... ظاہر ہے اگر گوشت مہنگا ہوگا تو کم کھایا جائے گا اور اسی حساب سے "مسلمانی" کم ہوتی جائے گی۔ میں بھی اسی لیے فکرمند ہوں......

گوشت کی قیمتوں میں یک دم اضافہ ہو گیا ہے اور کہیں سے احتجاج کا ایک لفظ سنائی نہیں دیا...... سگریٹ مہنگے ہو جائیں تو چھوڑ دو، چائے مہنگی ہو جائے تو کم پیو۔ آٹا مہنگا ہو جائے تو کیک کھالیں لیکن گوشت تو کم نہیں کھایا جا سکتا...... مجھے چونکہ گوشت کی قیمتوں میں اضافے کی خبر نہ تھی، اس لیے میں نے جیب میں پڑی رقم کے مطابق آرڈر دیا اور پھر بعد میں بل زیادہ بننے پر خوب خوب شرمندہ ہوا......

آج گوشت کا بیان چلتا رہے چنانچہ چھوٹے گوشت کی مارکیٹ سے باہر آجایئے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے سامنے بڑے گوشت کی مارکیٹ ہے...... یہاں بھی علم اور گوشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس مارکیٹ کے اندر بھی دکاندار تقریباً ایک ہی علاقے اور ایک ہی خاندان سے متعلق ہیں۔

ایک مرتبہ میرے والد صاحب جو انتہائی حساس طبیعت کے مالک تھے، گوشت خریدنے آئے۔ قصاب نے ایک بوٹی اٹھا کر کہا "چوہدری صاحب، بالکل بچے کی بوٹی ہے، بھون کے کھایئے، مزا آجائے گا"۔ وہ دن اور آج کا دن والد صاحب کبھی بڑا گوشت خریدنے نہیں گئے۔ وہاں پر گوشت کے عجیب و غریب شوقین نظر آتے ہیں، ایسے شوقین جو پلاؤ کے لیے الگ گوشت منتخب کرتے ہیں اور کریلے پکانے کے لیے الگ۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل ہوتے ہیں جو صرف سری پایوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔

گوشت کھانا مسلمان کی اور خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو بھنا ہوا گوشت کھائیں گے یا شکرانے کے طور پر ایک دو بکرے حلال کر دیں گے۔ اگر فوتیدگی ہو جائے تو بھی مہمانوں کی تواضع آلو گوشت سے کی جائے گی۔

میرے ماموں اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ بالکل گلا ہوا نرم گوشت کس کام کا گوشت وہ جو نوچ نوچ کر کھایا جائے۔

ایک چھوٹا سا قصہ ہے، جس میں گوشت کے بارے میں ہی کچھ بیاں ہے......میں اس وقت تقریباً ۱۵۔۱۶ برس کا تھا اور پہلی مرتبہ ولایت جا رہا تھا۔ جہاز میں میرے برابر کی نشست پر ایک مولانا براجمان تھے۔ وہ خاصے معصوم تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیوں چچا جان آپ کس سلسلے میں انگلستان جا رہے ہیں تو کہنے لگے! بیٹا کافروں کو مسلمان کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا، آپ کو انگریزی آتی ہے؟ کہنے لگے نہیں، جس نے مسلمان ہونا ہوگا اسے خود بخود میری زبان سمجھ آ جائے گی......

اُن دنوں ابھی جیٹ مسافر بردار طیارے اڑا نہیں کرتے تھے چنانچہ پنکھوں والا جہاز بڑے مزے سے ہواؤں اور بادلوں سے اٹھکیلیاں کرتا منزل کی جانب جاتا تھا۔ ہم کراچی سے چلے اور پھر طہران، قاہرہ، ایتھنز وغیرہ میں رکتے روم پہنچے۔ روم میں دو گھنٹے کا سٹاپ تھا اور ایئر لائن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافر حضرات ہوائی اڈے کے ریستوران میں جا کر اپنی پسند کا کھانا تناول فرمائیں، بل کمپنی کے ذمے ہوگا۔ اس اعلان پر مسافر حضرات بے حد خوش ہوئے۔ میں بھی خوش ہوا اور مولانا تو بے حد خوش ہوئے کیونکہ ہمیں شدید بھوک لگی تھی۔

ریستوران میں بیٹھے تو ایک خوبرو اطالوی خاتون ہاتھ میں مینو پکڑے ہمارے قریب آ گئی......مولانا کھانسے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، میں چونکہ ابھی بچہ تھا اس لیے مجھے کھانسی بالکل نہ آئی۔ میں نے اپنے لیے ایک عدد روسٹ چکن منگوا لیا اور اپنے ہم راہی سے دریافت کیا: ''مولانا آپ کیا کھائیں گے؟'' انھوں نے منہ بنا کر جواب دیا ''اس گوری گوری لڑکی سے کہو کہ میرے لیے صرف ابلی ہوئی سبزیاں لے آئے کیونکہ گوشت تو یہاں پر حلال نہیں ہوگا۔''

اب میں نے تو اس معاملے کے بارے میں غور نہیں کیا تھا کہ یہاں گوشت کس قسم کا ہوتا ہے اور مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے ان کا آرڈر بھی دے دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ویٹرس کھانا لے آئی......ایک ٹرالی پر میرا روسٹ مرغ ابھی تک روسٹ ہو رہا تھا۔ اس کی خوشبو پورے ریستوران میں پھیلی تھی۔ مرغ کے گرد انڈے اور آلو کے کتلے اور سلاد وغیرہ بہار دکھا رہے تھے......یہ سب کچھ میرے آگے رکھ دیا گیا۔ پھر ویٹرس واپس گئی اور ایک چھوٹی سی پلیٹ مولانا کے آگے لا کر رکھ دی۔ اس میں ایک ابلی ہوئی گاجر اور ایک دو آلو تھے۔ سفری چچا جان نے گاجر کھانے کی کوشش کی لیکن ان کی نظریں میرے روسٹ مرغ پر سے اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ میں مزے سے کھاتا جا رہا تھا اور وہ مجھے دیکھتے جا رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے گرج کر کہا ''برخوردار''۔

''جی جناب'' میں نے گھبرا کر جواب دیا۔

''یہ ہوٹل والی زنانی کو کہو کہ میرے لیے بھی یہی مرغ لے آئے، یہ شکل سے حلال لگتا ہے''۔

کہنے کا مطلب ہے کہ گوشت کھانے کے شوق میں ہم بعض اوقات اپنی مسلمانی کو بھی خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

لاہور کے ایک بہت ہی معروف ڈاکٹر صاحب اکثر بازار جا کر ایک بکرا خرید لاتے۔ گھر جا کر اسے خود ذبح کرتے، گوشت بناتے خود ہی بھونتے اور پھر اپنے بیٹوں کے ہمراہ ایک ہی نشست میں اسے چٹ کر جاتے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ گوشت ہونا چاہیے، چاہے گدھے کا ہی کیوں نہ ہو......

میں نے مکان بنایا تو ایک مزدور تقریباً روزانہ شام کو مزدوری کی رقم وصول کرتا، اس کا گوشت خریدتا اور بھون کر کھا جاتا۔ میں خود اگرچہ کھانے پینے کا زیادہ شوقین نہیں لیکن گوشت کھا ئے ہوئے اگر دو چار دن گزر جائیں تو جمائیاں آنے لگتی ہیں اور اپ مسلمان ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے......لیکن اب تو قیمت زیاد ہونے سے ایسا لگ رہا ہے کہ قیمہ بکرے کا نہیں ہمارا اپنا بن ر ہے...... ہمارے گردے نکالے جا رہے ہیں اور مغز کھایا جار ہے......اور وہ دن دُور نہیں جب ہم گوشت کی دکان پر جا کر قصا کے آگے لیٹ کر کہیں گے ''براہِ کرم میرا قیمہ بنا دیجیے۔''

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ارم ناز

بچوں کو ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے بچائیں

بچوں کے اذہان، نازک آنکھوں اور کمزور دل کی حفاظت اولین ذمہ داری ہے

میں جب بھی اپنی بیٹی کی طرف دیکھتا ہوں تو احساسِ شرمندگی اور تکلیف دگنا ہو جاتا ہے۔ گو وقت گزر چکا۔ میری بیٹی اب ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اس کی ہر تکلیف کا ذمہ دار میں ہوں۔ کاش وقت واپس پلٹ آئے...... لیکن گزرا ہوا وقت کب کسی کے لیے پلٹا ہے؟

چند سال پہلے میری بیٹی لیزا دو سال کی تھی۔ روزانہ کام کرتے ہوئے جب بھی وہ میرے پاس آتی تو مجھے بہت تنگ کرتی تھی، کبھی لیپ ٹاپ چھیڑتی تو کبھی میرے کندھوں پر جھولتی۔ ایسے میں کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ ایک دن بہت ضروری اسائنمنٹ کی تکمیل کے لیے مجھے دفتر سے صرف ایک دن کا وقت ملا تھا۔ میں نے لیزا کو اپنے اسمارٹ فون پر نظمیں لگا کر دے دیں۔ وہ دیکھنے لگی اور میں اطمینان سے اپنا کام کرنے لگا۔ پھر تو جیسے مجھے لیزا سے جان چھڑانے کا گر ہاتھ آ گیا۔ وہ جب بھی مجھے تنگ کرتی میں موبائل اسے تھماتا اور کام کرنے لگتا۔ اس روٹین کو جب چھے ماہ ہو گئے تو میری بیٹی کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ سوجن اور جلن حد سے بڑھنے پر جب ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ بچی کی آنکھوں کی سرجری کرنی پڑے گی۔ اتنی چھوٹی بچی کی آنکھ میں اس قدر تکلیف کیسے ہو سکتی؟ یہ سوال جب ڈاکٹر سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کی وجہ موبائل فون کا استعمال ہے کیونکہ اتنی چھوٹی بچی کی آنکھوں کے خلیے بہت نازک ہوتے ہیں، اس لیے وہ موبائل کی تیز اور مسلسل روشنی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میری بچی کی سرجری کی گئی۔ جن دنوں اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی وہ درد سے چلاتی اور روتی تھی۔ ہم میاں بیوی اس کو بہلانے پھسلانے کا مختلف سامان کرتے لیکن وہ نہ بہلتی۔ وہ دور انتہائی دکھ بھرا تھا۔ جب اس کی پٹی کھلی اور وہ دیکھنے کے قابل ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی لیکن ساتھ ہی ڈاکٹر نے یہ خبر بھی سنا دی کہ اب ساری زندگی اسے عینک لگانا پڑے گی۔

اب میری بیٹی سات سال کی ہے۔ یوں تو وہ ٹھیک ہے لیکن عینک اس کے چہرے کا لازمی جزو بن چکی۔ میں جب بھی کسی بچے کو اسمارٹ فون یا ٹیب وغیرہ استعمال کرتے دیکھوں تو فوراً اس کے والدین کو خود پر بیتے ان کرب بھرے لمحوں کے بارے میں بتاتا ہوں تاکہ ان کے بچوں کو کسی قسم پریشانی کا

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

سامنا نہ کرنا پڑے۔ والدین اپنی آسانی کے لیے بچوں کو ایسی چیزیں تو دے دیتے لیکن ان کے مضر اثرات بھول جاتے ہیں۔

والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد صحت مند و توانا اور قابل ہو تاکہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنی قابلیت کا لوہا منوا سکے۔ اس لیے وہ اولاد کی ہر خواہش اور ضرورت کو بلا تامل پورا کرتے ہیں، نیز چھوٹی عمر سے ہی جدید سے جدید اشیاء اور نت نئی ٹیکنالوجی سے انھیں متعارف کرواتے ہیں، لیکن جہاں سائنس کی ترقی اور ایجادات نے انسان کو زمین سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا وہیں اس کا بے جا اور غلط استعمال ننھے اذہان کو متعفن بھی کر رہا ہے۔

یوں تو ٹیکنالوجی نے بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت، تفریح، میل جول، دوستی اور زندگی کے ہر پہلو میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن بچے جو مستقبل کے معمار اور والدین کی امیدوں کا سہارا ہیں، وہ جدید ٹیکنالوجی کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر متاثر ہو رہے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ اگر وہ اپنے بچوں کو حقیقی معنوں میں ٹیکنالوجی کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھوانا چاہتے ہیں تو درج ذیل باتوں پر عمل کریں۔

اسکرین کا وقت مقرر کریں:

موبائل فون، ٹیب اور لیپ ٹاپ سے دلچسپی کے باعث بچے ہر وقت ان چیزوں سے چپکے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی جب بھی ذرا سے فارغ ہوں فوراً موبائل یا ٹیب پر گیم کھیلیں یا ویڈیوز لگا لیں۔ خصوصاً چھٹی کے دن۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچوں کے لیے وقت مقرر کریں۔ ماہرین کے مطابق اسمارٹ فون یا ریڈیو انٹینا سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جن سے کینسر، جینیاتی تبدیلی، بصارت، تناؤ اور یادداشت کی کمزوری جیسے امراض بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر جنم لے رہے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت نے بچوں کے تمام الیکٹرونک آلات دیکھنے کی حد مقرر کرتے ہوئے کہا کہ پانچ سال سے کم عمر بچے دن میں صرف ایک گھنٹہ جبکہ ایک سال سے کم اور دودھ پیتے بچوں کو اسکرین کو دیکھنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ یہ بھی ہدایت دی کہ والدین اپنا وقت بچانے اور بچوں کا دل بہلانے کے لیے بچوں کو برقی آلات مت فراہم کریں۔

گھر سے باہر کھیل کود: (لاک ڈاؤن کی صورت حال میں گریز کریں)

موجودہ دور کے والدین خود اتنے مصروف ہو چکے کہ ان کے پاس بچوں کے لیے وقت ہی نہیں۔ وہ انھیں اسمارٹ فون اور ٹیب جیسے آلات پکڑا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں نونہالوں کی صحت برباد کر رہیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو روزانہ کی بنیاد پر گھر سے باہر لے کر جائیں اور گھر سے باہر کھیلنے پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، اس کے فوائد سے آگاہ کریں نیز اسکول میں بھی انھیں کھیلوں میں حصہ لینے پر شاباش دیں، تبھی وہ صحتمند جسم کے ساتھ صحت مند ذہن کے بھی مالک بنیں گے۔
پہلے وقتوں میں بچوں کی صحت اس لیے قابل رشک ہوتی تھی کیونکہ وہ جسمانی مشقت والے کھیل بہت زیادہ کھیلتے تھے۔

بچوں کی نیند کا خیال رکھیں:

کم عمر بچوں کے تمام جسمانی اعضاء ہی افزائش کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کی بہترین صحت کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزانہ دس گھنٹے ضرور سوئیں۔ بچوں کے دماغ بہت زیادہ متحرک ہوتے ہیں۔ اگر وہ مقرر کردہ اپنی نیند پوری کریں گے تبھی ان کی ذہنی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئیں گی اور وہ دن بھر کی تھکاوٹ دُور کر کے اگلے دن کے لیے پھر سے تازہ دم ہو سکیں گے۔

روزانہ ورزش کریں:

والدین کو جس قدر اولاد کے مستقبل کی پروا ہوتی ہے، اسی قدر ان کی صحت کی بھی ہونی چاہیے۔ ہر وقت اسمارٹ فون، ٹیب یا ٹی وی دیکھنے کے سبب نہ صرف بچے موٹاپے کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ ان کی آنکھیں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین روزانہ انہیں ورزش ضرور کروائیں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خصوصاً آنکھوں کی، تاکہ انھیں دباؤ اور درد سے نجات ملے۔ اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ بچے توجہ مرتکز کر کے کوئی بھی کام کر رہے ہوں چاہے وہ برقی آلات کا استعمال ہو یا پڑھنا، ہر آدھے گھنٹے بعد بیس سیکنڈ کا وقفہ ضرور لیں۔ نیز پلکوں کو چند سیکنڈ جھپکانے کے بعد دوبارہ کام پر توجہ دیں۔ اس سے آنکھیں درد کا شکار نہیں ہوں گی۔

مخصوص فاصلہ برقرار رکھیں:

بچے جب بھی ٹی وی، اسمارٹ فون، ٹیب یا لیپ ٹاپ دیکھ رہے ہوں، والدین اس بات کا دھیان ضرور رکھیں کہ برقی آلات ان سے دُور مخصوص فاصلے پر ہوں۔ خصوصاً ٹی وی بیس انچ کی دُوری پر رکھا ہو۔ اسی طرح اسمارٹ فون اور ٹیب بھی دُور سے دیکھیں اور اگر آپ کا بچہ ہر چیز بہت نزدیک کر کے دیکھتا ہے تو فوراً آنکھوں کے معالج سے رجوع کریں۔

والدین بچوں کے ساتھ میل جول و بات چیت کریں:

عموماً والدین کام کی زیادتی یا مصروفیات کے باعث جدید ٹیکنالوجی تو بچوں کو فراہم کر دیتے لیکن خود ان سے دُور ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً بچے دن رات انھی آلات کا استعمال کرتے رہتے اگر ان پر نظر نہ رکھی جائے۔ ایسے بچے معاشرتی طور پر بہت زیادہ تنہا ہو جاتے ہیں کیونکہ جب تمام دن جب وہ اسمارٹ فون یا ٹیب استعمال کریں گے۔ گھر سے باہر جا کر کھیلنا اور نہ ہی والدین کے پاس بیٹھنا تو ایسی صورت میں بچے کا سماجی اور انفرادی طور پر تنہا ہونا ایک فطری عمل ہے۔

والدین کو چاہیے کہ روزانہ اپنے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزاریں، ان سے روزانہ کی مصروفیت کے متعلق پوچھیں کہ سارا دن انھوں نے کیا کھایا، کیا پڑھا اور کیا کھیلا؟ اس سے نہ صرف انھیں بچوں کی پسند و ناپسند کا پتا چلے گا بلکہ اُس کی روٹین کا بھی اندازہ ہوگا کہ کون سا کام یا چیز وہ غلط کر رہا ہے، جسے کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ باہمی میل جول سے والدین اور بچوں میں قربت بڑھتی نیز احساسِ تنہائی کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔

ظاہری جسمانی حالت میں تبدیلی

وہ بچے جو بہت زیادہ وقت کے لیے موبائل فون، ٹیب یا لیپ ٹاپ استعمال کرتے ہیں، انھیں کمر، گردن اور پٹھوں کے درد کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ لمبے عرصے تک ایک ہی طریقے سے بیٹھے رہیں تو ان مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک تو والدین زیادہ وقت کے لیے اسمارٹ فون یا ٹیب استعمال نہ کرنے دیں اور اگر ایسا کرنا ضروری ہے یعنی بچہ کوئی کام کر رہا تو ہر آدھے گھنٹے بعد اسے وقفہ کر کے اپنے بیٹھنے کا انداز بدلنے کا کہیں تاکہ آنے والی تکلیف سے جس حد تک ممکن ہو بچا جا سکے۔

بچوں کو جدید اسمارٹ فون اور دیگر گیجٹس کب دیں؟

ماہرین کے مطابق یوں تو بچوں کو جدید گیجٹس فراہم کرنے کی کوئی خاص عمر متعین نہیں لیکن بچوں اور بڑوں میں بڑھتے ہوئے عوارض کے باعث ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ان کے استعمال کی عمر مقرر کی ہے جس کا درج بالا سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ تاہم ماہرِ نفسیات کے مطابق بچوں کو اسمارٹ فون اور دیگر آلات دیتے وقت کچھ باتوں کا خیال ضرور رکھیں۔

☆ بچہ اسکرین دیکھنے اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کے قوانین کا پابند ہو۔

☆ بچہ بہت زیادہ فون یا میسج کرنے کا عادی تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو بعد میں سوشل میڈیا کے استعمال سے یہ شدت مزید بڑھ سکتی ہے۔ اس لیے پہلے ہی بچے کو آگاہی فراہم کر دیں۔

☆ بچہ فضول خرچ یا ضدی تو نہیں کیونکہ نیٹ پر نت نئی چیزوں کی پبلسٹی ہوتی رہتی۔ ایسا نہ ہو بچہ بعد میں ہر روز جدید اور نئی اشیاء کی آرزو کرے۔

☆ بچہ اپنی چیزوں کی حفاظت کرنے کا عادی ہے؟ اگر عادی ہوگا تبھی وہ اپنے موبائل فون یا ٹیب وغیرہ کی حفاظت کر سکے گا۔ بچے تو ناسمجھ اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان کو تو آپ جس چیز کا عادی بنائیں گے، وہ وہی کام کرنے لگ جائیں گے۔

اولاد والدین کا سرمایۂ حیات ہوتی، اس لیے اپنے آرام اور سکون کے لیے انھیں ٹیکنالوجی کے حوالے مت کریں۔ اپنی محبت، شفقت اور توجہ کو اسمارٹ فون سے مت تبدیل کریں۔ ایسا نہ ہو پھر آپ کو پچھتانا پڑے اور تب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

احمد سلیمی

سڑکوں پر...... ہوش کے ساتھ ہی مانگنے کی عادت جڑ پکڑ چکی تھی...... پھر اس کے مزید بھائی بہن پیدا ہو کر بڑے ہوئے۔

اس کی آنکھوں کے سارے خواب مر گئے تھے۔ اب تو اسے یاد ہی نہیں تھا کہ کبھی، خوابوں کی تتلیاں بھی اس نے پکڑنا چاہا تھا۔ اب خواب نہیں تھے، مگر دن رات زندگی کے عذاب تھے۔ اس کی زندگی ہی کتنی تھی؟ بارہ سال! اس عمر میں لڑکیاں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ گھر میں کام کرتیں اور نخرے، فرمائشیں زیادہ۔

اسے یاد نہیں تھا کبھی باپ سے اس نے کوئی فرمائش کی ہو۔ اسے ناز نخرے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں ایک تھیلا اُٹھائے، اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ پھرتے رہنا اسے یاد تھا۔ اس کے آگے دنیا کا حسن یہی تھا کہ چند مڑے تڑے کرنسی نوٹ اسے ملیں، تھیلے میں کچھ کھانے کی اور جلانے کی چیزیں بھر جائیں۔ بارہ سال کی اس لڑکی کے کچھ خواب اگر تھے تو یہی تھے۔

اس کا نام بختاور تھا مگر زندگی نصیبوں جلی تھی۔ تین بہنوں میں منجھلی تھی۔ دو چھوٹے بھائی تھے۔ باپ کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایسا ہڈ حرام تھا۔ افیون اور چرس کے نشے میں دھت اکثر اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ کبھی کبھار مزدوری کرتا تو وہ پیسے اپنے نشے میں اُڑا دیتا۔

بختاور کو یاد تھا، جب سے اس نے ہوش سنبھالا، ماں اور بڑی بہن کے ساتھ مانگنے جایا کرتی۔ کبھی گھروں میں کبھی

کورونا! تیرا شکریہ!

معصوم بچی کے دل سے نکلے الفاظ نے جب ایک ماں کو ہکا بکا کر دیا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اب ماں کے بغیر بھی وہ جانے لگے۔ اللہ پاک بے نیاز ہے۔

گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوتے مگر اولاد کی کثرت تھی نہ جانے اب یہ عطا تھی سزا تھی یا آزمائش۔

بختاور جوں جوں بڑی ہوئی، اس کے دماغ میں بہت سی باتیں شور مچاتیں۔ وہ اپنی ایسی زندگی سے تنگ آچکی تھی۔ کسی کا دروازہ کھٹکھٹا کے کچھ مانگتے ہوئے، گھر کی عورتوں کے ناگوار چہروں اور کڑوی باتوں سے دل پھٹ سا جاتا۔ دل میں دھواں سا بھر جاتا۔ کوئی کچھ دیتا بھی تھا تو جتلا کے، ہزار باتیں سنائی جاتیں۔ طعنے کسے جاتے، اُس کی اگلی پچھلی نسل کو کوسا جاتا۔

دس بارہ سال کی بچی کم سن ہوتی ہے مگر آج کے دور کا تیز رفتار میڈیا اسے سمجھدار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ بختاور کے گھر میں ٹی وی نہیں تھا مگر زندگی کی ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ لڑکوں کی چبھتی آنکھوں کو بھی خوب سمجھتی تھی۔ بازار اور سڑک پر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتی تو پیسے کم آنکھوں سے ہوس کے تیر زیادہ اُترتے تھے۔

کوئی دس روپے دے کر بے شمار سوال کرنے بیٹھ جاتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ باپ کیا کرتا ہے؟

وہ اور اس کے بھائی بہن ان سوالات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ روزانہ نئی نئی کہانیاں سُنا کر اپنی بے چارگی اور بے کسی بیان کرتے اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کرتے۔

بختاور اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ہیلی چوک سے لے کر اسمبلی کی عمارت تک......اور پورے جٹیال کی گلیوں میں صبح سے شام کر دیتی۔ شام تک تھیلا بھی بھر جاتا اور کچھ پیسے بھی مل جایا کرتے۔

اپنے قد سے بھی بڑے بڑے تھیلے وہ بھائی بہن کندھوں پر اُٹھائے بہت دور جوٹیال نالے کے پاس اپنے دو کمروں کے کچے مکان میں پہنچ جاتے۔ بھرا ہوا تھیلا اور کرنسی نوٹ دیکھ کر باپ اور ماں کی باچھیں کھل جاتیں۔ پھر گھر میں آگ بھی جلتی، چولہے پر ہانڈی بھی چڑھ جاتی۔

بختاور اور اس کے بھائی بہن اتنا تھکے ہوتے کہ کھانا کھاتے ہی جہاں جگہ ملتی لیٹ کر طویل دن کی عذاب ساعتوں کے بعد، مہربان رات کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔

کبھی نیند نہ آتی تو بختاور سوچتی تھی ایسا کب تک کرتی رہے گی؟ وہ لڑکی ذات ہے۔ کب تک لوگوں کی گندی نظروں سے خود کو بچائے گی۔ اس کی ماں اور بڑی بہن کی زندگی بھی ایسے ہی گزری تھی۔ ماں نے اسے سمجھایا تھا۔

''بھیک مانگتے ہوئے ہم غیرت کی قربانی دیتے ہیں۔ بس یاد رہے اپنی عزت بچا کر رکھنا۔ مرد ذات بہت کم بخت ہے۔ خبردار! اُسے انگلی پکڑنے مت دینا ورنہ بازو پکڑنے کو لپکے گا۔''

ایک دن وہ بھائی بہنوں کے ساتھ کُوڑا چننے کے لیے گئی تو حیران رہ گئی۔ اکثر لوگوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ سارا سارا دن پھرا کرتی تھی۔ اس دن اسے سمجھ نہیں آیا کہ لوگ پریشان سے، ایک دوسرے سے سہمے سہمے سے کیوں ہیں؟ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی تو وہ ایک دم پیچھے ہو جاتا۔ دکاندار بھی دُور سے ہی جھڑک کر بھگا دیتے۔ اس دن شام تک ان کے تھیلے میں چیزیں اور جیب میں پیسے بھی ہمیشہ سے کم تھے۔ اس شام انھوں نے باپ اور ماں دونوں سے گالیاں سنیں اور اپنے بستروں میں سسکتے رہے۔ آج کھانا بھی نہ ملا۔

چند روز تک ایسا ہی ہوتا رہا پھر ایک گھر کی بھلی مانس عورت نے اپنے ہاتھ بچاتے ہوئے انھیں لفافے میں کوئی چیز دے کر سمجھایا کہ ایک ایسی بیماری پھیلی ہے جو ایک انسان کو دوسرے سے لگتی ہے۔ اس لیے آئندہ میرے گھر مت آنا۔

وہ بھائی بہنوں کے ساتھ باہر سڑک پر آئی تو پولیس والوں نے روک کر خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ آئندہ گھر سے باہر نکلے تو تھانے میں بند کر دیں گے۔

گھر آ کر اُس نے باپ کو بتایا تو وہ گالی دے کر بولا:

''سب بکواس ہے۔ میں کئی دن سے اس بارے میں سن

رہا ہوں۔ سب کہتے ہیں کہ یہ ڈراما ہے۔ چین کے لوگ کتے اور سانپ کھاتے ہیں۔ یہ بیماری انھیں لگی ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔‘‘

بختاور بولی: ’’مگر ابا...... پولیس والوں نے بھی ہمیں منع کیا ہے۔‘‘

باپ نے اس کی بات کاٹی اور گرج کر بولا: ’’میں کچھ نہیں جانتا۔ بہانے مت بنا۔ کچھ آئے گا تو گھر چلے گا۔‘‘

ماں بولی: تم ذرا باہر جا کر پتا تو کرو۔ کیا پتا کوئی ایسی ویسی بات سچ مچ ہو۔ اِدھر کی عورتوں سے میں نے بھی ایسی بیماری کا سنا ہے۔‘‘

اس کا باپ غصے سے پاؤں پٹختا، گالیاں بکتا باہر گیا اور بہت دیر بعد بجھی بجھی حالت میں واپس آ کر کہنے لگا:

’’پورے علاقے میں خوف پھیلا ہوا ہے۔ ایک بیماری ہے، جسے کورونا کہتے ہیں۔ پوری دنیا میں پھیل چکی۔ گلگت میں بھی آ گئی ہے۔ سب لوگ گھروں میں بند ہیں۔‘‘

بختاور کی ماں فکر مند لہجے میں بولی: ’’اب کیا ہوگا؟ چولہا کیسے جلے گا؟ تم تو چارپائی توڑتے رہتے ہو۔ کبھی ہاتھ پاؤں چلائے ہوتے تو آج گھر چلتا۔‘‘

بختاور کا باپ ایسا نکما اور ناکارہ تھا کہ معصوم بچوں کی بھیک کی کمائی کھا کر پڑا رہتا۔ اب دھندہ رُک گیا تو ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ زندگی صرف نشے میں دھت رہنے کا نام نہیں۔

بختاور اور اس کے بھائی بہنوں کا کام بند ہو گیا۔ گھر میں کھانے کی قلت پڑ گئی مگر بختاور کی تو جیسے من کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر پھرتے رہنے، لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور برمے کی طرح بدن میں اُترتی ننگی نظروں سے بچ گئی تھی۔ گھر میں فاقے ضرور تھے مگر بختاور کے مزے ہو گئے۔ پہلے تھکے ہارے چُور چُور بدن کے ساتھ صبح کر دیتی تھی۔ اب دن اور رات دونوں سکون سے کٹنے لگے۔

اگلے دن باپ باہر سے آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ہاتھوں میں وزنی تھیلا تھا۔ اس میں چینی، آٹا، چاول اور چائے کی پتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چند چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کے لیے چار پانچ دنوں کا خرچہ تھا۔ اس نے بتایا کہ باہر گلی میں ایک تنظیم والے آئے تھے۔ ضرورت مندوں میں کورونا کی وجہ سے یہ راشن تقسیم کر رہے تھے۔ وہ تصویریں بھی نکال رہے تھے۔ کہہ رہے تھے اخباروں اور ٹی وی میں بھی ہم دکھائے جائیں گے۔

بختاور اور اس کے بھائی بہن میڈیا اور کورونا کو نہیں جانتے تھے۔ بس یہی بات ان کے لیے اہم تھی کہ ان کے گھر میں اب چولہا جلے گا۔ وہ بھوک سے کم سہی، مگر کچھ تو کھا سکیں گے۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے جیسے خیرات کی برسات ہونے لگی۔ اس کا باپ پہلے گھر سے نکلتا ہی نہ تھا۔ اب خدا جانے اسے کیسے معلوم ہو جاتا کہ فلاں جگہ خیراتی سامان تقسیم ہونے والا ہے۔ وہ گھر سے نکل جاتا اور واپسی پر تھیلا بھر کے لاتا۔

بختاور اور اس کے بھائی بہنوں کے لیے یہ کورونا جیسے رحمت بن گیا تھا۔ ان کے معصوم کندھوں سے گھر چلانے کا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب ان کا باپ تھیلا اور جیب بھر کے لاتا تھا۔ بھیک پہلے بھی ملتی تھی اور اب بھی۔ بس کورونا کے خوف سے اسے صدقے کا نام دے دیا گیا۔

بختاور اپنی ماں سے کہا کرتی: ’’ماں! یہ کورونا کب تک رہے گا؟ یہ کتنا اچھا ہے۔ ہم بھائی بہنوں کو کتنا آرام مل رہا ہے۔ ہمارا ابا پ اب کھانے کو لاتا ہے۔ میں تو سوچتی ہوں کہ یہ کورونا اب کبھی نہ جائے۔ اس نے ہمارے باپ کو بھی گھر کے لیے کچھ لانا سکھا دیا ہے۔ اے کورونا! تیرا شکریہ۔‘‘

معصوم بختاور کی بات سن کر ماں سمجھ ہی نہ پائی کہ وہ روئے یا ہنسے۔ ◆◆◆

دو گام سفر

محمد فاروق

بزاخفش فارسی زبان کی ترکیب ہے۔ "بز" فارسی زبان میں بکرے کو کہتے ہیں۔ جبکہ اخفش ایک عربی زبان شناس عالم تھے۔ بزاخفش سے مراد ہے اخفش کا بکرا۔ بزاخفش کی ترکیب اُس احمق شخص کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو بغیر سمجھے بوجھے گردن ہلادے۔ جو خالی الدماغ ہو۔ جس کو بات سمجھ نہ آئے مگر ہاں میں ہاں ملادے۔

اخفش کا پورا نام اخفش اکبر ابولخطاب عبدالحمید بن عبد المجید تھا۔ ولادت ہجر بحرین میں ہوئی۔ سکونت بصرہ میں رہی اور یہ قیس بن ثعلبہ کے غلام تھے۔ کتب تفاسیر میں اشعار کے ماہر تھے۔ اِن سے ایک جماعت نے علم حاصل کیا جن میں مشہور نام عیسی ابن عمر، ابوعبیدہ، اصمعی اور سیبویہ یہ ہیں۔ وفات ۱۷۷ھ میں ہوئی۔ اُن کی شہرت اخفش اکبر کے نام سے ہے۔

روایت ہے کہ اخفش اکبر اپنے طالب علمی کے دور میں انتہائی کند ذہن تھے۔ کوئی سبق اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عربی گرامر اُن کے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ خود اعتمادی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ ایک روز اُنھوں نے تنگ آکر اپنے اُستاد سے شکایت کی کہ مجھے سبق یاد نہیں ہوتا۔ عربی کی گردانیں میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ صرف ونحو کے قواعد کی پیچیدگیاں سلجھ نہیں رہیں، ایسی حالت میں کیسے پڑھوں؟

استاد نے اخفش کو مشورہ دیا کہ تم کسی کو عربی پڑھایا کرو۔ پڑھانے سے اسباق کی بار بار تکرار ہوتی ہے۔ اس طرح بہت سی الجھنیں سلجھ جاتی ہیں۔ مشکل طریق وتصور واضح ہو جاتے ہیں اور اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ اخفش گویا ہوئے، استاد محترم مجھ سے بھلا کون پڑھے گا۔ میرے تو اپنے دامن میں کچھ نہیں۔ اُن کے استاد نے اللہ جانے سنجیدگی سے کہا یا ازراہِ تفنن بات کی کہ تم ایک بکرا خرید لو۔ اُسے پڑھایا کرو۔ اخفش نے استاد کی نصیحت نہایت دیانت سے سمیٹ لی اور بکرا خرید لیا۔ اب اخفش کا معمول بن گیا کہ رات کو بیٹھ کر بکرے کو سبق سناتے۔ عربی صرف ونحو کے قائدے گوش گزار کرتے اور اس وقت تک بکرے کو سبق پڑھاتے رہتے، جب تک بکرا بول نہ اُٹھتا یا سر نہ ہلا دیتا۔ اخفش کے خیال میں جب بکرا بول پڑے یا سر ہلا دے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کو سبق یاد ہو گیا۔

بکرے کو سبق یاد ہوا یا نہیں، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، تاہم مسلسل محنت و ریاضت سے اخفش کو شرح صدر عطا ہو گیا۔ اُس کا دماغ کھل گیا اور زبان چل پڑی اور وہ ایسے فاضل و عالم بنے، کہ عربی زبان کے صف اول کے علما میں شمار ہوئے۔ تاہم بزاُخفش کی ترکیب ایسے شخص کے لیے بولی جانے لگی جو بغیر سمجھے کسی بات پر سر ہلا دے۔

اخفش کی روایت سے عیاں ہے کامیابی و کامرانی کی منزل

اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنا، اُن کی اصلاح کی کوشش نہ کرنا ایک منفی عادت ہے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

دور نہیں، صرف چلنا شرط ہے۔ ایک جذبہ دل چاہیے جو ہر چیز کو مقابل لے آتا ہو۔ قدم اُٹھائیں اگر راستے میں مشکلات ہیں تو دوسری طرف راستے میں ہزار ہا شجر سایہ دار آپ کے منتظر بھی ہیں۔ پیدائشی طور پر کوئی شخص بھی علوم وفنون کا ماہر نہیں ہوتا۔ مادر رحم سے کبھی کوئی انسان سیکھ کر نہیں آتا۔ انسان کورے ذہن کی حالت میں دنیا میں قدم رکھتا ہے اور یہ اس کی کوشش و محنت ہوتی ہے جو اسے مختلف علوم وفنون میں ماہر بناتی دیتی ہے۔

یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں رکاوٹوں سے زیادہ سیکھنے کے مواقع ہیں، بس سیکھنے کے لیے ایک مزاج اور پرعزم لگن ہونی چاہیے۔ غبی دماغ اور کند ذہن ہونا کوئی برائی اور کمزوری نہیں، البتہ اس غبی پن میں مبتلا رہنا، کند ذہنی کو روگ بنا کر پالنا ایک برائی اور کمزوری ہے۔

مندرجہ بالا روایت سے آشکارا ہوتا ہے کہ کامیاب اشخاص کی زندگی میں منزل کا تعین ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ساری توانائیاں ایک منزل کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے اس لیے آج اگر ہم کسی میدان میں کامیابی کا پرچم لہرانا چاہتے ہیں تو پہلے میدان کا تعین کریں۔ کس میدان عمل میں آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ سمت کے تعین کے بغیر سفر ایک سعی لاحاصل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اولاً کامیابی کے لیے کسی منزل کا تعین ہو، کار عمل کا کوئی شعبہ مقرر ہو، تب خوش نصیبی استقبال کرے گی۔

دوم یہ کہ کامیابی کے سفر میں سب سے بڑی سد راہ اپنی ذات ہوتی ہے۔ اپنے نقص وعیب تلاش کیے جائیں، اپنی خامیوں کوتاہیوں کو کھلے دل سے تسلیم کیا جائے، بالکل اُسی طرح جیسے اخفش نے اپنی کمزوری کا اقرار کیا کہ وہ کند ذہن اور غبی دماغ ہے۔ پھر اُس کمزوری کو دور کرنے کے لیے اس کا علاج کیا۔ یہ اُن کا مثبت طرزِ فکر تھا۔

اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنا، اُن کی اصلاح کی کوشش نہ کرنا ایک منفی عادت ہے۔ دوسروں پر اُنگشت نمائی کرنا اور اپنے عیب ونقص کی اصلاح کو فراموش کرنے کا رویہ ہمیشہ ناکام لوگوں کا طریق ہے۔ جو افراد ہر وقت دوسروں کے بارے میں شکایت کناں رہیں اور اپنی ذات میں موجود خامیاں بھول جائیں۔ کامیابی کے مواقع اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بیوقوف دوسروں کے نقص تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتے اور عقل مند اپنے عیب سنوارنے پر متوجہ رہتے ہیں۔

پہلا رویہ تخریب کا ہے جبکہ دوسرا تعمیر کا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ اخفش کے طریق پر نکتہ چیں ہوں گے، مگر اخفش چونکہ اپنی ذات پر نکتہ چیں تھا اس لیے وہ اپنی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سوئم، راستے کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کسی ایسے استاد یا ماہر شخص سے مشورہ ضرور لیں جو اُن راستوں سے پہلے گزرا ہو، جو راہوں کے نشیب وفراز سے شناسا ہو کیونکہ صحیح اور بروقت مشورہ سفر کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

چہارم، جو مشورہ ملے اس کے مطابق محنت وریاضت سے کام کرنا شروع کر دیں کامیابی کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ آپ دل جمعی سے اپنے کام میں مشغول رہیں۔ مشیت الٰہی جلد آپ کی کاوشوں کو ثمر بار کرے گی۔ عجلت بازی سے گریزاں رہیں کیونکہ کامیابی اچانک برق آسمانی کی طرح چمکتی ہے نہ یکدم زلزلہ کی طرح آتی ہے، بلکہ یہ بتدریج خوشبو کی طرح پھیلتی جاتی ہے۔ یہ تو ایک پودے کی مانند نشوونما پاتی ہے۔ جیسے پودا فوراً وجود میں نہیں آتا، پہلے بیج سے تنا بنتا ہے، پھر شاخیں اور پتے نکلتے ہیں، پھر پھول کھلتے اور پھل پکتے ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد پودا شجر سایہ دار میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس سفر میں کوئی طریق مختصر نہیں ہے۔

عام طور پر لوگ دو گام چلتے اور ہمت ہار بیٹھتے ہیں جبکہ مسلسل محنت سے ہی خوابوں کو تعبیر ملتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کامیابی ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کا ثمر ہوتی ہے۔ جو بھی سستی وکاہلی کی بیڑیاں قدموں سے اُتار کر سرگرم عمل ہوگا۔ رحمت خداوندی اسی پر سایہ افگن ہوگی۔ ◆◆◆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مختصر افسانہ

مکمل عشق

مریم چودھری

"تمہیں ہر چیز اتنی آسان کیوں لگتی ہے؟ تم ہر وقت مسکراتی رہتی ہو؟ تم بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ہمیں نہیں پکارتیں۔ درد ہو تو تم چلاتی بھی نہیں۔ تم لوگوں کی پروا کیوں نہیں کرتی؟ تم نے کبھی نہیں سوچا کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ایک ہم ہیں جو اپنی زندگی ہی لوگوں کے لیے جیتے ہیں۔ تم اتنی الگ سی کیوں ہو؟ آخر ایسا کیا ہے تم میں؟ جو تمہیں ہم سب سے ممتاز بناتا ہے۔ ایسا سکون اور اطمینان ہمیں نصیب کیوں نہیں؟ کچھ تو خاص ہے تمہارے پاس ہے جو ہم نہیں جانتے۔"

فجر عجوہ کے ساتھ چائے کی بیٹھک پر یہ گفتگو کر رہی تھی۔ عجوہ مسکراتی رہی۔ عجب نور تھا اس کے چہرے پر۔ فجر کو شک تھا کہ عجوہ کو یقیناً کسی سے محبت ہے تبھی اتنے رنگ اس کے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو سر سے پاؤں تک عشق میں ڈوبی ہوئی تھی

چہرے پر کھلتے ہیں مگر کس سے؟ کون ہے وہ جس کے عشق میں عجوہ اتنی سرشار رہتی ہے؟ فجر جاننا چاہتی تھی لیکن پوچھنے کی ہمت کبھی نہ کرسکی۔ اتنے میں عجوہ کی کلاس کا وقت ہو گیا۔ اُسے اُٹھ کر جانا پڑا۔

☆☆☆

"دیکھو عجوہ! میں کب سے تمہارا انتظار کررہی تھی اور تم ہو کہ اتنی دیر سے آئی ہو۔ کاش ہماری کلاس بھی ایک ساتھ ہی ہوتی۔ یہ چند گھنٹوں کی دُوری بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ عجیب بے چینی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ مجھے سمجھ نہیں آتا۔ اس دوستی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" یونیورسٹی کے باہر کھڑی فجر عجوہ سے مخاطب تھی۔

"اچھا بابا! اب ایسا نہیں ہوگا۔ کوشش کروں گی جلد باہر آجایا کروں۔" عجوہ مسکراتے ہوئے فجر کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی۔ اسی ازلی اطمینان اور مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

☆☆☆

بھائی مجھے سمجھ نہیں آتا عجوہ کا اور میرا آٹھ سال کا سفر ہے۔ میں نے کبھی بھی اس لڑکی کو جھگڑا کرتے نہیں دیکھا۔ ہر چیز سے مطمئن رہتی ہے...... اور تو اور اپنے حق کے لیے بھی نہیں لڑتی۔ بہت ہی خوش رہنے والوں میں سے ہے۔ جب بھی کچھ مانگو، دے دیتی ہے۔ مدد کے لیے ایسے بھاگتی ہے جیسے اس کے سوا کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ مجھے آج تک میری اور اس کی دوستی سمجھ ہی نہیں آئی۔ ادھر مجھے تکلیف ہوئی اور دوسرے ہی پل وہ میرے پاس ہوتی ہے۔ ایسے جیسے میرا اور اس کا روحانی رشتہ ہو...... انتہائی گہرا۔

"بھائی اس میں ضرور کچھ ہے۔ ورنہ کوئی کیسے آپ کے سکون کی وجہ بن سکتا ہے مگر ایک بات ہے، آج تک میں اس کے گھر نہیں جاسکی۔ مجھے جانا چاہیے۔ اب تو اتنا وقت گزر گیا اور یونیورسٹی بھی مکمل ہونے کو ہے۔ مجھے معلوم ہے اس دفعہ پھر سے عجوہ ہی ٹاپ ٹین میں آئے گی۔" یونیورسٹی جاتے ہوئے فجر اپنے بھائی سے محو گفتگو تھی۔ اتنے میں وہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ فجر نے گاڑی سے اُتر کر بھائی کو خدا حافظ کہا اور اندر کی جانب چل دی۔ اس کی نگاہیں عجوہ کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں

☆☆☆

اتنا وقت ہونے کو ہے، عجوہ کہاں رہ گئی؟ وہ تو چھٹی بھی نہیں کرتی...... اور...... اور اب تو آخری سمیسٹر کے امتحانات بھی سر پر ہیں۔ چھٹی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر وہ کہاں رہ گئی؟ فون کال بھی نہیں اُٹھا رہی۔

فجر کافی دیر سے عجوہ کا انتظار کررہی تھی اور آتے جاتے ہر شخص سے پوچھ چکی تھی مگر سارا دن گزر جانے کے بعد تک کوئی خیر خبر نہ مل سکی۔ اس کی بے چینی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فجر نے گھر آتے ہی وہ پرانی کتاب نکالی جہاں عجوہ کے گھر کا پتا موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کی گلی میں موجود تھی۔

☆☆☆

عجوہ کے گھر کے قریب بہت ہجوم تھا۔ لوگ ہی لوگ۔ جوں ہی فجر اس کے گھر میں داخل ہوئی تو معلوم ہوا کہ عجوہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہے؟ لیکن یہ کیا؟ میں جیسے ہی یہاں آئی ہوں مجھے عجیب سا سکون ملا ہے جیسے میں عجوہ کے پاس ہوں۔ وہ نہیں جاسکتی۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اچانک یہ خبر سن کر فجر خود کو سنبھال نہ سکی اور عجیب صدمے میں چلی گئی۔

وہ عجوہ کے کمرے میں ایک ایک چیز حیرت اور آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لیے دیکھ رہی تھی۔ دیواروں پر محمدؐ کے پاک نام کی خطاطی والے فریم، درود شریف لکھے فریم، عجوہ کے ہاتھوں سے لکھا محمدؐ کا نام، جگہ جگہ۔ اس کی نوٹ بک فجر کے ہاتھ میں تھی۔ جس میں لکھی ہر تحریر کا ایک ایک لفظ عشق

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہے؟

ایک تڑپ محبوب جیسا بننے کی، ایک لگن نقش پا پر چلنے کی کوئی لمحہ چین نہیں لینے دیتی۔ ہر لحظہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو نا گوار خاطر ہو۔ اسے محبت کا خوف کہتے ہیں۔ یہ محبت کا خوف عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام نے پالیا تھا۔ پھر ان کی آلائشیں صاف ہوتی گئیں۔ یہ عشق انہیں سفلی زندگی کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھا کر آسمانوں کی بلندیوں پر لے گیا۔ ستاروں کی مانند چمکنے کا خطاب دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پالیا۔ ان میں سے ہر ایک ہادی بن گیا۔ یہی ارشاد ہوا کہ جس کی بھی پیروی کرو گے منزل نزدیک تر ہو جائے گی۔

شیر خدا علی کرم اللہ وجہ حالت جنگ میں مد مقابل کو گرا کر سینہ پر چڑھ گئے۔ کفر ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ بھی تھا۔ جلد ہی ہمت ہار گیا۔ چہرہ مبارک پر تھوک دیا کہ اشتعال میں آ کر جلدی کام تمام کر دیں۔ پر شیر خدا نے چھوڑ دیا۔ یہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا تھا کہ جب میرے محبوب نے کبھی ذاتی مخاصمت نہیں رکھی تو مجھے بھی زیب نہیں دیتی۔ حالت جنگ، جذبات عروج پر لیکن محبوب کے عشق کی اور اپنی وفا کی لاج رکھنا فراموش نہیں ہوئی۔ یہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ایک روز عثمان غنی رسالت مآب کے پیچھے چلتے ہوئے قدموں کے نشان مبارک گنتے جا رہے تھے۔ پلٹ کو پوچھ لیا۔ عثمان کیا کر رہے ہو۔ عرض کیا قدموں کے نشان گن رہا ہوں کہ ان قدموں کی تعداد کے برابر غلام آزاد کر سکوں اور کر بھی دیے۔ یہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ہر نقش پا پر ہر ادا پر سو طریقوں سے قربان۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گواہ تھا۔ اوہ..... تو وہ یہ عشق تھا جس میں عجوہ گم تھی، سرتا پاؤں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی وہ نام اور مکمل ذات تھی، جس کی خوشبو فجر کو عجوہ سے جوڑے رکھتی تھی۔ یہی وہ سکون تھا، جو عجوہ کے اندر سے نکل کر فجر کو اپنے اندر اُترتا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ بے خودسی ہو کر عجوہ کے پاس بھاگی آتی تھی۔ تو وہ روحانی رشتہ یہ تھا۔ آج فجر گنگ تھی۔

☆☆☆

"میرا ہمیشہ یہ کہنا تھا کہ عشق محض اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور عجوہ ہمیشہ اس کے خلاف بولتی۔ وہ کہتی، "بھلا عشق میں اذیت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تو تسکینِ دل کے سوا کچھ بھی نہیں۔" وہ کتنی سچی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی اور میں جاہل اسے دنیاوی اور عام عشق سمجھتی رہی۔

جس کا عشق اللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہو بھلا اس میں اذیت کیسی؟..... اور اس کی زندگی میں بے چینی کیسی؟ تکلیف کیسی؟ مجھے آج ہر اس سوال کا جواب مل رہا ہے جو میں اس سے آٹھ سال پوچھتی رہی اور اس کا وہ مطمئن انداز میں مسکرا دینا۔ مجھے آج احساس ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کر کے، ان سے عشق کر کے بہت سکون ملتا ہے..... اور پھر ساتھ رہنا۔

عجوہ کا عشق بھی مدینہ تھا..... اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ میں ہمیشہ عجوہ سے پوچھتی رہتی مگر مجھے اب جواب مل گیا ہے کہ..... عشق میں کتنا سکون ہے۔ محبت اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراپا عشق..... عشق میں سکون کے سوا کچھ بھی نہیں اور اللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہی مکمل عشق ہے۔

فجر حرم پاک میں بیٹھی اپنے بھائی سے گفتگو کر رہی تھی۔ آج اس کے ارد گرد بھی سکون کے سوا کچھ نہیں تھا۔

جگ بیتی

ڈاکٹر اختر احمد

کچھ بھی ناممکن نہیں

اگر حوصلہ اور ارادے بلند ہوں تو غربت بھی آپ کی کامیابی کے آڑے نہیں آسکتی

پیرو، براعظم جنوبی امریکہ کا تیسرا بڑا ملک ہے جس کی تاریخ اور ثقافت 15 ہزار سال سے زیادہ ہے۔ ایک طرف ایمزون کے جنگلات کا دوسرا بڑا حصہ یہاں موجود ہے تو دوسری طرف کوہ انڈیز کا وسطی سلسلہ بھی، جو رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا اور اُونچائی کے اعتبار سے ہمالیہ کے بعد دوسرا سب سے اُونچا پہاڑی سلسلہ ہے۔

پیرو سیاحوں کے لیے بہت کشش رکھتا ہے اور دنیا کے کئی حصوں سے لوگ اس کی سیاحت کرنے آتے ہیں۔ سیاحت کے لیے کولوراڈو کی ڈوڈسن فیملی بھی یہاں آئی تھی۔ اس گھرانے کی 11 سالہ اینا بھی اس سفر کے بارے میں بہت پُرجوش تھی۔ پیرو میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ مصر کی طرح آثارِ قدیمہ، یہاں موجود جنگلی حیاتیات جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے۔ اینا کو سب اچھا تو لگ رہا تھا مگر اسے بے چینی سے انتظار تھا کوسکو کی سیر کا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اینا نے رخ کیا اپنی آخری منزل یعنی پیرو کے شہر کوسکو کا جہاں اس کی خواہش ایک یتیم خانہ دیکھنے کی تھی۔ اس سفر کے لیے اینا

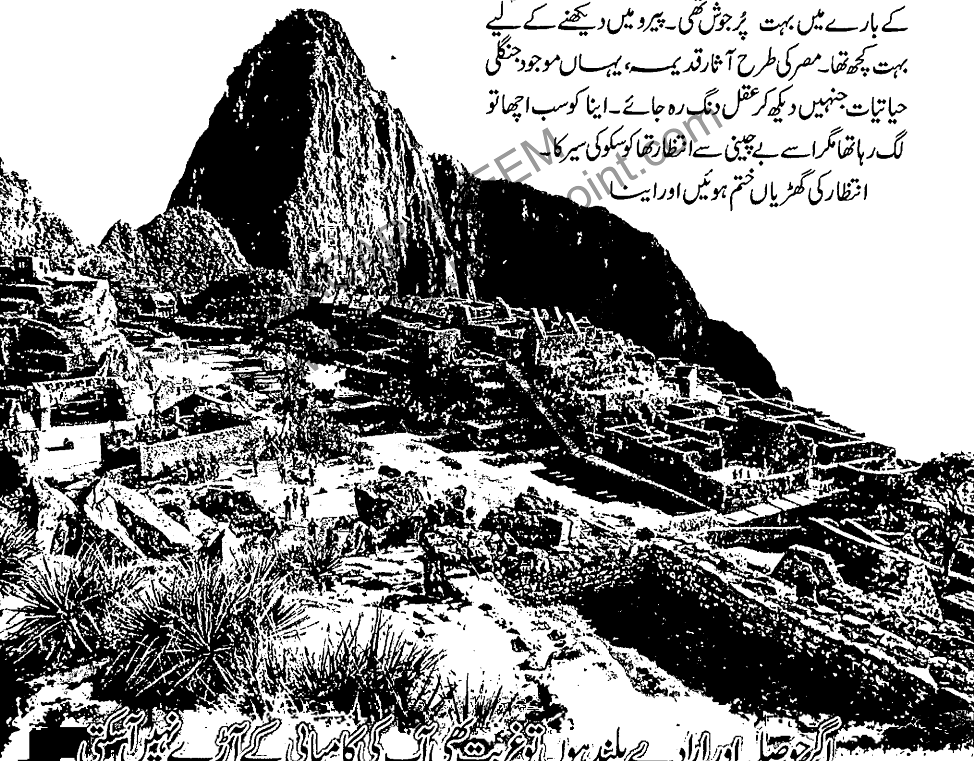

نے تیاری بھی کی تھی۔ وہ اپنے ساتھ یتیم خانے کی بچیوں کے لیے گڑیائیں، ٹیڈی بیئر اور چھوٹے تحائف بھی لے کر گئی تھی۔ ان لوگوں کا یتیم خانے میں بہت پُرجوش استقبال ہوا۔ بچیوں نے ایان کے اعزاز میں ایک مقامی رقص کا بھی مظاہرہ کیا۔ اینا نے ایک اُستاد سے پوچھا:

''کیا آپ کے ہاں آنے والے تمام مہمانوں کا استقبال اسی طرح کیا جاتا ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، جو مہمان بھی آئے گا، یہ بچیاں اسی محبت اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کریں گی۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ آپ ہمارے اس یتیم خانے کی پہلی مہمان ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اینا نے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ جب سے ہمارا یہ یتیم خانہ قائم ہوا ہے کسی نے آج تک اس کا دورہ نہیں کیا۔ آپ پہلی مہمان ہیں جس نے اس یتیم خانے کو دیکھنے کی خواہش کی۔''

''پھر چندہ یا فنڈ کیسے آتے ہیں؟'' اینا نے پوچھا۔

''ہمیں کوئی معقول چندہ نہیں ملتا۔ باقی رہا ہمارا گزارا تو ان بچیوں کے نصیب سے کوئی نہ کوئی آسرا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ بچیاں کئی کئی وقت کھانا نہ ملنے یا ناقص غذا ملنے پر صبر شکر کر لیتی ہیں۔''

اینا خوراک کی کمی کی شکار بچیوں کو دیکھ کر دکھی ہو گئی۔ اینا نے وہ دن یتیم خانے کی بچیوں کے ساتھ بہت بھرپور انداز میں گزارا۔ ان کے ساتھ خوب کھیلی۔ شام کو اینا کی واپسی سے پہلے سب بچیاں بہت اُداس ہو گئیں۔ اس یتیم خانے کی بچیوں کے درمیان 11 سال کی اس چھوٹی سی بچی نے دل ہی دل میں کئی بڑے فیصلے کر لیے تھے جس کا اس وقت تذکرہ مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اینا اپنی آنکھوں کی نمی اپنی ہتھیلی کی پشت سے دور کرتے ہوئے ان بچیوں کو بائے بائے کر کے واپس اپنے شہر کولوراڈو چلی گئی۔

وہاں سے آنے کے بعد اینا اپنے ساتھ اتنا پیار لائی تھی کہ اس نے اس پیار کو اپنی سہیلیوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنی ان ہم جماعتوں، کی جو ہسپانوی زبان کی طالبات تھیں، کوسکو کے یتیم خانے کی بچیوں سے قلمی دوستی کرا کے محبت اور اپنائیت کے رشتوں کو مزید فروغ دیا۔ اینا اکثر اپنی ماں سے یتیم خانے کی ہی باتیں کیا کرتی۔

اینا نے اپنے گھر والوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کیوں نہ مستقل بنیادوں پر وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کوسکو کے یتیم خانے کی بچیوں کے حالات بہتر ہو سکیں۔ کم از کم مستقل بنیادوں پر بے چاریاں پیٹ بھر کر کھانا تو کھا سکیں۔ اینا کے والدین نے اسے اجازت دے دی۔ اینا نے بہت چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا۔ اس کی ہم جماعت اور پھر اسکول کی سہیلیوں نے اپنا فالتو سامان الگ کیا تو انھیں خود ہی اپنے وہ کپڑے، کھلونے، سینڈل اور دیگر چیزیں بھی نظر آ گئیں جو اگرچہ ان کے دل سے اُتر چکی تھیں مگر تھیں بالکل نئی اور کوسکو کی یتیم لڑکیوں کے لیے بہت قیمتی تحفہ۔

اینا کا حوصلہ بڑھا اور اس نے کمیونٹی سے بھی چندا اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور کمیونٹی نے بھی اینا کی لگن کو دیکھتے ہوئے اسے مایوس نہیں کیا۔ یوں باقاعدہ طریقے سے ''دل پیرو والوں کا'' کے نام سے ایک خالص خدمتی اور غیر نفع بخش ادارے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ لوگوں نے ''دل پیرو والوں کا'' کی دل کھول کر مدد کی۔

اس تنظیم نے اپنے لیے یہ راہنما اصول منتخب کیا کہ اگر یہ دنیا کو بدلنا ہے تو دلوں کو بدلنا ہو گا، وہ بھی ایک ایک کر کے چنانچہ کوسکو کے اس یتیم خانے اور اس میں مقیم لڑکیوں کے حالات بدلنے شروع ہو گئے۔ عمارت میں نیا رنگ و روغن ہوا، نیا باورچی خانہ تعمیر ہوا۔ ایک گرین ہاؤس کی بنیاد رکھی گئی جس میں نہ صرف یہ کہ تازہ سبزیوں کا حصول ممکن ہوا بلکہ یتیم خانے کی انڈوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پولٹری فارم بھی قائم کیا گیا اور پھر اینا کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لیے سولر گیزر بھی لگائے گئے تاکہ اینا کی سہیلیاں بھی گرم پانی کے غسل کا لطف لے سکیں۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

چیوشن فیئ

''دل پیرو والوں کا'' نے ابتدائی چار برسوں میں ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ کی مدد فراہم کی۔ جس سے اس یتیم خانے کی طالبات کے لیے وظائف کا انتظام کیا گیا۔ ایک وظیفے کا نام ماریہ اسکالرشپ رکھا گیا جو سکو کی ایک مقامی خاتون کی یاد میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ خاتون غربت کے باعث تعلیم حاصل نہ کر سکی اور ایک بچی کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھی۔

اینا کو اس کارنامے پر کئی قومی ایوارڈ اور انعامات ملے مگر اینا کے لیے سب سے بڑا انعام سکو کی ان یتیم بچیوں کی محبت تھی جن کی وہ دوست بھی تھی، محسن اور آئیڈیل بھی۔

یتیموں کی پرورش کا حکم تمام مذاہب میں ہے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یتیم کی کفالت کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح پاس پاس ہوں گے، یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی۔

ہم یوں تو ہمیشہ دعا کرتے ہیں کہ روزِ قیامت ہمیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اور دیدار نصیب ہو مگر آخر کیوں اس کا وہ آسان راستہ نہیں اپناتے جس کا اشارہ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم کسی یتیم کی اپنے بچوں کے ساتھ پرورش کرتے ہیں یا کسی یتیم خانہ کی مدد کرتے ہیں۔ تو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نصیب ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

☆اسکول سے نکالی جانے والی لڑکی......اب امیر ترین

اگر حوصلہ اور ارادے بلند ہوں تو غربت بھی آپ کے آڑے نہیں آسکتی اور آپ دنیا کے کامیاب ترین انسان بن سکتے ہیں۔ اس بات کو ایک چینی خاتون نے سچ کر دکھایا۔

انتہائی غربت اور مفلسی میں پیدا ہونے والی چیوشن فیئ اس وقت 7 ارب ڈالر (7000 ارب روپے) کی مالکہ ہے۔

ایک وقت تھا جب اسے اسکول سے مفلسی کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اپنی ترقی کے راستے میں غربت کو نہ آنے دیا۔ چیو اس وقت Lens Technologies کی چیف ایگزیکٹو ہے۔ یہ وہ کمپنی ہے جو دنیا بھر کے موبائل فونز کے لیے ٹچ اسکرین بناتی ہے، ایپل اور سام سنگ بھی اس کے کسٹمرز میں شامل ہیں۔

چیو چین کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے والد فیکٹری میں کام کے دوران حادثہ میں نابینا ہو گئے۔ اسے اسکول سے سولہ سال کی عمر میں نکال دیا گیا اور اس نے ایک فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا جہاں وہ گھڑیوں کے لینز بنایا کرتے تھے۔ اس کی ایک دن کی آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم تھی۔

چیو نے اپنی بچت کے ساتھ تین ہزار ڈالر کے ساتھ کاروبار کا آغاز کیا اور ایک ایسا موقع آیا کہ اسے اپنا گھر بیچ کر ملازمین کی تنخواہیں دینی پڑیں لیکن اس نے بالکل ہمت نہ ہاری۔

2003ء میں جب اسمارٹ فونز کا سلسلہ ہوا تو اسے بہترین مواقع میسر آئے۔ اس نے فونز کے ٹچ اسکرین بنانے

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

شروع کردیے اور یہاں اس کی ترقی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

☆☆☆

☆دو بھائیوں کا خواب

یہ بات 1878ء کی ہے۔ ایک شخص سفر سے واپس آیا تو اس کے بیٹے دُور سے ہی اسے دیکھ کر اس کی طرف لپکے۔ بڑا بیٹا 11 سال کا تھا اور چھوٹا 7 سال کا۔ ابھی بچوں اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا کہ اس نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا اور کہا:

"بیٹو! میں تمہارے لیے ایک چیز لایا ہوں۔ لو اسے پکڑو۔" اور اس نے ایک چیز ان کی جانب اُچھال دی۔ دونوں بیٹے اسے پکڑنے کے لیے تیار تھے مگر اس ایک لمحے میں ایک ایسی بات ہوئی اس نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ وہ چیز ان بچوں کی ہاتھوں میں آنے کے بجائے چھت کی سمت اُڑنے لگی اور چند لحموں میں پھڑ پھڑ کر فرش پر گر پڑی۔ لڑکے پھٹی آنکھوں سے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ تیزی سے اس کھلونے کی سمت بھاگے۔ وہ ایک اُڑنے والا مشینی کھلونا تھا جسے تار، بانس اور کاغذ سے بنایا گیا تھا۔

اس کھلونے نے بچوں میں پرواز کا جنون بھر دیا۔ وہ اس کھلونے سے اس وقت تک کھیلتے رہے جب تک وہ ٹوٹ نہیں گیا۔ چونکہ ان کے پاس کوئی دوسرا کھلونا نہیں تھا لہٰذا انھوں نے خود ہی اس قسم کا کھلونا بنالیا۔ بعد میں انھوں نے پتنگیں بنانا شروع کردیں۔ جو اس قدر عمدہ ہوتیں کہ محلے کے تمام لڑکے انھی سے خریدتے۔

اُن لڑکوں کے نام تھے ولبر رائٹ Wilbur Wright اور آرول رائٹ Orivlle Wright جنہیں ہم رائٹ برادرز کے نام سے جانتے ہیں۔

دونوں بھائی جو چیز بھی اُڑتی ہوئی دیکھتے، تجسس سے تکنا شروع کر دیتے۔ گھنٹوں پشت پر لیٹ کر پتنگوں کو اُڑتا دیکھتے۔ چڑیوں اور کبوتروں کو اُڑتا دیکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ کس طرح عقاب بغیر بازو ہلائے اُڑتا رہتا ہے۔ وہ دونوں ہوا میں اُڑنا چاہتے تھے لیکن غربت کی وجہ سے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے۔

تعلیم یافتہ تھے نہیں، دیہات میں جا کر بدبودار مردہ گھوڑوں اور بھینسوں کی ہڈیاں چنتے اور انھیں کھاد کی فیکٹری میں فروخت کر دیتے۔ بعد میں وہ لوہے کے ٹکڑے چننے لگے جسے کباڑ خانے میں بیچ دیتے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) بنایا اور اخبارات شائع کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کاروبار ناکام ثابت ہوا۔ پھر انھوں نے سائیکلوں کی خرید و فروخت اور مرمت کی ایک چھوٹی سی دکان شروع کردی۔

اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے، اخبار کی پرنٹنگ کرتے ہوئے اور سائیکلوں کے ٹائروں میں ہوا بھرتے ہوئے وہ ایک خواب کبھی نہیں بھولے...... "پرواز کا خواب"...... یہ خواب کی طاقت ہی تھی جس نے 17 دسمبر 1903ء کے ایک ٹھٹھرتے دن انھیں مشینی پتنگ میں بٹھا دیا۔ ان کی محنت اور لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا

ہے کہ انھوں سے دوسو سے زائد تو صرف پروں پر تحقیق کی اور بالآخر انسانوں کے ہزاروں سال پرانے خواب ''ہوا میں اُڑنے'' کو یقینی بنا دیا۔

☆ آفس بوائے کا ای میل ایڈریس

ایک بے روزگار شخص نے ایک ادارے میں آفس بوائے (چپراسی) کے لیے درخواست دی۔

''تمہارا کام صفائی کرنا ہے، اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔'' انٹرویو کے بعد اسے منتخب کرتے ہوئے ایچ آر منیجر نے ایک کاغذ اس کے آگے بڑھایا:

''اس پر اپنا ای میل ایڈریس لکھ دو۔ میں تمہیں ایک فارم میل کروں گا، تم اسے بھر دینا۔''

''میرے پاس نہ تو کمپیوٹر ہے اور نہ ہی ای میل ایڈریس۔'' لڑکے نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

''کس دور میں جی رہے ہو بھائی۔'' منیجر نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

''جس شخص کا ای میل ایڈریس نہیں، اس کا وجود ہی نہیں اور جس کا وجود نہیں، اسے ہم نوکری پر کس طرح رکھ سکتے ہیں۔''

لڑکا نا اُمیدی کی حالت میں دفتر سے نکل گیا۔ اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہزار روپے کے نوٹ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

وہ بازار گیا اور سب پیسوں کے ٹماٹر خرید لیے اور گھر گھر جا کر بیچنے شروع کر دیے۔ دو گھنٹوں کے اندر اندر اس کے پیسے دگنے ہو گئے۔ پیسے لے کر وہ دوبارہ بازار گیا اور تمام ٹماٹر ایک مرتبہ پھر فروخت کر دیے۔ رات میں جب وہ گھر پہنچا تو اس کے پاس چار ہزار روپے تھے۔

کام بہت مشکل تھا، لیکن اس کے حوصلوں سے بڑا نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہر روز صبح جلدی اُٹھے گا، منڈی جائے گا اور رات دیر تک کام کرے گا۔ اس کا کام چل پڑا اور بہت جلد وہ ٹھیلا خریدنے کے قابل ہو گیا۔

اس کی مسکراہٹ، محنت اور سادگی نے پانچ سال کے اندر اندر اسے امیر اور خوشحال آدمی بنا دیا۔ اب اس نے سوچا کہ اپنے گھر والوں کا بیمہ (Insurance) کروانا چاہیے۔

ایک انشورنس ایجنٹ کو فون کر کے بلایا، اس سے تفصیلی ملاقات کی۔ مختلف منصوبوں کے متعلق معلومات لینے کے بعد معاملات طے کر لیے۔ جب گفتگو مکمل ہو گئی تو ایجنٹ نے فارم بھرنا شروع کیا۔ ایک نقطے پر پہنچ کر ایجنٹ نے سوال کیا۔

''آپ کا ای میل ایڈریس کیا ہے۔''

''میرا ای میل ایڈریس نہیں۔'' اس شخص نے سکون سے جواب دیا۔ اس شخص کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''آپ کا ای میل ایڈریس نہیں ہے اور اتنی زیادہ ترقی کر لی۔ آپ کو اندازہ ہے اگر آپ کا ای میل ایڈریس ہوتا تو آپ کیا ہوتے؟''

اس شخص نے تھوڑی دیر سوچا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آفس بوائے۔''

کامیابی ہر شخص کی دسترس میں ہے لیکن تم اسے حاصل اسی وقت کر سکتے ہو جب تمہیں اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت کا ادراک ہوتا ہے۔'' (اسٹیفن رچرڈز)

دکھوں، غموں اور مایوسیوں میں کھو کر انسان مسکرانا بھول جاتا ہے۔ دکھ اور مصیبتیں تو آزمائشوں کی طرح زندگی کے ساتھ چلتی ہیں مگر ان اداسیوں کو مسکراہٹوں میں بدلنے کے لیے یہ لاجواب مزاحیہ کلام نہایت عرق ریزی سے آپ کے لیے یکجا کیا گیا ہے۔ کچھ دیر کے لیے نا اُمیدی کے اندھیروں سے نکل کر خوشیاں تلاش کیجیے جو آپ کے آس پاس ہی موجود ہیں۔

☆☆☆☆

شوق سے لختِ جگر نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کے بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے دھڑ، راکٹ کے سر پیدا کرو
میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو
میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر پیدا کرو اور مختصر پیدا کرو
میری درویشی کے جشنِ تاجپوشی کے لیے
ایک ٹوپی اور کچھ مرغی کے پَر پیدا کرو
حضرت اقبال کا شاہین تو کب کا اُڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

(سیّد ضمیر جعفری)

☆☆☆

تم بھول گئے شاید

وہ جو دودھ شہد کی کھیر تھی
وہ جو نرم مثل حریر تھی
وہ جو آملے کا اچار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو ہرن کے سیخ کباب تھے
وہ جواب اپنا جواب تھے

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

وہ جو کوئٹہ کا انار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو سیب زینت باغ تھے
وہ جو شاخ شاخ چراغ تھے
وہ جو آلوؤں کو بخار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ رقیب کے جو بغیر تھی
وہ جو چاند رات کی سیر تھی
وہ جو عہد فصل بہار تھا
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(انور مسعود)

☆☆☆

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجیے
اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسا ضرور ہو کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگرچہ بیس تو دس خام بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجیے

(اکبر الہٰ آبادی)

☆☆☆

خبط مجھ کو شاعری کا جب ہوا
دس منٹ میں ساٹھ غزلیں کہہ گیا
سب سے رو رو کر کہا سن لو غزل
تاکہ میں ہو جاؤں پھر سے نارمل
رحم اپنوں کو نہ آیا جب ذرا
تو پریشاں ہو کے ہوٹل میں گیا
تاکہ مل جائے اک ایسا آدمی
چائے پی کر جو سنے غزلیں مری
جا کے بیٹھا سات گھنٹے جب وہاں
اک معزز شخص آئے ناگہاں
دیکھتے ہی ہو گیا دل باغ باغ
اب تو ہوگا پیٹ ہلکا اور دماغ
بعد از آداب اور تسلیم کے
میں نے ان سے یہ کہا تعظیم سے
آئیے تکلیف اتنی کیجیے
چائے میرے ساتھ ہی پی لیجیے
آ کے بیٹھے ساتھ جب کی التجا
آپ کا جو حکم ہو منگواؤں گا
مسکرا کر پھر تو بولے آنجناب
مرغ یخنی قورمہ نرگس کباب
شیرمال و شاہی ٹکڑا فیرنی
اور اگر مل جائے تو چورن کوئی
توس مکھن دودھ کافی رائتا
الغرض جو کچھ کہا منگوا لیا
ناک تک جب کھا چکے میں نے کہا
ہو تعارف اب ہمارا آپ کا
نام ہے اسرار میرا محترم
ساری دنیا جانتی ہے بیش و کم
شاعر اعظم ہوں میں عزت مآب
وہ یہ بولے میں تو بہرا ہوں جناب

(اسرار جامعی)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پروفیسر ہی جب آتے ہوں ہفتہ وار کالج میں
تو اونچا کیوں نہ ہو تعلیم کا معیار کالج میں
کچھ ایسے بھی پڑھا کو پنچھیوں کو ہم نے دیکھا ہے
کہ پر دفتر میں پہنچے شہر میں منقار کالج میں
اگرچہ دوسرے مشروب بھی مہنگے نہیں ملتے
مگر چلتا ہے اکثر شربتِ دیدار کالج میں
وہ ڈگری کی بجائے میم لے کر لوٹ آیا ہے
ملا تھا داخلہ جس کو سمندر پار کالج میں
مجھے ڈر ہے کہ ہم دونوں کہیں سمدھی نہ بن جائیں
تری گلنار کالج میں مرا گلزار کالج میں

(ڈاکٹر انعام الحق)

☆☆☆

مسرت کے دن بھی رُلاؤ گی، ظالم؟
ابھی پھر سے بازار جاؤ گی، ظالم؟
سنوارو گی کنگھے سے زلفوں کو اپنی
پہ چاندی کو کیسے چھپاؤ گی، ظالم؟
لگاؤ گی آنکھوں میں کاجل کا ناوک
محلے کے بچے ڈراؤ گی، ظالم؟
نکھارو گی رخسار غازہ لگا کر
کھنڈر کو دوبارہ بناؤ گی ظالم؟
بجا، مسکرا کر گئی ہے پڑوسن
مگر اب کچہری لگاؤ گی، ظالم؟
سنبھالوں گا بچے یا شاپر تمہارے
یہ بازار کب تک گھماؤ گی ظالم؟
یہ مانا کہ ہے عید کا دن خوشی کا
خوشی میں مگر کتنا کھاؤ گی، ظالم؟
بناؤ گی مجمع میں شوہر کا بھرتہ
''جہاں میں تماشہ بناؤ گی ظالم؟''

(محمد تابش صدیقی)

☆☆☆

اس کے ابا سے معافی کی گزارش نہیں کی
بھاگ جانے کی بھی ہرگز کوئی کوشش نہیں کی
اِس پہ اُس نے بھی مری کوئی سفارش نہیں کی
الغرض باپ نے اس کے، مری بخشش نہیں کی
دو کزن، چار عدد بھائی اور ابا اس کے
سب نے پیٹا ہمیں اور ہم نے بھی جنبش نہیں کی
پیار سے سب کو ہی کہہ دیتا ہوں ''بچے!'' اکثر
شکر ہے آپ کو یوں کہنے کی لغزش نہیں کی
مل گیا ہم سے بریک اپ کا بہانہ اس کو
ہم نے جب بارہ بجے سالگرہ وِش نہیں کی
چغلیاں کھاتی ہے تیری یہ نکلتی ہوئی توند
تو نے اے دوست، کئی سال سے ورزش نہیں کی
پٹ کے بیوی سے بھی گھر سے نہیں نکلے عاطفؔ
''ہم نے بازار میں زخموں کی نمائش نہیں کی''

(عاطف ملک)

☆☆☆

فیس بک پر جو تمہارے لیے گلنار تھی، میں تھا
وہ جو الہڑ سی بقول آپ کے مٹیار تھی، میں تھا
وہ جو آمادۂ امداد تھے ہر وقت، وہ تم تھے
جس کو پیسوں کی ضرورت تھی جو نادار تھی، میں تھا
تم کو یہ دیکھ کے ممکن ہے پریشانی سی ہو
وہ جو معقول سے رشتے کی طلبگار تھی، میں تھا
کورٹ میرج کے فضائل جو بتاتے تھے، وہ تم تھے
گھر سے جو بھاگ کے جانے پہ تیار تھی، میں تھا
اپنی بیگم کے مظالم پہ جو نالاں تھے، وہ تم تھے
جو تسلی تجھے دیتی تھی جو غمخوار تھی، میں تھا

(ڈاکٹر عزیز فیصل)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

قطعات

گدھے کے ساتھ اک لیڈر کا فوٹو
ذرا دیکھو تو کیا بڑھیا چھپا ہے
یہ فوٹو دیکھ کر اک شخص بولا
نہ جانے کون سا ان میں گدھا ہے

☆☆

وہ حال ہے ہر ایک بشر کانپ رہا ہے
بیٹا بھی جھکائے ہوئے سر کانپ رہا ہے
شوہر بھی ہے نوکر کی طرح کونے میں دبکا
بیگم نے قدم رکھا تو گھر کانپ رہا ہے
(آثم پیرزادہ)

☆☆☆

وبا بھی چار سو پھیلی ہے میں بھی گھر پہ بیٹھا ہوں
پریشاں رہتی ہے بیگم میری ہر وقت بے چاری
خدا جانے اشارہ کس کی جانب کر کے کہتی ہے
''نجانے جان کب چھوڑے گی یہ منحوس بیماری''
(امجد علی راجا)

☆☆☆

دال کی ڈش بھی تجھے پیش نہیں کر سکتا
چانپ بکرے کی میسر ہے نہ اب مرغ کی ٹانگ
سبزی خوروں کی حکومت رہے جب تک قائم
''مجھ سے پہلی سی ضیافت مری محبوب نہ مانگ''
(احمد علوی)

☆☆☆

میری بیگم ہے 'جیلس' خواتین سے
پوچھتی ہے یہ مس فاخرہ کون ہے
آئی ڈی کارڈ میرا بنا تو کہا
اب بتاؤ مجھے نادرہ کون ہے

☆☆

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی
سنگ باری کے لیے شیطان کی جانب گیا
ایک کنکر پھینکنے پر یہ ندا اُس نے سُنی
تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

☆☆

جب بھی چاہیں مرغ کھا لیتے ہیں یہ دولتمند لوگ
دن کی پابندی نہیں منگل ہو یا اتوار ہو
ہاں مگر مفلس کو کب ہوتا ہے یہ کھانا نصیب
مرغ ہو بیمار یا وہ خود کبھی بیمار ہو

☆☆

ہم کو تو بڑھاپے نے کہیں کا بھی نہ چھوڑا
محرومیٔ جذبات کو بیٹھے ہیں چھپائے
خوش ہوتے ہیں ہم لوگ اگر کوئی حسینہ
اس عمر میں ہم پر کوئی تہمت ہی لگائے

☆☆

میں تنہا ہوں مجھے ایسے ملازم کی ضرورت ہے
کہ جو تنخواہ لے مجھ سے فقط دو وقت کا کھانا
وہ صبح شام دے گا حاضری دربار داتا پر
وہاں سے لائے گا کھانا اپن دونوں کا روزانہ
(ضیاء الحق قاسمی)

☆☆☆

بے وجہ اختلاف میں اسباب سے گئے
بٹنے کو دال تو ہے، مگر جوتیاں کہاں
ویسے تو باس نے کبھی گالی بکی نہیں
لیکن وہ جیسے کہتا تھا..ابن فلاں،، کہاں
(قیوم طاہر)

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کتاب کا عنوان بلاشبہ نیا نہیں کہ بحیثیت مسلمان ہم اللہ کے پیغامات بخوبی جانتے، سمجھتے اور پڑھتے ہیں مگر یہ عنوان اپنے آپ میں ایک چونکانے والے معنی رکھتا ہے۔ کتاب کے سرورق پر لکھی ایک سطر بہت حیران کن اور انوکھی ہے۔

”غلبۂ اسلام کو مستقبل سے کھینچ کر حال میں لانے کا لائحہ عمل“

جب میں نے یہ سطر پڑھی تو سوچا کہ آخر ایسا کیا ہے اس کتاب میں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کے لیے کتاب کے صفحات کھنگالنا ضروری تھا۔ پہلے نظر پڑی اس کی فہرست پر اور دل خوش ہو گیا ہر طرح کے موضوع کو یہاں دیکھ کر۔ وہ ہر سوال، وہ ہر بات، جو قاری کے ذہن میں اُبھر سکتی ہے۔ شاید کسی بھی موضوع کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب بہت ہوشیار ہیں۔ پیشے سے ڈاکٹر ہیں لیکن یہ حقیقت بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی، اس ذات پاک کے کلام کی مدد اور اللہ سے محبت و قلبی تعلق پیدا کیے بغیر کسی مریض کو شفایابی تک پہنچانا ممکن نہیں کیونکہ یہ اسی ذات پاک کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسے شفا دے اور کس کے وسیلے سے دے۔ ڈاکٹر صاحب نے اللہ سے، اس کے کلام پاک قرآن سے اور اس کے محبوب رسول ﷺ سے ایسا مضبوط تعلق جوڑ لیا کہ سائنس اپنی جگہ، طب اپنی جگہ اور روحانیت سے فیض اپنی جگہ قائم رہا۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ۱۵۰۰ سال بعد بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور ان شاءاللہ تا قیامت رہے گا۔ ارشاد ربّانی ہے کہ ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب کرے۔ اگرچہ مشرک بُرا منائیں۔“ الصّف: ۰۹)

کتاب کا ایک باب بہت خوبصورت ہے بعنوان ”اسلام کا عروج قرآن سے وابستہ ہے۔“

یہی سچ ہے کہ اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ اور سب سے افضل ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

”اگر ہم اسلام کے پھیلاؤ کا جائزہ لیں تو آج اللہ کے فضل سے سب سے تیزی سے پھیلنے والا دین اسلام ہی ہے اور یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی اور طاقت ہے۔

”آج سے کئی سال پہلے ایک مفکر نے پیش گوئی کی تھی کہ ”بغیر کسی تلوار بغیر کسی بندوق اور بغیر کسی جنگ کے میں دیکھ رہا ہوں کہ محض چند دہائیوں میں مسلمان یورپ کی اکثریتی آبادی ہوں گے۔“ اس پیش گوئی کی بازگشت ابھی مکمل طور پر تھمی نہ تھی کہ فورم آن ریلیجن اینڈ پبلک لائف کی رپورٹ (The Future Of The Global Muslim Population) نے تہلکہ مچا دیا۔ جس میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور آئندہ بیس برس تک اس میں ۳۵ فیصد اضافہ متوقع ہے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اب اگر یہ سوچا جائے کہ غلبۂ اسلام کب کیسے ہوگا؟ تو اس سوال کے جواب میں یہ حکم ربّانی قرآن میں پہلے ہی موجود ہے: ''ہماری باتیں سارے عالم میں پھیل جائیں گی اور لوگوں کے دل ان کو قبول کریں گے اور وہ پکار اُٹھیں گے کہ قرآن ہی سچا ہے۔'' (حم سجدہ۔ ۵۳)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں واضح طور پر وہ راز بتا دیا ہے جس کے ذریعے دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ ہے صرف اور صرف قرآن پاک کی عظیم، سچی اور انقلابی تعلیم کو دنیا میں پھیلانا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب مسلمان قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو دنیا پر غالب آ جائیں گے۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ مثال موجود ہے۔

ملکہ وکٹوریا دنیا کے پانچویں حصے پر حکمراں تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اتالیق اور وزیر اعظم لارڈ میلبورن سے دریافت کیا۔ ''آپ نے تاریخ عالم کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس میں آپ کو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا نظر آئی؟''

وزیرِ اعظم لارڈ میلبورن نے بلاتامل جواب دیا: ''اسلام کا عروج۔'' ملکہ وکٹوریا نے سوال کیا، ''آپ نے اس کے اسباب پر غور کیا؟''

لارڈ میلبورن نے کہا، میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ان کے پیغمبر (ﷺ) نے انھیں ہدایت کے لیے ایک کتاب (قرآن مجید) دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے ترقی کی تمام راہیں ان پر کھلی رہیں، پھر جیسے جیسے انھوں نے اس کتاب سے بے اعتنائی برتنا شروع کی ان کا زوال شروع ہو گیا۔'' پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ بولا، ''اگر کسی زمانے میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مسلمانوں نے من حیث القوم پھر قرآن کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی قرآن کے مطابق بنالی، تو پھر ہم کیا ساری دنیا ان کے زیرِ سایہ آ جائے گی۔''

اس کے علاوہ جارج برنارڈ شاہ نے تقریباً اسّی سال قبل پیش گوئی کی تھی کہ دنیا کا مستقل مذہب اسلام ہے۔ وہ اس کی توانائی ہے جو زندگی کے بدلتے ادوار کے تمام تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ غیر مسلم تک اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جب مسلمان قرآن پر عمل کریں گے تو وہ دنیا پر غالب آ جائیں گے مگر مسلمانوں کو اس بات کا احساس تک نہیں۔

آج وقت کی سب سے بڑی اور اہم ترین ضرورت مسلمانوں کا خواب غفلت سے جاگنا ہے۔ غیر مسلموں کے پاس کچھ نہیں وہ تہی داماں ہیں لیکن مسلمان اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کے پاس کامل دین اسلام ہے، کامل پیغمبر رسول اکرم ﷺ ہیں، کامل کتاب قرآن ہے۔ مسلمان ہر طرح سے افضل ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں قرآن کو صرف مرنے والے کے ایصالِ ثواب کے لیے، اپنی دنیاوی مشکلات کم یا ختم کرنے کے لیے اس کی آیتوں کو بطور تعویذ اور محض حساب کتاب کا کلام سمجھ لیا ہے، کہ بس ثواب ملے، پہنچایا جائے، گلے میں لٹکایا جائے، مگر...... اس میں اللہ نے کیا فرمایا ہے؟ کیوں فرمایا ہے؟ کس لیے فرمایا ہے؟ اور کس کے لیے فرمایا ہے؟ اس پر کسی کا دھیان نہیں۔ جس دن ہم نے اس کے پیغامات کو سمجھنا اور ان تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دی، اس دن مسلمان غیر مسلم کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔

یہ کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ یہی نہیں، ایسی ہر کتاب، جو ہمیں قرآن سے محبت کرنا سکھلائے اور جو ہمارے دین اسلام کو آسانی سے سمجھنے میں ہماری مدد کر سکے۔ یہ خوبصورت کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ اسے ڈاکٹر صاحب سے براہِ راست اس نمبر پر رابطہ کر کے منگوایا جا سکتا ہے۔03335242146

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

چمنِ خیال

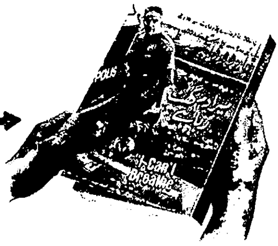

اُردو ڈائجسٹ کا شمارۂ جون موصول ہوا۔ حسبِ سابق سرورق نے دل موہ لیا۔ سفاک سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ بے بس اور مظلوم شخص کی گردن پر گھٹنا رکھے اُسے زندگی سے محروم کر رہا ہے۔ سرورق نہایت حسبِ حال ہے۔

پی کے 713 کا سفر، عنوان سے پہلا تاثر یہ تھا کہ شاید کراچی طیارہ حادثہ پر کوئی تحریر ہے لیکن یہ تو ان دنوں کی داستان ہے جب پی آئی اے واقعی باکمال اور لاجواب تھی۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب نے پڑھنے والوں کو اپنا ہم سفر بنا لیا۔ عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہوتی سپر پاور ایک عمدہ تجزیہ ہے۔ حقیقت میں ابھی تک اس موضوع پر اُردو کے جرائد میں ایسا تفصیلی مضمون شائع نہیں ہوا۔ امریکی فوج کے اندرونی ڈھانچے اور جدید اسلحے کی کہانی اس سپر پاور کے زوال کو جلد ممکن بنا دے گی۔

سید عاصم محمود صاحب اپنے تحقیقی مضامین سے ہمیشہ پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ بل گیٹس پر لکھا گیا مضمون اس کے کھرب پتی کے چہرے سے انسانیت دوستی کا غازہ اُتار کر اندر سے مکروہ چہرہ دکھاتا ہے اور یہ بات بل گیٹس کے ساتھ خاص نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندے اپنی دولت بچانے کی خاطر ہمیشہ سے ایسے کرتے آئے ہیں کہ اب انھوں نے قانونی طریقے اپنا لیے ہیں۔ بہرحال یہ ایک معلوماتی اور انکشافات سے بھرپور مضمون ہے جس کے کچھ مندرجات سے اختلافات کیا جا سکتا ہے لیکن عمومی تاثر وہی ہے جو اُوپر بیان ہوا۔

ڈائجسٹ کے دیگر سلسلے، افسانے، کہانیاں، معلومات اپنی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ کوارنٹین وبا کے دنوں میں سرکاری اسپتالوں میں قائم کوارنٹین سینٹروں کی جو تصویر کشی کرتا ہے آج بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خالد اختر کی طرف سے طنزیہ خطوط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ اولڈ ہومز میں زندگی کے دن کاٹتے ہمارے بزرگ واقعی کس بات کی سزا کاٹ رہے؟ ضمیر جھنجھوڑ دینے والی تحریر ہے۔

(ڈاکٹر سید بلال مسعود، اسلام آباد)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ 10 سال سے زائد عرصہ سے پڑھ رہا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ہوں۔ سالانہ خریدار بھی ہوں۔ اس مرتبہ جون کے شمارے میں بل گیٹس کے خلاف سید عاصم محمود کا مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کہ ادارہ اب مقبول و معروف اور انسانیت کی فلاح کے لیے سرگرم شخص کے بارے میں اس طرح کے بے وزن اور سازشی نظریات پھیلا رہا ہے۔ خدا کا خوف کریں۔ خود اسلامی ممالک سے تو ریسرچ ہوتی نہیں اور چلے ہیں ترقی یافتہ لوگوں پر تنقید کرنے۔ بل گیٹس نے وہی کیا جو ایک سرمایہ دار کاروباری شخصیت کرتی ہے۔ کوئی بھی کاروباری اپنی دولت کو پانی کی طرح بہانے سے پہلے سوچتا ہے اور درست جگہ سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اشرافیہ سے تعلقات بناتا اور اپنی دولت کا ایک حصہ ہی فلاح و بہبود کے لیے مختص کرتا ہے۔ باقی سرمایہ کاروبار میں لگاتا ہے۔ کیا بُرا ہے اس طرح کرنے میں؟

حیرت ہے کہ بل گیٹس کے بچپن کے ایک واقعہ سے جس میں گیٹس اسکول میں ایک ویڈیو گیم کا ٹائم بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، فاضل مصنف نے یہ اخذ کیا کہ بل گیٹس دھوکے باز تھا۔ بچے تو گیم کھیلتے ایسا کرتے ہیں تبھی تو وہ بچے کہلاتے ہیں اور اگر کوئی بھی دن رات محنت کر کے اہم سافٹ ویئر بناتا ہے تو اسے پیٹنٹ کرواتا ہے۔ گیٹس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ شاید اگر میں آئی ٹی کی اہم سرمایہ دار شخصیت ہوتا اور کروڑوں روپے اسکولوں میں کمپیوٹر فنڈ دوں تو اگر ان میں میرا ہی تیار کردہ مستند سافٹ ویئر، جو مارکیٹ میں موجود سافٹ ویئر سے بہتر ہے، انسٹال ہو تو کیا خرابی ہے؟

اسی طرح اور بھی کئی جگہ مضمون میں خامیاں ہیں۔ عرض ہے کہ اس طرح کے مضامین سنجیدہ، سائنٹیفک اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں میں رد کر دیے جاتے ہیں۔ براہِ کرم اس طرح کے سازشی نظریات پر مبنی بے بنیاد مضامین مت شائع کریں۔ اُردو ڈائجسٹ کا ایک معیار ہے۔ کم نہ ہونے پائے۔ شکریہ۔

(شاہد قیاس)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ کی یہ روایت ہے کہ اس نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔ چاہے کوئی بڑی شخصیت ہو، مشہور و معروف ہو یا بااثر۔ جہاں اس نے دوسروں کے اچھے اقدامات اور کامیابیوں کو سراہا، وہیں اس نے ایسی شخصیات کے پول کھولنے میں بھی دیر نہ لگائی جن کے مثبت اقدامات کو کبھی اس نے سراہا بھی تھا۔ گویا اُردو ڈائجسٹ کا کردار اس ماں جیسا ہے جو اچھے کاموں پر اپنے بچوں کی پیٹھ تھپتھپاتی تو غلط کام پر سرزنش بھی کرتی ہے۔

اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جب بل گیٹس کی شخصیت کے مثبت اور اچھے پہلو دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس جریدے نے بل گیٹس اور اس کی بیوی ملینڈا گیٹس کی اچھائیوں اور کامیابیوں کو دل کھول کر سراہا۔

جولائی ۲۰۱۹ میں سرورق ان کی تصویر سے سجایا اور اُمید کی کہ یہ کامیاب جوڑا اسی طرح فلاحی خدمات انجام دیتا رہے گا مگر جب...... انکشاف ہوتا ہے کہ اسی شخصیت کے کچھ نئے مخفی روپ بھی اب دنیا کے سامنے آنے لگے، جن کے بارے میں دنیا نہیں جانتی، تو اس میگزین نے ایک بار پھر سچ لوگوں تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا اور بل گیٹس کے منفی پہلو سامنے آنے پر ان کا بھی انکشاف کیا۔ اس بات سے ہچکچائے بغیر، کہ یہی جریدہ ان میاں بیوی کی مدح سرائی بھی کر چکا۔ یہی تو خوبی ہے اس ڈائجسٹ کی، کہ چاہے پھر وہ گاندھی ہو یا گیٹس، مشہور شخصیات کے کامیاب چہروں نے جب جب اپنے روپ بدلے اور منفی اثرات سامنے آئے، تب تب اُردو ڈائجسٹ نے ڈنکے کی چوٹ پر سچ لکھا۔ (ندیم انجم، لاہور)

☆☆☆

شمارہ اپریل اور مئی ۲۰۲۰

(لاک ڈاؤن کی وجہ سے ڈاک کی ترسیل بند رہی، لہٰذا کچھ خطوط ہمیں شمارہ اپریل اور مئی سے متعلق دیر سے موصول ہوئے۔ ادارہ)

☆☆

شمارۂ جون کے ساتھ اس بار اپریل اور مئی کا اُردو ڈائجسٹ بھی ملنے پر اتنی زیادہ مسرت ہوئی کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ جب ڈاک بابو کے انتظار میں آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اچانک میری پوتی ابیہہ پھولی سانسوں ہاتھوں میں یہ کہتے ہوئے، لو دادا جی آپ کی اُردو کی دو ڈائریاں (ڈائجسٹ) آئی ہیں۔ یعنی جیسے عید پر مفتی منیب الرحمان کے چاند نظر آنے کے ساتھ مفتی پوپلزئی صاحب کا چاند بھی آن نکلا ہو۔ ادھر ابھی دونوں چاند دیکھنے کے لیے نکالے ہی تھے کہ احمد مجتبیٰ اپنی ماں کی کپڑوں والی ٹوکری گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ پھرتی سے ایک شمارہ جس پر عمران خان کی تصویر تھی، اپنے ٹوکرے میں ڈال کر بھاگ نکلے۔

جو شمارہ ہمارے ہاتھ لگا اس کی ورق گردانی شروع کر دی اور شام تک پڑھ کر ہی دم لیا۔ شام کو احمد مجتبیٰ کو پیار کیا تو وہ اپنی ٹوکری سے ’لے لو‘ کہتے ہوئے میری طرف اپنے ننھے منے ہاتھوں میں ڈائجسٹ تھامے کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے ورق گردانی کر لی اور اب مجھے پڑھنے کی اجازت دے رہا ہو۔

رات دیر تک اس شمارے میں شائع ہونے والا ہر مضمون بھی ٹڈی دل کی طرح چٹ کر لیا۔ یوں لگا کہ اُردو کی کھٹی میٹھی چٹنی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کی سمارٹنس یعنی انتہائی بانکا سجیلا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ لگتا ہے مہنگائی کے ہاتھوں مجبوراً آپ نے اس کو کم خوراکی تک محدود کر دیا ہے۔ برنی سینڈرز کو پہلے تو اپنا ہی کوئی برنی سمجھا بعد ازاں پتا لگا پاکستان کا نہیں پولینڈ کا برنی ہے۔ اس کی ہمت، خلوصِ نیت اور سچی لگن نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سانچ کو آنچ نہیں، کے مصداق اور محنت میں عظمت عزم ولولہ ہو تو انسان کیا نہیں کر سکتا؟

میرا خیال ہے کہ ابھی برنی کو جو بائیڈن کو آگے لانا چاہیے۔ سیاسی اکھاڑے میں مسٹر ٹرمپ کا زور چلتا دکھائی نہیں دیتا اور ریاست متحدہ امریکا کی موجودہ صورت حال بھی خاصی پریشان کن ہے۔ ایسی صورت میں امریکا میں پاکستانیوں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ نہ جانے کب تک دنیا جھلستی سلگتی رہے گی؟ آخر کب تک؟ (شیخ نذیر احمد، اسلام آباد)

☆☆☆

میں نے جب کچھ کمانا شروع کیا تو تعلیمی قرضوں سے نجات کے بعد، تسکین ذوق کی خاطر اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بن گیا۔ اُردو ڈائجسٹ سے میری دل لگی اس وقت ہوئی جب میرے ہائی اسکول کے استاد نے مجھے اس کا ایک شمارہ پڑھنے کو دیا۔ میں بچپن سے ہی نونہال اور تعلیم و تربیت کا دلدادہ تھا۔ اُردو ڈائجسٹ مجھے بہت ہی پسند آیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس کی حیثیت اُردو قاری کے لیے وہی ہے جو ریڈرز کی انگریزی پڑھنے والوں کے لیے ہے۔ اس بار کرونا کی وبا اور لاک ڈاؤن کے باعث ماہِ اپریل کا شمارہ کچھ دیر سے ملا، مگر میرا یہ دوست جب ملا تو بہت خوشی ہوئی۔ سرورق سبز رنگ کو نمایاں کرتا وزیر اعظم کی تصویر لیے بھلا لگا۔

ہندو مسلم فسادات پر نظر اور دو قومی نظریہ کو تقویت دیتی تحریریں قاری کو ماضی سے روشناس کراتی ہیں۔ صالحہ محبوب کی معاشرتی کہانی ’حق حقدار کو ملا‘ بہت سبق آموز اور معاشرتی برائیوں پر ضرب کاری ہے۔ نعمت اللہ خان کی داستان حیات ہمیں اپنے سورماؤں سے ملاتی ہے۔ اور ایک پیغام ہے کہ اپنے حصے کی شمع جلاتے جائیں۔

خوبصورت پرندے ہدہد پر مضمون بہت اچھا تھا۔ صاحبزادہ شیر زمان نے شاعری پر جو اشعار کا بہترین گلدستہ حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا، کیا کہنے۔ ہیروں کا محافظ بھی بہترین کہانی تھی اور پھر تہذیب و تمدن کی اہمیت اُجاگر کرتی خرم سہیل کی تحریر ’ڈراما ریٹنگ کی دلدل میں‘ بہت ہی زبردست تھی۔ المختصر مزہ آ گیا۔ آپ کو ٹوئٹر پر فالو کیا۔ اللہ کرے یہ سلسلہ جاری رہے اور اللہ اس میں مزید برکت دے۔ (محمد نوید شاکر، راولپنڈی)

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

عید قربان اور باورچی خانہ

جینا جہانگیر

لاک ڈاؤن ہے تو سادگی سے بھی مثالی پکوان بنائے جاسکتے ہیں

عید الاضحی کو اگر پکوانوں کا دن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس عید پر قربانی کرنے کی وجہ سے تقریباً ہر گھر کے افراد مختلف طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس بار لاک ڈاؤن اور کورونا کی صورتحال نے عید الفطر کو بھی پھیکا سا کر دیا۔ یہ اور بات کہ کچھ طبقات میں کورونا اور لاک ڈاؤن کا اثر نہ ہوا اور ان گھروں میں تمام جشن وروایات ہمیشہ کی طرح منائی گئیں جو بہرحال سماجیات کے موجودہ تقاضوں کے برخلاف اقدام تھا۔ یہ وبا ایسی ہے جس میں ہماری بیماری اور لاپروائی، دوسروں کی زندگی اور موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے احتیاط بے حد لازم ہے۔ اب رہی بات عید قرباں کی رونقوں کی، تو ہر تہوار اپنی بھرپور خوبصورتی کے ساتھ، مذہبی عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر منایا جاسکتا ہے۔ مختلف کھانے بھی پکائے جاسکتے ہیں مگر کیا آپ اس عید پہ ایسا پکوان کھانا اور پکانا پسند کریں گے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ ترین پکوان تھا؟

اپنے باورچی خانے میں سادگی سے گوشت کی ایک ڈش بنانے کے لیے بہترین اور لذیذ کھانے کا نام ثرید ہی ہوسکتا ہے۔ اس بار عید پر اسے گھر پر بنائیں اور نئی طرح کے جذبے سے گندھی عید منائیں۔ اس پکوان کو عام طور پر شوربے میں روٹی بھگو کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کئی احادیث بھی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ترین کھانا روٹی کا ثرید تھا۔ (ابوداؤد شریف) اسی طر[ح] صحیح بخاری میں ہے کہ عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت تمام عورتو[ں] پر ایسے ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔

مختلف غذائی ماہرین کے مطابق یہ پکوان گوشت کی ڈش ہونے کے باوجود جلد ہضم ہوجاتا ہے اس لیے یہ نظام ہاضم[ہ] کے لیے بھی بہترین ہے۔ جبکہ اس کے دیگر فوائد بھی ہیں۔

ثرید کے لیے درکار اجزاء

600 گرام بغیر ہڈی بھیڑ یا گائے کا گوشت۔ چھوٹ[ی] بوٹیاں کرلیں۔

لوکی کا آدھا حصہ کاٹ لیں۔ زیتون کا تیل، 2 کھان[ے] کے چمچ، پیاز ایک عدد لہسن کی 4 پوتھیاں ادرک حسب ذائقہ۔ کاٹ لیں یا پیس لیں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

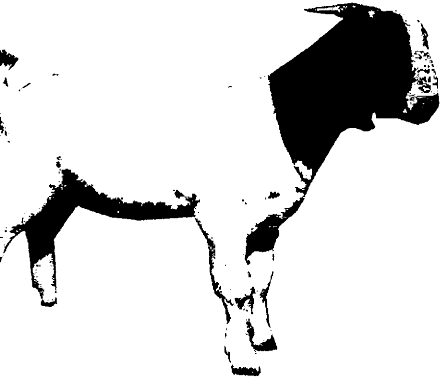

ٹماٹر کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ، ٹماٹر ایک عدد، نمک اور کالی مرچ حسب ذائقہ 1/4 چائے کا چمچ، ہلدی 1/4 چائے کا چمچ، سرخ مرچ پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، گرم مسالا پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، دھنیا پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ، زیرہ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ دہی، ایک لیٹر ابلا ہوا پانی۔

پکانے کا طریقہ

زیتون کا تیل برتن میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیں اور پھر اس میں پیاز، لہسن اور ادرک کا اضافہ کریں۔ انھیں اس وقت تک تلیں جب تک ہلکے سے سنہری رنگ کے نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد اس میں مسالے ڈال کر اس آمیزے کو ایک منٹ تک پکائیں۔

اس پر ٹماٹر کا پیسٹ اور کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال دیں جبکہ حسب ذائقہ نمک اور معمولی سا پانی بھی شامل کرلیں۔ اس آمیزے کو اس وقت تک پکائیں جب تک ٹماٹر پیسٹ کی شکل اختیار نہ کرلیں اور تیل آمیزے سے الگ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد گوشت کا اضافہ کریں اور چولہے کی آنچ بڑھا دیں، جبکہ آمیزہ چمچ سے ہلاتے رہیں۔

اس کے بعد ابلے ہوئے پانی کا اضافہ کر کے اسے ابلنے کے لیے رکھ دیں، جب یہ اُبل جائے تو آنچ ہلکی کر کے برتن ڈھانپ اور گوشت اس وقت تک پکائیں جب تک وہ گل نہ جائے۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں دہی اور لوکی ڈال کر مزید پندرہ منٹ تک پکائیں۔

جب سالن پک جائے تو چولہا بند کر کے دھنیا پودینا سے سجائیں۔ ثرید تیار ہے۔ ایک گرم روٹی کے ٹکڑے کریں اور پلیٹ میں رکھ دیں۔ اب اس کے اُوپر ثرید ڈالیں اور گرم گرم ہی پیش کریں۔

☆☆☆

عیدالاضحیٰ کے موقع پر گوشت کے دیگر پکوان دسترخوان
کی شان بنتے ہیں۔ خواتین عیدالاضحیٰ پر پکوان بنانے
مصروف رہتی ہیں اور گھر والوں کی تواضع کے ساتھ مہمانو
آمد کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ چاہے قربانی گائے کی ہ
بکرے کی، دنبے کی ہو یا اُونٹ کی، عیدالاضحیٰ پر کھانوں
پہلا پکوان کلیجی ہی ہوتی ہے جسے سب شوق سے کھاتے ہیں
کلیجی کے بعد دوسرا نام بریانی کا ہے کیونکہ دن میں
کھانے کے بعد لوگ شام میں چاول جیسے یخنی پلاؤ یا مسا
والی بریانی کھانا پسند کرتے ہیں۔ گھر میں قربانی ہو اور
نئے پکوان نہ بنیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ عیدالاضحیٰ پر پکا
جانے والے چند نہایت آسان اور لذیذ کھانے یہ ہیں۔

کلیجی:

کلیجی بنانے کے بہت سارے طریقے ہیں۔ ہر گھر
کے پکانے کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ کلیجی مختلف تراکیب
پکائی جاتی ہے مثلاً بُھنی ہوئی، شوربے والی، توا کلیجی، کھٹی کلی
شاہی کلیجی، مغلیائی اور دیگر لیکن سب سے زیادہ رجحان
ہوئی کلیجی کا ہی ہے۔

بکرے کے گوشت کے پکوان:

مہنگائی کی وجہ سے بکرے کا گوشت عام طور پر کم
جاتا ہے لیکن عیدالاضحیٰ کے موقع پر بکرے کے گوشت

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پکوان بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں جن میں بکرے کی چانپ، بریانی اور پلاؤ، قورمہ، ران روسٹ اور سجّی وغیرہ شامل ہیں۔

سب سے سادہ اور آسان روسٹ بنانے کے لیے دہی میں ادرک کا پیسٹ، نمک، لال مرچ حسب ذائقہ ڈالیں اور اُبلے ہوئے نیم گلے مٹن کی بوٹیاں اس آمیزے میں ڈبو دیں اور تقریباً آٹھ گھنٹے بعد گرم گھی میں ہلکی آنچ پر پکالیں۔ پانی نہ ڈالیں کیونکہ دہی اور گوشت کا اپنا کافی پانی نکلتا ہے۔ اسی میں گوشت گل جائے گا اور انتہائی آسان مگر بے تحاشا لذیذ مٹن روسٹ تیار ہو جائے گا۔ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

گائے کے گوشت کے پکوان:

گائے کی قربانی سب سے زیادہ عام ہے۔ کئی افراد گائے کی قربانی میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ گائے کے بے شمار پکوان عام طور پر گھروں میں پکائے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ عید کے موقع پر کچھ خاص پکوان جیسے اسٹو، پسندے، شامی کباب، تکّہ بوٹی، نہاری، کٹاکٹ، پائے، کوفتے، سیخ کباب وغیرہ۔

گائے کا گوشت اگر پہلے ہی ادھ نیم گلا کر فریج میں رکھ لیا جائے تو مہمانوں کے آنے پر، کھانا فوری طور پر مرغ کے تیار ہونے جتنے وقت میں پک جاتا ہے۔

دنبہ کے گوشت کے پکوان:

دنبے کی قربانی کراچی اور دیگر شہروں میں کم ہی دکھائی دیتی ہے حالانکہ دنبے کے گوشت میں وٹامن ڈی اور پروٹین وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ دنبے کا گوشت غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے گوشت کے پکوان جن میں روسٹڈ لامب، اسپائسی لامب لیگ، عربی لامب اسٹیو وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا گوشت چونکہ تھوڑا سا ہمک والا ہوتا ہے۔ ایک خاص مہک جسے کچھ لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اسے دُور کرنے کے لیے دنبے کا گوشت کیسا بھی پکائیں، تھوڑی سی سوکھی میتھی ڈال دیں۔ اس سے دنبے کے گوشت کی خاص ناگوار مہک ختم ہو جاتی ہے۔

اونٹ کے گوشت کے پکوان:

آج کل اُونٹ کی قربانی عام ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے کسی کسی محلے میں اُونٹ کی قربانی کا شور وغوغا اٹھتا تھا مگر اب تو ہر محلہ میں تقریباً ایک یا دو اُونٹ تو ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اُونٹ کا گوشت بازاروں میں بہت کم ہی ملتا ہے لیکن عید قرباں کے خاص موقع پر لوگوں کو اُونٹ کا گوشت میسر آ ہی جاتا ہے۔ اس کا گوشت چونکہ نمکین ہوتا ہے اس لیے ہائی بلڈ پریشر جیسے امراض میں مبتلا افراد کو اُونٹ کے گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے نیز اسے پکاتے وقت اس میں نمک نہیں ڈالنا چاہیے۔ اُونٹ کا گوشت پکانے کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے اور عام طور پر لوگوں کو اس سے واقفیت نہیں ہوتی کیونکہ عام دنوں میں اُونٹ کا گوشت بہت ہی کم پکایا جاتا ہے۔ ذائقے کے اعتبار سے یہ بہت لذیذ ہوتا ہے لیکن اسے پکانے کے لیے خاص مہارت چاہیے۔

باربی کیو:

اس دفعہ شاید باربی کیو کی وہ بہاریں اور رونقیں نہ ہوں، مگر چھوٹے محدود پیمانے پر گھروں کی چھتوں پر آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل کر اس کا مزہ لے سکتے ہیں۔ عید کے دنوں گھروں میں تکے بنانے کا رواج بہت پرانا ہے اور اس کی تیاری میں خواتین سے زیادہ گھر کے مرد حضرات اور بچے حصہ لیتے ہیں۔ رات کو گھر کی چھتوں پر یا صحن میں بیٹھ کر تکے بوٹی کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ باربی کیو میں تکہ بوٹی، ملائی بوٹی، افغانی کباب، بہاری تکہ بوٹی اور کشمیری سیخ کباب شامل ہیں۔ عید منائیں، مزیدار کھانے بھی پکائیں لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نا جانے دیں اور غریبوں کو نہ بھولیں۔

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

مایوسی کا علاج ہنسی!

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ایک دن سید انشاء اللہ خان انشاء نواب صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ گرمی کی وجہ سے دستار سر سے اُتار کر رکھ لی۔ انشاء کا منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب صاحب کو شرارت سوجھی اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ٹھونگ ماری۔ جس پر انشاء نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ! بچپن میں بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ جو لوگ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں شیطان ان کے ٹھونگیں مارتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بات سچ تھی۔

☆☆☆

ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے، اگر آپ ان کے پانچ شعر سنا دیں تو میں آپ کو پانچ سو روپے دوں گا۔

دوسرے شخص نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیے۔ پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''اپنا تعارف تو کروائیے۔''

شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا، ''میں ہی عبدالعزیز خالد ہوں۔''

☆☆☆

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ''آئی سی ایس'' میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کے والد کمرے میں بے تکلفانہ چلے آئے۔ ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے

انھیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کروایا: ''یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں۔''

والد محترم کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں ان کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں۔''

☆☆☆

ایک ڈراما نگار کا ڈراما سٹیج ہوا تو اس نے جارج برنارڈ شا کو بھی ڈراما دیکھنے کی دعوت دی۔ ڈرامے کے دوران سارا وقت برنارڈ شا سوئے رہے۔ جب ڈراما ختم ہوا تو ڈراما نگار نے خفگی سے کہا:

''میں ڈرامے کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی تھا مگر آپ سارا وقت سوئے رہے۔''

برنارڈ شا نے بڑے سکون سے جواب دیا، ''سونا بھی تو ایک طرح کی رائے ہی ہے۔''

☆☆☆

پطرس بخاری کے کسی عزیز کا نکاح تھا۔ اس کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک شخص ڈھونڈ کر لایا گیا جو بہت دبلا پتلا تھا۔ پطرس صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے، ''نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نکاح خواں اور چھوہارے کی۔ ماشاء اللہ ان میں دونوں صفات موجود ہیں۔''

☆☆☆

اسرار الحق مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب جو ان کے روشناس نہیں تھے، ان کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر انھوں نے اپنی کن سری آواز میں گنگنانا شروع کیا۔

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔''

☆☆☆

جرأت نابینا تھے۔ ایک روز بیٹھے فکر سخن کر رہے تھے کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ آ گئے۔ انھیں محو پایا تو پوچھا ''حضرت کس سوچ میں ہیں؟''

جرأت نے کہا، ''کچھ نہیں، بس ایک مصرعہ ہوا ہے۔ شعر مکمل کرنے کی فکر میں ہوں۔'' انشاءؔ نے عرض کیا، ''کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔''

جرأت نے کہا، ''نہیں! تم گرہ لگا کر مصرعہ مجھ سے چھین لوگے۔'' آخر بڑے اصرار کے بعد جرأت نے بتایا۔ مصرعہ تھا۔

''اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی''

انشاءؔ نے فوراً گرہ لگائی: ''اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔''

جرأت لاٹھی اُٹھا کر انشاءؔ کی طرف لپکے۔ دیر تک انشا آگے اور جرأت پیچھے پیچھے انھیں ٹٹولتے ہوئے بھاگتے رہے۔

☆☆☆

اکبر الہ آبادی دلی میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں مہمان تھے۔ سب لوگ کھانا کھانے لگے تو آلو کی ترکاری اکبر کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی دختر حور بانو سے (ج کھانا کھلا رہی تھی) پوچھا کہ بڑے اچھے آلو ہیں۔ کہاں سے آئے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے خالو بازار سے لا ہیں۔ اس پر اکبرؔ نے فی البدیہہ شعر پڑھا۔

لائے ہیں ڈھونڈ کے بازار سے آلو اچھے
اس میں کچھ شک نہیں ہیں حور کے خالو اچھے

☆☆☆

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

5. The bidders shall submit the bid in two parts. The first part shall be for specification, called the **"Technical Proposal"**, the second one for the cost, called the **"Financial Proposal"**. These bids should be sealed in envelop and **must** be submitted separately.
6. The technical bid will be opened first and evaluated. If the specification of bid meet the requirement of bid documents, then bid will be qualified for opening Financial Proposal, otherwise the same shall be returned unopened.
7. the bidders shall specify the name of product, name of manufacturer, country of origin, detailed specifications & compatibility, warranty details and in case of participating the bid as contracting firm, name of registered supplied/Distributor shall be specified.
8. The bidder shall include all taxes and duties in the bid price.
9. Procurements shall be governed under the Punjab Procurement Rules 2014.
10. If any further information required regarding the tender please visit the office of the undersigned during working hours.

IPL - 5309

Deputy Director (FFP)

WASA, Faisalabad

03409995455

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اُردو کے پروفیسر گھر آئے تو بیوی سے پوچھا:

''بیگم آج کیا پکایا ہے۔ مہنگائی کے ہاتھوں پریشان عورت نے جواب دیا۔

''خاک پکائی ہے۔''

پروفیسر صاحب بولے: ''خاک کو الٹ کریں تو کاخ بنتا ہے۔ کاخ فارسی میں محل کو کہتے ہیں۔ محل کو الٹا کریں تو لحم بنتا ہے۔ لحم کو اردو میں گوشت کہتے ہیں۔ اچھا بیگم آج گوشت پکایا ہے۔''

☆☆☆

ناصر کاظمی اور حبیب جالب بے تکلف دوست تھے۔ جالب نے کاظمی سے کہا:

''آپ کی غزلیات سن کر میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش مجھ میں بھی ایسی غزل لکھنے کی استعداد ہوتی۔ جب میں آپ کا کوئی کلام دیکھتا ہوں میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس پر میرا نام لکھا ہو۔''

کاظمی نے جالب کی اس تعریف کا شکریہ ادا کیا۔ جالب نے کاظمی سے پوچھا:

''میری غزل دیکھ کر آپ کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔''

ناصر نے جواب دیا: ''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ کی غزل یا نظم آپ کے نام سے ہی چھپی۔ غلطی سے میرا نام نہیں چھپ گیا۔''

WATER & SANITATION AGENCY
OFFICE OF THE PROJECT DIRECTOR (FF)
P.O. BOX NO. 229, FAISALABAD
Phone: +92-41-24314194
Email: pmuwasafsd@yahoo.com

TENDER NOTICE

Sealed bids are invited from manufacturer/registered dealers and Distributors of manufacturer **(for specified products as requirement of bid)** or contractors who have deposited their enlistment/renewal fee for the financial year 2020-21 in WASA Faisalabad/HUD&PHED Lahore and having experience in this specific field.

Sr. No.	Name of Work	TS No. & Date	Estimate cost in Rupees (PKR)	Earnest Money (PKR)	Tender Fee. (PKR)	Time Limit
1.	Supply and Installation of Online Turbidity (NTU) & potential hydrogen (P_H) Analyzers Sensors for Water Treatment Plant (10MGD)	339/D(FP)/ WASA Dated 12/06/2020	2,526,940/-	2% of estimate cost	1500/-	04 Months

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

TERMS & CONDITIONS:

1. Tender Documents can be obtained from the office of Deputy Director French Funded Project, WASA near Novelty Bridge Sammundri Road, Faisalabad immediately after advertisement of tender notice through newspapers and uploading the notice on PPRA website with 2% (two percent) earnest money of the estimated cost in shape of (CDR) deposit-at-call from any scheduled Bank. The bids will be opened in Committee Room French Funded Project near Novelty Bridge Summundri road, Faisalabad. Bids receiving time 11:00 AM & opening time of bids 11:30 AM on 13.07.2020.
2. Earnest money must be accomplished with the tender which should be valid for at least Sixty (60) calendar days after the date specified for opening of the bids otherwise it will not be entertained.
3. Tenders shall be opened in the presence of interested bidders or their representatives who may care to be present.
4. Procedure of open competitive bidding = Single Stage two Envelop System.

ROSHAN

Packages Limited.

ہم اپنے کسان بھائیوں کا خیال رکھتے ہیں

پاکستانی آم اپنے منفرد ذائقے اور خوشبو کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے مگر بدقسمتی سے ناقص پیکیجنگ کی وجہ سے گاہک تک بہترین حالت میں نہیں پہنچ پاتا۔ جس کی وجہ سے 30 سے 40 فیصد پھل ضائع ہو جاتا ہے۔ اپنے پھلوں کی محفوظ ترسیل کے لیے روشن پیکیجز کے عمدہ اور مضبوط ڈبے کا انتخاب کریں اور ڈھیروں منافع کمائیں۔

www.roshanpackages.com.pk info@roshanpackages.com.pk

RoshanPackages.LTD Roshan Packages Limited +92 42 32300010

HEAD OFFICE: 325 G-III, M.A JOHAR TOWN, LAHORE - PAKISTAN

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com